کوہاٹ کے ترقی پسند مصنفین



حمید اظہر — عزیز احمد — رحمان ساقی



استادہ — محمد اکرم منسهود- لعل زاده ناظر- محمد اجمل خٹک - محمد اشرف مفتون- عبدالغفران نیکمد
کرسیوں پر — محمد نواز خٹک- عبدالخالق خلیق- حضرت بادشاه گل- غلام سرورخان مهمند حار- میر هلا
بیٹھے ہوئے — مولانا عبداللہ — امیر حمزه خان شنواری - سمند خان ...

سنگِ میل

سرحد نمبر

۹ روپیہ

فارغ بخاری

رضا ہمدانی

جنوری ۱۹۵۰ء

نمبر ۷ — ۸

قیمت دو روپے آٹھ آنے

سالانہ پانچ روپے

نیا مکتبہ پشاور

(پاکستان)

ترتیب

اداریہ

پیغامات

منظومات

ادبیاتِ سرحد

افسانے

مقالات

شخصیات

فارغ بخاری

اداریہ

سرحد نمبر

سرحد نمبر آپ کے سامنے ہے۔ اس نمبر کی تیاری میں خلاف توقع پانچ مہینے لگ گئے۔ یہ نمبر ساتویں اور آٹھویں شمارہ پر مشتمل ہے اور اس کی ضخامت سنگ میل کے عام شماروں سے چار گنا ہے۔ ویسے یہ نمبر ہمیں چار مہینے بعد یعنی نومبر میں پیش کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اس کی ترتیب میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا اعلان کرتے وقت ہمیں ان مشکلات کا بہت کم اندازہ تھا۔ کسی ایک موضوع پر کوئی نمبر پیش کرنا بجائے خود ایک نہایت مشکل کام ہے، اور پھر ایک ایسے صوبے کے متعلق یہ کوشش کتنی دشوار ہوگی جو شروع سے ہی پس ماندہ رہا ہے۔ اور اس کے متعلق کسی زبان میں بھی آج تک کوئی صحیح لٹریچر پیش ہی نہیں ہوا۔ انگریزی زبان میں کچھ کتابیں ملتی ہیں وہ بھی غیر ملکی حکمرانوں کی لکھی ہوئی۔ جن کا سارا زور قلم محض اسی مقصد کے لئے صرف ہوا کہ یہاں کے باشندوں کو وحشی۔ خونخوار اور درندے ثابت کر کے بیرونی دنیا کو ان سے نفرت دلائی جائے۔ اور ان حریت پرور انسانوں پر جنہوں نے کبھی ایک دن کے لئے بھی انگریز سامراج کا اقتدار تسلیم نہیں کیا۔ ہر ستم بہیمانہ اور لاانسانیت سوز مظالم ڈھانے کا جواز پیدا کیا جائے۔

"ایک عظیم مہذب طاقت کے ۲۵ سالہ پرامن قبضہ کے بعد بھی اس نیم وحشی قوم پر بہت ہی کم اثر قائم ہو سکا۔ اور ہمیں اس کے متعلق اتنا کم علم ہے کہ اس کا اہم ترین شہر پشاور بھی ایک ہیبت کدہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں شہر سے دو میل دور بھی انگریزی جان کے بچاؤ کے لئے کوئی ضمانت نہیں؟"

یہ اقتباس پنجاب کے ایک سابق ڈپٹی کمشنر مسٹر وار برٹن کی تصنیف "خیبر میں اٹھارہ سال (۱۸۷۹ - ۹۸)" سے لیا گیا ہے۔

یہ لارڈ لٹن کے الفاظ ہیں جو اس نے اپریل ۱۸۷۷ء میں سیکرٹری آف سٹیٹ کو لکھے جس میں اس نے اعتراف کیا ہے۔ کہ سرحدی باشندوں پر طاقت و بربریت کی عظمت اثر قائم نہ کر سکی۔ اور ایک ربع صدی کے تسلط کے بعد بھی وہ نہ سرحدی جسموں پر قبضہ کر سکے نہ دلوں پر ــــ

انگریزوں نے اپنی زبان و قلم کی تمام تر قوتیں سرحد کے غیور و جسور انسانوں کو خونخوار اور وحشی ثابت کرنے میں صرف کر دیں۔ اور دنیا کو قائل کرنے کے لئے اس علاقے کو ہیبت کدہ کا نام دیا۔ تاکہ ایشیا کے ان پاسبان خطہ پر مخالفانہ قبضے کا جواز پیدا ہو سکے۔ آگے چل کر وار برٹن لکھتا ہے

"سرحد پر ملائیت کا غلبہ ہو رہا ہے"

اور ملائیت کے غلبے سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ پٹھان انگریز دشمن نہیں بلکہ عیسائیت دشمن ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کا مطلب یہ تھا کہ پٹھان غلامی کے دشمن نہیں عیسائیت کے دشمن ہیں۔ اور انگریزی استعمار پرستی سے عداوت نہیں رکھتے بلکہ انگریز کے مذہب سے بیر رکھتے ہیں۔

یہ سینکڑوں صفحات کی کتاب پٹھانوں کی غارت گری، خون آشامی اور بربریت کے افسانوں سے بھری پڑی ہے۔ اور ہر ممکن طریقے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ پچھتر لاکھ انسانوں کا ملک ایک جنگل ہے جس میں بھیڑیے بستے ہیں۔ اور جہاں انسانیت و ثقافت نے کبھی سانس ہی نہیں لی۔ اور انگریز انہیں انسان بنانے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ لیکن یہ نیم وحشی عقل و سائنس کی غلامی پر قانع ہونے کے لئے تیار نہیں۔

وار برٹن کا ایک اور ارشاد ملاحظہ ہو:۔

"آفریدی کو پیدا ہوتے ہی سارے بنی آدم سے نا اعتباری سکھائی جاتی ہے اور وہ ساری دنیا کو اپنا دشمن سمجھ کر جینے کی ابتدا کرتا ہے۔ تاکہ کوئی اس کو زیر نہ کر سکے بلکہ اس کو قابو میں

لانے کے لئے محبت اور منافقت کی ضرورت ہے؟

آفریدیوں کا اور دوسرے سرحدی قبائل کا جرم صرف اتنا ہے کہ وہ حریت پسند ہیں۔ سرحدیوں کی یہ خصوصیت مغربی اقوام کی نظر میں عیب ہی لیکن انہیں اس پر فخر ہے کہ اُن کی قوم نے خوشحال خان پیدا کئے۔ کرنل لارنس نہیں پیدا کئے۔ اور نہ ہی دُنیا کو غلام بنانے کے لئے انسانیت کے بنیادی اصولوں کو مسخ کیا۔ کاش ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۹ء کی جنگوں کے شعلے آفریدی علاقے سے بھڑکتے۔ تاکہ داربرٹن کی روح کو سکون مل سکتا۔ کہ اس کا نظریہ صحیح تھا۔

بہرحال انسانوں کو جیتنے کے لئے محبت اور منافقت کا ملا جلا نسخہ انگریز قوم ہی تیار کر سکتی ہے۔ اور مجھے کہنے دیجئے کہ آج اُن کی سیاست کے تنکم میں جو مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ وہ اسی نسخے کا ردعمل ہے۔

انگریز قوم کو سرحد پر قبضہ رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس عظیم طاقت نے نیم وحشی انسانوں پر منافقت سے قبضہ رکھنے کی دردِ سری کیوں مول لی۔ اس کے متعلق سرالفریڈ لائیل اپنی تصنیف "ہندوستان میں برطانوی اقتدار کا عروج و توسیع" میں لکھتا ہے:۔

"روس کی ایشیا میں سابقت جسے نپولین کی جنگوں نے روک دیا۔ اور جو کچھ عرصہ بعد پھر بحال ہو گئی۔ اور بحیرہ کیسپین کے تمام وسطی حصوں میں شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ خصوصاً ۱۸۲۸ء کے روسی ایرانی معاہدے نے جس سے ایران بہت حد تک روسی اثر میں آ گیا تھا۔ اس احساس کو قوی بنا دیا۔ اور اس وقت سے آج تک ہماری تمام تر پالیسی اور ہمارا مرکز توجہ شمال مغربی سرحد رہی ہے۔ اور یہ ہماری مدافعانہ یا مزاحمانہ یا محتاطانہ تدابیر تھیں جو روس کے مزعومہ ارادوں کے لئے عمل میں لائی جاتی رہی ہیں"

یہ ہے وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے انگریز کو اس نیم وحشی علاقے پر قبضہ رکھنے کی ضرورت پیش آئی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ جہاں روسی اقتدار کا خطرہ تھا۔ وہاں

انگریز کی غلام ساز نگاہیں نہ پہنچ سکیں۔ اور آج بھی ہوائی اور ایٹمی زمانے میں محض روسی اقتدار کے ہّوے نے انگریز کو دنیا بھر کی سیاسیات پر قبضہ رکھنے کے لئے مضطرب کیا ہوا ہے۔

ہندوستان کی غلامی کے تحفظ کے لئے انگریز ہمیشہ سرحد پر قبضہ رکھنے کے لئے مجبور رہا۔ چنانچہ سر لائل کے خیال میں افغانستان ایک "دیوار حفاظت" تھی ہندوستانی میدانوں کو روس کے پنجے سے بچانے کے لئے سرحد میں قوت، طاقت منافقت اور عسکری سلطہ پروں کی ضرورت اس لئے رہی کہ سر الفریڈ کے الفاظ ہیں۔

"عسکری سرگرمیوں کا مقصد ان ریاستوں کی حفاظت ہے جو روس۔ چین اور ایران کو ہمارے مقبوضہ خطوں سے دور رکھتی ہیں۔"

یہ تو تھا خود انگریزوں کی زبانی سرحد پر قبضہ رکھنے اور اُسے غلام بنانے کا مقصد ــــ حاشا وکلا انگریز کی نیت کبھی یہ نہ تھی۔ کہ ایشیائی تمدن کو غارت کرے یہ اور بات ہے کہ اس تمدن کو غارت کئے بغیر وہ سرحدی باشندوں کو "نیم وحشی" ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

"پنجاب میں پینتیس سال" کا مطالعہ کرتے وقت مجھے مسرت ہوئی کہ اس شریف النفس انگریز نے کتنے ہمدردانہ لہجے میں سرحدیوں کی خون آشامی اور اپنی عدل گستری کا ذکر کیا ہے ــــ

لطف یہ کہ وہ برسوں پشاور کی عدالتوں میں منصف رہا۔ لیکن کبھی کسی قاتل کا جرم ثابت نہ کر سکا۔ اور اسے صحیح قاتل کا پتہ نہ چل سکا مجھے یقین ہے کہ اس میں اس کی قوت فیصلہ کا قصور نہ تھا۔ بلکہ وہ ہمدردانہ طرح دے جاتا ہوگا۔ تاکہ خون آشامی رواج باقی رہے۔ ورنہ اگر میجر میکڈانلڈ کے قاتل کا سراغ لگ سکتا ہے۔ تو کسی سرحدی کے قاتل کا کھوج نہ نکلنے کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہی وہ ذہنی تعصب تھا۔ کہ یہ منصف ایبٹ آباد کی دلفریبیوں کا قائل ہو کر بھی یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں کہ یہ شہر سرحدی ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ غلطی سے سکاٹ لینڈ کی ایلین بریز سرحد میں آگئی

ہے۔

جرائم قتل کے متعلق میجر جیمس لکھتا ہے:۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ پشاور کا علاقہ پٹھانوں کی آبادی پر مشتمل ہے۔ اور پٹھان اور خون آشامی ہم معنی الفاظ ہیں"

اس فیصلے کی صداقت پر قریباً ساڑھا سٹھ سال کے بعد ہیروشیما گواہ ہے جسے سرحدیوں کی رائفلوں کے بجائے امریکی ایٹم نے خاک و خون نہیں بلکہ آگ کے شعلوں اور راکھ میں بدل دیا — اور اس راکھ میں لاکھوں انسانوں کا خون اور ہڈیاں یوں اڑ گئیں کہ زبانِ خنجر کے چپ رہنے پر پکارنے کے لئے آستین کا لہو تک بھی نہ رہا۔

رابرٹ منٹگمری لکھتا ہے:۔

"سرحدی خون بہانے میں مسرت محسوس کرتے ہیں وہ انتقام لینا تقدیس سمجھتے ہیں۔ مسلسل اور متعدی خون خرابہ ان کا نشاطیہ پہلو ہے۔ اور خون بہانا ان کے نزدیک ایک نیکی اور مقدس فریضہ ہے — خون ریزی ان کا جدی ورثہ ہے۔ وہ عدل و انصاف کی جگہ خون بہاتے ہیں۔ اور غلطی کی اصلاح تلوار کی نوک سے کرتے ہیں"

اور اس کے باوجود ان کی جنگلی فطرت کا یہ عالم تھا کہ مسٹر کے (K A Y) کو اعتراف کرنا پڑا کہ انگریزوں سے پہلے ۱۸۵۳ء میں پشاور میں ۲۴ قتل ہوئے اور ان کے عدل گستر اور تہذیب پرور تمدن آموز عہد ۱۸۷۲ء میں ۴۹ قتل ہوئے

مسٹر ہربرٹ ایڈورڈ کو شکایت تھی کہ

" پشاور میں پٹھان صرف ۴۶ فی صد ہیں۔ لیکن یہاں کی ہوا کی کچھ ایسی خاصیت ہے۔ کہ ہر مسلمان میں تشدد اور خون آشامی کا جذبہ پیدا ہے"

غالباً یہ پشاور کی ہوا کا ہی اثر تھا کہ پٹھانوں کا جذبۂ خون آشامی انگریز میں منتقل ہو گیا۔ اور ۲۳۔ اپریل ۱۹۳۰ء کو قصہ خوانی بازار پشاور میں نہتے اور پر امن شہریوں پر مشین گنوں سے گولیاں برسا کر اس نے اس جذبے کا مظاہرہ کیا۔ یہ انگریزی عہد کا وہ رسوا کن عالم واقعہ ہے جسے انسانی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

ایک جگہ سر الفریڈ آنے والی سفید نسلوں کو یوں مشورہ دیتا ہے :-

" پٹھان قوم کے کردار پر نگاہ ڈالتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ان پر تشدد سے حکومت کی جائے۔ کیونکہ جنگلی گھوڑے کو ریشم کی لگام نہیں دی جا سکتی"

یہ وہ آئینہ ہے جس میں انگریز پختون قوم اور صوبہ سرحد کو دیکھتے رہے ۔۔۔ اور آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ سرحد کی غیرت جنگلی گھوڑے کا اڑیل پن نہ تھا۔ بلکہ انسانی خودی اور خود داری تھی جس نے آخر انگریز کی غلامی کا جوا اتار پھینکا۔

ان مثالوں کے پیش کرنے سے یہ مقصد تھا کہ آج تک سرحد کے متعلق لے دے کر انگریزی زبان میں ہی کچھ لٹریچر ملتا ہے ۔ اور اس کی بھی یہ حالت ہے ۔ کہ مغربی مستشرقین کی تاریخی دیانتداری کا حاکمانہ مصالح نے دیوالہ نکال دیا۔ ایسی حالت میں ہندوستان و پاکستان کے مشاہیر فنکاروں سے سرحد کے متعلق کچھ لکھوانا کتنی بے معنی سی بات ہے جبکہ خود یہاں کے باشندوں کو اپنے ماحول کے متعلق علم رکھنے کے باوجود تحقیق و تدقیق کے لئے کوئی لٹریچر نہیں ملتا۔ اور پھر یہاں کے لکھنے والوں کا جائزہ لیا جائے تو جہاں اردو نظم ترقی کے اعلےٰ مدارج طے کر کے قابل رشک حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ وہاں اردو نثر ہنوز بالکل ابتدائی دور سے گزر رہی ہے ۔ ان حالات و واقعات میں سرحد نمبر کی ترتیب میں جن مشکلات کا ہمیں دو چار ہونا پڑا اس کا اندازہ قارئین خود لگا سکتے ہیں

ہم پٹھانوں کو فرشتے نہیں سمجھتے اور نہ ہی سرحد نمبر پیش کرنے کا یہ مقصد ہے کہ اس میں اہل سرحد کی جا و بے جا قصیدہ خوانی کی جائے ۔ دوسرے لوگوں کی طرح ان میں بھی بہت سی کمزوریاں ہیں۔ بلکہ جہالت اور پسماندگی کے باعث یہ کمزوریاں دوسرے مہذب علاقوں میں بسنے والوں کی نسبت یہاں کچھ زیادہ ہی ہونگی۔ لیکن آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ کر محض عیب گنوانا اور خوبیوں کو ہضم کر جانا نہ کسی نقاد کے شایان شان ہے۔ اور نہ ہی یہ بات کسی مؤرخ کو زیب دیتی ہے

ہمیں اعتراف ہے کہ پٹھانوں کے بعض قبیلوں میں بڑی قبیح رسمیں بھی رائج ہیں جن میں دختر فروشی اور امرد پرستی کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اٹک کے اس پار بسنے والی ساری پختون قوم ہی اسی قماش کی ہے۔ پٹھانوں سے گھل مل جانے کے بعد جب غیر ملکی لوگوں کا خیالی ہوّا ذہن سے دور ہوتا ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ لوگ کتنے سادہ دل، غیور، ملنسار اور خلیق واقع ہوتے ہیں۔ پٹھانوں کے جنگجو اور بازدوئے شمشیر زن ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ محض خونخوار اور وحشی ہیں اور سوائے تلوار چلانے اور جنگ کرنے کے انہیں کوئی اور کام آتا ہی نہیں۔ یہ بے چارے بھی ہماری آپ کی طرح انسان ہیں۔ گوشت پوست سے بنے ہوئے انسان — ان کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے اور اس دل میں ایک عام انسان کے دل کی طرح غصے اور نفرت کے ساتھ ساتھ محبت کا جذبہ بھی موجود ہے۔ پنجاب کے "ہیر رانجھا" اور "سوہنی مہینوال" کی طرح یہاں بھی "موسیٰ خاں گل مکئی" اور "آدم درخانئی" کے رومان گذرے ہیں۔

پٹھان قوم کا اپنا ایک الگ کلچر ہے، تمدن ہے، زبان ہے، ادب ہے، موسیقی ہے — ان کے لوک گیتوں اور لوک ناچوں میں زندگی دھڑکتی اور رقص کرتی ہوئی رواں دواں محسوس ہوتی ہے۔ وہ حجروں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتے ہیں۔ سیاسیات عالم پر تبصرے کرتے رہتے ہیں۔ موسموں کے تغیر و تبدل پر خیال آرائی کرتے ہیں۔ مناظر فطرت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ فرصت کے اوقات میں شکار کرتے ہیں۔ فصلوں کے دنوں میں جشن مناتے ہیں۔ چراگاہوں میں لمبی لمبی تانیں اڑاتے ہیں۔ پنگھٹ کی فضاؤں میں نغمے بکھیرتے ہیں۔ منڈیروں پر چھپ چھپ کر ملاقاتیں کرتے ہیں۔ عشق و محبت کی داستانیں بنتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ غیور بھی ہیں۔ بہادر بھی، حریت پرست بھی اور یہی خصوصیت انہیں دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہے۔

صنعت و حرفت اور گھریلو صنعتوں کو صوبہ سرحد میں جو مرتبہ حاصل ہے ہندوستان اور پاکستان کا کوئی دوسرا صوبہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ پٹھانوں کو حکمران طبقے کی قدغن سے تعلیم و تربیت کے مواقع حاصل نہ ہو سکے۔ لیکن ان کے ذہن نہایت سلجھے ہوئے ہیں اور ان میں غیر معمولی تخلیقی قوت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں

کسی کو نشو ونما کا موقع ملا۔ اس نے وہ عروج پایا کہ بین الاقوامی شخصیتوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔

پٹھان صرف صوبہ سرحد میں ہی آباد نہیں ہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں آج وہ دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور وہ جہاں کہیں بھی ہیں سالہا سال گزرنے کے بعد بھی اپنی چند امتیازی خصوصیات کے محافظ ہیں۔ جن کی بدولت نہایت آسانی کے ساتھ انہیں پہچانا جاسکتا ہے۔

پٹھانوں میں ہزار برائیاں ہوں۔ لیکن ان کی حریت پرستی سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ دوست تو دوست دشمن بھی ان کے اس جذبے کے معترف ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری جہالت اور پسماندگی ہے۔ مذہب کے معاملہ میں وہ نہایت راسخ العقیدہ واقع ہوئے ہیں۔ یہ چیز کسی وقت خوبیوں میں شمار ہوتی تھی۔ لیکن اس ابلیسی سیاست کے دور میں اسے بھی بہت بڑی کمزوری سمجھا جاتا ہے۔ اور حقیقتاً یہی ایک ایسی کمزوری تھی جس کی وجہ سے ان کی عسکری طاقت کو ہر موقع پر نہایت آسانی سے تسلطائی قوتیں اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتی رہیں۔

سب سے پہلے یونانیوں نے انہیں لوٹا۔ پھر ایرانیوں نے اپنی غارت گریوں کو اسلامی رنگ دیکر ان سے فائدہ اٹھایا اس کے بعد مغل شہنشاہوں نے اپنے آپ کو ظل الہٰی ظاہر کرکے ایک عرصہ تک انہیں اپنی جوع الارضی کی ہوس کا آلہ کار بنائے رکھا۔ اور آخر ان پر اپنا اقتدار جمانے کی بھی کوشش کی۔ اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوجاتے۔ لیکن خوشحال خان خٹک جو ان موروثی شہنشاہوں کی چال بازیوں سے بخوبی واقف تھا۔ ان کی نیت کو بھانپ گیا۔ اور اپنی آزادی و خود مختاری کے لئے شہنشاہ اورنگ زیب سے ٹکر لینے کے لئے میدان میں کود پڑا

خوشحال خان کی بغاوت ایشیا میں آمریت کے خلاف سب سے پہلی بغاوت تھی۔ جس میں سوشلزم کا صحیح تصور اور آزادی کا مقدس جذبہ تھا۔

انگریز سالہا سال تک پٹھانوں کے ساتھ قوت آزمائی سے عاجز آگئے

تو انہوں نے بھی ان کی اسی تاریخی کمزوری کا سہارا لیا۔ اور زر خرید علماء سے اطیعو اللّٰہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم کی تفسیر کو اپنی حکومت پر چسپاں کرا یا۔

کانگریس کی تحریک آزادی نے بہت حد تک سرحد میں بھی سیاسی بیداری پیدا کی لیکن یہاں جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس تحریک کی باگ ڈور تھی انہوں نے پٹھانوں کی اس کمزوری کو رفع کرنے کے بجائے اسے اور زیادہ ابھارا ۔ اور "اسلام بری" اور "ہم قرآن آزاد کرائیں گے" کے پرفریب نعروں کے ساتھ انہیں عدم تشدد پر آمادہ کرکے ان کی شجاعانہ سپرٹ کو مٹانے کے لئے اپنی ساری قوت صرف کر دی ۔ یہ لوگ پٹھانوں کے نادان دوست تھے ۔ جو غیر شعوری طور پر سرمایہ دار دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے ۔ کانگرس کے بعد مسلم لیگ نے شعوری طور پر اس سادہ لوح طبقہ کو مذہب کے نام پر فریب دیا ۔ اور ان کی بیش بہا قربانیوں سے اپنے لئے مسندیں خریدیں ۔

آج پاکستان بن جانے کے بعد بھی حالات کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ اور یہ سرزمین اب بھی بے آئین ہے ۔ وہی رسوائے عالم سرحدی ایکٹ (کالا قانون) اب بھی یہاں رائج ہے ۔ کہنے کو تو یہاں جاگیرداری ختم کرنے کا ڈھونگ بھی رچایا جا رہا ہے اور آئے دن سینکڑوں اصلاحی سکیمیں بھی بنائی جاتی ہیں ۔ لیکن یہ سب باتیں محض اعلانات تک ہی محدود ہیں ۔ اور عمل کا ان میں کوئی دخل نہیں ۔

اس نمبر میں سرحدیوں کی زندگی کے ہر پہلو کو تاریخی حقائق کی روشنی میں اجاگر کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے ۔ اور سرحد نمبر کو اردو ادب میں صوبہ سرحد کے متعلق ایک تاریخی دستاویز بنانے میں ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ۔ اس کوشش میں قارئین اور ناقدین ہمیں کامیاب پائیں ۔ تو ہم سمجھیں گے ۔ کہ ہماری محنت اکارت نہیں گئی ۔ اور اگر اس میں انہیں کوئی کمی محسوس ہو تو بھی اسے نقش اول تصور کرنا چاہیے ۔ نقش ثانی یقیناً اس سے کہیں زیادہ بہتر ہو گا ۔ ارتقا کا سلسلہ غیر منتہم ہے ۔ اور کسی چیز کو حرفِ آخر کہنا انسانی مساعی کو محدود کرنا ہے ۔

●

سرحد نمبر کا ٹائیٹل

سرحد نمبر کا ٹائیٹل پاکستان کے مصوّر زوبی کی صناعی کا مظہر ہے - زوبی کا فن ادب اور آرٹ کے تعلق کو ہی نمایاں نہیں کرتا - بلکہ وہ اس حقیقت کا ایک اعلان ہے - کہ آرٹ کی بنیاد پر ہی ادب کا ایوان تعمیر ہوتا ہے - زوبی نے سرحد نمبر کے سرورق میں سرحدی تمدن کے نظری خدوخال اور اس کی ثقافتی رُوح کو پورے طور پر اجاگر کیا ہے - سنگلاخ چٹانوں کی اس سرزمین میں، جس پر سامراج کو ہمیشہ خونِ ناحق کی سُرخیاں نظر آتی رہیں - اور وہ ان سرخیوں کو تاریخ کے صفحوں پر اچھالتے رہے - لیکن مصوّر کی نگاہیں سرحد کے رنگ و نور کی تابانیوں کا جائزہ لے رہی ہیں - دوشیزہ سرحد کی جھکی جھکی نگاہیں اور پتھروں کا حسین و جمیل پس منظر انسانی اخلاق، جرات، سطوت، اور شرافت کا مرقع ہے - زوبی اپنے اس شاہکار میں فن کے معراج پر نظر آتا ہے - اور جدید مصوّری کی تاریخ میں وہ اپنے لئے ایک مخصوص مقام حاصل کر رہا ہے -

آخر میں ہمیں ان تمام فنکاروں کا شکریہ ادا کرنا ہے - جنہوں نے اپنی گرانمایہ تخلیقات سے سرحد نمبر کی ترتیب میں ہمارا ہاتھ بٹایا -"

●

"سنگ میل آئندہ 20x30 سائز پر ماہنامے کی صورت میں شائع ہوگا قیمت فی پرچہ ۸ روپے ہوگی! سالانہ چندہ بحال رہیگا -

●

کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس

یہ تاریخی ادبی و تہذیبی کانفرنس ۱۱ - ۱۲ - ۱۳ نومبر کو اوپن ایئر تھیٹر باغ جناح لاہور میں منعقد ہوئی - جس میں پاکستان کے تمام صوبوں کے ترقی پسند حلقوں کے مندوبین یا تہذیبی نمائندے اور کسانوں مزدوروں کے مندوب بھاری تعداد میں شامل ہوئے اس کانفرنس میں دنیا بھر کے مشاہیر ترقی پسند ادیبوں کو شرکت کی دعوت دی گئی لیکن

سوائے سوویٹ ادیبوں کے سب نے معذوری ظاہر کی۔ اور اپنے خیرسگالی کے پیغامات بھیجے بعض ادیبوں کو تو ان کے فاشسٹ حکمرانوں نے پاسپورٹ نہ دیئے۔ بعض جیل کی کوٹھڑیوں میں بند تھے۔ اور بیشتر اپنی بے مائگی کے باعث اس قدر دور دراز سفر سے معذور تھے۔

کانفرنس ۱۱ نومبر کو شروع ہو کر ۱۴ نومبر کو اختتام پذیر ہوئی۔ روزانہ تین اجلاس ہوتے رہے۔ ہر نشست میں کم و بیش پانچ ہزار اوسط حاضری رہی۔ رات کے اجلاس کلچرل پروگراموں کے لیئے وقف رہے جن میں سرحدی، سندھی، اور پنجابی تہذیب اور کلچر کے نہایت کامیاب مظاہرے کئے گئے۔

عصر کی نشستوں میں مقالے، نظمیں، قرار دادیں اور نیا آئین پیش کیا گیا۔ اور قرار دادوں کے حق میں مختلف حضرات نے نہایت بلیغ اور سلجھی ہوئی تقریریں بھی کیں۔ مقالات میں چراغ حسن حسرت اور ممتاز حسین کے مقالے نہایت ٹھوس اور پر مغز تھے۔ نظموں میں پنجابی کے عوامی شاعروں کی نظمیں بے حد پسند کی گئیں۔ قرار دادیں یوں تو سب کی سب نہایت کارآمد اور وقتی تقاضوں کے عین مطابق تھیں۔ لیکن خصوصاً صوبائی زبانوں کے تحفظ، امن، رجعتی ادیبوں اور رجعتی پرچوں کے بائیکاٹ اور تمام دنیا کے ترقی پسند ادیبوں پر تشدد کے خلاف جو قرار دادیں پاس کی گئیں۔ ان کا عوام نے نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ آئین میں ترقی پسند مصنفین کے لئے صاف اور سیدھے راستے کا تعین کیا گیا۔ اور عدم طبقاتی نظام کے حصول کے لئے عملی جدوجہد میں حصہ لینے کا پروگرام پیش کیا گیا۔ آخری نشست مشاعرہ کی تھی۔ جس میں اردو، پشتو اور پنجابی شعراء نے اپنا کلام سنایا

اس کانفرنس کو ناکام بنانے کے لئے مخالف عنصر نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ منتظمین کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ صاحب اقتدار طبقے کے پٹھوؤں اور سرمایہ داروں کے زر خرید اخباروں نے ترقی پسندوں کے خلاف دنیا بھر کے الزام تراشے ——— اور ان کی ناکہ بندی کے لئے اپنے تمام تر ذرائع استعمال کر ڈالے۔ سی۔ آئی۔ ڈی اور پولیس نے ان غنڈوں کے خلاف قانون کو حرکت نہ دی۔ کیونکہ جاگیردار، سرمایہ دار اور برسر اقتدار طبقہ ان کی پشت

پر تھا بمشکل تمام اوپن ایئر تھیئٹر میں کانفرنس کے انعقاد کا بندوبست کیا گیا۔ لیکن وہاں بھی یار لوگ پہنچ گئے۔ اور تھیئٹر والوں کو دھمکایا کہ ترقی پسند کمیونسٹ ہیں۔ پاکستان کے دشمن ہیں۔ تم نے انہیں یہاں کانفرنس کرنے دی تو حکومت تمہیں کبھی معاف نہ کرے گی تھیئٹر کے سیکرٹری صاحب بھی بوکھلائے اور نوٹس پر نوٹس بھیجنے لگے۔ تھیئٹر میں سبجیکٹ کمیٹی کے جلسے کرنے کی ممانعت کر دی۔ بجلی اور پانی تک ترقی پسندوں پر بند تھا۔

غرض کہ اسلام کے ان نام نہاد دعویداروں نے تمام یزیدی حربوں سے کام لیا۔ اور انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح کانفرنس نہ ہونے پائے۔ لیکن کانفرنس ہوئی اور اتنے ٹھاٹھ سے ہوئی کہ اس کی یاد برسوں تک لوگوں کے دلوں سے محو نہ ہوگی۔

دشمنوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا زخم تھا۔ اس زخم کے کرب سے وہ سخت پیچ و تاب کھانے لگے۔ اور آخر بے نقاب ہو کر غنڈہ گردی پر اتر آئے۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس میں چند غنڈوں کو گڑبڑ پھیلانے کے لئے بھیجا گیا۔ جو بُری طرح ناکام ہوئے۔ اس ناکامی نے اُن کے حوصلے پست کر دیئے۔ اور بعد میں انہیں ایسی حرکت کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ کانفرنس ختم ہو رہی تھی۔ حریفوں کے دعوے باطل ہو چکے تھے۔ اور وہ حیران تھے کہ کریں تو کیا کریں۔ آخر ان سے نہ رہا گیا۔ اور کانفرنس کے آخری اجلاس یعنی مشاعرہ میں پندرہ بیس مسلح غنڈوں کو شراب پلا کر انتشار پیدا کرنے کے لئے بھیجا۔ کانفرنس والے بھی بیدار تھے۔ دروازے پر ہی انہیں روک دیا گیا۔ تصادم ہُوا۔ اور انجمن کے رضاکاروں میں سے دو طالب علم شدید طور پر مجروح ہوئے۔ کانفرنس بخیر و خوبی ختم ہوگئی اور دشمن ناکام و نامراد کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔

چند مقامی و غیر مقامی روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں نے بھی کانفرنس کی مخالفت میں گلا پھاڑ پھاڑ کر غوغا آرائی کی۔ انہیں سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے بھاری رقمیں ملیں اور حق نمک ادا کرنے کے لئے وہ ثقافت، صحافت، تہذیب، اخلاق اور ادب کی تمام قدروں کو بالائے طاق رکھ کر بالکل ننگے ہو کر سامنے آ گئے۔ اور وہ ہرزہ سرائی کی کہ کوئی معقول انسان بھی ان کی مذمت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ غلط اور بے بنیاد

الزام لگا کر ترقی پسند ادیبوں پر کیچڑ اچھالتے رہے۔ انہوں نے حکومت کو مشورے دیئے کہ ترقی پسندوں کو پھانسی لگا دیا جائے۔ انہوں نے ذاتی حملے کئے۔ اور ننگی اور فحش گالیاں دیں۔ اور ابھی ان کی یہ ابلیسانہ مہم جاری ہے۔ لیکن اس کے باوجود کانفرنس پوری طرح سے کامیاب رہی ۔۔ ترقی پسند ادیب ان غلیظ چیتھڑوں کی ہرزہ سرائی کا جواب دینا جانتے ہیں۔ ان ملت فروش اور موقع پرست لوگوں کی پاکستان دوستی کا بھرم بھی انہیں علوم ہے۔ لیکن وہ ان کی سطح پر اترنا نہیں چاہتے۔ ان کے سامنے انسانیت کو سنوارنے کا ایک عظیم پروگرام ہے۔ دشمن چاہتے ہیں کہ غیر ضروری باتوں میں الجھا کر انہیں حقیقی مقصد سے دور کر دیا جائے۔ لیکن وہ دشمن کی اس چال کو جان چکے ہیں۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مخالفوں کی دشنام طرازی اور یاوہ گوئی کا جواب دیئے بغیر پوری سرگرمی سے اپنے کام میں لگے رہیں گے۔

"کتے بھونکتے رہتے ہیں اور قافلے گزر جاتے ہیں"

●

روسی مہمان

کل پاکستان ترقی پسند مصنفین اپنے بہت بڑے ہمسایہ و ترقی یافتہ ملک سوویٹ روس کے ممنون ہیں۔ کہ اس نے اپنے ملک کے نامور ادبا و شعراء کو ان کی کل پاکستان کانفرنس میں شریک ہونے کی اجازت دی۔

یہ انجمن کی بدنصیبی تھی۔ کہ ان کے مہمان عزیز موسم کی خرابی کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے۔ اور کانفرنس کو جو رونق ان کی شمولیت سے نصیب ہونی تھی۔ وہ اس سے محروم رہی۔ تاہم پاکستان کی تاریخ ادب میں یہ واقعہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا کہ پاکستان کے ترقی پسند مصنفین نے جو کانفرنس انسانیت اور عوام کی بقا کے لئے منعقد کی۔ اس میں روسی ادیبوں نے بھی عملاً حصہ لیا۔

یہ وفد چار بزرگ شعراء پر مشتمل تھا۔ نیکولائے تیخن اوف۔ اناطولی سوفرانوف

روسی ایک اور مرزا ترسون زادہ ــــ

ہمارے ان مہمانوں کی آمد بوجوہ بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ یہ صرف چند شعراء یا ادباء کی ایک مشاعرے یا جلسے میں شمولیت ہی نہیں بلکہ ان کی تشریف آوری روس اور پاکستان کے مستقبل کے تعلقات کے لئے ایک نیک فال ہے جس پر سامراجی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی ہے ۔ دنیا کی ہر چیز کو ڈالر کی عینک سے دیکھنے والے ہرگز گوارا نہیں کرتے ۔ کہ پاکستان روس کے ساتھ اپنے روابط بڑھائے ۔

جہاں اپنے مہمانوں کی آمد پر ہمیں مسرت ہے وہاں ہمیں بے حد ندامت بھی ہے ۔ کہ حکومت پنجاب کے بعض عاقبت نا اندیش عمال نے ان مہمانوں کی اہانت کی ۔ اور وہ کتابیں جو انھوں نے بطور تحفہ پاک سوویٹ ریلیشن کے سیکرٹری کو دی تھیں ۔ پولیس چھاپہ مار کر لے گئی ۔ چاہیئے تو یہ تھا ۔ کہ حکومت پاکستان ان کا خیر مقدم کرتی ۔ اور ان کے شایانِ شان اُن کا استقبال کرتی ۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا ۔ ہمیں افسوس ہے کہ حکومت مغربی پنجاب نے اپنی بے بصیرتی سے ایک ایسا قدم اٹھایا جس کا اثر بین الملی طور پر برا پڑے گا ۔

ہم ایک بار پھر اپنے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں ۔ جنہوں نے ہماری استدعا کو شرف قبولیت بخشا ــــ

(جنوری ۱۹۵۰ء)

●

سرحد نمبر کا خیر مقدم

ڈاکٹر عبدالحق ناظم انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی

آپ قابلِ قدر ادبی کام کر رہے ہیں ۔ صوبہ سرحد میں "سنگ میل" کی اشاعت درحقیقت ادبی سنگ میل ہے ۔ آپ نے جس جرأت اور آزادی سے اس کام کو جاری رکھا ہے ۔ اور اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں جو کوشش کی ہے وہ بہت بڑی قومی خدمت ہے ۔ قومی ترقی میں ادب کا بہت بڑا حصہ ہے ۔ زندگی کی طرح ادب کی راہیں بھی بہت پُر پیچ ہیں ۔ اس میں افراط و تفریط سے بچ کر صحیح رستے پر قائم رہنا کامیابی کی جان ہے ۔

مجھے امید ہے کہ آپ کی کوششوں سے اردو زبان و ادب کا صحیح ذوق اہلِ سرحد میں پھیلے گا ۔ اور ہماری قومی زبان کی ترقی و فروغ میں بہت بڑی مدد ملے گی ۔

• • •

نیاز فتح پوری مدیر نگار لکھنؤ

مکرمی! تازہ سنگ میل پہنچا ۔ معلوم نہیں میں نے آپ کو اس سے قبل کوئی خط آپ کی خدمات کے اعتراف میں لکھا ہے یا نہیں ۔ اگر نہیں تو یہ میری فروگذاشت ہے ۔ اگر لکھ چکا ہوں تو اس خط کو توثیق مزید سمجھیے ۔

پاکستان کے دو ہی چار رسالے ایسے ہیں جن کو بے اختیار دیکھنا پڑتا ہے۔ اور "سنگ میل" بھی انہی میں سے ایک ہے
اس میں شک نہیں آپ اردو ادب کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دے رہے ہیں اور ترقی پسند رسائل میں کم ایسے ہیں جو "سنگ میل" کی طرح دل و دماغ کے صحیح توازن کے ساتھ مرتب کئے جاتے ہوں۔

سرحد نمبر کے لئے میرا پیام یہ ہے ؎

بہ ایں کہ کعبہ نمایاں شود ز پا منشیں
کہ نیم گام جدائی ہزار فرسنگ است

• • •

عبدالمجید سالک مدیر انقلاب لاہور

"سنگ میل" صوبہ سرحد میں اردو کا۔ ترقی پسند ادب کا، جدید شاعری کا سنگ میل ہے۔ خود "سنگ میل" کے نام سے اس کی ترقی پسندی اور اس کی اقدام نوازی ظاہر ہے۔ اس لئے کہ ہر "سنگ میل" کے آگے ایک اور "سنگ میل" کا وجود ضروری ہے تاکہ راہی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔
ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں پر بہت بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان میں بعض غلط کار اور غلط نگار پیدا ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے ترقی پسندی کے بلند نصب العین کو رسوا کر دیا ہے۔ ہر اس شخص کو جو "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کا قائل ہے۔ اور بیکار و فضول تحریرات کا روادار نہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ایسا پاکیزہ و باکار ادب پیدا کرنا اس کا فرض عین ہے۔ جس میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں اور بدنمائیوں کے ساتھ منعکس ہو۔ اگر ادیبوں اور شاعروں نے ذمہ داری کا احساس نہ کیا۔ تو ان کی تحریک ناکام ہو جائے گی۔ اس لئے صوبہ سرحد کے نغزگو شعرا اور معجز نگار ادبا کو ہوشیار ہونا چاہیئے۔ اور "سنگ میل" کی رہنمائی میں اپنی منزل

کی طرف گامزن رہنا چاہئے۔

• • •

چراغ حسن حسرت مدیر "امروز" لاہور

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے۔ کہ رسالہ سنگ میل پشاور دسمبر کے دوسرے ہفتے میں سرحد نمبر کے نام سے ایک خاص نمبر شائع کر رہا ہے۔ سنگ میل اگرچہ پشاور سے نکلتا ہے۔ جہاں کتابت وطباعت کی وہ سہولتیں میسر نہیں، جو لاہور کے رسالوں کو حاصل ہیں۔ تاہم اُس نے سال بھر کے قلیل عرصے کے اندر اردو کے ماہانہ رسائل میں نہایت ممتاز اور نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے۔

مجھے امید ہے۔ کہ سنگ میل کا یہ شمارہ پاکستان کے دوسرے حصّوں کے لوگوں کے لئے جو سرحد کے مسائل سے بے خبر ہیں۔ بہت معلومات افزا ثابت ہوگا یوں بھی سنگ میل اپنی آغازِ اشاعت سے سرحد کے مسائل سے پوری طرح اعتنا کرتا رہا ہے۔ اور اس میں اس قسم کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن سے سرحد کی زندگی کے مختلف پہلو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ سنگ میل میں پشتو کے مشہور شاعروں رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک وغیرہ کی نظموں کے جو تراجم شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اور میرے خیال میں تو ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں۔ جنہوں نے پہلی مرتبہ سنگ میل کے ذریعے سرحد کے اِن مقبول عام شاعروں کے خیالات سے آگاہی حاصل کی ہے

کیا اچھا ہو۔ کہ سنگ میل مستقل طور پر اسی صفحات سرحد کے مسائل کے لئے وقف کر دے

• • •

فیض احمد فیض مدیر "امروز" لاہور

مکرمی! اسلام علیکم! خدا بھی کسی دن حواس ٹھکانے ہوئے تو مضمون

ہوں گا،

مجھے ندامت ہے کہ اتنی مدت سے کسی کے لئے بھی کچھ نہیں لکھ سکا لیکن سلسلہ ابھی تک قائم ہے۔ اس فکر میں ہوں کہ اوقات ذرا منظم ہو جائیں۔ تو باقاعدہ لکھنا شروع کر دوں۔ انشاء اللہ جلد کچھ نہ کچھ بھیجوں گا۔ سنگ میل بہت بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اور سرحد نمبر اس کا عظیم کارنامہ ہوگا۔

سید احتشام حسین

مجھے خوشی ہے کہ سنگ میل اپنا خاص نمبر' سرحد نمبر کے نام سے نکال رہا ہے۔ آزادی پسندوں کے خیال میں صوبہ سرحد ایک مدت سے جذبۂ آزادی کا نشان بن چکا ہے۔ لیکن اب تک اس کی ساری قوتیں حصول آزادی کی جدوجہد ہی میں صرف ہو رہی ہیں، آنکھیں اس وقت کی منتظر ہیں جب آزادی کی تمام برکتیں ۔۔ تعلیم، خوش حالی، صنعتی ترقی جمہوری نظام حکومت اور آزادیٔ عمل ۔۔ اس علاقے کو مکمل طور پر آزاد بنائیں گی۔ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے صوبہ سرحد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور یہ اس کے نوجوانوں، ادیبوں اور شاعروں کا کام ہے۔ کہ اس کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اسے تہذیبی ترقی کی اس راہ پر لگانے کی جدوجہد کریں جو قوموں کی آسودگی کا راستہ ہے۔ اس علاقے کے ادب میں آزادی، قوت، اور حسن کا اظہار ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ وہاں کے مناظر اور مسائل ہمیں یہی سبق دیتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ خاص نمبر سرحد کی روح کو بیدار کرے گا۔ اور سرحد کی تاریخ میں خود سنگ میل بن جائیگا۔ میری بہترین تمنائیں ادارۂ سنگ میل کے ساتھ ہیں

• • •

آل احمد سرور

مکرمی تسلیم! خط ملا۔ سنگ میل، میرے پاس برابر آتا ہے میں اس کا بڑے

شوق سے مطالعہ کرتا ہوں ۔ اور میری رائے میں یہ اردو کے چند بہترین پرچوں میں سے ہے ۔
سرحد میں اردو سے دلچسپی خاصی ہے ۔ مگر اردو کا چرچا زیادہ نہیں ہے ۔ اور نہ وہاں کے لوگوں نے اردو علم و ادب پر اب تک گہری توجہ کی ہے ۔ سنگ میل کے اجزاء سے یہ کمی پوری ہوتی نظر آتی ہے ۔ سنگ میل کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے "تبرکات" حاصل کرنے کی بجائے نوجوان لکھنے والوں کا ایک حلقہ جمع کر لیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے صفحات میں اچھے اچھے نئے نام نظر آتے ہیں ۔ اور مضامین اور نظموں میں تازگی ۔ جوش حیات اور جدید ذہن کی کارفرمائی ملتی ہے ۔ پرچے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ترقی پسند خیالات کا علم بردار ہے ۔ اردو ادب میں یہ تحریک انسان دوستی ۔ جمہوریت پسندی ۔ سائنٹفک نقطہ نظر اور علمی تنقید کی تحریک ہے ۔ پرچے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مقامی رنگ ملتا ہے ۔ اس نے سرحد کے جوش اور ولولے ، اس کے جذبۂ آزادی اور جذبۂ شجاعت کی عکاسی کی ہے ۔ اس میں خیبر اور خیبر کے پار کے انسانوں کے دل کی دھڑکن اور ان کی روح کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ اردو ادب کو وہاں صحیح معنی میں جڑ اور بنیاد اس وقت ملے گی ۔ جب اس میں سرحد کی فضا کا حسن اور وہاں کے پہاڑوں کی بلندی ملے گی ۔ قبائلی لٹریچر کے اچھے اچھے نمونوں ۔ قبائلی گیتوں کے ترجموں اور سرحد کی داستان حریت کو ابھی اور نمایاں کرنے کی ضرورت ہے ۔ نظموں اور افسانوں پر تو ویسے ہی توجہ ہے ۔ علمی مضامین پر اور توجہ کرنی چاہئے ۔ سرحد کی اقتصادی حالت ۔ وہاں کے معاشرتی اور معاشی مسائل ۔ وہاں کی سیاست پر بے لاگ اور علمی تنقیدیں ہونی چاہئیں ۔ پشتو کے ادب پاروں کو باقاعدہ اردو میں منتقل کرتے رہنا چاہئے ۔ ان تمام لوگوں کو سنگ میل کے حلقے میں لانا چاہئے ۔ جو نئی زندگی اور اس کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں ۔ جو ماضی کے پرستار نہیں ہیں ۔ جو ایک نئی اور بہتر دنیا میں اپنے لئے ایک باعزت مقام بنانا چاہتے ہیں ۔
سنگ میل کے تبصرے مجھے خاص طور پر پسند آئے ۔ ضرورت ہے کہ یہ تبصرے باقاعدہ ہوں اور ان میں چند TOPICAL کتابوں ہی کو نہ لیا جائے ۔ بلکہ وقیع علمی

کتابوں پر بھی سنجیدہ اور مفصل تبصرے کئے جائیں تنقید کی جتنی سخت ضرورت ہے آج اتنی کبھی نہ تھی۔ آج ذہن پراگندہ ہیں۔ اور خیالات میں اُلجھن ہے۔ نوجوانوں اور ادیبوں کو ذہن میں روشنی اور خیالات میں وضاحت کا پرچار کرنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سنگِ میل اس مقصد میں کامیاب ہوگا۔

اپنی علالت کی وجہ سے میں اب تک آپ کے لئے کوئی مضمون نہ بھیج سکا۔ عنقریب کچھ لکھ کر بھیجوں گا۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

● ● ●

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

سرحد سے ہندوستان کی دو ہزار برس کی یادیں وابستہ ہیں۔ باشندگانِ سرحد کے لئے محبت لگاؤ اور اخوت کے جو پُر خلوص اور گہرے جذبات ہندوستانیوں کے دلوں میں موجزن ہیں۔ انہیں گوشت و ناخن کا تعلق کہا جاسکتا ہے۔ اہلِ سرحد کے خلوص اور جذبۂ انسانیت کو اہلِ ہند رشک و احترام کے جذبات کے ساتھ یاد کیا کرتے ہیں۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہوگیا۔ لیکن ہر ہندوستانی کے دل میں اہلِ سرحد کی عزت ہے۔ چوتھائی صدی کی مسلسل جنگِ آزادی میں سرحد نے جس پاکیزہ ایثار سے ہندوستان کا ہاتھ بٹایا۔ اُسے ہندوستان کبھی بھول نہیں سکتا۔ اہلِ سرحد کی فلاح بہبودی اور ترقی سے غافل ہونا ہندوستان کی اخلاقی موت ہوگی۔ زمین کا فاصلہ دلوں کے قُرب میں حائل نہیں ہوسکتا۔

● ● ●

کرشن چندر

محترمی!

آپ کا خط ملا۔ سنگِ میل مل رہا ہے۔ مندرجات کا بیشتر حصہ صحت اور توانائی

کا حامل ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس روش کو کبھی پسپائیت میں مبدل نہ ہونے دیں گے سنگِ میل کے لئے میں کوئی مضمون یا افسانہ اسی ماہ میں بھیج دوں گا۔

• • •

ممتاز حسین

مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ سنگِ میل "سرحد نمبر" نکال رہا ہے۔ اور اسے صحیح معنوں میں سرحد کی زندگی اور انقلابی جدوجہد کا ترجمان بنانا چاہتا ہے۔ سنگِ میل ان چند ترقی پسند رسائل میں ہے جنہوں نے اپنے دامن میں غیر شعوری یا شعوری طور پر رجعت پسندی کو بہت کم پناہ دی ہے۔ جب میں سنگِ میل کے اس شعوری وقار کو نظر میں رکھتا ہوں تو اس سے میری توقعات اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ سنگِ میل کے اس نمبر میں سرحد کے پٹھانوں کا انقلابی بانکپن ضرور جھلکے گا۔ اور اس انقلابی بانکپن میں سیف و قلم دونوں ہی کی تیزی ہوگی۔

• • •

احمد ندیم قاسمی ناظم اعلیٰ انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان

سرحد نمبر نکالنے کا فیصلہ کر کے آپ نے بہت اہم قدم اٹھایا ہے۔ سرحد اور سرحدیوں کے متعلق پاکستان و ہند بلکہ ساری دنیا میں عجیب و غریب حکایتیں مشہور ہیں جن میں سرزمین سرحد کی سنگلاخی اور پٹھانوں کی سفاکی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ غیر ملکیوں نے پٹھان کی نشانہ بازی اور قزاقی کا ذکر کر کے اپنی طرف سے "سفرنامہ" لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے، اور ہمارے ہم وطنوں نے پشاور کے کسی بنگلے میں بیٹھ کر بڑے رومینٹک انداز میں اور غلیظ احساسِ برتری کے ساتھ وہاں کے پھلوں اور کبابوں اور لڑکیوں کے قصیدے لکھے ہیں۔ اور پٹھانوں کے "اجڈپنے" پر طنز کئے ہیں۔ یہ بہت ہی کم لوگوں کو

معلوم ہے کہ پٹھان بے حد جذباتی ہے، حساس ہے، اور نرم دل ہے۔ اس کے مضبوط پیکر میں بہت نازک دل دھڑکتا ہے، وہ بہترین دوست ہے، بہترین محبت کرنے والا ہے، بلا کا مہمان نواز ہے، انتہا درجے کا غیرت مند ہے، وہ بڑے نرم و نازک شعر کہتا ہے، اور بڑی جرأت سے یلغاریت کرتا ہے۔ اور اب وہ اپنی قوت سے بھی آشنا ہو رہا ہے، اور ان اداروں سے بھی نفرت کرنے لگا ہے جنہوں نے اُسے چیتھڑے پہنا کر پیٹ پالنے کے لئے ہاتھ میں دو تڑے وال بندوق تھما دی ہے۔ میں نے کئی اصحاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ سرحد، پاکستان و ہند کے دوسرے صوبوں سے ایک صدی پیچھے ہے۔ لیکن آج چارسدہ کی عوامی تحریک اور دوسری سیاسی و ادبی ترقی پسند تحریکیں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ اب سرحد، پاکستان کے سب صوبوں سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے،

"سنگِ میل" ترقی پسند رسالہ ہے مجھے یقین ہے کہ اس کے سرحد نمبر میں صرف درۂ خیبر سے گذرتے ہوئے قسمت آزماؤں کی داستانیں نہیں ہوں گی۔ بلکہ آپ پٹھان کو بحیثیت انسان پیش کریں گے آج پٹھان کے دل میں استحصال پسندوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے خلاف جو جذبہ کارفرما ہے۔ اُس کا جائزہ لیں گے اور ہمیں دکی پہاڑیوں اور پشاور کے سبزہ زاروں میں دھڑکتی ہوئی ان قوتوں کو بے نقاب کریں گے۔ جو عنقریب ایک زبردست اور ہمہ گیر عوامی تحریک کی صورت میں نمودار ہونے والی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ آپ کامیاب ہوں گے۔ اس سے پہلے پشاور ایسے مقام میں بیٹھ کر سنگِ میل ایسا رسالہ جاری کرنا اور جاری رکھنا آپ کا کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔

● ● ●

اوپندرناتھ اشک

آپ سنگِ میل کا "سرحد نمبر" نکال رہے ہیں، یہ جان کر مسرت ہوئی کہ ہم جیسے لوگ، جنھوں نے کبھی سرحد کی زیارت نہیں کی، آپ کے سنگِ میل اور خصوصاً اس نمبر کی بدولت سرحد کی ادبی اور ثقافتی اور تمدنی سرگرمیوں سے روشناس ہو

جائیں گے۔ سنگ میل کا سرحد نمبر اس لحاظ سے ملک کی زبانوں کہنا چاہیئے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرے گا۔
آپ کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی ہو، یہی میری دعا ہے۔

● ● ●

علی سردار جعفری

برادرم فارغ صاحب تسلیم! کل آپ کا رسالہ اور خط ملا۔ اس کرم فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی ہے۔ آپ نے بڑا صاف ستھرا پرچہ نکالا ہے۔ رات کو لیٹے لیٹے پورا پرچہ پڑھ ڈالا۔ اس زمانے میں شاذ و نادر ہی میں کسی رسالے کو پورا پڑھتا ہوں۔ بعض رسائل پر بڑھاپا طاری ہے۔ اور بعض پہ بدیانی کیفیت ایسے دور میں کوئی اچھا رسالہ نکالنا بہت بڑی بات ہے۔ میں سنگ میل کا آخری حصہ، ٹائٹل کے اس پار بہت شوق سے پڑھتا ہوں میں نے سرحد کی سنگلاخ وادیاں تو نہیں دیکھی ہیں۔ لیکن وہاں کے بلند و بالا انسانوں کا ضرور عاشق ہوں۔ اپنے پٹھان دوستوں سے وہاں کی زندگی کی کہانیاں سنی ہیں جس میں سادگی اور غیرت ہے، صحت اور آزادی کا جذبہ ہے۔ اور اس کے سینے سے انسانیت کے بہترین چشمے پھوٹ سکتے ہیں۔ سنگ میل نمبر ایں آپ کی نظم اور خصوصیت کے ساتھ اس کا یہ شعر ؎

کتنی یلغاروں کا سیلاب یہاں سے گذرا
آج تک مجھ پہ کسی تاج کا سایہ نہ پڑا

بہت پسند آیا۔ اس آخری مصرعے میں سرحد کی پوری تاریخ ہے۔ اس سے پہلے حفیظ جالندھری کی نظم "خیبر" پڑھی تھی۔ اور مجھے اب بھی یاد ہے کہ جب میں اس شعر پر پہنچا کہ ؎

کھلی رہتی ہے اس درے کی چشم انتظار اب بھی
کہ آجائے کوئی راہوار وحشت پر سوار اب بھی

تو قرونِ وسطیٰ کی وحشت و بربریت کی تصویر میری نظروں کے سامنے آگئی۔ لیکن آپ کی نظم پڑھ کر آزادی کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ اور دل کا حوصلہ بڑھتا ہے

سرحد کی زندگی اور پشتو ادب سے اردو والوں کو روشناس کرانے میں آپ کا رسالہ بہت مفید ہو سکتا ہے۔ بہت دن ہوئے خوشحال خاں خٹک کی نظموں کا ایک انگریزی ترجمہ نظر سے گذرا تھا۔ میں بعض نظمیں اردو میں منتقل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وقت نہیں نکال سکا۔ آج آپ کا "سنگ میل" پڑھ کر وہ یاد تازہ ہوگئی۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ وقتاً فوقتاً خوشحال خاں کی نظموں کے ترجمے شائع کرتے رہیں۔ اصل پشتو میں نظمیں لکھ کر نیچے نثر میں ترجمہ کر دیجئے اور اگر ترجمہ نظم میں ہو تو کیا کہنا (یہ آپ کا سب سے زیادہ قیمتی ورثہ ہے) اور اسے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں میں عام کیجئے۔

ہمارے ماضی کی روایات میں باغی اور انقلابی شاعروں کی بڑی کمی ہے۔ ہم اب تک مغل شہنشاہیت سے ٹکرانے والے باغی سپاہی اور پشتو ادب کے اس روشن تارے کی تابناکیوں سے محروم رہے ہیں۔ آپ ہماری اس محرومی کو دور کر سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ پٹھانوں کی گذشتہ اور موجودہ جنگ آزادی کی روایات کو بھی اپنے رسالے کے صفحات پر زندہ کیجئے۔ اس طرح آپ ایک بہتر اور صالح ادب کے پیدا کرنے میں مدد دیں گے۔

میری بہترین خواہشات اور تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اور میں "سنگ میل" کی ترقی کا خواہش مند ہوں۔ اپنے تمام ساتھیوں سے میرا سلام کہیئے +

• • •

ظہیر کاشمیری مدیر سویرا لاہور

رفیق محترم!

سرحد نمبر کی تقریب پر مبارک قبول فرمائیں۔ "سنگ میل" کے اجراء سے پہلے صوبہ سرحد ادبی اعتبار سے "بانجھ" تصور کیا جاتا تھا۔ اور کوئی ایسا اشاعتی ذریعہ نہ تھا جس سے

اِس صوبہ کے مقامی کلچر، سیاست اور افغانی روایتوں سے بیرونی دنیا کو روشناس کرایا جا سکتا۔ سنگ میل نے اپنی ترقی پسند پالیسی سے صرف پاکستان کی ادبی تحریک کو ہی گہرے طور پر متاثر نہیں کیا۔ بلکہ اس نے چٹانوں پر بسیرا کرنے والے شاہین زادوں کے عظیم ماضی سے نقاب کشائی بھی کی۔ اُن کی موجودہ معاشرتی خامیوں پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ اُنھیں ایک درخشاں مستقبل کی بشارت بھی دی۔

سرحد نمبر کی اشاعت، سرحد کی ادبی زندگی میں ہی نہیں بلکہ سیاسی زندگی میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ امید ہے صوبہ کے ترقی پسند اور عوامی مفکّروں کو اپنے گرد و پیش پر تنقید و تبصرہ کرنے کا پورا موقع مل سکے گا۔ افغانی عوام کی سماجی بیماریوں کے نسخے تجویز ہو سکیں گے۔ اور معاشرہ کی گندی رگوں کی فصد بھی کھولی جائے گی

آپ کے صوبہ میں کسانوں پر ہبوطِ آدم سے بھی پُرانے متشددانہ قوانین مسلّط ہیں۔ آپکے عوام تعلیمی اعتبار سے بالکل پسماندہ ہیں آپ کے صوبے پر FUEDAL OLIGACHY قسم کی حکومت قبضہ جمائے ہوئے ہے — اور بڑے بڑے خوانین ہیں کہ رنگین محلوں میں پیچوان کو ٹملائے خاصانِ حرم کی ملاقاتوں میں دن گزار رہے ہیں۔ یا صوبہ بھر کو کھوکھلے سیاسی نعرے دیکر گمراہ کر رہے ہیں۔ اس سیاسی انارکی کے پیشِ نظر آپ اپنے انقلابی مشن کو اور زیادہ تیز کیجئے۔ ایسے مضامین نظم و نثر پر زیادہ توجہ دیجئے جس سے سرحدی بڑوں کی تخریب کے اسباب پیدا ہوں۔ کسان جرگہ مضبوط ہو اور شہری اور سیاسی آزادی کے دور کو قریب تر لایا جا سکے — اگر آپ اپنی عہد آفرین کوششوں میں مستعدی سے مصروف رہے، سنگ میل کے ذریعے افغانی عوام کے دلوں میں نئے میلانوں کی شمعیں روشن کرتے رہے، تو وہ دن دور نہیں۔ جب اٹک پار کا علاقہ عالمگیر اخوّت کا پرچم بلند کر کے دنیا بھر کو آشتی کا پیغام دینے میں پیش پیش ہوگا۔

آپکا صوبہ بڑی بڑی سیاسی تحریکوں کا مرکز رہ چکا ہے۔ آپکے ہر ضلع میں ان گنت سیاسی کارکن موجود ہیں۔ جو یا تو بورژوا سیاست کے پھندوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں

یا حالات سے مایوس ہو کر بے عمل ہو چکے ہیں۔ آپ سنگ میل کی وساطت سے ان میں نئی زندگی اور نیا شعور پیدا کرنے کی مہم جاری رکھیئے، تاکہ وہ مرتی ہوئی طاقتوں سے تعلق توڑ کر زندہ عوامی تحریکوں سے ناطہ جوڑ سکیں۔ تاکہ ان میں تساہل کی جگہ عزم اور خود اعتمادی عود کر آئے ـــــ اس نہج پر آپ ادبی ذرائع کو جتنا مضبوط کریں گے اتنا ہی آپ کے صوبہ کی عوامی تحریکیں مضبوط ہوں گی۔

سنگ میل کی بُنت دوسرے بورژوائی پرچوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں وہ دھاگے استعمال نہیں ہوئے۔ جو کسی رئیس زادی کا بلوز چمکا سکیں، بلکہ اس کی بُنت میں وہ تانا بانا استعمال ہوا ہے۔ جس سے ان دنوں مشرق و مغرب میں انقلاب بُنے جا رہے ہیں ـــــ آپ دیگر آزاد ممالک کے ترقی پسند پرچوں کی طرح اپنے صوبہ کے ترقی پسند ادب کی تحریک کا بلا واسطہ اور بھرپور سہارا دیجیئے ـــ تمام ادیبوں کو ایک مرکز پر لائیے اور چھوٹے چھوٹے ادبی اور فنی حلقوں کو (Co - ordinate) کر کے ایک مضبوط اور ناقابلِ شکست تحریک کا روپ دیجیئے ـــ سرحد کے ترقی پسند ادیبوں کا اتحاد، سرحد کی عوامی قوتوں کا اتحاد ہے۔

سنگ میل سرحد کے ادیبوں اور سرحد کی عوامی تحریکوں کے درمیان بہترین (Liaison Agency) کا کام کر رہا ہے۔ ذرا سی توجہ سے اس کام کو اور بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ادیب کسان جرگہ کی سیاسی جدوجہد میں براہ راست حصہ لینے پر قائل کیا جا سکتا ہے ـــــ ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ سنگ میل اُس آدرش کا نقیب ہے۔ جس کے حصول کے لئے (The "Little Golden America") کے مصنف پیٹروف نے سیباسٹپول کے مورچے پر جان دیدی۔ اور (The novel and the people) کا مصنف رالف فوکس سپینی عوام کی طرف سے لڑتا ہوا میڈرڈ کے مورچے پر شہید ہو گیا۔

سنگ میل کا ہر شمارہ اور خصوصاً سرحد نمبر، پاکستان کے ترقی پسند ادب کی تحریک میں ایک پائیدار اضافہ کی حیثیت سے زندہ رہیں گے ـــــ امید ہے کہ سرحد کے

ادیب دوسرے صوبوں کے ادیبوں کے ساتھ اپنا آدرشی سفر جاری رکھیں گے اور بہت جلد سنگِ میل سے گذر کر سنگِ منزل تک جا پہنچیں گے ✦

• • •

ساحر لدھیانوی

سنگِ میل کے ترقی پسند رسالہ ہونے کے بارے میں مجھے ہرگز کوئی شک نہیں بلکہ مجھے یقین ہے، کہ جو کام سویرا سرانجام نہیں دے سکا۔ وہ سنگِ میل کر دے گا۔ کیونکہ اس کی ترتیب و تدوین آپ جیسے مخلص اور محنتی نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے ✦

• • •

اختر انصاری

مکرمی و محترمی! تسلیم!

سنگِ میل برابر پہنچ رہا ہے۔ جس کے لئے میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ اس جملے کو محض رسمی خیال نہ کیجئے گا۔ میں درحقیقت آپ کے موقر جریدے کو ایک قابلِ قدر تحفہ خیال کرتا ہوں۔ سنگِ میل جیسے رسالے کے اجراء پر (اور پشاور جیسے مقام سے) آپ یقیناً مستحق مبارکباد ہیں۔ اور آپ کی یہ کوشش لائقِ ستائش ہے۔ سنگِ میل کی کتابت، طباعت، گیٹ اپ، مضامین کا معیار، اندراجات کی ترتیب، ہر چیز اعلیٰ درجے کی ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ مضامین کا عام رجحان ترقی پسندانہ ہے۔ سنگِ میل کے معنوی، صوری حسن کی بناء پر یہ چند جملے بے اختیار قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ ورنہ ایک مدت سے میں رسالوں سے بالکل بیزار ہو چکا ہوں۔ اور آج کل تو یہ گھن جس شدت کے ساتھ لگ رہی ہے۔ اس کے تصور ہی سے گھن آتی ہے ✦

• • •

انور

فارغ بھائی! تمہارا سنگِ میل پہنچ گیا،
کتنے اچھے ہو تم کہ مجھ جیسے نااہل اور کاہل الوجود آدمی کو بھی معاف کر دیتے رہو۔
سنگِ میل کا معیار دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ تم مبارکباد کے لائق ہو۔ اس قدر شاندار میگزین میں اپنا نام نہ دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ اور یہ دیکھ کر خوشی کہ تم اب سرحد نمبر نکال رہے ہو۔

کیا اس نمبر میں صرف سرحد کے بارے میں باتیں ہوں گی۔ کاش ایسا نہ ہو۔ اس سے اس نمبر کی اہمیت تو ضرور بڑھ جائے گی۔ لیکن مجھے یہ نقصان پہنچے گا۔ کہ میں اس میں چھپ نہ سکوں گا ٭

• • •

کشمیری لال ذاکر

محترم بھائی جان تسلیم و نیاز،
یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ سنگِ میل کا سرحد نمبر نکال رہے ہیں۔ یوں تو ہر شمارے میں کچھ صفحات آپ نے سرحد کے لئے وقف کر رکھے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو اچھا خاصا معلوماتی مواد مل جاتا ہے۔ لیکن اس موضوع کے لئے ایک پورا ایشوع صرف کر دینا تو یقیناً قابلِ ستایش امر ہے۔ اچھا ہوا اگر آپ اس میں سرحد کے سبھی شعبوں مثلاً اقتصادی سیاسی، ادبی، کلچرل پر مضامین فراہم کر کے انہیں CHRONCHR OBGICAL ترتیب دیں۔ عام لوگوں کے لئے تو سرحد جیسے ابھی دریافت ہی نہیں ہوا۔ میرا مطلب ہے۔ کہ عوام سرحد کے متعلق بہت ہی کم واقفیت رکھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ سنگِ میل کا سرحد نمبر کولمبس بن کر ہمارے ذہنوں کو دنیا کے اس حصے سے آشنا کرائے گا۔ جس سے متعلق ہمارے سامنے صرف دھند ہے، کہر ہے اور ہلکا ہلکا اندھیرا ہے۔

خدا آپ کو اپنی مساعی میں کامیاب کرے۔

• • •

عبدالرحیم شبلی

برادران گرامی!

رحمان ساطحی کی زبانی یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی - کہ آپ "سنگ میل" کا سرحد نمبر شائع کر رہے ہیں - مجھے آپ کی انتظامی صلاحیتوں پر اعتماد ہے - اس لئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں - کہ "سرحد نمبر" ترقی پسند ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا - اور پاکستان و ہندوستان کے ادبی حلقے اس کا پُرجوش خیر مقدم کریں گے -!

دل چاہتا ہے کہ میں بھی "سرحد نمبر" کے لئے کوئی مضمون لکھوں ۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم "پیغام" ہی بھجوا دوں - لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میں ان دونوں متبادل رستوں میں کوئی بھی اختیار نہ کر سکوں گا - مجھے اپنی بیکار مصروفیتوں کے ہجوم پہ خود بھی تعجب ہے تقسیم سے پہلے خیام و عالمگیر کے ماحول میں کچھ ایسا غرق ہونا پڑا - کہ در جینا و کفا کی طرح مسودوں کے دائرے سے باہر جھانک کر بھی نہ دیکھ سکا - اور جب دس برس کے بعد چھاپے خانے کی گڑگڑاہٹ سے نجات ہوئی اور میں یہ کہتا ہوا ندیم کے بقول "واٹر ٹائٹ کمپارٹمنٹ" سے باہر نکلا ؎

مسافر غریب ایک رستے میں تھا   وہ چوروں کے ہاتھوں میں جا کر پھنسا

تو صحافتی الجھنوں نے اُٹھ کر میرا دامن تھام لیا - اب مجھے خواہ محسوس ہو رہا ہے کہ جب تک ذہن اور صحت کی قربانی نہ دوں گا - اُن سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں ہے اس کشمکش کے دوران میں جب کبھی نگاہ اُٹھا کر ادبی حلقوں کی طرف دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرا منہ چڑا کر مجھے اردو ادب کا راجگوپال آچاریہ قرار دینا چاہتے ہیں بہرحال مجھے آپ سے معذرت کرنی ہے - کہ اس وقت مضمون تو نہیں لکھ سکتا ہوں البتہ میرا یہ محبت بھرا "پیغام" قبول فرمایئے -

دراصل بات یہ ہے۔ کہ مجھے صوبہ سرحد سے کچھ بہت زیادہ واقفیت بھی نہیں ہے مجھے اپنی زندگی میں صرف ایک آدھ مرتبہ اٹک کے اُس پار جانے کا اتفاق ہوا لیکن یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا! اِس وقت جب میں رائٹر کے تاروں پر سر جھکائے آنکھیں بند کر کے سرحد کا تصور باندھتا ہوں تو میرے ذہن میں اجاڑ پہاڑ، ویران ٹیلے، سنسناتی ہوئی ندیاں، سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے دریا، مسجدوں کی صفوں میں سرسراتے ہوئے سیاہ بچھو، بازاروں میں بوجھل شلواروں کے اندر ہاتھ ڈال کر "دِڈ دِڈی" کرتے ہوئے پٹھان، میدے کے بڑے بڑے نان، موٹے گوشت کے کباب بھنتے ہوئے بتیرے، نشیلی چائے افیون آمیز تمباکو کے بھبکے، سُود خوار پٹھانوں کے خونخوار چہرے اور رات کے وقت بندوقوں کی کھٹاکھٹاہٹ، اور گولیوں کی جھنکار — اور نہ جانے کیا کیا گھوم جاتا ہے۔

مجھے سرحد سے بیک وقت محبت بھی ہے اور نفرت بھی!

اِن حالات میں سوچتا ہوں کہ لکھوں تو کیا لکھوں؟ البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ کبھی سرحد آؤں اور ایک ایک پٹھان کے سینے کے اندر جھانک کر دیکھوں (بشرطیکہ وہ اس کی اجازت دے!) کہ اس کے دل کی دھڑکن کیا کہہ رہی ہے "آپ مجھے ماضی پرست کہہ لیجئے۔ لیکن نہ جانے کیوں میں بودھ، کنشک، سکندر اور خوشحال خان خٹک کے زمانے کا سرحد دیکھ کر خاص طور پہ متاثر ہوتا ہوں۔ مجھے آثارِ قدیمہ کے ویرانوں میں گھوم کر قصہ خوانی بازار کی سیر سے کہیں زیادہ لطف آتا ہے۔ اگر میرا اختیار ہو تو میں پہاڑ کی اس چوٹی پر بسیرا کروں جس کے متعلق خوشحال خان خٹک نے وصیت کی تھی کہ مجھے ایسی جگہ دفن کرنا جہاں ملوکیت پرستوں کے گھوڑوں کی گرد بھی نہ پہنچ سکے! میں خوشحال خان خٹک کی مجاہدانہ سرفروشی اور خاص کر شاعرانہ بے نیازی پر جان چھڑکتا ہوں۔ کاش آج کل کے ترقی پسند ادیب اور شاعر اسے شمع راہ بنائیں! ہماری راہ بے حد کٹھن ہے۔ لیکن اگر خودداری اور بغاوت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ تو

مجھے یقین ہے کہ آج صوبہ سرحد میں لوگ شلواروں کے اندر ہاتھ ڈال کر توٹ وانی کرتے نظر نہ آئیں گے، نان کباب اور نسّلی چائے کی فروخت بند ہو سکتی ہے، پٹھان سُود کھانے کی عادت کو خیرباد کہہ سکتے ہیں۔ مسجدوں کو سیاہ بچھوؤں سے پاک کیا جا سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ ان بچھوؤں کی ہلاکت کا بھی سامان ہو سکتا ہے۔ جو سرحد کی سیاسی زندگی سے لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کی نگاہیں عام طور پر نجات دہندہ کے انتظار میں آسمانوں کا جائزہ لیتی ہیں۔ لیکن میں سرحد کی سنگلاخ زمین سے ابھی تک مایوس نہیں ہوا۔ عجب کیا ہے کہ صوبہ سرحد ایک اور خوشحال خان خٹک کو جنم دینے میں کامیاب ہو جائے۔ جو ترقی پسند شاعر بھی ہو اور مجاہد بھی ہے!

● ● ●

کنہیا لال کپور

سنگِ میل کی حیرت انگیز مقبولیت قابلِ رشک ہے۔ جس بے باکی سے یہ رسالہ وقت کے اہم تقاضوں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس کی داد نہ دینا نا انصافی اور احسان فراموشی ہو گی۔ رجعت پسند حلقوں کے لئے سنگِ میل کا وجود سنگ آمد و سخت آمد کا مترادف ہے۔

مجھے مسرت ہے۔ کہ صوبہ سرحد نے سنگِ میل ایسا معیاری رسالہ پیش کیا ہے۔ جس کے اغراض و مقاصد میں اہلِ سرحد کی خودداری۔ بلند ہمتی اور اولوالعزمی کی جھلک ہے ✽

● ● ●

ابراہیم جلیس

برادرم فارغ بخاری صاحب!

یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ کہ آپ سنگِ میل کا سرحد نمبر مرتب کر رہے ہیں۔ میں چونکہ پاکستان میں تازہ وارد ہوں، اس لئے سرحد کے بارے میں کوئی مضمون یا افسانہ نہیں لکھ سکا۔ ویسے آپ کا یہ اقدام بڑا مستحسن ہے۔ سنگِ میل نے پچھلے دنوں

جب کہ پاکستان کے سارے نامور ترقی پسند رسالے قیدِ سکوت کاٹ رہے تھے بڑی پامردی کے ساتھ ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کی ہے۔
سنگِ میل اس کٹھن دَور میں اور اس بورژوا ڈیموکریسی میں سچ مچ ترقی پسند ادب کو سنگِ میل ہے۔ سرحد نمبر کے بعد اگلے شروع کے لئے میں ایک افسانہ آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

• • •

خدیجہ مستور مدیرہ "روحِ ادب" کراچی

محترمی تسلیم!
سرحد کا نام سنتے ہی جانے کیوں کچھ وحشت سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ یہاں کے متعلق روایتیں ہی کچھ ایسی بھونڈی سنتے چلے آئے ہیں۔ لیکن "اٹک کے اس پار" کا حصّہ پڑھتے پڑھتے ذہن مانوس ہو چلا ہے۔ اور معلوم ہوا ہے کہ وہاں صرف اکھڑپن اور بات بات پر لڑمرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ـــــ ہمارے ہی جیسے دھڑکتے ہوئے حساس دل ہیں نرم و نازک جذبات ہیں، زندگی کی پرانی قدروں کو بدلنے کی تمنا ہے، موجودہ نظام سے نفرت ہے اور وہ سب کچھ ہے۔ جو آج کا انسان سوچ سکتا ہے۔
سرحد نمبر کے شائع ہونے کی خبر سے مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ میں اس نیک اقدام پر آپ کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ سرحد نمبر ان تمام خصوصیات کا حامل ہوگا۔ جو سرحد کے بے شمار روایتی "شمشیر بازوں" کو دُنیا کے سامنے ان کے اصلی اور بے حد توانا روپ میں لا کھڑا کرے گا۔ امید ہے آپ بعافیت ہوں گے۔

• • •

منظومات

اقبال

او غافل افغان

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان!
تو بھی اے فرزند کہستان! اپنی خودی پہچان!
اپنی خودی پہچان!
او غافل افغان!

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز!
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان!
اپنی خودی پہچان!
او غافل افغان!

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان!
اپنی خودی پہچان!
او غافل افغان!

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج!
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان!
اپنی خودی پہچان!
او غافل افغان!

●

سلام مچھلی شہری

خیبر نے کہا ــــ؟

ــــ صحیفۂ ملک کے مقدس ترین ورق نے،
ضعیف خیبر کے آہنی بازوؤں کی جانب اشارہ کر کے،
وطن کے محبوب، فرمانبردار اور کہن سال پاسباں سے،
ہمالیہ کا مزاج پوچھا ــــ
عروسِ گنگ و جمن کی رنگین جلوہ گاہوں کا حال پوچھا،
چناب و راوی کے ساحلوں کے حسین گیتوں کی خیریت پوچھ کر
بڑی ملتجی نگاہوں سے
پاسبانِ وطن کو دیکھا:

ضعیف خیبر نے ــــ
فرماں بردار اور کہن سال پاسباں نے،
اُداس آنکھوں میں اشک بھر کر،
دلِ حزیں کو سنبھال کر،
"مادرِ وطن" کے نئے مگر گہرے گہرے زخموں کو ٹال کر،
دھیمے دھیمے ــــ دَرد اور کراہ سے چور ہونے پر بھی متین بن کر،
کہا کہ اے مادرِ وطن!
مجھ کو آج اپنے ہی بھائیوں سے،

ترے سپوتوں سے،

صرف اتنی سی بات کہنی ہے،
یہ بتانا ہے،
ان کو بس اتنا ہی جتانا ہے —— آج دنیا کا حال کیا ہے!
—— بساطِ عالم کے سارے مہرے عجیب تیزی سے ناچتے ہیں،
اور اس تگ و دو میں اپنی منزل کا راستہ ہم کو ڈھونڈنا ہے ——
ہماری منزل یہی نہیں ہے کہ ہم نے زنجیر توڑ ڈالی،
کہ ہم نے وہ طوق نوچ ڈالے جنہیں بدیسی حکومتوں نے
ہمیں بہت ناتواں سمجھ کر ہماری گردن کا
ہار جانا =
ہماری منزل تو آنے والے زمانے کے ساتھ رقص میں ہے ——
بساطِ عالم کے سارے مہرے عجیب تیزی سے ناچتے ہیں!
ہمیں بھی اس رقص کے لئے اپنی کاوشوں پر یقین رکھ کر،
دماغ و دل پر بھروسہ کر کے،
فضائے عالم کا جائزہ لے کے اپنا مہرہ سنبھالنا ہے =
حیات اور موت کی جو شطرنج آج دنیا میں ہو رہی ہے ——
ہمیں بھی یہ کھیل کھیلنا ہے،
ہمیں بھی منزل کو ڈھونڈنا ہے ——
—— ہمالیہ کی جبیں کے سورج کی نرم و نازک شعاعیں لے لو،
ہری بھری کھیتیوں کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کی آنچ لے لو،
رواں دواں ندیوں کی لہروں سے درسِ عزمِ حیات لے لو،
نئے مسائل سے منہ نہ موڑ دو ——
سکونِ قلب و نظر کی خاطر چہکتی کوئل کے گیت لے لو،

کنارِ گنگ و جمن وطن کی عزیز وادی کا رنگ لے لو —
چناب و راوی کا ساز لے لو — !

مگر مرے ساتھیو — !
تمہیں ان نئے مسائل کو جاننا ہے —
رواں دواں کاروانِ گیتی، رواں دواں وقت کے تقاضے،
رواں دواں زندگی کی رَو میں،
رواں دواں ہم اگر نہ ہوں گے،
اگر ہم اتنے پہ خوش رہیں گے کہ طوقِ افرنگ توڑ دینے کے بعد
یہ زندگی بہت ہے،
تو آنے والے نئے زمانے میں جس کی خاطر غریب جنتا نے سعیٔ پیہم کی
ٹھان لی ہے،

ہماری کوئی جگہ نہ ہوگی —
— بساطِ عالم پہ اپنا مُہرہ، ہماری مرضی پہ منحصر ہے،
ہم اپنی منزل سمجھ رہے ہیں،
ہم آنے والی حسین دنیا میں اپنی منزل کو جانتے ہیں،
رواں دواں کاروانِ گیتی کا رہنما ایشیا بنے گا —
اور ایشیا کو ہمالیہ کی جبیں کے سورج کی نرم کرنیں،
عروسِ گنگ و جمن کے نغمے،
چناب و راوی کی نرم لہریں،
جگائیں گی، راستہ بتائیں گی اور پھر جاوداں کریں گی — !!!"

نذیر مرزا برلاس

ننھا بھکاری

قصہ خوانی[1] پر حسیں کیفیتیں چھانے لگیں / زندگی کی مستیاں ہر سو نظر آنے لگیں
ڈوبتے سورج کے سائے ہر طرف چھائے ہوئے / موڑ پر ننھا بھکاری ہاتھ پھیلائے ہوئے
اک طرف عشرت کا اک امڈا ہوا سیلاب سا / اک طرف اک بھیک منگا مضطرب بیتاب سا
جسم سے کپڑوں کی میلی دھجیاں چپکی ہوئی / یعنی سر سے پاؤں تک بدبختیاں لپٹی ہوئی
ہاتھ پاؤں مضمحل جی مضطرب نظریں اداس / اور چہرے پر بھیانک بھوک کے خوف و ہراس
بچپنے کی سادگی، شوخی، ہنسی باقی نہیں / اس کی ان مردہ رگوں میں زندگی باقی نہیں
بھیک کی عادت سے خودداری کا جذبہ کھو چکا / اس ذرا سی عمر میں احساس مردہ ہو چکا
عمر بڑھتی جائیگی مجبور ہوتا جائے گا! / اور خودداری سے کوسوں دور ہوتا جائیگا
پھیر لیتے ہیں نگاہیں جس کو رہرو دیکھ کر / کاش خود فطرت کو رحم آجائے اس کو دیکھ کر
تانبے اور چاندی کے یہ سکے نہ ہونے چاہئیں / اس کے ان ننھے سے ہاتھوں میں کھلونے چاہئیں

●

[1] پشاور کا پر رونق بازار جہاں پچھلے پہر سے آدھی رات گئے تک بڑی چہل پہل اور گہما گہمی رہتی ہے۔

قتیل شفائی

خوانینِ سرحد

۱ کس سے فریاد کرے درۂ خیبر کا وقار — کس سے لپٹے میرے سرحد کی برہنہ چوٹی
کس کے دامن پہ گرائے کوئی جلتے آنسو — کس کی دہلیز پہ پیٹے گی یہ قسمت کھوٹی
بھوک اگلتے ہوئے کھیتوں میں بچارے دہقاں — ہل چلاتے ہوئے چلاتے ہیں روٹی روٹی
جن کو پروردۂ ذہنیتِ افرنگ کہیں — کھا گئے نوچ کے جمہور کی بوٹی بوٹی

۲ کون اس دیس میں دیگا ہمیں انساں کی بھیک — جس میں خونخوار درندوں کی شہنشاہی ہے
جس میں غلے کے نگہباں ہیں وہ گیدڑ جن سے — قحط و افلاس کے بھوتوں نے اماں چاہی ہے
یہ وہ خطہ ہے کہ اربابِ ہوس کے ہاتھوں — جس کی تقدیر میں لکھی ہوئی گمراہی ہے
اُف یہ غیرت کے پرستار یہ غم کے پیکر — دل میں طوفاں ہیں مگر چال میں روباہی ہے

لوگ چلائیں - مگر کاکُلِ ثروت کے اسیر
اپنے زرّیں اصولوں پہ اڑے رہتے ہیں

یہ لٹیرے یہ ہوس کار لٹیرے مل کر
فکرِ جمہور کی راہوں میں کھڑے رہتے ہیں

یہ وہ بے آب نگینے ہیں شہنشاہی کے
جو حکومت کی انگوٹھی میں جڑے رہتے ہیں

اُن سے فریاد کی تلقین ہوئی ہے ہم کو
جن کے احساس پہ تالے سے پڑے رہتے ہیں

آؤ اے فاقہ زدہ قوم کے بھوکے شیرو
ہر بڑی توند کے ہاتھوں سے نوالا چھینیں

یہ ستمگر تو پلاؤ پہ جھپٹتے جائیں
اور ہم راہ میں بیٹھے ہوئے چاول بینیں

چند ڈاکو تو یہاں مالِ غنیمت بانٹیں
اور ہم صاف کریں ان کیلئے قالینیں

آؤ اے ابلہ پا راہروانِ منزل
مسکراتی ہیں وہ گھوڑوں کی چمکتی زینیں

●

ظہور نظر

؟

اٹک کے اس پار بسنے والے میرے رفیقو!

اگرچہ امید و عزم کا دریا تبسم ۔۔ جھلک رہا ہے
تمہاری نظموں تمہارے افسانوں اور گیتوں کی ہر نظر میں
مگر میں پھر بھی تمہارے فن کی جوان پلکوں پہ
ہلکے ابہام کی سسکتی نمی سی محسوس کر رہا ہوں
حسین فن پاروں، شاہکاروں میں ایک معصوم تشنگی اک کمی سی محسوس کر رہا ہوں

اور اس کا باعث
میری نظر میں فقط یہی ہے
کہ تم نے اپنے عزیز طبقے کی الجھنوں اور روائتوں سے
نکل کے اس تیز و تند آواز کو سنا ہی نہیں ہے
جو گونجتی، گرجتی، لپکتی، بڑھتی

ہزارہ اور چارسدہ کی سرزمین سے اٹھ کر
تمام سرحد پہ چھا رہی ہے
اگر سنا ہے تو اپنے افکار میں سمویا نہیں ہے اُس کو
اسی بنا پر میں سوچتا ہوں
کہ تم نے حالات و وقت کے چیختے تقاضوں کو صرف اپنایا ہے
ابھی اُن کا ساتھ دینے سے ڈر رہے ہو
ابھی تمہارے دلوں کی دھڑکن نہیں بنی ہے
وہ عالمی جدوجہد جس نے
تمام دنیا کے بھوکوں، ننگوں کو اک نئی زلیست دی ہے
اور جو تمہارے پیارے اٹک کے اس پار بھی نگاہیں، ٹھا رہی ہے

میرے جواں ساتھیو!
میرے ہمسفر رفیقو!!
بُرا نہ مانو۔ تو میری اس پر خلوص آواز پر ذرا کان دھر کے سوچو!!!
کہ میں نے جو کچھ کہا ہے
وہ جھوٹ ہے کہ سچ ہے؟؟؟

احمد ریاض

سرحد کے عظیم فن کارو!

ابل رہی ہے پہاڑوں کی چوٹیوں سے جو آگ
تمہاری کوششِ پیہم کا ما حصل ہی تو ہے
پگھل رہی جو زنجیرِ گردشِ ایام!
شعورِ عظمتِ آدم کا ما حصل ہی تو ہے

فریب خوردہ پٹھانوں کے تیرہ غاروں میں
جلائی تم نے نئے انقلاب کی قندیل
تمہارے عزم و حرارت نفس ارادوں نے
بلند کی ہے اک احساسِ مشترک کی فصیل

پرانے جاہ پسندوں کی زر نوازی نے
بجھا دیئے تھے جو کانٹے، اٹھا رہے ہو تم
بڑے خلوص بڑے انہماک سے شب و روز
نئی فضا میں پھریرے اڑا رہے ہو تم

یہ سامراج کا فتنہ یہ سیم و زر کا طلسم
تمہارے پاؤں کی زد میں تمہاری راہ میں ہے
وہ بُت فریبِ قیادت نے جس کو ڈھالا تھا
تمہارے عزم جواں سال کی پناہ میں ہے

عزیز اختر

سرحد

اے چٹانوں کے کوہ و دمن کے وطن
سینکڑوں انقلابات کے بعد بھی
تو جواں ہے جواں ہی رہے گا قیامت تلک
وادیوں سے تری گھاٹیوں سے تری
آندھیوں کی طرح بادلوں کی طرح
نو بہ نو انقلابات لاتے ہوئے
اپنے نیزے فضا میں اڑاتے ہوئے
مشعلیں زندگی کی جلاتے ہوئے
اور بجھاتے ہوئے
انقلاب آفریں موجِ ایّام کو
اپنے جذبات کی گرم رو میں لئے
غیر مسلم بھی گذرے مسلماں بھی
پھر بھی تیری زمیں پھر بھی تیری فضا
پھر بھی تیرے سپوت اور آب و ہوا

اپنی آزادیوں کے محافظ رہے
اور تلوار کی دھار کو اک نئی
آب دیتے رہے تیز کرتے رہے
اے چٹانوں کے کوہ و دمن کے وطن
سامراجوں کے منحوس قدموں کی آتش فشاں گرد سے
جب ترے لہلہاتے ہوئے کھیت جلنے لگے
قہقہے ہچکیوں میں بدلنے لگے
اور ماحول کی جگمگاتی ہوئی شمعیں بجھنے لگیں
دل کو آسودگی بخشنے والی شمعوں کی رنگیں شعاعیں سمٹنے لگیں
جبر و وحشت کی شامیں، تشدد کی صبحیں نمایاں ہوئیں
زندگی آگ کھانے لگی
خون پینے لگی
خاک اڑانے لگی
گاؤں ویراں ہوئے
شہر برباد ہونے لگے
سینکڑوں آفتابوں کو بندوق کی
سنسناتی ہوئی گولیاں چھیدنے لگ گئیں
تھوک اگتی رہی
خون مزدور و دہقاں کا بکتا رہا

اے چٹانوں کے کوہ و دمن کے وطن
مفلسی اور بڑھتی ہوئی بھوک کا
موت جب گرم بازار کرنے لگی
وادیوں سے تری گھاٹیوں سے تری
کچھ بہادر، جیالے، ابھرنے لگے
اور مجبور انساں کو بیدار کرنے لگے
سامراجوں کا سینہ دھڑکنے لگا
ٹمٹماتی ہوئی شمعیں روشن ہوئیں
جبر و وحشت کی شامیں
تشدد کی صبحیں
فنا ہو گئیں
زرد چہرے خوشی سے دمکنے لگے
عیش افروز فردا کی امید کے
خشک ہونٹوں پہ تارے چمکنے لگے
اے چٹانوں کے کوہ و دمن کے وطن
ماضی وحال پر تیرا احسان ہے
روحِ انسانیت کا تو خلاق ہے
عظمتِ آدمیت کا آفاق ہے

★

پرویز سلیم

ایک جہان بیدار ہوا ہے

محنت کا حق مانگ رہے ہیں ہشت نگر مظلوم ہزارہ
جاگی ہے کمزور رگوں میں آج نئے جیون کی دھارا
صدیوں کے خاموش لبوں سے پھوٹے ہیں سنگین ترانے
سرحد کے دہقان اٹھے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے

دھرتی، کھیت، مویشی، گاؤں خانوں کی جاگیر نہیں ہیں
فاقے، بھوک، تشدد، نوع انساں کی تقدیر نہیں ہیں
سب کی مشترکہ ملکیت دھرتی کے انمول خزانے
سرحد کے دہقان اٹھے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے

روندے کچلے انسانوں کی چیخیں اب للکار بنی ہیں
بے بس اور افسردہ باہیں لوہے کی دیوار بنی ہیں
آج نہیں تو کل ٹوٹیں گے جاگیروں کے تانے بانے
سرحد کے دہقان اٹھے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے

یہ سرکش طوفانی لہریں کونے کونے چھا جائیں گی
ظلمت کے آکاش پہ ہر سو بجلی بن کر لہرائیں گی
اِس آندھی کے شوخ تھپیڑے گل کر دینگے دیپ پرانے
سرحد کے دہقان اُٹھے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے

جُگ جُگ کا فریادی انساں وقت کی باگیں موڑ رہا ہے
ایک جہاں بیدار ہُوا ہے ایک جہاں دم توڑ رہا ہے
پورب پچھم اتر دکھن پر پھیلائے سُرخ فضا نے
سرحد کے دہقان اٹھے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے

حسن طاہر

سرحد کا افغان

پتھر دیس کا رہنے والا پتھر جیسی کایا
کبھی غلامی محکومی کو اُس نے نہیں اپنایا
اُس نے ہمیشہ جان پہ کھیل کے اپنا وطن بچایا
دُنیا کو دکھلایا
وطن کی عزت پر مرتے ہیں غیرت مند انسان
اس کی نرالی شان!
سرحد کا افغان!!

●

باتیں یہ کم کم کرتا ہے
بات پہ لیکن کٹ مرتا ہے
اپنے قول کی پچ کرتا ہے
بڑی چیز ہے آن!
سرحد کا افغان!!

●

دُور دیس سے آئے فرنگی اس کو علم سکھانے
رام اسے کرنے کی خاطر کئی بہانے
لیکن اس خود دار انساں نے ان کے جھوٹ نہ مانے
خود ہی لگے ٹھکانے
آج بھی ہے آزاد اور خود مختار مگر افغان!
سرحد کا افغان

•

اس کے دیس کی ریت نرالی بندوقوں سے کھیلے
طیاروں کو مار گرائے روکے فوج کے ریلے
ہار کبھی نہ ماننے چاہے جیون بھر دُکھ جھیلے
پھر بھی بدلہ لے لے!!
دشمن کو دشمن ہی جانے
جان رہے یا آن!
سرحد کا افغان!

•

قصہ خوانی کے بازار میں ڈٹ کر گولی کھائے
توپ ہو یا بندوق مگر یہ کبھی نہ پیٹھ دکھائے
کتنا ہی مجبور رہے مُنہ سے کبھی نہ نکلے ہائے

مَوت سے بھی لڑ جائے
واہ دلیر انسان :
سرحد کا افغان !!

•

چارسدہ میں جاگیرداروں خانوں سے ٹکرایا
کھیت کسانوں کو لڑنے کا اس نے ڈھنگ سکھایا
وقت بتائے گا اُس نے کیا کھویا ہے کیا پایا
اپنا حق منوایا
اُونچی ہل کی شان !
سرحد کا افغان !!

•

جنم جنم کا بلی ہے تُو سرحد کے افغان
تیری شکتی تیری طاقت پر دھرتی کو مان
اٹھ کر توڑ بھی دے جاگیرداروں خانوں کے بان
اپنا حق پہچان !
تیرے دم سے اُونچی ہوگی تیرے وطن کی شان
سرحد کے افغان !!!

★

جمیل ملک

سرحد

یہاں کے لوگوں کی زندگی کے
کئی فسانے سُنے تھے میں نے
کسی کا ارشاد تھا یہاں کے تمام انسان بھیڑیئے ہیں
کسی کی یہ مخلصانہ رائے تھی سخت جاہل ہیں، غیر تہذیب یافتہ ہیں
یہاں کے بوڑھے، جوان، بچے
کوئی بصد اضطراب کہتا کہ سُن کے اُس پار تم نہ جانا وگرنہ واپس نہ آسکو گے
کہ لوٹ لیتے ہیں جان سے مار ڈالتے ہیں پٹھان سادہ مسافروں کو

مَیں سوچتا ہوں
کہ کتنی جھوٹی تھیں وہ حکایات، وہ فسانے

جنہیں تراشا تھا حکمرانوں کی ساحری نے
مَیں دیکھتا ہوں
یہاں کے انسان کتنے مخلص ہیں، کتنے مہمان نواز ہیں، کتنے زندہ دل ہیں
یہاں سے دن رات شعر و علم و ادب کے سوتے اُبل رہے ہیں
مسافروں کے لئے یہاں کے جوان بنتے ہیں مشعلِ راہ، نورِ منزل
"قصور" اُن کا فقط یہی ہے
کہ باحمیّت ہیں، سیدھے سادھے ہیں اور نفرت رہی ہے اِن کو
غلام قوموں کی زندگی سے
مَیں سوچتا ہوں
کہ آج آزاد ہوں، مرے ذہن پر نہیں ہے کسی کا غلبہ
مَیں دیکھتا ہوں
کہ میری آنکھوں سے اُٹھ چکا ہے وہ گورے آقاؤں کی سیاست کا شوخ پردہ

احمد ظفر

اٹک کے اس پار

اٹک کے اس پار زندگی کی نئی سحر جھانکنے لگی ہے
اٹک کے اس پار تازہ کرنیں جمیل لمحوں کو ساتھ لے کر امڈ رہی ہیں

اٹک کے اس پار تیرگی تھی
اٹک کے اس پار زندگی نے مہیب راہوں پہ چلتے چلتے نشان منزل کو کھو دیا تھا
اٹک کے اس پار سنگلاخ اور سخت دھرتی کے سخت سینے پہ ظلم ہی ظلم ہو رہے تھے
اٹک کے اس پار سازشیں جال بن رہی تھیں

مگر اسی تیرگی کی تہ میں نئی سحر مسکرا رہی تھی
نئے نئے عزم رقص میں تھے
اٹک کے اس پار ایک طوفاں امڈ رہا تھا

وہ رنگ و نکہت کا ایک طوفاں
اٹک کے اس پار گوشے گوشے میں بڑھ رہا ہے
اٹک کے اس پار لوگ بیدار ہو چکے ہیں
اٹک کے اس پار زندگی کی نئی سحر جھانکنے لگی ہے
اٹک کے اس پار تازہ کرنیں جمیل لمحوں کو ساتھ لے کر امڈ رہی ہیں!

فارغ بخاری

خوشحال خان خٹک

آدمیت خونچکاں، انسانیت تاراج تھی
ارضِ مشرق روشنی کے واسطے محتاج تھی
ایشیا کی سرزمیں مدت سے تھی ظلمت نصیب
اے کہستانی ادیب

اوج پر رہتا تھا ظل اللہیوں کا اقتدار
جاں بلب تھے ہر طرف اندھی عقیدت کے شکار
بن چکی تھی ادعائے ہوش کی دنیا رقیب
اے کہستانی ادیب

ہو رہا تھا ظلم مذہب کے مقدس نام پر
ٹوٹتے تھے پے بہ پے کوہ ستم ہر گام پر
نشۂ ثروت میں کھوئے تھے اخوت کے خطیب
اے کہستانی ادیب

چھا رہا تھا ہر طرف جمہور کش فاشی نظام
بیکس و مظلوم انسانوں کا جینا تھا حرام
زندگانی تھی زمانے میں ہلاکت کے قریب
اے کہستانی ادیب

تو نے توڑا اونچی اونچی بارگاہوں کا غرور
خاک میں تو نے ملایا کجکلاہوں کا غرور
ہند میں آزادیٔ جمہور کے پہلے نقیب
اے کہستانی ادیب

تیری جانبازی حریفان وغا میں فرد تھی
تیرے آگے سطوت اورنگ شاہی گرد تھی
جاگ اٹھے تیرے بل بوتے پہ خوابیدہ غریب
اے کہستانی ادیب

رشک کرتا ہے جہاں اب بھی تیرے کردار پر
اک قلم پر ہاتھ تھا اور دوسرا تلوار پر
تو کبھی سرکش مجاہد تھا کبھی باغی ادیب
اے کہستانی ادیب

ثاقب رزمی

جاگے سرحد کے فن کار

جاگے سرحد کے فن کار
جلتے وقت نے روشن کی ہے
ان بجھ جوت اٹک کے پار
جاگے سرحد کے فن کار
گیت بکھر جائیں گے جگنو بن کر وادی وادی میں!
عشق نئی منزل کا سنگ گائیں گے راہی راہی میں
نئی امیدوں کا رس گھل جائے گا ڈالی ڈالی میں
البیلے رنگوں کو لے کر آئے گی گل ریز بہار
جاگے سرحد کے فن کار
جلتے وقت نے روشن کی ہے
ان بجھ جوت اٹک کے پار
جاگے سرحد کے فن کار
مزدوروں دہقانوں کے دکھ درد مٹائے جائیں گے
ہر خوشے کی لوٹ کے افسانے دہرائے جائیں گے
جاگیروں کے سارے خونیں پھندے کاٹے جائیں گے
اس پتھریلے دیس کے دہقاں اب ہو جائیں گے بیدار

جاگے سرحد کے فن کار
جلتے وقت نے روشن کی ہے
اُن بجھ جوت اٹک کے پار
جاگے سرحد کے فن کار

وہ پھوٹے سرحد میں فکر و دانش کے تازہ سوتے
وہ بدلے گیتوں، تحریروں، شعروں کے بہتے دھارے
وہ لوٹے تاریک عقیدوں کے سب زنگیلے حلقے
وہ رجعت کے اندھیاروں پر ہوئی اجالوں کی یلغار

جاگے سرحد کے فن کار
جلتے وقت نے روشن کی ہے
اُن بجھ جوت اٹک کے پار
جاگے سرحد کے فن کار

وہ قسمت کی ماری جنتا دکھ کا کارن جان گئی
وہ یکساں جیون کی نئی تمنا ہر دل میں دھڑکی
وہ دنیا کے بے بس انسانوں کی نفرت عام ہوئی
وہ اٹھی خاموش فضا میں نئے تقاضوں کی جھنکار

جاگے سرحد کے فن کار
جلتے وقت نے روشن کی ہے
ان بجھ جوت اٹک کے پار
جاگے سرحد کے فن کار

★

رضا ہمدانی

خیبر

یہ فلک بوس، پراسرار چٹانیں جن سے
ہر زمانے میں بغاوت کے شرر بھڑکے ہیں

یہ شجاعت کے علمدار یہ غیور انساں
جن کے دل موت کی آغوش میں بھی دھڑکے ہیں

اپنی اجڑی ہوئی کٹیائیں جنہیں راس آئیں
جو زر و سیم کے ایوانوں سے بیگانہ رہے

بارگاہوں پہ کبھی جھک نہ سکی جن کی جبیں
جو سدا عظمت جمہور کا افسانہ رہے

جن کو غربت زدہ ماحول گوارا تھا مگر
اپنی آزادی کی دولت کے نگہبان رہے

جو شہنشاہوں کے ہاتھوں میں کبھی بک نہ سکے
آدمیت کا جو ہر دور میں عنوان رہے

آج خاموش ہے کیوں وادیٔ خیبر کے مکیں
آج بھی گردنِ جمہور پہ خنجر ہے رواں

زندگی آج بھی ہے موت کے پنجے میں اسیر
آج بھی ہیں وہ غلامی کی روایات جواں

اٹھ کہ سرمایہ پرستوں کا یہ فرسودہ نظام
ہر قدم پر نئے زندانوں کی تعمیر میں ہے
دیکھ پھر آج وہ "ظلِ الٰہی" کی ہوس
تجھ کو محکوم بنانے کی تدابیر میں ہے

مضمر تاتاری

اجالا

(سرحد کا ایک امی فن کار جو عوام کا محبوب اور ہردلعزیز انقلابی شاعر ہے)

آ کے گلشن میں صبا نے چھیڑ دی پھولوں کی بات
آ گئی ہے یاد مجھ کو یوم آزادی کی رات

گردنیں کٹ کٹ کے تیغوں سے یہ کرتی تھیں گلا
عمر بھر کی جنگ آزادی کا ملتا ہے صلہ

گھر لٹے جاتے تھے لیکن جشن تھا بازار میں
سر پہ رکھ کر مالنیں لائیں گلوں کے ہار میں

ناتواں بوڑھے، جواں سولی پہ لٹکائے گئے
اور برہنہ عورتوں کے ناچ دکھلائے گئے

گود میں ماں باپ کی بیٹوں کے سر کٹوا دیئے
یوں منایا جشن آزادی کے گھر لٹوا دیئے

بے کفن بے گور مُردوں کا نہ تھا کوئی شمار
روند کر لاشوں کو پہنچے کرسیوں تک عہدہ دار

•

آ چکا ہے اب مگر فکر و نظر میں انقلاب
اب ہمیں بہلا نہیں سکتے ہیں یہ موہوم خواب

ابر گوہر بار سے برسے گا پانی زہر کا
بھیک محتاجوں سے اب مانگے گا حاکم شہر کا

برف کے تودے سمندر میں جلائے جائیں گے
بجلیاں چن چن کے خس خانے بنائے جائیں گے

آندھیوں کی گود میں طوفاں سلائے جائیں گے
برق کے دامن پہ گل بوٹے بنائے جائیں گے

پھول کی پتی دبوچے گی گلا شمشیر کا
کام موجوں سے لیا جائے گا اب زنجیر کا

•

مور کی مانند ہیں گو ناتواں، لاچار ہم
ہے دماغ افلاک پر مہر سلیماں کی قسم

کوئی دن گزرے تو بس سرحد کا جوانِ ارجمند
بحر و بر کیا ہیں ستاروں پر بھی ڈالے گا کمند

منظور عارف

یادگار[1]

یہ وہ مقام ہے جہاں
فرنگیوں کے راج میں چلیں سلگتی گولیاں
یہ وہ مقام ہے جہاں
بہادر و غیور و حرّیت پسند نوجواں
مشین گن کی باڑھ کے مقابلے میں ڈٹ گئے
خوشی خوشی گلے سے موت کے لپٹ لپٹ گئے
یہ وہ مقام ہے جہاں
فرنگیوں کے حکم کی اڑیں فضا میں دھجیاں
وہ نوجواں جو تصرِ بے کسی میں تھے پڑے ہوئے
فرنگیوں کے راج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے

[1] بازار قصہ خوانی پشاور کا وہ تاریخی مقام جہاں انگریز سامراج نے ۱۹۳۰ء میں گولی چلائی تھی ان کی یاد میں یہ یادگار تعمیر کی گئی ہے۔

فرنگیوں کا راج اِک عذاب ایک ظلم تھا
فرنگیوں کا راج اِک گناہ ایک جرم تھا
فرنگیوں کے راج میں سند وابھی ہر روز زندگی
فرنگیوں کے راج میں نہ موت تھی نہ زندگی

یہ وہ مقام ہے جہاں
شہید ہو گئے کئی وطن پرست نوجواں

شہید ۔ تیرگی میں روشنی کی اِک لکیر ہے
شہید ۔۔۔ راہِ زندگی میں کارواں کا میر ہے
شہید ساری قوم کا ہے اِک گروہ کا نہیں
وہ سر دیا جو شان کا نہیں شکوہ کا نہیں
شہید کے لہو سے قوم کامیاب وسرخرو
شہید کے لہو سے گلشنِ وطن میں رنگ و بو

ادب! کہ یہ وطن کے سرکشوں کی یادگار ہے
یہ سرفروش انقلابیوں کی یادگار ہے

●

خاطر غزنوی

یادگاریں

۲۳-اپریل ۱۹۳۰ء صوبہ سرحد کی تاریخ آزادی میں ایک ناقابل فراموش دن ہے اس دن انگریز سامراج نے محبانِ آزادی کو اپنی پوری قوت سے کچلنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سینکڑوں نوجوانوں کا خون قصہ خوانی بازار میں ندی نالوں کی طرح بہا ان شہیدانِ آزادی کی یادگار قائم کرتے وقت کانگرس اور مسلم لیگ میں بڑی جھڑپ ہوئی اور آخر دونوں جماعتوں نے الگ الگ سرخ اور سبز یادگاریں بنائیں۔ جو اب تک قائم ہیں ان دو رنگی یادگاروں سے متاثر ہو کر اس نظم کی تخلیق ہوئی ہے (ادارہ)

ہم نے آزادئ وطن کے لئے — سب سے پہلا قدم اٹھایا تھا
اور اس جرم ناسزا کے عوض — اپنے سینے پہ زخم کھایا تھا
قصہ خوانی میں گھومنے والو — تم یہاں آکے بٹ سے جاتے ہو
گھول کر زہر اپنی نظروں میں — اپنے مقصد سے ہٹ سے جلتے ہو
درمیاں ان کے تم تعصب کی — ایک دیوار چنتے جاتے ہو
اپنے روپہلے کارناموں پر — اک سیہ جال بنتے جاتے ہو

جان دی ہم نے جس یقیں کے لئے
اس کو دونیم کر دیا تم نے
سبز اور سرخ یادگاروں میں
ہم کو تقسیم کر دیا تم نے

احمد فراز

لختئے[۱]

ادھ کٹے بالوں پہ افشاں کے ستارے لرزاں
سرد و بے جان سے چہرے پہ تھرکتی آنکھیں
گُدرے گالوں پہ غازے کی تہیں ہانپتی ہیں
جیسے مرگھٹ میں چراغوں کی لویں کانپتی ہیں

ٹوٹتے جسم میں لہرانے کی ناکام اُمنگ
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی سبک رفتاری
کسی سوکھی ہوئی ٹہنی کا جھکاؤ جیسے
خشک ہوتی ہوئی ندی کا بہاؤ جیسے

رقص کرتی ہوئی پشواز پہ باہوں کی اُڑان
یا کسی جھیل میں کنکر کے گرا دینے سے
بادباں جس طرح گرداب میں چکراتے ہیں
چند لمحوں کے لئے دائرے لہراتے ہیں

گرد آلود سے ماتھے پہ پسینے کی نمی
جھنجھناتے ہوئے ہر گام پہ پیلے گھنگرو
رہگزاروں سے عرق پھوٹ رہا ہو جیسے
دور اک شیش محل ٹوٹ رہا ہو جیسے

زندگی بال فشاں جان بلب خاک بہ رخ
منجمد ساکن و حیران ہیولے کی طرح
چند تانبے کے تراشے ہوئے سکوں کے عوض
ڈھول کی تھاپ پہ رقصاں ہے بگولے کی طرح

●

۱ سرحد کے رقاص لڑکے جنہیں پٹھانوں کی مجلسی زندگی میں بہت بڑا دخل ہے +

اختر ہوشیارپوری

دہکتی چٹانیں

ہم نے ہر دور میں شمعوں کو جلائے رکھا
تیرہ و تار زمانوں کو کبھی راہ نہ دی
وقت کے تند تھپیڑے بھی لپکتے آئے
اپنے کہساروں کو لیکن کوئی جنبش نہ ہوئی

ہم کو کیا کیا نہ زمانے نے دکھائے غمزے
اپنا سر جھک نہ سکا پھر بھی خداؤں کے حضور
بارہا پاؤں میں آئے ہیں سر و کاہکشاں
اپنی ہمت کا مگر بڑھتا گیا ناز و غرور

اپنی سنگین و سیہ غاروں میں پلتی ہے وہ زیست
آج تک موت بھی جس کو کبھی لرزا نہ سکی
ہم کو عشوہ گرِ تہذیب بھی بہکا نہ سکا
اپنی پتھریلی زمینوں میں لچک آ نہ سکی

ہم زمانے پہ جھپٹتے ہیں عقابوں کی طرح
انقلابوں کی جبیں نور فشاں ہے ہم سے
کوہ آثار عزائم کی ہمیں ہیں تغییر
عظمت و سطوتِ آدم کا نشاں ہے ہم سے

اپنے کاشانوں سے ہم جب بھی نکل کر آئے
اونچے ایوانوں پہ اک برق سی لہرائی ہے
مے و مینا کے ہمیں گیت سنانے والو
ہم کو تلواروں کی جھنکار ہی راس آئی ہے

کچھ ہمیں جانتے ہیں زیست کے ہنگاموں میں
کس طرح قوم کی تشکیل ہُوا کرتی ہے
کس طرح وقت کے تاریک شبستاں کی فضا
مہر کی کرنوں میں تبدیل ہُوا کرتی ہے

اب بھی چاہیں تو بدل سکتے ہیں تقدیرِ جہاں
رنگ بپھرے ہوئے طوفاں کا دکھا سکتے ہیں
سبزہ و لالہ و ریحاں کا ہے کیا ذکر کہ ہم
تپتے صحراؤں سے خورشید اُگا سکتے ہیں

★

مجید شاہد

تقاضے

اے کشورِ سرحد کے زبوں حال خداوند
ہر حال میں ہر رنگ میں اکثر تہہِ افلاک
ہے تیرا جنوں اب بھی اُن اقدار پہ حاوی
اقوام نے شدت سے کیا تھا جنہیں محسوس
ہیں تیرے مقاصد ہی مشیت کے ارادے
جذبات کی تسخیر سے ہوتے ہیں ہویدا
ہے ظلم اگر جوہرِ کردار کے باذمت
کب مصلحتِ وقت کو ہوگا یہ گوارا
اے بخیہ گرِ سینۂ کونین خبر ہے
طبقات کی تقسیم میں الجھا ہے زمانہ
ہر قیدِ ضوابط سے نکل تیری نظر میں
کر وقت سے بیباک تقاضے کہ ہمیشہ
اپنے نفسِ گرم سے تعمیرِ جہاں کر
سب کہنہ و فرسودہ دساتیر بدل ڈال

کیوں آج ہے تو اپنے زمانے سے بہت دور
مہر و مہ و انجم نے تجھے دیکھا ہے مسرور
جو گردشِ حالات کے زنداں میں ہیں محصور
فطرت نے تیری اب بھی ان اوصاف سے معمور
لیکن تو ہے اس راز کے اظہار سے معذور
وہ راز کہ سینوں میں ہیں صدیوں سے جو مستور
احساس ترا ازمعیشت سے رہے چور
ہو تیری نظر میں کوئی مختار نہ مجبور
باقی ہیں ابھی جسم میں انسان کے ناسور
کیا تجھ کو عناصر کی یہ ترتیب ہے منظور
جچتا ہی نہیں مجلسِ اقوام کا منشور
آزادیٔ افکار رہا ہے تیرا دستور
ہر دور کے معمار ہوا کرتے ہیں مزدور
تاریخ کہے گی تجھے پیغمبرِ جمہور

★

رشیدہ اختر

کروٹ

خیبر کی سنگلاخ چٹانوں کا افسانہ جاگ اٹھا ہے
ہر فرزانہ جاگ اٹھا ہے ہر دیوانہ جاگ اٹھا ہے

عقل کی افیوں تم نے پلا کر جس سے بیداری چھینی تھی
جانے کیسے کروٹ لے کر وہ دیوانہ جاگ اٹھا ہے

شمع بجھا کر تم نے جس کو موت کے اندھیارے سونپے تھے
ایک نئی پھر جوت جگانے کو پروانہ جاگ اٹھا ہے

شہروں کی آباد فضائیں سو بھی جائیں تو کیا ہوگا
اب تو صحرا صحرا، ویرانہ ویرانہ جاگ اٹھا ہے

کس کس کی آنکھوں میں اب تم نیند کا یہ افسوں پھونکو گے
ہر سو بیداری پھیلی ہے سارا زمانہ جاگ اٹھا ہے

★

فرید عرش

کروٹ

جن کو صدیوں بہکائے رکھا دنیا نے جاگ اٹھے ہیں
بھولی بھٹکی دنیا کو وہ راہ دکھانے جاگ اٹھے ہیں
ان سے کوئی کیا اُلجھے گا حالات کسی کے بس میں نہیں ہیں
سونے والے اے غمِ دوراں تیرے بہانے جاگ اٹھے ہیں
اُونچے محلوں میں رہنے والے فرزانو دیکھ رہے ہو
دُنیا کا دستور بدلنے کو دیوانے جاگ اٹھے ہیں
سرحد کے آزاد منش مزدوروں ناداروں کو مژدہ
بوڑھے وقت کی شریانوں میں سرخ زمانے جاگ اٹھے ہیں
سوچتے کیا ہو پھونکوں سے گل کر دو عرشؔ پرانی شمعیں
ایک نئی لو پہ جل مرنے کو پروانے جاگ اٹھے ہیں

★

محسن احسان

یادگار[1]

نہیں اسے تم یہاں گراؤ

یہ اونچے گنبد سنہرے مینار سالہا سال سے کھڑے ہیں

ہماری تاریخ کے کئی زرنگار ادوار اس عمارت سے منسلک ہیں

ہے یہ عمارت ہمارے آقاؤں کی نشانی

وہ اجنبی حکمراں کہ جن کے طفیل ہم نے ہمارے آبا نے علم و تہذیب کی درخشندہ شعلوں سے

کیا ہے اپنے سیاہ خانوں کو نور افشاں

"کہ ہم تو سرحد کے رہنے والے پٹھان تھے جنگلی تھے وحشی تھے غیر تہذیب یافتہ تھے"

ہمارا پیشہ تھا رات دن جنگ اور پیکار

کہ ہم تو ناحق "سفید لوگوں" کو جان سے مار ڈالتے تھے

[1] یادگار وہ عمارت ہے جسے لارڈ ہیسٹنگز نے تعمیر کرایا تھا

ہمیں غلط فہمیاں تھیں ہم سے وہ چھین لیں گے"

ہماری آزادیاں، ہمارے بلند ٹیلے، فراخ میداں، جواں نغمے

وہ اجنبی حکمراں کہ جن کی عنایتوں نے

ہمارے ذہنوں کو بربریت کے تند جذبوں سے پاک کر کے

ہمارے سرکش سروں کو آداب کے سلیقے سکھا دیئے ہیں

مگر یہ کیا بعض سر پھرے لوگ کہہ رہے ہیں

کہ یہ عمارت یہ اونچے گنبد سنہرے مینار توڑ ڈالو

کہ یہ عمارت ہمارے آزاد پرکھوں اور ہمارے لغزوں پہ ہنس رہی ہے

ہماری تاریخ کا تمسخر اڑا رہی ہے

کہ یہ عمارت ہے یادگار اُن سیاہ و ناپاک ساعتوں کی

وہ ساعتیں جبکہ ایک مار سپید نے صرف اپنی تفریح کے بہانے

ہمارے سینوں، ہمارے ذہنوں، ہمارے جذبوں پہ زہر کی مہر ثبت کر دی

اسے ہٹا دو! اسے گرا دو!!

امین راحت چغتائی

ابدی شعلے

پتھریلے پہاڑوں کے انساں اب عالمِ امکاں لے لیں گے
لہرا کے بہاریں آئیں گی اور رنگِ گلستاں بدلیں گے
اوہام کے اندھیاروں میں ہمیں الجھاتے رہے جو مدت تک
اب وقت کی بے آوازی ہی، وہ دشمنِ ایماں بدلیں گے
اے رہبرو، اے دادگرو، اے چارہ گرو، اے غمخوارو
تم درد بڑھاتے رہتے ہو، ہم درد کا درماں بدلیں گے
جس جشنِ بہاراں پر دنیا انساں کی عظمت کھو بیٹھی
ہم خشک چٹانوں کے باسی وہ جشنِ بہاراں منا لیں گے

جب محفلِ رنداں چاہتی ہو، ہر راگ نیا، ہر ساز نیا
پیرانِ طریقت بدلیں گے، یارانِ غزلخواں بدلیں گے

حالات بدلتے رہتے ہیں، قانون بدلتے رہتے ہیں
اِس دور کی ہر شے بدلی ہے، اِس دور کے یزداں بدلیں گے

لو چھٹنے لگے غم کے بادل، لو کھلنے لگیں دل کی کلیاں
اب سُرخ بہاریں آئیں گی، اب زیست کے عنواں بدلیں گے

جو کُٹیاؤں میں بھی چمکے وہ مہرِ منوّر لائیں گے
محدود رہے جو ایواں تک وہ ماہ درخشاں بدلیں گے

ادراک قدم چومے جن کے، وہ دیوانے ہیں دیوانے
ہم سرکش اور ازلی باغی اب عالمِ امکاں بدلیں گے

تعمیرِ جہاں کی کیا ہو گی، تخریب نہ ہو جب تک لاحت
تخریب عمل پیرا ہو گی، تعمیر کے ساماں بدلیں گے

ادبیات سرحد

محمد اجمل خٹک پشتو زبان کا ایک بلند پایہ ادیب ہے - اور پشتو ادب کے ہر شعبے پر پوری طرح حاوی نظر آتا ہے - وہ غیر معمولی تخلیقی قوتوں کا مالک ہے - اور حیرت انگیز طور پر پشتو کے عظیم فن کاروں کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا ہے - اس کے باوجود وہ انانیت اور بیجا نام و نمود کی ہوس سے کوسوں دور ہے - زیر نظر مقالے میں اصولی طور پر اس کا ذکر بار بار آنا چاہیئے تھا - اگرچہ اس نے خود ستائی کے خیال سے اپنے آپ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے - لیکن اس مقالے کی جامعیت اور تاریخی اہمیت سے قارئین مصنف کی فنی عظمت اور علمی استعداد کا بخوبی اندازہ لگا سکیں گے

(ادارہ)

محمد اجمل خٹک

پشتو ادب

کسی زبان کے ادب کی تاریخ پر بحث کرنے سے پہلے اس کے تاریخی پس منظر سے پوری واقفیت ضروری ہے۔ چنانچہ جب تک پشتو زبان کی تاریخ پر روشنی نہ ڈالی جائے پشتو ادب کے بارے میں کچھ لکھنا بے معنی ہے۔ اس لئے میں پشتو ادب کے مختلف ادوار اصناف، ارتقا اور انحطاط پر کچھ لکھنے سے پہلے پشتو زبان کی تاریخ پر اپنے مطالعے اور تحقیق کا نچوڑ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ پشتو زبان بھی پٹھان قوم کی تاریخ اور دوسری باتوں کی طرح اختلافی نظریوں کی بھول بھلیوں میں الجھی ہوئی ہے لیکن موجودہ دور کی تاریخی ترقی اور مستشرقین اور غیر ملکی سیاحوں کی کاوشوں اور پرانے کتبوں اور آثار سے جواب تک دستیاب ہو سکے ہیں انسان ایک نتیجے پر پہنچ سکتا ہے اور جہاں تک میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پٹھان اس آریائی قوم کی ایک شاخ ہے۔ جو تین ہزار قبل مسیح، بلخ، بخارا اور دریائے آمو کے گرد و پیش میں آباد تھے۔ اور پشتو ان ہی لوگوں کی زبان ہے۔ اور اس کے ثبوت میں کئی مستشرقین کے وہ اقوال موجود ہیں۔ جو انہوں نے کافی تدقیق و تحقیق کے بعد لکھے ہیں۔

۱- پروفیسر کلیپر تھ (Kalepoth) لکھتا ہے: "پشتو زبان جسے چند لوگوں نے سامی زبان کہا ہے میرے نزدیک خالص انڈو آرین زبان ہے، کیونکہ نہ الفاظ نہ لغات اور نہ ہی گرامر کے لحاظ سے اس کا سامی زبانوں سے کوئی تعلق ہے۔"

۲- پروفیسر ڈورن (Dorn.) کی ایک کتاب ۱۸۴۷ء میں پیٹرز برگ سے شائع ہوئی۔ اس میں لکھا ہے:-
"پشتو تراکیب، الفاظ، گرامر میں کسی لحاظ سے بھی عبرانی سے کسی قسم کی مشابہت نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ آریائی زبان کی ایک شاخ ہے۔"

۳- مشہور مورخ الفنسٹن لکھتا ہے:-
"میں نے ۲۱۸ کلمات میں چھان بین اور تحقیق کی، تو معلوم ہوا کہ ایک لفظ بھی سامی زبان کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا۔ البتہ پانچ فی صد الفاظ کردی زبان سے تعلق رکھتے ہیں اور کردی زبان انڈو آرین زبان ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ پشتو بھی (انڈو آرین) زبان ہے۔"

۴- مسٹر راورٹی پشتو زبان کا مشہور عالم تھا۔ اس نے پشتو زبان میں جہاں اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ ایک پشتو گرامر بھی لکھی ہے۔ جو ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی، وہ اس کتاب کے مقدمے میں لکھتا ہے۔ "پشتو اور ژند اور پہلوی زبانوں میں بہت قربت ہے پشتو کی پرانی کتابوں میں ژند کی طرح حروف حرکات طور پر استعمال ہوتے ہیں چنانچہ میں کہتا ہوں کہ پشتو زبان سنسکرت اور ژند سے بہت قریب ہے"

۵- ایک اور مستشرق اور محقق ہنری والٹر بلیو (Henry walter Bleu. نے بھی پشتو کی گرامر لکھی ہے یہ پشتو زبان کی اصلیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے "میں اپنی انتہائی تحقیق و تدقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پشتو زبان سنسکرت کی بہن ہے۔"

۶- ایک اور یورپین محقق جیمز ڈارمسٹر جس نے ۱۸۸۹ء میں "ہار و بہار" کے نام سے قومی ترانوں پر مشتمل ایک پشتو کتاب شائع کی، لکھتا ہے: "یہ زبان ژند یا ایسی زبان جو ژند سے بہت قریب ہے، سے مشابہت رکھتی ہے۔"

۷- ڈاکٹر ٹرمپ نے [illegible]ء میں ایک پشتو گرامر لکھی، وہ پشتو کی تاریخ کے بارے میں یوں لکھتا ہے: "میں وثوق سے کہتا ہوں کہ پشتو زبان مغربی زبانوں سے

نہیں نکلی ۔ بلکہ یہ انڈو آرین زبان ہے "
۸ ۔ ڈاکٹر ولیم ہنری (فرانس) لکھتا ہے کہ پشتو ایک طرف سنسکرت اور دوسری طرف اوستا سے قریب ہے ۔ اور پھر آگے لکھتا ہے ۔ کہ اس قربت کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ زبانیں یعنی پشتو، سنسکرت اور اوستا آریائی زبان کی تقسیم سے پہلے ایک چیز تھیں ۔
۹ ۔ ایک اور بہت بڑے محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر جی اے گریرسن نے ہندوستان کی زبانوں پر ایک ضخیم کتاب (LINGUISTIC SURVEY OF INDIA) لکھی ہے، اس نے اس کتاب کی دسویں جلد میں پشتو کے متعلق نہایت تحقیقی بحث کی ہے ۔
" پہلے بعض لوگ اس زبان کا عبرانی سے رشتہ جوڑتے تھے ۔ لیکن اب ثابت ہو چکا ہے ۔ کہ یہ خالص آریائی زبان ہے "
یہ ان مغربی علماء مستشرقین کے نظریے ہیں ۔ اور اس میں کسی قسم کے شبے کی گنجائش نہیں کہ انیسویں صدی سے یورپ کے محققین نے مشرقی تاریخ کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں ۔ اور نہایت دماغ سوزی اور کاوش سے مصر قدیم کے خطوط، ایران کے پرانے کتبے اور چین، ہندوستان کی پرانی تحریریں پڑھی ہیں ۔ بہت سی مردہ زبانوں کا کھوج لگایا ہے ۔ اور ان پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں ۔ اور ان فراموش شدہ زبانوں کے پڑھنے اور تحقیق کرنے کے لئے اصول اور قواعد وضع کئے، ان مستشرقین میں سے مندرجہ بالا چند ایسے محقق ہیں جو صرف آریائی قوم کی زبانوں اور تمدن کی تحقیق کرتے رہے ۔ انہوں نے آریائی اور ہندوستان اور ایران کی پرانی زبانوں کو سیکھا، ان میں پوری دسترس حاصل کی ۔ اور پھر تحقیقات کے لئے کمربستہ ہوئے ۔ چنانچہ انہوں نے پشتو کے بارے میں نہایت کاوش اور تلاش کے بعد جو نظریے قائم کئے ان میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ پشتو آریائی زبان ہے ۔ لیکن بحث کی اہمیت کے پیش نظر صرف یہی کافی نہیں ۔ بلکہ وہ تاریخی شواہد بھی ضروری ہیں ۔

جو اس گروہ کے نظریئے کو اور پختہ کرتے ہیں۔

اس میں تو کوئی شک نہیں، کہ پرانے زمانے کی تاریخ کتبوں۔ قدیمی آثار۔ سیاحت ناموں یا اسی طرح کے اور ذریعوں ہی سے کچھ معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں بھی انہی ذریعوں سے پشتو زبان کی تاریخ حاصل کرنا ہوگی۔ پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آج تک دریافت شدہ کتابوں، قدیم آثار۔ یا سیاحت ناموں میں پٹھان یا پشتو کا ذکر کہیں آیا ہے یا نہیں۔ اور اگر کہیں ذکر ہے تو کس زمانے تک۔ ہمیں اس قوم اور زبان کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہی وسائل ملتے ہیں

۱۔ وید ۲۔ اوستا ۳۔ ہیروڈوٹس کا جغرافیہ ۴۔ سکائی لاکس کا سیاحت نامہ

۵۔ بطلیموس

۱۔ وید۔ قدیم آریوں کی مذہبی کتاب ہے۔ جو بعض مورخوں کے نزدیک ۱۹۰۰ قبل مسیح اور بعض کے خیال میں ۱۴۰۰ قبل مسیح میں لکھی گئی تھی۔ کہتے ہیں جب آریا اپنی اصلی سرزمین آرینا ویجہ سے ہجرت کرنے کے بعد نکلے تو باختر میں آکر دم لیا۔ یہاں انہوں نے ایک بہترین تمدن کی بنا ڈالی۔ اور پھر یہاں سے کچھ دریائے سندھ کے کنارے جا کر آباد ہوگئے۔ اور کچھ ایران کی طرف چلے گئے۔ چنانچہ ان تین گروہوں سے جو گروہ ہندوستان کی طرف آیا۔ وید ان ہی کی مسلمہ مذہبی کتاب ہے۔ اس میں پشتون کا ذکر کچھ اس طرح آیا ہے

کہتے ہیں۔ کہ جب آریا خیبر پہنچے، تو یہاں کچھ مدت کے بعد ان میں ایک لڑائی چھڑ گئی۔ اس لڑائی میں آریوں کے دس قبیلے شامل تھے۔ جن کے یہ نام بتلائے گئے ہیں

(۱) پکہت (۲) الینا (۳) بھالا نا (۴) شیوا (۵) ولیشانن (۶) انو (۷) دلوحیو (۸) توروا شا (۹) یادو (۱۰) پورو (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۱ ص ۸۲)

ماہرین لسانیات کا خیال ہے۔ کہ ان میں سے پہلا قبیلہ پکہت (PUKHT) بدلتی ہوئی دنیا اور زبان کے ساتھ ساتھ پخت اور پھر پختون کی صورت اختیار کر گیا (یہ خیال رہے کہ پشتو کا حرف "ش" "خ" سرحد کے مختلف علاقوں میں

بہ تغیر لہجہ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ "پختون و پشتون" نہ صرف ہم معنی ہیں بلکہ ایک ہی لفظ کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں)

(ب) ایک مشہور انگریزی محقق رالف ٹی ایچ گرفتھ نے وید کی دو جلدوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ "پکہت" کا ذکر ان مقامات پر لایا ہے

جلد دوم ص ۱۰۱ جلد دوم ص ۱۵۲ جلد دوم ص ۲۶۰ جلد دوم ص ۴۶۵

(ج) پشتو ادبیات کی تاریخ ص ۲۸-۲۹ میں جناب حبیبی نے وید سے کئی ایک ایسے فقرے نقل کئے ہیں جن میں پکہت کا ذکر قوم اور بادشاہ کی حیثیت سے آیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پکہت کے نام سے وید سے بہت پہلے بھی ایک قبیلہ موجود تھا۔

۲ - اوستا ۔ یہ کتاب بھی آریوں کے اس گروہ کی ہے جو بخدیا باختر میں متمدن تھے۔ جو ۱۰۰۰ ق م میں لکھی گئی ہے۔ اس میں بخد کا لفظ کئی جگہ آریاؤں کے وطن کے ایک حصہ کے لئے استعمال ہوا ہے، ماہر لسانیات اور مورخین کہتے ہیں کہ یہی پکہت ہے جو بخد، بخت، (پلیبت) اور پشت اور بعد میں پښتو اور پښتون (پشتون) ہو گیا، جیسا کہ بعد میں ذکر کیا جائے گا۔ زبانوں کے لب و لہجہ اور تلفظ کے قانون کے ماتحت پښت پکہت، اور بخت بدلے جا سکتے ہیں۔

۳ - سنہ ۴۸۴ ق م میں یونان کے ایک مشہور مورخ ہیروڈوٹس نے اپنے جغرافیئے میں پختون کا ذکر پکتویس کے اور پختونخواہ (علاقہ پشتون) کا ذکر پکتیکا کے نام سے کیا ہے اس لئے یہ بھی کہا ہے کہ یہ پکتیکا کا علاقہ انڈس (سندھ) کے اس کنارے پر واقع ہے۔ اور اس علاقے کے رہنے والے نہایت جفاکش اور بہادر ہیں یہ پوست پہنتے ہیں۔ تیر، کمان، اور چھرے استعمال کرتے ہیں۔ اور ان کے رہن سہن کا طریقہ باختریوں کی طرح ہے۔

۴ - یونان کا ایک اور سیاح امیر البحر سکائی لارکس جو سنہ ۵۲۱ء - ۴۸۶ ق م کی بحیرہ عرب کی ساحلی معلومات کے لئے مامور ہوا تھا۔ یہ کاسپیتروس (کابل) کے

رستے سے پکتیکا بختونخواہ) اور پھر انڈس کو گیا، اور وہاں سے کشتی میں دریا کے
رستے بحیرہ عرب پہنچا۔

(جغرافیہ ہیرو ڈوٹ ۹۰ - ۱۰۲۸۱ صفحہ
میکالے کی تاریخ ہیروڈوٹس جلد اول صفحہ ۲۰۸ جلد دوم صفحہ ۱۵
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد اول صفحہ ۱۵۰)

۵۔ یونان کے مشہور جغرافیہ دان بطلیموس نے بھی اپنے جغرافیہ میں کہا ہے۔ کہ پکتیین،
پاره دیا میزار (پامیر) کے جنوب کی طرف ہے۔ اور یہ جگہ پکتیانوں کا مسکن ہے۔
(تاریخ افغانستان جلد اول صفحہ ۹۲۰)

چنانچہ معلوم ہوا کہ پکہت، اوستا؛ بخد ہیروڈوٹس کا پکتویس اور پکتیکا سکائی لارنس
کا پکتیکا اور بطلیموس کا پکتیین، اور پکتیان تمام الفاظ اسی علاقے کے لئے جنہیں ہم پختونخوا
کہتے ہیں استعمال ہوئے ہیں یا یہاں کے رہنے والی قوم کے لئے اور آریاؤں کی ایک شاخ کے
لئے استعمال ہوئے ہیں۔ اور یہ تمام مورخین اس امر پہ متفق ہیں۔ کہ موجودہ لفظ پختون
اور پختونخواہ وہی پرانے وقتوں کا پکہت۔ بخد، پکتیوس، پکتیین اور پکتیان ہیں، زمانے
اور زمان کی تبدیلی کے ساتھ موجودہ صورت اختیار کر گئے۔ جیسا کہ زمانے کے انقلابات
دوسری باتوں پر اثر کرتے ہیں۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ زبانوں پر اثرانداز
ہوتے ہیں، اور زبان تو آب وہوا، ماحول، جغرافیئے اور گردو پیش کی زبانوں سے بہت
حد تک متاثر ہوتی ہیں۔ لہذا اگر بید کا پکہت، یا حسن میں اوستا کی زبان کا بخد ہوا ہو یا یونانیوں
نے اسے پکتیوس یا پکتیین کہا ہے، تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ بھی ہے
کہ یہ سب سے بدلتی ہے۔ جیسا کہ آج کل بھی فارسی میں شب اور پشتو میں شپہ فارسی
میں بہ اور پشتو میں پہ فارسی میں سبک اور پشتو میں سپک

۲۔ ک یا کھ ۔ خ سے بدلتی ہے، جیسا کہ سنسکرت مکھ۔ پشتو مخ یا فارسی
گلاہ اور پشتو خلئی یا سنسکرت کھادل اور پشتو خوړل (کھانا)

۳۔ خ ش سے بدلتی ہے جیسا کہ شہر سے "ښهر" (خار) یا لشکر سے لښکر (لخکر)

۴۔ ذ۔ ت ۔ ز سے بدلتی ہے۔ مثلاً زیادہ کی پشتو زیات، برباد کی پشتو بربات اسی طرح وید کا پکہت پخت، پشت، اوستا کا پخد، پخت، یا پشت ہے۔ اسی طرح وید کے پکہت کو یونان کے جغرافیہ دان اور مورخوں نے پکتین یا پکتیولیس لکھا ہے۔ اور یہ تغیر یونانی زبان، لہجہ اور تلفظ کی وجہ سے ہے، اور یہ بات یورپ کے تمام علماء اور مستشرقین مانتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر لاسن (L O S S O N) جس نے یونانی باختری بادشاہوں کی تاریخ لکھی ہے، نے لکھا ہے، کہ یونانیوں کا پکتیولیس موجودہ پشتون ہے۔ اور بعد میں اسی طرح دوسرے مستشرقین مثلاً ٹرومپ اور گریرسن نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ اور اب یہ تمام مورخین وید کے پکہت اور یونانی مورخوں کے پکتیولیس ہی کو پختون سمجھتے ہیں (بارٹولڈ کا تاریخی جغرافیہ اور ادب کی تاریخ صفحہ ۱۴۲)

اگر میں اپنی معلومات اور اقتباسات کو مناسب ترتیب دینے میں ناکامیاب نہیں ہوا۔ تو مجھے کہنے دیجئے کہ ہم یہاں تک تو پہنچ گئے۔ کہ پختون کا لفظ وہی وید اوستا اور یونانی علماء کا کہا ہوا لفظ ہے۔ اور اس تاریخی بحث کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نام کا ایک قبیلہ سنہ ۱۴۰۰ ق م میں جبکہ وید لکھی جا رہی تھی، موجود تھا، اور پھر سنہ ۱۱۰۰ ق م میں بھی موجود تھا۔ اور اسی طرح ہیروڈوٹس کے زمانے میں سنہ ۴۸۴ ق م میں یہ پختون پکتین کے نام سے مشہور تھا۔ اور سکائی لارکس نے بھی جو سنہ ۵۲۱ ۔ ۴۸۶ ق م میں دریائے سندھ کے کنارے پر آیا تھا، یہاں اس نے پکتیکا یا پختو نخواہ کو پایا اور اسی طرح بطلیموس نے بھی پختون یا پختو نخواہ کو پکتین یا پکتیان کے نام سے موسوم کیا۔ آج جسے ہم پختون کہتے ہیں، یہ وہی آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے کا پکت ہے۔ اور پھر اسی پکت، پخت یا پشتون قوم کی ایک زبان ضرور تھی جو کہ اسی مناسبت سے پشتو کہلائی گئی ہے۔ اور جیسا کہ پشتون نام اور قوم وید اور اوستا کے زمانے کا ہے۔ اسی طرح پشتو بھی اتنی ہی پرانی زبان ہے، اور جیسا کہ قاعدہ ہے۔ کہ قوم کے نام کے بعد واؤ مجہول لگا کر قوم کی زبان بنا دیتے ہیں۔ جیسے ہندکی سے ہندکو، پارس سے پارسو اسی طرح پکہت سے پکہتو ہی۔

اس سلسلے میں مورخین کا کہنا ہے۔ کہ آریا اپنے اصلی وطن "آریا ویجا" سے بخت یا باختر

کوکے گئے اور یہاں آباد ہوگئے اور جب کچھ عرصہ بعد اس جگہ کو بھی ناکافی پایا تو وہاں سے کچھ قبائل ایران کی طرف چلے گئے۔ کچھ سندھ کے میدانوں میں آکر آباد ہوگئے اور کچھ قبیلے باختر اور بلخ کے گرد و نواح میں رہنے لگے۔ جب تک یہ ایک رہے۔ ان کی زبان بھی ایک ہی تھی، جو آریک کہلاتی تھی۔ اور جب یہ تین حصوں میں تقسیم ہوگئے، تو لازمی طور پر ان کی زبانوں پر مختلف آب و ہوا کا اور جغرافیائی اثر ہوا اور اسی طرح زبان بھی تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ جو ایران کی طرف چلے گئے، تو ان کی زبان اوستا، پرانی فارسی اور پھر بعد میں موجودہ فارسی ہوئی۔ اور جو سندھ کی طرف آگئے ان کی زبان سنسکرت اور ہندی ہوگئی، اور جو لوگ بلخ یا باختر کے گرد و نواح میں رہنے لگے، تو ان کی زبان پشتو ہوگئی۔

تاریخی اسناد سے تو یہ ثابت ہوچکا کہ پشتون قوم تقریباً چار ہزار سالہ قدیمی قوم ہے اور اسی طرح پشتو زبان بھی، لیکن مزید ثبوت کے طور پر اب ہم پشتو اور دوسری آریائی زبانوں کے درمیان قرب تلاش کریں گے۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ پشتو اسی خاندان کی ایک رکن ہے۔

ا۔ پہلے مندرجہ ذیل جدول سے پشتو، سنسکرت اور پرانی فارسی کی ہم آہنگی ملاحظہ ہو:۔

اردو	پشتو	سنسکرت	اوستا	فارسی
چمڑا	سرمن (څرمن)	چرمن	چرمن	چرم
رات	شپہ	شپ	شپ	شب
تانت	ژئ	جیسا	جیسا	زہ
انگارہ	انگار	انگار	۔	انگار
سُسر	سخر	سوسور	ہوسور	خسر
زمین	زمکہ	جاکہ	زیم	زمین
زبان	ژبہ	جوا	۔	زبان

فارسی	اوستا	سنسکرت	پشتو	اردو
ستارہ	ستوریہ	ستارہ	ستورے	ستارے
شاخ	-	شاکھ	بناخ (شاخ)	شاخ
آب	آپہ	آپ	اوبہ	پانی
گندم	-	گودم	غنم	گندم
رخ	-	مکھ	مخ	چہرہ
سفید	سپتا	سپیت	سپین	سفید
میش	میشی	میش	میشر	بھیڑ
نو	نوا	نو	نوی	نیا
کوہ	گیری	گیرہ	غر	پہاڑ
-	گرم	گھرما	غرما	دوپہر
درخت	دن	دن	ونہ	درخت

۲- ابتدا۔ ساکن۔ پشتو زبان کی یہ خصوصیت سنسکرت میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ خصوصیت آریائی زبانوں کی ہے مثلاً پشتو (شپہ) سنسکرت (شپہ)

۳- اعداد و شمار۔ اعداد و شمار کے لئے پشتو، سنسکرت اور اوستا میں جواب ر ہیں۔ ان میں بھی کافی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً

فارسی	اوستا	سنسکرت	پشتو	اردو
یک	ایوہ	ایکم	یو	ایک
دو	دوہ	دوا	دوہ	
سہ	تھری	تری	درے	
چہار	چتور	چتوار	صلور	
پنج	پنچہ	پانترچہ	پنزہ	

اردو	پشتو	سنسکرت	اوستا	فارسی
چھ	شپږ (شپگ)	شپش	شوش	شش
سات	اووہ	سپتہ	ہپتہ	ہفت
آٹھ	اتہ	اشتا	ہشت	ہشت
نو	نہ	ناوا	نو	نہ
دس	لس	داشا	دسا	دہ
بیس	شل	ولشتی	ویستی	بیست
تیس	دیرش	تیرلشت	تیرلیت	سی
چالیس	څلویشت	چتوارلیت	چتورلش	چہل
پچاس	پنځوس	پنچاشت	پنچاست	پنجاہ
ساٹھ	شپیتہ	ششتی	شوستی	شصت
ستر	اویہ	سپتی	ہپتائتی	ہفتاد
اسی	اتیہ	اشیتی	اشتائتی	ہشتاد
نوے	نوی	نوتی	نواتی	نود
سو	سل	شتسا	ستا	صد

اسی طرح ان کے علاوہ اعداد مثلاً گیارہ، بارہ وغیرہ سنسکرت، اوستا اور پشتو میں ایک ہی طرح بنتے ہیں۔ اور وہ یوں کہ پہلے اکائی اور پھر دہائی، مثلاً ایک، یو — گیارہ (ایک اور دس) یولس، بارہ (دو اور دس) دوہ لس، اسی طرح سنسکرت میں گیارہ کے لئے "ایکہ داشا" اور بارہ کے لئے "دوا داشا" اسی طرح اوستا میں گیارہ "ایوہ دسا" بارہ کے لئے "دوہ دسا" وعلیٰ ہذالقیاس — اور اسی طرح کئی باتیں پشتو گرامر اور زبان میں ہیں۔ جو سنسکرت اور اوستا سے ملتی جلتی ہیں۔

مندرجہ بالا دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ پختون آج سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے بھی علاقے میں آباد تھے۔ چنانچہ ان کی کوئی نہ کوئی زبان بھی ضرور تھی، اور جیسا

کہ بتایا جاچکا ہے، کہ یہی پشتو ان کی زبان تھی۔ اس لئے یہ بات بھی ضروری ہے۔ کہ اس قوم اور اس زبان کا ادب بھی ضرور اتنا نیا نہ ہوگا۔ جتنا نظر آتا ہے۔ اور چونکہ شعر و ادب انسان کی طبعی صفات ہیں۔ چنانچہ اگر ہم ایک قوم کے وجود اور اس کی بول چال کی زبان کو تسلیم کریں تو لازمی طور پر اس کے ادب کے وجود سے بھی انکار نہیں کرسکتے۔ اگرچہ آج ہمیں سن ہجری سے پہلے کے پشتو ادب کے متعلق کوئی آثار یا کوئی ایسی نشانی نہیں ملتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سن ہجری سے پہلے پشتو ادب سرے سے تھا ہی نہیں، در اصل ادب تھا، اور ضرور تھا۔ لیکن بدقسمتی سے تاریخ کی نظریں ہجرت سے پہلے کے پشتو ادب تک نہیں پہنچ سکیں ـــ ہوسکتا ہے کہ آج جس قدر معلومات ہمیں میسر ہیں۔ کل ان سے متعلق ہم ایک آدھ قدم اور ادھر جاسکیں جیسا کہ "پٹہ خزانہ" جیسی تاریخی اور کارآمد کتاب کے معلوم ہوجانے سے پہلے ہمارے ادب کی تاریخ تیسری صدی ہجری سے پہلے اندھیرے میں تھی۔ لیکن اس کے دریافت ہوجانے پر پشتو ادب کی پرانی تاریخ کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوگئیں ـــ اسی طرح ممکن ہے کل کوئی اور "پٹہ خزانہ" جیسی کتاب ہمیں مل جائے، اور ہم پشتو ادب کے سلسلے میں ایک جدید تحقیق کا دروازہ کھول سکیں

پشتو ادب کی قدامت ہم اس طرح بھی ثابت کرسکتے ہیں کہ ایک طرف ہم پشتو کے ٹپے کی قدامت، وزن اور لحن پر بحث کریں اور دوسری طرف پشتو کے سب سے پہلی معلوم شدہ نظم کو زیر بحث لائیں۔

ٹپہ:- آریائی زبانوں کی پرانی منظومات کی بنیاد جیسا کہ اوستا، سنسکرت اور پہلوی زبانوں میں ہے۔ سلیبل (ہیجے) کے حساب سے تھی (سلیبل کو پشتو میں "سیلاب" بھی کہتے ہیں) اور قافیہ ضروری نہیں گردانا جاتا تھا، جیسے کہ اب بھی یورپی زبانوں کا قاعدہ ہے۔ اور اس "سلیبل" یا ہیجے کے علم کو (جو علم عروض کی جگہ کام دیتا تھا) "علم چھند" کہا جاتا تھا۔ اور یہ چھند ویدکے علوم میں مشہور علم تھا۔ علامہ ابوریحان البیرونی نے بھی کتاب الہند میں اس کی تشریح کی ہے، ہم جب پشتو کے ملی ادب اور خاص طور پر

ٹپوں کو دیکھتے ہیں۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھند کے اصول پر وضع کئے گئے ہیں علاوہ یہی پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ گیت اس دور سے کہے جا رہے ہیں جب کہ ویدا اور اوستائی زبانوں کی طرح پشتو اپنی علیحدہ حیثیت اختیار کر رہی تھی۔ اور ادبی میدان میں ہاتھ پاؤں پھیلا رہی تھی۔ اور یہ عروضی مماثلت اسی وقت سے اس میں داخل ہوئی ہے۔ اور پشتو ادب کے ملی اوزان اور خاص کر ٹپہ اس وقت کی پیداوار ہے۔

۲۔ پشتو کی سب سے پہلی دریافت شدہ نظم امیر کروڑ کی ہے، اس کا وزن الفاظ اور معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی رواں دواں، مترنم، اور ہر لحاظ سے مکمل نظم ابتدائی چیز نہیں ہو سکتی، بلکہ زبان کے ارتقائی ادوار سے واقف لوگ یہ ماننے پر مجبور ہوں گے۔ کہ وہ مقام جہاں کوئی زبان پہنچ کر اس معیار کی نظم تخلیق کرے تو اس ادب نے کم از کم چھ صدیاں تو ضرور گذاری ہوں گی

امیر کروڑ کی یہ نظم پشتو ادب کی تاریخ میں وہی حیثیت رکھتی ہے، جو اردو ادب میں غالب اور ذوق کے دور کے اشعار کو حاصل ہے۔ اگر ہم اردو نظم کی ابتدا امیر خسرو کے نیم فارسی اشعار سے کریں۔ تو اردو ادب جب غالب اور ذوق کے دور تک پہنچتا ہے تو کم از کم چھ صدیاں گذرتی ہیں۔ اور یہ وہ وقت تھا جب کہ نشر و اشاعت اور ادب نوازی کے ذرائع آج کی نسبت نہایت محدود تھے۔ لیکن اس وقت سے تو یقیناً کہیں زیادہ پیچھے ہوں گے۔ جس وقت کا ذکر ہم پشتو کی اس نظم سے متعلق کرتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ان حالات میں امیر کروڑ سے پہلے پشتو ادب نے پروان چڑھنے میں چھ صدیوں سے بھی زیادہ عرصہ لیا ہوگا۔ بہرحال ہم اتنا تو یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں۔ کہ پشتو ادب سن ہجری سے بہت پہلے کا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتنا پرانا ہے

چونکہ ہمیں اس کے متعلق مکمل تاریخی مواد نہیں مل سکا جس پر ہم ادبی تاریخ کے پیش نظر بحث کر سکیں۔ اس لئے مجبور ہیں کہ پشتو ادب پر بحث کی ابتدا ۱۳۹ھ سے کی جائے۔

زمانے کا یہ دستور ہے۔ کہ ہر نئی پود اپنے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں کوئی نہ

کوئی جدت لاتی ہے، خواہ وہ ترقی پسندانہ ہو یا انحطاطی ۔۔۔ بہرحال تغیر و تبدل اور تجدید و انقلاب کا یہ عمل ہر وقت اور ہر دور میں جاری و ساری رہتا ہے۔ اور یہی اصول پشتو ادب پر بھی حاوی ہو سکتا ہے۔ ہر نئی ادبی تخلیق پہلے سے کچھ نہ کچھ جدید تر کی ہوتی ہے۔ اور پھر اس کا اثر یہاں اس لئے بھی زیادہ ہے کہ پشتون کی تاریخ بیشمار سیاسی انقلابات اور مد و جزر سے آشنا ہے۔ لازمی طور پر اس کا اثر پشتو ادب پر بھی ہوا ہے، اور چاہیئے تو یہ تھا ۔ کہ اس پر اسی روشنی میں مفصل بحث کیجاتی لیکن ایک طرف مقالے کا دامن اور دوسری طرف بحث کی وسعت اور انتشار اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اور ہم مجبور ہیں کہ یہاں تفصیلی بحث کی بجائے اختصار پر اکتفا کریں۔

٨ کافی تحقیق و تدقیق کے بعد پشتو ادب میں ہم سب سے قدیم صنف "ٹپہ"، مصرعہ یا لنڈی کو کہہ سکتے ہیں، اس کے بعد معلوم شدہ زمانے میں امیر کروڑ کی رزمیہ نظم ہے

ٹپہ:۔ اس کے تاریخی پس منظر پر لکھنا بعینہٖ پشتو ادب کی ابتدائی تاریخ پر لکھنے کے مترادف ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ قیاساً ہم اس کے متعلق کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ پشتو ٹپہ اس وقت کی پیداوار ہے۔ جبکہ پشتو زبان اوستا اور سنسکرت کی طرح قدیم آریائی زبان "آریک" سے بن رہی تھی۔ اور پھر اس زبان کے بولنے والوں نے اپنے طبعی جذبات اور احساسات کا ذریعہ اظہار اس زبان کو بنایا۔ ہو سکتا ہے کہ ٹپہ کی ابتدائی شکل ایسی نہ ہو جیسی موجود ہے۔ اور
٩ بعد میں اس کی شکل بدل کر موجودہ رنگ اختیار کر گئی ہو۔ کیونکہ آریائی زبانوں کی قدیم منظومات سنسکرت، اوستا، اور پہلوی زبانوں میں آہنگ (RYTHM ، کی بنیاد پر تھی منظومات کے ٹکڑوں کو آہنگ (RYTHM) کے مطابق ڈھالتے۔ اس میں قافیہ ردیف نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح پشتو ٹپہ بھی قدیم آریائی منظومات کی طرح قدیم آریائی علم عروض "چھند" کے اصولوں پر تخلیق کیا جاتا تھا۔ اور اب بھی اسی اصول پر وضع کیا جاتا ہے۔ یعنی ہر ٹپے کا پہلا مصرعہ ٩ اور دوسرا ١٣ سیلابوں یعنی ہجوں پر وضع کیا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقیقت

قدیم آریائی زبانوں کے ساتھ مماثلت یا قدیمی آریائی علم عروض "چھند" کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ اور یہی ٹپے کے قدیم ہونے کا ثبوت ہے۔

ٹپے کے بعد پشتو کی دوسری قدیم ترین چیز امیر کروڑ سوری کی یہ نظم ہے

زہ یم زمری پہ دی نړئ لہ ما اتل نشتہ　　یہ هند و سند هر او پہ تخار او پہ کابل نشتہ
میں شیر ببر ہوں، دنیا میں میرا کوئی ثانی نہیں　　لہ ما اتل نشتہ، لہ ما اتل نشتہ

ہندوستان، سندھ اور تخار اور کابل میں
کہیں بھی میرا ثانی نہیں میرا کوئی ثانی نہیں

اس نظم کا خالص ملی وزن خالص پشتو لغات سادہ افکار اور عام فہم طرز بیان اور تشبیہوں اور استعاروں سے پاک ہونا۔ اور فخریہ مضمون۔ اس بات کا شاہد ہے کہ پشتو ٹپے کی طرح یہ بھی خالص پشتو کی ایک قدیم صنف ہے۔ اور سلاست اور روانی اس کی مظہر ہے۔ کہ یہ پشتو ادب کی پہلی نظم نہیں، بلکہ یہ ارتقائی دور کی ایک ترقی یافتہ چیز ہے، اور "پشتو" اور "پشتونیت" کے بغیر اس پر اور کوئی اثر نہیں، اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس دور تک پشتو ادب بیرونی اثرات سے بالکل محفوظ تھا۔ پشتو ادب کے ملی اوزان کا یہ دور سنہ ۵۰۰ ہجری تک پہنچتا ہے۔ اس دور میں جو اشعار ہم تک پہنچے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ پشتو ادب اور ملی اوزان نے بیرونی اثرات سے محفوظ رہنے کی بہت کوشش کی ہے۔ لیکن جیسا کہ یہاں کی سرزمین، تہذیب، تمدن اور زبان پر یہ اثر ہونا ناگزیر تھا۔ اسی طرح ادب بھی اس دستبرد سے نہ بچ نہ سکا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف سنہ ۷۲۹ ہجری تک تنگرا اور کلات کے گرد و نواح میں شیخ ملکیار نے اسی ملی وزن پر ایک نظم کہی ہے۔

ترند بہیگی تو نکہ بہیگی خاړی تو غاړی　　زما زړہ کی خوخپل لالی غواړی
دریائے ترنگ بہے جا رہا ہے۔ اس کی موجیں کنارے کنارے آگئیں ہیں۔ میرا دل تو اپنے محبوب کے انتظار میں ہے۔

کہ رود دہ رود دہ د ترنگ دردے　　خاونہ درچ کا زړہ کی مومی زما تپل موده
لے دریا، اے دریائے ترنگ۔ خدا کرے تو سوکھ جائے مجھے اس پار کا محبوب دکھ رہا ہے

یہ تمام الفاظ خالص پشتو اور وزن خالص ملی ہے۔ مفہوم و مضمون وہی سادہ اور عام فہم ہے۔ جو امیر کروڑ کے دور میں تھا۔ احساسات بھی ہجر و فراق کی حد تک محدود ہیں، اور دریائے ترنک کو یہ پیغام بھی معصومانہ انداز میں دیا جا رہا ہے

اور دوسری طرف اس سے پانچ سو سال پہلے ۲۲۳ھ میں ابوہاشم دریائے ہلمن کے کنارے ایک ایسی نظم کہتا ہے۔

زبہ ھم خدو ینا کاندی چہ ئی وبیتا ۔ ۔ ۔ ۔ دخاوند پہ لاس کہ ذر او درسو ئند

اگر آدمی کے پاس مال و دولت آجائے۔ تو اس کی زبان بھی اچھی باتیں کرتی ہے

درھم ژبہ دَ، کہ خوک ژبہ ورکیگی ۔ ۔ ۔ ۔ دوسلحہ کہ خوک پہ کاندی قتا اوند

اگر کوئی سخنور بننا چاہے تو دولت زبان ہے۔ اور اگر کوئی جنگ کرنا چاہے

تو اس کے لئے اسلحہ ہے؟

اس نظم کے وزن پر فارسی اور عربی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ اور زبان میں درہم اور قتال جیسے فارسی اور عربی الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔ صاحب دولت کا غرور ظاہر کرنا اور اس پر تنقید بھی پشتو کے اس دور کی اپنی پیداوار نہیں۔ اور درہم کو زبان اور اسلحہ کے ساتھ تشبیہ دینا بھی نیا قدم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ دور ۱۳۹ھ سے ۴۷۵ھ ایسا ہے۔ کہ ایک طرف بیرونی عوامل اپنے اثرات ڈال رہے ہیں۔ اور دوسری طرف پشتو ادب اس سے بچنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ نئے اثرات بھی قبول کر رہا ہے پہلے پہل یہ اثرات ان لوگوں کی تخلیقات میں نمایاں ہونے لگے جنہوں نے عربی اور فارسی علوم میں مہارت حاصل کی، اور وہ ان زبانوں کے ادب اور دوسرے لوازمات سے آگاہ ہوئے، کہیں انہوں نے ترجمے کئے اور کہیں ان زبانوں کا مضمون اور مفہوم اپنی زبان میں منتقل کیا، اور کہیں اسلامی اور تبلیغی مضامین کو رواج دیا۔ اور اس طرح کسی نے ادبی اصناف کی پیروی شروع کر دی۔ مثلاً ابومحمد ہاشم سروانی جو خود بھی ایک پائے کا عالم اور ادیب تھا۔ اس نے شہر لبست میں تحصیل علم کیا تھا۔ مشہور عربی ادیب ابن خلاد کا شاگرد تھا۔ اور فارسی عربی میں شعر کہتا تھا، مندرجہ بالا نظم اس نے

عربی سے ترجمہ کی، اسی لئے اس کے اشعار پر عربی اوزان، مفہوم اور زبان کا اثر غالب ہے
نیز پشتو ادب پر شاہی درباروں کا بھی بہت بڑا اثر ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ غزنوی بادشاہ فارسی شاعروں اور قصیدہ گوؤں کے منہ لعل و جواہر سے بھرتے رہتے، اور ان کی وجہ سے قصیدوں کا رواج بہت زیادہ ہو گیا۔ اسی کے زیر اثر پشتو ادیبوں نے بھی اپنی صوفیانہ مناجاتی اور سادہ روزی نظموں کے علاوہ مرثیئے اور قصیدے کی طرف بھی توجہ دی، جیسا کہ امیر محمد سوری کی وفات پر اس کے درباری شاعر اسعد سوری نے ۴۲۵ھ ہجری میں مرثیہ کی طرز کا قصیدہ کہا:-

د فلک لہ چارو څه اوکړم کوکار   ز مولی هر گل چه خاندی په بهار

آسمان کے کاموں پر میں کیا شور و غوغا کروں۔ بہار میں جو پھول ہنستا ہے وہ اسے مرجھا دیتا ہے۔

یا

شہاب الدین غوری کے درباری شاعر شکارندوی نے ۵۰۰ھ میں بادشاہ کی مدح یوں کی

د سرلی څلو نکی مالکری سنگارونه   بیا ئی و لونل په غرونه کښی لالونه

بہار کو سنوارنے والے خدا نے پھر سنگار شروع کر دیئے، اور پھر اپنے پہاڑوں پر لال و گوہر بکھیر دیئے

زمکه شوه لاشونه شنه لمنے شے نتوے   طیلسان زمردی دا غوستی غرونه

زمیں، وادیاں اور ڈھلانیں سرسبز ہو گئیں، اور پہاڑوں نے زمردی کپڑے پہن لئے۔

یا

غوریوں کے درباری شاعر تایمنی نے سلطان غیاث الدین غوری کی مدح میں مثنوی کی طرز کا ایک قصیدہ کہا ــ

ن زه غږیږم په صفت د سلطان   چه دی بادار غازی ملک و جهان

آج میں سلطان کی مدح سرائی کرنے لگا ہوں۔ جو جہان کا بادشاہ، غازی اور آقا ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ زبان میں بھی فارسی، عربی اثر کے ماتحت کئی الفاظ داخل ہوگئے۔ اور وزن اور موضوع بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسی طرح علماء اور درباری شاعروں کے ذریعے پشتو ادب میں عربی اور فارسی کا اثر ہونا شروع ہوا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ اثر ایک خاص طبقے تک محدود تھا لیکن درباروں اور علماء کی نشستوں سے دُور چلے جائیں تو شاعر اپنی قدیم اور خالص طرز پر چل رہے ہیں۔ اور ان درباری شاعروں اور علماء کے علاوہ جتنے اشعار ہمیں مل سکے ہیں وہ عروضی طور پر سب کے سب خالص ملی ہیں۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ جوں جوں اسلام کی تبلیغ اور تعلیم زیادہ ہوتی گئی اور عربی کے ساتھ پشتونوں کی عقیدت بڑھنے لگی، ان کی زبان اور موضوع پر اس کا اثر ہوتا گیا۔ پھر بھی ،، قومی عروض، سادگی، عام فہمی، روانی اور سلاست الفاظ اور موضوع دونوں میں اسی طرح بے باکی سے رہے خاص کر بیٹنی نیکہ کی یہ مناجات جو سنہ ۳۰۰ھ میں کہی گئی اور خالص ملی وزن، خالص پشتو الفاظ کیساتھ ساتھ تمام پیچیدگیوں سے پاک اور سادہ ہے

لویہ خدایا لویہ خدایا ستا پہ مینہ کبنی هرځایہ
غرولاړ دی درناوی کبنی پتہ لہ ژوی پہ زاری کبنی
دلتہ دی پہ غرو لمنی زموږ کیږدی دی پکښی پلنی
داد ګړی دی پہ کړی خدایہ
لویہ خدایہ لویہ خدایہ

اے عظیم خدا۔ اے عظیم خدا — تیری محبت میں ہر مقام پر
پہاڑ اپنی مکمل سنجیدگی سے ایستادہ ہیں اور تمام مخلوق عجز و انکسار کے ساتھ
یہاں پہاڑوں کی ڈھلانیں ہیں اور ان میں ہماری وسیع برادریاں ہیں
ان کو وسعت دے
اے عظیم خدا۔ اے عظیم خدا

بیٹ نیکہ کے بعد اس کے بیٹے اسمٰعیل سڑبنی نے سنہ ۴۰۰ھ میں ایک

سندرہ (گیت) لکھا۔

کہ یون شپون دے مخکښ بیلتون دی | لہ کسی غروجی خس بنبیون دی

اگر یہی رفتار رہی تو بس آگے فراق ہے۔ خرشبون کوہ سلیمان سے جا رہا،

کہ ورورہ وروری خو بنبون وروارہ | نہ چہ بیلتون کرے شماوینہ کورہ

اے بھائی اے خرشبون بھائی ۔ تم جو جا رہے ہو ذرا میرا رضا دیکھتے جاؤ

ملکیار غرشین ۔ ۵۸۱ھ ۔ نے شہاب الدین غوری کی معیت میں جب ملتان پر حملہ کیا، تو وہاں اپنے سپاہیوں کو دشمن کے خلاف اکسانے کے لئے یہ پشتو رجز تخلیق کی

ملکیار غرشین نے دہلی ہی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہے

تخبتن موسل دعا | ادس مو یو غل دی
هواد د کابل دی | غازیانو کوری
تخبتن موسل دی

اللہ ہمارے ساتھ ہے | اب یورش ہے
پرایا دیس ہے | لیکن غازیو دیکھو
اللہ ہمارے ساتھ ہے

اسی طرح قطب الدین بختیار نے ۶۳۲ھ میں یہ اشعار خالص قومی طرز پر کہے۔

دیوی زیرہ سوری سوری کرلا | راتہ وگورہ مسلو کی
رونے نے میرے دل کو چھلنی کر دیا ہے | ذرا میری طرف دیکھ اے حسینہ
پہ بیلتون کیں دی اوباسم | لہ خوبدمنہ زیرگی کوکی
تیری جدائی میں میرے درد بھرے دل سے ۔ | چیخیں نکلتی ہیں
راتہ اد گورہ مسلو کی
ذرا میری طرف دیکھ اے حسینہ

یشخ متی (۴۲۳ — ۴۸۸ھ) جس نے "خدائی مینہ" (خدا کی محبت) کے نام سے

ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کی ایک عارفانہ نظم یہ ہے :۔

خاوندہ! خکلے ستا جمال دی   ځکاره نور په نور کمال دی

اے مالک تو نہایت خوبصورت ہے ۔ تیرے کمالات ہر گام پر بکھرے ہوئے ہیں

که ورځ که شپه که پیری کال دی   ستا د قدرت کمکی مثال دی

دن ہے کہ رات ہے صدی ہے یا سال ہے۔ یہ سب تیری قدرت کی ادنٰے مثالیں ہیں

ستا د نور دلو پیو رنړا دی   دلته چه څوک وي تماشا دی

یہ تیرے نور کے اجالے ہیں ۔ یہ سب تماشے

بابا ہوتک (۶۶۱ھ تا ۷۴۰ھ) کا ایک رزمیہ ترانہ ملاحظہ ہو :۔

په سور غویل راته ننداور دی   ډکه په جوپه را ته پیغور دی

په کلی کور راباندې مغل راغئ   هم په غزنی هم په کابل راغئ

کوہ سرخ پر آج جنگ کی آگ بھڑک رہی ہے ۔ لوگو یہ نہایت غیرت کا مقام ہے

گاؤں اور گھروں میں مغل آگئے ہیں ۔ غزنی اور کابل پر بھی انہوں نے

دھاوا بول دیا ہے ۔

چنانچہ ۷۴۹ھ میں شیخ ملکیار کا دور ہے جس کی ایک نظم اس سے پہلے حوالہ کے طور پر آچکی ہے ۔

یہ تو تھے اس معلوم شدہ دور کے شعرا اور ان کے وہ اشعار جو قومی عروض کے مطابق تھے ، اس دور کو ہم ملی اوزان کے دور کے نام سے موسوم کریں گے ۔ یہ دور ۸۰۰ھ تک ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے ، کہ اگرچہ یہ آج ہمارے لئے پشتو ادب کا اوّلین دور ہے ۔ مگر دراصل یہ وہ ابتدائی دور نہیں ، اور نہ ہی خالص ملی اوزان کا وہ دور ہے ۔ جو ہمارے دعوٰں اور تاریخی شواہد کا حاصل ہے ۔ بلکہ یہ ان ملّی اوزان اور خالص پشتو کے دور کی وہ کڑی ہے ۔ جو ہم تک پہنچ سکی ہے ۔ اس دور میں پشتو کے خالص ادب میں فارسی اور عربی کا اثر ہونا شروع ہو چکا تھا ۔ اور پشتو ادب و زبان میں نئی چیزیں داخل ہو چکی تھیں ۔ جیسا کہ ابو ہاشم سروانی کے اشعار کے اوزان بھی ملی نہیں ۔ بلکہ پشتو ادب میں نو وارد ہیں ۔

اسی طرح اسعد سوری، اور شکار ندوئی نے قصیدے کو پشتو میں داخل کیا۔ اور اگرچہ ان کی زبان بالکل خالص ہے، پھر بھی ہاشم غیر شعوری طور پر بدر، ریم اور قتال جیسے الفاظ استعمال کر گیا ہے اور اسعد سوری کے چوالیس بیت اور شکار ندوئی کے پینتالیس ابیات کے قصیدوں میں ایک طرف پشتو زبان کی خالص لغات کا قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔ جو اس لحاظ سے پشتو ادب کے لئے امیر کروڑ کی نظم سے کم اہمیت نہیں رکھتے اور دوسری طرف اسعد سوری کے قصیدے کے مطلع میں فلک اور بہار اور شکار ندوئی کے قصیدے میں طیلسان زمردی اور نیسان مشاطہ جیسے الفاظ اس بات کی غمازی کرتے ہیں۔ کہ اس دور میں پشتو ادب پر بیرونی اثر ہونا شروع ہو چکا تھا۔ لیکن یہ اثر ظاہری طور پر ایک خاص طبقے تک محدود تھا۔ اور خالص ملی اوزان پر بیرونی اثرات اتنے مسلط نہ تھے۔ جتنے بعد کے ادوار میں۔

اسی طرح ان اشعار سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ یہ موضوع عروض کے لحاظ سے سادگی اور لطافت کے حامل ہیں، سادہ افکار عشقیہ ترانے، مناجات، مناظر قدرت کی سادہ عکاسی، اور عام فہم رنگ ان میں جھلکتا ہے۔ اور یہی اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اسے خالص ملی اوزان کا دور کہتے ہیں

ایک ماہر لسانیات نے کہا ہے کہ زبانوں کے ارتقا اور انحطاط کی تاریخ پر سیاسی اور مذہبی ترقی اور تنزل کا پرتو ہوتا ہے

جب ہم ہجری کے بعد کے اس دور کو دیکھتے ہیں۔ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ پشتو ادب یا زبان چاہے وہ پہاڑوں کے مختلف گوشوں تو کیا فولادی قلعوں میں بھی بند ہوتی۔ تو یہ اثر اس پر ضرور ہوتا، کیونکہ اس سے پہلے اسلام یہاں پہنچ چکا تھا۔ اور پشتون قوم نے اسے اپنا لیا تھا۔ چونکہ اسلام کی تعلیم وغیرہ عربی زبان میں ہی تھی۔ اس لئے یہاں کی زبان اور ادب پر عربی کا اثر ناگزیر تھا۔ دوسری طرف طاہری، صفاری اور سامانی شہنشاہوں کے درباروں میں فارسی شاعری اور فارسی شعرا کی قدر دانی کی جاتی تھی اور خاص کر محمود غزنوی نے تو فارسی شعرا کو خوب نوازا چنانچہ اس کا اثر بھی پشتو زبان پر ہوا۔ اور پشتو زبان اور ادب میں بیرونی زبانوں کی خصوصیات

داخل ہونی شروع ہوگئیں۔ جہاں پشتو زبان اور ادب کے دوسرے پہلوؤں پر عربی فارسی کا اثر ہوا وہاں اس اثر کے ماتحت محمود غزنوی کے زمانے میں قاضی سیف اللہ نے کاوش اور محنت سے عربی رسم الخط کو مدنظر رکھ کر پشتو تحریر کے لئے موجودہ رسم الخط وضع کیا۔

پشتو میں بہت سے اصوات تو ایسے تھے جن کے لئے عربی رسم الخط کے مروجہ حروف میں اشکال مل گئیں۔ اس کے علاوہ 'پ' 'ٹ' 'چ' 'ڈ' 'ڑ' 'ژ' 'گ' فارسی رسم الخط سے لئے گئے۔ اور پشتو اور فارسی رسم الخط میں فرق کرنے کے لئے 'ٹ' 'ڈ' اور 'ڑ' کے 'ط' کی جگہ اور گ کے اس کش (ـــ) کی جگہ ان حروف میں ایک دائرہ تھوڑی کا اضافہ کیا گیا۔ اور یہی حروف پشتو رسم الخط میں اس شکل میں رائج کر دیئے گئے ټ - ډ - ړ - ګ' اس کے علاوہ پشتو بول چال میں چند ایسے اصوات تلفظ اور لہجے تھے۔ جن کے لئے نہ تو عربی رسم الخط میں حروفی شکل تھی اور نہ فارسی میں اس کے علاوہ مختلف قبائل کے تلفظ اور لہجے کے فرق کا لحاظ بھی مدنظر تھا۔ قاضی سیف اللہ نے تمام پشتون قبائل کی زبان تلفظ اور لہجے کا مطالعہ کر کے پشتو رسم الخط میں فارسی اور عربی کے علاوہ مندرجہ ذیل حروف کی ایزادی کی ځ - څ - ښ - ږ - ڼ -

اس میں پہلا حرف "زیم" کہلاتا ہے۔ جس کا اصل تلفظ ج اور ز کے درمیان ہے اور بعض اسے ج اور بعض ز کی طرح پڑھتے ہیں مثلاً "ځنګل" کو مروت اور قبائل جنگل اور یوسف زئی زنگل کہیں گے۔ اسی طرح "څ" کو "سیم" کہتے ہیں۔ اس کا تلفظ "چ" اور "س" کے درمیان ہے مگر "چ" اور "س" کے طور پر بھی بعض قبائل اس کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً "څادر" کو چادر بھی کہتے ہیں۔ اور "سادر" بھی۔ "چ" اور "س" کے درمیان ایک اور تلفظ بھی اس کا ہے جو لکھا نہیں جا سکتا۔

قندھاری اور خٹک "ښہر" کو شہر اور لښکر کو لشکر کہتے ہیں۔ یوسف زئی بالترتیب "خار" اور "لخکر" اس کے لئے ش اور خ کے بین بین ایک حرف "ښ" "ښین" وضع کیا گیا جس کو خٹک "ش" اور یوسف زئی "خ" کہتے ہیں۔ اور اگر "پښادر" کو پڑھنا ہو۔ تو خٹک "پېښور" اور یوسف زئی "پیخور" پڑھیں گے۔

"ږ" اس حرف کو وضع کرنے سے تحریر میں تین قسم کی مختلف شکلوں سے چھٹکارا بھی ملا اور رسم الخط کی یگانگت بھی باقی رہی یعنی ایک مفہوم کی ادائیگی کے لیے خیگی، خیشری، او خیجی، (لڑھکتا ہے) تین مختلف شکلیں اور تلفظ ہیں۔ تو اس کی وحدت کے لئے "ږ" حرف وضع کیا گیا۔ تو اب خیږی کو بعض اپنے لہجے کے مطابق خیگی بعض خیشری اور بعض خیجی پڑھیں گے۔

ان چار حروف کے وضع کرنے کے بعد پختو میں ایک خاص 'صوت' کے لئے شکل کی کمی رہی وہ "ڑ" اور "ن" کے بین بین ہے اور پشتو تک مخصوص ہے۔ تو اس کے لئے قاضی سیف اللہ نے "ڼ" حرف وضع کیا۔ جو بعد میں "نړ" کی مرکب صورت میں مستعمل ہوا۔

اس طرح پشتو رسم الخط کے لئے "یے" کے سمیت ۴۳ حروف مقرر ہوئے۔ جو پشتو رسم الخط کی تمام ضروریات کو پورا کرسکتے ہیں۔ البتہ حرکات اور سکنات کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور وہ کمی آج تک پشتو رسم الخط میں بدستور چلی آتی ہے

اس کے بعد جب اسلام کا عروج شروع ہوا، اور مغلوں کی سلطنت کا دور آیا۔ تو اس سیاسی اور مذہبی انقلاب نے پشتو ادب پر یہ اثر کیا۔ کہ ان کے عروض، افکار، زبان ہر شعبے میں عربی اور فارسی داخل ہونے لگی۔ اور اس طرح ایک ایسی ہوا چلی کہ جو شاعر کچھ لکھتا تو اس کی کوشش یہی ہوتی کہ اس نئے رجحان کے زیر اثر لکھے۔ اکبر زمینداوری (۱۵۵۰ء) کے اشعار اور پھر اس کے بعد کا ادب ہمارے اس بیان کی تصدیق کرے گا

د خیل ګمان له حوایه څه وییل کړم   د عشق ویریه تل پټېله بېتول کړم

میں اپنی حیرت کے متعلق کیا کہوں۔ محبت کے مارے جو فریاد میرے منہ سے نکلتی ہے اُسے چھپانے کی کوشش کرتا ہوں۔

ما ملام لکه بورا په ګلو ګشت کړو   اوس به څم په سو ګو د مو فراق د ګل کړم

میں بھنورے کی طرح پھولوں کا طواف کرتا تھا۔ لیکن اب پھولوں کے فراق میں زندگی کاٹنی پڑے گی۔

دغماز لہ مون بہ زہ پہ لمبہ کباب دم   کنخیر بہ دیار بزم گل او مُل کوم

غمّاز کے کلیجے کو شعلوں پر رکھ کر - یار اور گُل و مُل کی محفل اس سے فراموش کر دونگا -

زما دیار د مینے اور پہ زیرہ کبنی بل دے   زہ بہ سر و مال شندم دیدیہ حاصل کرم

میرے دل میں محبوب کی محبت کی آگ بھڑک رہی ہے - اپنا سر و مال لٹا کر اس کی دید حاصل کروں گا

دبیلتون لہ دیرہ ژاریم او بنکے دینے   زہ اکبر پخپل اشناد سر شندل کوم

میری آنکھوں سے جُدائی کے صدمے سے خون بہہ رہا ہے - اے اکبر میں اپنے دوست پر سر قربان کر رہا ہوں

ان اشعار کا وزن ، مضمون اور زبان اور پھر آئندہ دور کے اشعار کا مقابلہ کیا جائے تو صاف انقلاب نظر آتا ہے - اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے - یہ صرف اکبر پر ہی منحصر نہیں - اس کے بعد سب کا یہی حال ہے - اور یہ رنگ نہایت عام ملتا ہے - یہاں سے پشتو ادب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے - اس دور کے اشعار پڑھ کر آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ تمام عربی اور فارسی اوزان کی تقلید میں کہے گئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں سے ایک بھی عربی عروض کے قاعدے پر پورا نہیں اترتا، اور اس لئے نہ تو وہ ملی رنگ ہے اور نہ خالص عربی فارسی اوزان ہیں - تو اس وجہ سے اس دور کو "نصف عروضی اوزانوں کا دور" کہنا چاہیئے - اور سچ تو یہ ہے - کہ پشتو زبان اور پشتو ادب نے جو ادبی یا علمی سرمایہ پیدا کیا ہے یا اسے کچھ معیار ملا ہے وہ اسی دور کا مرہونِ منت ہے - اسی دور نے خوشحال خان خٹک جیسا "پشتو زبان اور ادب کا باپ" پیدا کیا - اور رحمان بابا جیسا میدانِ تصوف کا شہسوار میدان میں آیا - حمید جیسا جزئیات نگار بھی اسی دور کا ستارہ ہے - اور کاظم خان شیدا نے بھی اسی زمانے میں رنگین اور حسین وجمیل اشعار کا گلدستہ دنیا کے سامنے پیش کیا ، علی خان بھی اسی دور کی بہار کا سیلانی تھا - اور حافظ الپوری بھی آئینہ

عبرت لئے اسی دور میں گھومے گھومے پھرا۔ اسی دور نے ہمیں پیر محمد کاکڑ کے پرلطف دیوان سے آشنا کیا اور احمد شاہ ابدالی کے ادبی موتیوں میں حب وطن کی پکار بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ المختصر پشتو ادب کا یہ دور نہایت تاباں تھا۔ اور پشتو ادب میں جو تعمیری الٹ پھیر ہوا وہ اسی دور میں ہوا اس دور کے ادب اور ادبی شخصیتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

لیفِ عروضی اوزانوں کا دور

اس دور کی ابتدا میں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اکبر ایک نغز گو شاعر تھا۔ اکبر شہر زمیندآور کا رہنے والا تھا۔ ۸۰۰ھ کے بعد گذرا ہے، اور اس کے اس بیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی مغلوں سے بیزار تھا

د مغلو تیمور ھسے پہ اور اوسوم ۔ چہ بہ ھیر پہ دے ماتم زمیندا ور کرم

تیمور مغل نے مجھے اتنا تنگ کیا۔ کہ اس ماتم نے مجھ سے زمینداور بھلا دیا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر تیمور کے حملوں کے وقت زندہ تھا۔ اکبر کے بہت کم اشعار زمانے کی دستبرد سے بچ سکے ہیں۔ اکبر کی ایک مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

زہ عاشق یم یار ھم نیز ۔ میں بھی عاشق ہوں۔ اور میرا دوست بھی
نور غم نہ لرو تمیز ۔ اس کے علاوہ ہمیں کچھ بھی نہیں
بو پہ بل عاشقان یو ۔ ایک دوسرے پر عاشق ہیں
ھم پہ خپل عشق صادقان یو ۔ اور اپنے عشق میں صادق ہیں
یو پہ بل پسے رنځوردہ یو ۔ ایک دوسرے کے لئے ہم بیمار ہیں
چہ نژدے نہ یو رنځور یو ۔ کیونکہ ہم جدا ہیں
عشق کہ بندہ دے کہ پلاشے ۔ عشق اچھا ہے کہ برا
پیدا کوے مو خو مولا دے ۔ ہمارے خدا نے پیدا کیا ہے

اس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قابل اور نغز گو شاعر تھا لیکن افسوس اس کے بہت کم اشعار دستیاب ہو سکے ہیں۔ اس کے بعد شیخ عیسٰے اور الف ہوتک مصنف نصیحت نامہ اور بحر الایمان جیسا کہ ان دونوں کتابوں کے نام سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک نصائح سے بھرپور منظوم کتاب ہے اور دوسری دینی تبلیغ پر مبنی ایک مثنوی ہے۔ اس کے بعد ملا مست زمند کا نام آتا ہے۔ مست ایک اچھا عالم فاضل اور محقق تھا۔ نیز ایک مجاہد اور جنگجو شخص تھا۔ اسی نے "سلوک الغزوات" کے نام سے جہاد کے بارے میں اس نے ایک کتاب لکھی۔ جو پشتو کی قدیم کتابوں میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ رباعیات، قصائد اور غزلیات کے نمونے بھی قلمی خط میں پائے گئے ہیں۔ اس کا دور ۹۵۰ھ خیال کیا جاتا ہے اس کا کلام ملاحظہ ہو۔

مستہ ستا یہ قناعت پہ لاس کبن کنج دے ۔۔۔ د دوہ کونو راحت ستا دے غم مہ خورہ

اے مست! جب تجھے قناعت کی دولت حاصل ہے۔ تو کچھ فکر نہ کر
دونوں جہانوں کی خوشی تیری ہو گئی

یوہ شپہ تیرہ پہ حد د کفار بندہ دہ ۔۔۔ کال دسرکہ عبادت پہ خانقاہ کہ

کفار کی سرحد پر لڑتے ہوئے ایک رات گذارنا۔ خانقاہ میں عمر بھر کی عبادت
سے بہتر ہے

مست مست الست اور جہاد کا دیوانہ تھا۔ اسی لئے اس کے اشعار بھی ان ہی جذبات کے آئینہ دار ہیں، مست کے بعد مرزا خان انصاری پشتو ادب کے آسمان پر جلوہ گر ہوا مرزا خان انصاری پشتو کے مشہور شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا پشتو دیوان جو دستیاب ہوا ہے۔ وہ مرزا خان انصاری ہی کا ہے۔ سب سے پہلے پشتو ادب میں جس شخص نے تصوف اور معرفت کے مضامین داخل کئے وہ مرزا خان ہی ہے، وہ یوسف زئی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اور علاقہ تیراہ میں رہتا تھا۔ حالانکہ اب اس علاقے میں یوسف زئی کوئی نہیں۔ لیکن اس کے متعلق روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تیراہ ہی کا تھا۔ اور پیر روخان کا مرید بھی تھا۔ اس کی پیدائش کی

تاریخ کا پتہ تو نہیں چل سکا۔ البتہ وفات کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ ۱۰۷۱ھ میں دکن کی جنگ میں مارا گیا۔ مرزا خان کا سارا دیوان جمال قدرت کے نظاروں، وحدت الوجود کی باریکیوں، معرفت اور تصوف کے موضوعات و رموز سے پُر ہے۔

نمونہ کلام:۔

د وحدت په بازار دا نغے — په هر ځائے کښ د مے مکین دے

اے مخاطب! دنیا بازار وحدت ہے اور ہر جگہ وہ مکین ہے

زه به څه وایم چه څه یم — نیست و هست د واړه په ده یم

میں کیا کہوں کہ کیا ہوں۔ میری ہستی اور نیستی دونوں اسی کے پرتو ہیں

مرزا خان کی وفات کے بعد اس کا شاگرد دولت اللہ ہے وہ بھی اپنے استاد کی طرح ادب کے پیمانے میں تصوف کی مے اور معرفت کی شراب بھرتا ہے۔ اس نے عرفانیات کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔ دولت نے پانچ ہزار اشعار کی کلیات لکھی۔ جس کا ایک قلمی نسخہ پشتو ٹولنہ کابل اور دوسرا برطانیہ کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ دولت بھی اپنے استاد کی طرح تصوف اور معرفت کے میدان کا شہسوار تھا۔ اس کا تمام دیوان عشق حقیقی اور معرفت الٰہی کا آئینہ دار ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصوف کی اس منزل میں تھا۔ جہاں انسان فنا فی اللہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اس مرتبے پر پہنچ کر منصور پر بھی تنقید کرتا ہے۔

که دولت پوشیده حال د چا نه دا تو کړی

د منصور په دود لائق په سر د دار د ی

اگر دولت کے دل کا راز افشا ہو جائے تو وہ منصور کی طرح دار پر کھینچوا دیا جائے

دولت کا نام شیخ دولت اللہ تھا لیکن وہ دولت کے نام سے مشہور تھا۔ وہ قوم کا لوہانی تھا جنہیں "لوانړے" بھی کہا جاتا ہے۔ اور نوحانی یا لوانړے پٹھانوں کا ایک قبیلہ ہے۔ یہ رشید آباد نامی ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۰۰۰ھ کے قریب پیدا ہوا۔ دولت اپنے اشعار کو الہامی اشعار کہتا ہے۔

چه الہام راباندے اوشی کو ینده شم   یو میت هم چه په دوه نشی بے الہام

میں جو کچھ کہتا ہوں وہ الہام ہوتا ہے۔ بغیر الہام کے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔

مرزا خان کی طرح دولت بھی پیر روخان کا مرید تھا

نمونۂ کلام:-

په دوه کونه بادر اوکوره   موجود هیڅ نشته بے خدایه

دونوں جہانوں میں ماسوائے اللہ تعالٰے کے اور کچھ موجود نہیں

دیوه اشنا نښان په کښ لیده شی   په هر گل چه فهم بنه جدا جدا کوم

ایک ہی دوست کی نشانیاں ملتی ہیں۔ جب میں ہر پھول پر علیحدہ علیحدہ غور کرتا ہوں

دخودبینی سترگے ړندے شوے دی   هسے نه چه حق غائب شونا پدید دے

خودبین کی آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں ورنہ حق غایب ہو کر ناپدید نہیں ہوا

دا فقیر دولت یو مست یم - داشنا پر مینه هست یم

په ازل مے شراب څښلی دیوانه یم لا تراوسه

میں فقیر دولت ایک مست ہوں۔ اور دوست کی محبت میں زندہ ہوں۔

اور روز ازل میں نے شراب پی ہے اور آج تک اُس سے مست و دیوانہ ہوں

په ظاهر باطن چه گورے یو سبحان دے   صورتونه ډیر لیده شی جانان یو دے

دراصل ظاہر اور باطن میں ایک ہی سبحان ہے۔ تصاویر بہت سی دکھائی دیتی ہیں اور محبوب ایک ہے۔

جیسا کہ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے، دولت ایک اچھا متصوف شاعر تھا، اور اپنے استاد مرزا خان کی قائم کردہ بنیادوں پر اس نے یہ عمارت تعمیر کی۔ ان دونوں استاد شاگردوں نے پیر روخان کے مسلک پر خوب نام پیدا کیا ہے۔ اور پشتو ادب کے دامن پر خوب گلکاری کی ہے۔ پشتو شاعری جو متصوفانہ تصورات و تخیلات سے بیگانہ

تھی۔ اس کی وجہ سے آشنا ہوئی۔ اسی زمانے میں اخوند درویزہ نے بھی نام پیدا کیا، لیکن اس نے نظم سے زیادہ نثر میں طبع آزمائی کی۔ نثر کے ضمن میں اس کا باقاعدہ ذکر ہوگا، اخوند درویزہ کی صرف ایک مثنوی ہی مل سکی ہے۔ جو پند و نصائح کا مجموعہ ہے۔

اس کے بعد خوشحال خان خٹک ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قلم لئے پشتو ادب کا استقبال کرتا ہے۔ اس زمانے میں پشتو ادب میں تلواروں کی جھنکاریں گھل گئیں۔ سیف و قلم کا دھنی ایک طرف پشتون قوم کی غیرت اور ترقی کا ضامن بن کر تاریخ کے صفحات میں "بڑا خان" کے نام سے لکھا جاتا ہے۔ تو دوسری طرف پشتو زبان اور ادب کے گلستان میں وہ وہ پھول کھلاتا ہے۔ کہ ادب کی تاریخ میں "بابائے پشتو" کا نام پاتا ہے۔ پشتو ادب اس سے پہلے معنی اور موضوع دونوں کے لحاظ سے محدود تھا۔ اور فقط مرزا اور دولت کے طفیل صوفیانہ شاعری اس میں داخل ہوئی خوشحال نے پشتو کو ادب کے ہر راز، افکار اور اصناف سے روشناس کرادیا، چاہے وہ عشقیہ تھی یا اجتماعی۔ رزمیہ شاعری تھی یا بزمیہ، قومی تھی۔ یاد ملی، فلسفہ تھا یا اخلاق۔ خوشحال نے ایک جامع اور کامل استاد کی طرح ہر موضوع اور صنف پر لکھا، اس کے اشعار کے مطالعے کے بعد معلوم ہو جائے گا۔ کہ ایک طرف وہ سیاسی لیڈر کی طرح خوابیدہ قوم کی رگوں میں جوش اور گرمی عمل بھر رہا ہے۔ تو دوسری طرف ایک تجربہ کار حکیم کی طرح حکمت کے نکات بیان کر رہا ہے۔ کہیں وہ ماہر نفسیات بن کر مختلف قبائل اور طبقات کی نفسیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور کہیں ایک مؤرخ کی حیثیت سے تاریخی واقعات کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ کبھی وہ دام محبت میں گرفتار اور جلنے والے سے درد بھرے گیت الاپتا نظر آتا ہے۔ تو کبھی ماہر علم نباتات و حیوانات کی حیثیت سے جانوروں اور پودوں کے خواص بیان کرتا ہے، مختصر یہ کہ خوشحال نے پشتو ادب میں ہر موضوع کو داخل کیا، اور یہی نہیں بلکہ طنز و مزاح اور تنقید جو کہ ادب کے ارتقائی دور کی پیداوار ہوتی ہے۔ خوشحال نے آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے پشتو شاعری میں اس کی بنیاد رکھی۔ کیا

معنی اور کیا موضوع ہر لحاظ سے خوشحال نے پشتو شاعری میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا اور صرف یہی نہیں بلکہ پشتو ادب کو ترقی کے ایسے راستے پر ڈال دیا کہ پشتو کے ادبی مورخوں نے اسے بابائے پشتو کے نام سے یاد کیا۔

جیسا کہ خوشحال کی زندگی کے حالات سے ظاہر ہے وہ ایک زبردست جنگی جرنیل اور تجربہ کار سیاست دان لیڈر تھا ۔ اور پشتون قوم کو متحد اور بیدار کرنے کے لئے اس نے سیاحتیں بھی کیں، خانی کے دور میں سیر و شکار و تفریح اور عیش و عشرت بھی کی، مروجہ علوم میں مہارت تامہ رکھتا تھا ۔ علم باطن یعنی تصوف سے بھی روشناس تھا ۔ اس کے انہی اوصاف کی وجہ سے پشتو ادب کا دامن مالا مال ہو گیا ۔

کہتے ہیں خوشحال خان نے نظم و نثر میں ۲۵۰ کتابیں لکھیں ۔ اس نے ایک ایسے مدرسۂ فکر کی بنا ڈالی جس پر پشتو ادب کو ناز ہے اس کے مختلف اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کہ ئے درست دَ مقو زور راتہ ښکاره کړ   بیا فلک سره کشتی پہ خپل دستور کړم

اگرچہ آسمان نے اپنی پوری طاقت بھی مجھے دکھا دی ہے پھر بھی میں اس کے ساتھ بدستور کشتی لڑتا رہوں گا

مست ہاتھیان خونی زمری بہ زنځیر کیږی   بویہ ماچہ ګمان فلک وتہ تولبور کړم

بدمست ہاتھی اور خونی شیر زنجیروں میں جکڑے جا سکتے ہیں، چاہیئے کہ اب میں بھی آسمان کے ساتھ ٹکر لوں

دَ زمری توری تو پہ لښکر نہ دے   تورے هم کلہ یواځے پہ خپل ګمان شی

شیروں کی بہادری لشکروں کے بل پر نہیں ہوتی، جوانمردی ہمیشہ اکیلے سر پر دکھائی جاتی ہے

که اسمان دزمری پہ خولہ کښی درکا   پہ زمری پہ خولہ کښی ملہ پریږدہ همت

اگر گردش دوران تمہیں شیر کے منہ میں لا ڈالے ۔ تو تو وہاں بھی ہمت نہ ہار

دخوشحال خټک خوشي په هغه وخت شي — چه بولبلا اوشي د توره او د زغره

خوشحال خٹک کے لئے مسرت کے لمحات وہ ہیں جبکہ تلواروں اور زرہوں کی جھنکاریں گونجنے لگیں۔

دا افغان په ننګ م او تړله توره — ننګيالے د زمانے خوشحال خټک يم

میں افغانوں کی غیرت کے لئے کمر بستہ ہو گیا ہوں۔ میں جہان میں غیرت مند خوشحال خٹک ہوں

لا په خوب کښې په لړزه پرپوځي له کټه — چه د چا تر غوږ شوي د توره شرنګ شو

نیند میں بھی ڈر کے مارے پلنگ سے گر گر پڑتا ہے۔ جس کے کانوں میں ایک بار بھی مری تلوار کی جھنکار گونجی ہے

یہ تو تھے چند سیاسی کلام کے نمونے اب آیئے کہ چند اشعار اجتماعی زندگی کے متعلق دیکھیں

کډ توره لري د توري خوان هغه — چه کټل، خوړل، بخښل که خان هغه

جیسے تلوار چلانے کا ڈھنگ آتا ہے وہی جوانمرد کہلاتا ہے۔ جو کما کر کھاتا ہے اور بخشش کرتا ہے خان وہی ہے۔

هر دهغه چه همتناک بوکښتاک شي — د عالم سره خوبن په ذليست وڅراک

مرد وہ ہے جو باہمت اور سخی ہو۔ اور جس کے تعلقات ہر ایک سے اچھے ہوں

چه دروغ تر خوله اوباسي کله خوله ده — چه رښتيا تر خوله اوباسي خوله هغه

جس منہ سے جھوٹ نکلے اسے منہ نہیں کہا جا سکتا۔ جس منہ سے سچ نکلے منہ وہی ہے۔

حیرت فلسفہ اور تصوف کی آخری منزل ہے۔ خوشحال اسے یوں بیان کرتا ہے

حيران يم نه پوهيږم چه زه څه يم څه به شم — له کومه يم راغلے بيا به کوم لوري ته ځم

حیران ہوں نہیں سمجھ سکتا کہ میں کیا ہوں اور کیا ہو جاؤں گا۔ کہاں سے آیا ہوں اور پھر کہاں جاؤں گا

جہان یو کمتورے دے زہ پہ شان د میگی یم
حیران پکښې جلاؤزم لاس دپښې پکښې دم
یہ دنیا ایک کوڑے کی، اور میں ایک چیونٹی کی مثال، حیران ادھر ادھر بھٹک رہا ہوں۔
اور تصوف کی دنیا میں یوں خیال آرائی کرتا ہے
کہ دِسترگے دِھر فان شتہ مبارک گلزار پہ نند ارہ چہ استقلال کړے
اگر تیری آنکھیں معرفت آشنا ہیں۔ تو تجھے گلزار کے نظارے مبارک ہوں۔
گل تہ شہ رنگ و بوئے ورکړے چا شے دلالہ گل چا شے پا تہ لال کړے
پھولوں کو یہ رنگ و بو کس نے بخشی۔ گل لالہ کو سُرخی کس نے دی
حب وطن کے زیر اثر سینکڑوں بلکہ ہزاروں نظمیں خوشحال نے کہیں، جن میں سے چند اقتباس ملاحظہ ہوں۔
بنہ پہ ھند کښې چمبا گل دے تر دا گل د وطن خار بنہ
ہندوستان کے پھولوں میں بہترین موتیا کا پھول ہے۔ لیکن اس پھول سے بھی میرے وطن کے کانٹے اچھے ہیں
پښتنے جونہ دِ زلفے باد تہ نیسی چہ شمال ئے بوئیں راوړی وزتہ
پشتون دوشیزائیں اپنی زلفیں ہوا کے رخ پہ لہرائیں، تاکہ مجھے ان کی خوشبو زنتمبور میں پہنچے
حسن و محبت کے جذبات کو یوں بیان کرتا ہے
دے وا تہ وائی چہ پہ ښکلو نظر وکړہ سترگے چہ پیدا دی خو دیدار لرہ کند
کیوں کہتے ہو حسینوں پہ ڈالوں نہ میں نظر۔ آنکھیں ملی ہیں یار کے دیدار کے لئے
مست یم مے پرست یم رندی کرمہ کرمہ
واوړہ محتسبہ باده خورمہ خورمہ

میں مست ہوں مے پرست ہوں، میں شراب پیتا ہوں، پیتا ہوں، پیتا ہوں
اے محتسب سن، پیتا ہوں، ہاں پیتا ہوں، پیتا ہوں

کہ جنت په عبادت خما موقوف وی   داخو بیه شوه تا لطف وعطا څه شو

اگر تو نے جنت کو عبادت کے صلے میں دینے ہو، تو پھر لطف اور مہربانی کیا ہوئی، یہ تو سوداگری ہوئی۔

اگر خوشحال کے چمن ادب میں سیر کی جائے تو آدمی حیران ہوتا ہے۔ کہ وہ رنگا رنگ پھولوں میں سے کس کس کو انتخاب کرے، ہر طرف پرمعنی اور رنگین پھول کھلے ہوئے ہیں

خوشحال خاں خود اس ادبی بہار کے متعلق کہتا ہے

همیشه به په لغں سے وی د بلبلو   داچه جوړ کړه خوشحال په دنیا باغ

ہمیشہ اس باغ میں بلبلیں چہکتی رہیں گی۔ خوشحال نے جو یہ باغ سخن کھلایا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خوشحال بابا نے ایک قابل قدر جدید رنگ اور خیال کا پشتو ادب میں اضافہ کیا۔ اور پشتو ادب کو ہر لحاظ سے ترقی کی طرف لے گیا،

اسی دور میں پشتو ادب کا ستارہ اپنی پوری تابانیوں پر تھا۔ کیونکہ ایک طرف خوشحال خاں نے پشتو شعر و شاعری میں ادبی، سیاسی، اجتماعی، اخلاقی، فلسفیانہ وطنی، حماسی اور تنقیدی خیالات کو سمو دیا تھا۔ اور دوسری طرف عبدالرحمان بابا عرفانی احساسات سے اشعار کے گلدستے تیار کر رہا تھا

عبدالرحمان بابا

مہمند قبیلے سے تھا۔ اور بہادر کلی کا رہنے والا اس کی زندگی کا بیشتر حصہ عشق و تصوف میں گذرا ہے۔ اور وہ اس حد تک اس میں غرق تھا۔ کہ بغیر اس کے اسے کوئی چیز نظر ہی نہ آتی تھی جیسے کہ وہ خود کہتا ہے

کارخانہ چہ دے دھر لیدہ کیږی　　ھیڅ ئې د عشق سی کار دے نور ځه نشته

یہ زمانے کا کارخانہ - تمام کا تمام عشق ہی عشق ہے اور کچھ نہیں

اور اسی فنافی العشق کے جذبے نے اسے اپنے گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا - وہ ہزارخانی میں رہنے لگا - اسے عشق اور تصوف نے دنیا سے دل برداشتہ کر دیا تھا - فقیری اور درویشی کی زندگی بسر کرتا تھا - اس نے نہ تو اس نے اپنا دیوان خود مرتب کیا ہے اور نہ زندگی کے واقعات ہی لکھے - اس لئے اس کے متعلق کچھ زیادہ تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں - البتہ اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ سنہ ۱۰۵۰ھ اور سنہ ۱۱۲۰ھ کے درمیان زندہ تھا اور پھر ہزارخانی ہی میں وفات پا گیا - عبدالرحمان بابا کا مزار پشاور میں ہے

رحمان بابا نے جو کچھ کہا اس کے بعد لوگوں نے اسے ترتیب دیا - حقیقت تو یہ ہے کہ پشتو ادب میں عبدالرحمان بابا کے دیوان کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی - تمام پشتو خواندہ میں ہر ایک کو عبدالرحمان بابا کے اشعار زبانی یاد ہیں

رحمان بابا کی ساری شاعری عرفانیات، تصوف اور عشق حقیقی کے رموز و اسرار سے پر ہے - اور ساتھ ساتھ اخلاقیات کی تعلیم بھی اس میں موجود ہے - الفاظ کی شستہ تراکیب کی چستی اور روانی اور روزمرہ کے محاورات کے استعمال کی وجہ ہے کہ رحمان بابا کے اشعار اکثر محفلوں میں ضرب الامثال کے طور پر استعمال ہوتے ہیں

نمونہ کلام :-

دا جہان دے رب له عشقه پیدا کړے　　د ھمه وُ مخلوقاتو پلار دے دا

یہ دنیا خدا نے عشق سے پیدا کی - تمام مخلوق کا باپ عشق ہے

زه عاشق یم سی کار دم دے له عشقه　　نه خلیل نه داؤد زے او نه محمد یم

میں عاشق ہوں اور میرا کام صرف عشق ہے، میں نہ خلیل ہوں نہ داؤدزئی

اور نہ جہند

پہ دنیا کښې مخ د یار دے نور څه نشته — هر څه دي دیدار دے نور څه نشته

دنیا میں سوائے رخِ محبوب کے اور کچھ نہیں سب کچھ یار کا دیدار ہے اس کے سوا کچھ نہیں

لکه مړی چې د ژوندیو په میان پروت دی — هسې بیل یم له عالمه په عالم کښې

جیسا مردہ زندوں کے درمیان پڑا ہو، میں بھی اسی طرح اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس دنیا سے جُدا ہوں

مرتبه که ستا د عشق کړم ور څرګنده — ملائک به واړه وائي که بشر وے

اگر میں تمہارے عشق کے مرتبے کا راز کھول دوں تو فرشتے افسوس کرنے لگیں کہ اے کاش ہم انسان ہوتے

سرو په ډیو د ګلو په شیر زړه ګي — هزار زړونه ستا د زلفو په هر ول کښې

سُرخ پھولوں کی طرح تمہاری زلفوں کے ہر ایک خم میں ہزاروں خون آلود دل جھول رہے ہیں

رحمان بابا کے عشق کا فلسفہ یہ ہے کہ وہ محبت میں آہ و فغان نہیں کرتا۔ محبت کے زخموں کے لئے مرہم کا طلبگار نہیں، بلکہ زندگی کو عشق اور محبت کے درد کو لذت تصور کرتا ہے۔ اور یہی رضا کا مرتبہ ہے

خدائی ئے ما و ته ګلونه د جنت کړي — که داغونه م په زړه باندې د غم ښندي

خدا اسے جنت کے پھول بنا دیتا ہے۔ اگر وہ میرے دل پر غم کے داغ بھی رکھ دیتا ہے

شاید درد کښې طبیبانې و رحمان ته — لا به ښه شې که له دې حاله بتر دے

تیرے درد میں طبیب رحمان کو یہ مشورہ دیتے ہیں، کہ اگر تو اس سے بھی بدتر ہوتا تو اچھا تھا۔

تصوّف اور عشق کی باریکیوں کے علاوہ رحمان بابا نے پند و نصائح سے بھرپور

اشعار بھی کہے ہیں

هغه زړه به د طوفانه بے پرواه وی ... چه کښتی غوندی د خلقو بار بردار شی

وہ دل طوفان سے بالکل بے نیاز ہوگا، جو کشتی کی طرح بوجھ اٹھانے لگے

هر ژوندے چه د مړی ده په قبر ورشی ... هومره بس دے نصیحت په دا دنیا

دنیا میں اس سے بڑھ کر اور کوئی نصیحت نہیں کہ ایک زندہ شخص کسی قبر کو دیکھ لے

جب خوشحال خاں اور رحمان بابا پیدا ہوئے تو پشتو ادب کا سر فخر سے اونچا ہوگیا اور ان مشہور اساتذہ نے الگ الگ فکری مدرسوں کی بنیاد ڈالی۔ لطیف استعارات اور رنگین تشبیہات اور دوسرے شعری صنائع بدائع کا استعمال بھی اب ہونے لگا مختلف اصناف بھی اس میں آ داخل ہوئے، یہاں سے پشتو ادب کا ایک ایسا دور شروع ہوا۔ جسے ہم زریں دور کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بعد خوشحال خاں کے خاندان کے شعراء عبدالقادر خان خٹک، اشرف خان ہجری، سکندر خان، صدر خان، جو خوشحال خاں کے بیٹے ہیں۔ مشہور شاعر تھے۔ اشرف خان ہجری باپ کی طرح ۱۰۹۲ ہجری میں مغلوں کے ہاتھوں بیجاپور میں قید ہوا۔ اور دس سال قید میں رہا۔ اس نے بھی خوشحال خاں کی طرح حب وطن اور مغلوں کے جور کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی بہت سے اشعار کہے ہیں۔ اور ایک قابل قدر دیوان جو اب بکھری ہوئی صورت میں ہے، چھوڑا، اس کے چند اشعار یہ ہیں:-

اوس به څه د وطن کا نړی بوټی جاړم ... د رخصت سلام م اوکړه، ترجلا شم

اب وطن کے پتھروں اور گل بوٹوں کو کیا روؤں۔ سلام رخصت کہہ کر اب اس سے جدا ہو رہا ہوں

شورش مکړه له گردون د کشمکشه ... لو مړه کلک گلاهی غی په امنطراب

گردوں کی کشمکش کی وجہ سے شورش مت کرو۔ دام میں تڑپ کر پرندہ

اور زیادہ الجھ جاتا ہے

جاہد نارو زمانے پہ دا دا کړو
پہ خندا کښې زخم د ړکا ندی پړ درد دہ

زمانے نے جسے موقعہ دیا اور وہ مغرور ہو گیا زمانے نے اسے ہی ہنسی ہنسی میں اور دبھرے زخم بھی دے دیئے

عبدالقادر خان خٹک

سنہ ۱۰۶۱ھ میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۱۲۴ھ تک زندہ رہا، ایک اعلیٰ پائے کا شاعر اور ادیب تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے تقریباً ساٹھ کتابیں لکھیں۔ ان میں چند ایک کے نام یہ ہیں :-

(۱) دیوان (۲) گلدستہ (۳) نصیحت نامہ (۴) چہل حدیث (۵) آدم درخانی (۶) یوسف زلیخا (۷) حدیقۂ خٹک

عبدالقادر خان ایک نکتہ سنج شاعر تھا۔ اس نے عشقیہ، صوفیانہ، اخلاقی اور اجتماعی اشعار کہے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کو "خون جگر" سے موسوم کرتا ہے جیسے :-

رنگینہ شعرہم مگنړہ الفاظ
دا دوان تمامہ زړہ د وینو سود دے

میرے رنگین اشعار کو الفاظ نہ سمجھ۔ یہ میرے دل کے خون کی ندی ہے۔

نصیحت نامے سے دو اشعار یہ ہیں :-

کہ سپین او سری ئی پہ کور کښې تل دی
چہ نہ ئی علم نہ ئی عمل دے

بنیادی شتہ آخر پہ خوار شی
بخت بد تر کومہ ورسرہ مل دی

گھر میں چاندی اور سونا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس کے پاس علم اور عمل نہیں تو اس کا انجام خراب ہے۔ قسمت کب تک اس کا ساتھ دے گی۔

حدیقۂ خشک سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

درلیغا لوړ غمو نه لرے شوے له دله — پکښې غم د خپل آشنا دے تل تو تله
شبنم وصل د گل بیا مونده خاموش شو — تر محرومه شی چه شور کاندے بلبله

اے کاش میرے دل سے دوسرے غم نکل جائیں - اور اس میں صرف غم جاناں ہی رہ جائے -
شبنم خاموش تھی اور اس نے پھول کا آغوش پالیا - بلبل نے شور کیا اور محروم رہی -
ہمت اور عمل کا درس اس نے یوں دیا -

ژرنده واهه له څه حاصل کاندی چه گرزی — یو زمان تلا رسے مکره له طلبه

پن چکی تب کچھ حاصل کرتی ہے جب تک گردش میں رہتی ہے - اپنے مقصد سے ایک لحظہ بھی غافل نہ رہ

هغه د توری څخ ئی سور کړه په میدان کښې
هم هغه سړے عزت نې ږدی له نیره ده

جس نے میدان میں تلوار کو خون آلود کیا - وہی میدان جنگ سے سرخرو واپس آتا ہے

"گلدستہ" کا بند ملاحظہ ہو :-

په خوړ ا تمکه کښې کله زراعت شی — د امید تخم هرگز په ضائع مکړه
له بدانو سره خه، بدی له خو شی — دا وینا د هر چا د تره کښی ده
تا مت به د کار مان ورغله دی زدی — د زمان د بلان نښی چا کساه

شور زمین میں کاشت ناممکن ہے - امید کا بیج اس میں ہرگز ضائع نہیں کرنا چاہئے -
بروں کے ساتھ نیکی - نیکوں کے ساتھ برائی کرنے کے برابر ہے - یہ ہر ایک کے لئے واضح بات ہے
آخر کار وہ افسوس کے ساتھ انگلیاں کاٹے گا - جس کے گھر ایک لحظہ

کے لئے بھی کسی بڑے نے قدم رکھا

صدر خان خٹک

اس کی شاعری کا اندازہ کرنے کے لئے صرف یہی شعر کافی ہے جس میں وہ تمام علوم کو عشق کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے

دَ عشق یو سبق کافی دِ   نور دَ کل جہان دَ فتر هیچ

عشق کا ایک درس ہی کافی ہے۔ باقی تمام دنیا کے دفتر بیکار ہیں

صدر خان بھی صاحب دیوان ہے، اور اس کے علاوہ اس نے شیریں فرہاد کا پشتو ترجمہ بھی کیا ہے

خوشحال خان خٹک۔ اس کی اولاد اور رحمان بابا کے بعد پشتو ادب کے آسمان پر ایک اور ستارہ جگمگایا۔ اور وہ تھا عبدالحمید مہمند۔

عبدالحمید بابا

ضلع پشاور کے ایک مشہور گاؤں ماشوگگر کا رہنے والا تھا۔ اور مہمند قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، اس کی شاعری کا دور ۱۱۳۰ھ کے قریب ہے

عبدالحمید بابا صرف شاعر ہی نہ تھا۔ بلکہ ایک عالم اور فاضل بھی تھا، اس نے پشتو شاعری میں نازک خیالی مضمون آفرینی، نازک تشبیہات۔ لطیف استعارات اور دیگر صنائع بدائع وسیع پیمانے پر داخل کئے، اور پشتو ادب میں اس لحاظ سے استادی کا درجہ پایا۔ جس طرح خوشحال خان .... حماسیات۔ اخلاقیات اجتماعیات، ملی جذبات اور دیگر وہ کچھ جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ لایا اور رحمان بابا نے تصوّف اور پند و نصائح کا ایک فکری مدرسہ کھولا۔ اسی طرح حمید بابا نے بھی پشتو میں جذبات نگاری، نازک خیالی اور مضمون آفرینی میں انفرادیت پیدا کی، اور اس نئی طرز کا استاد مشہور ہوا" دَ پشتو ادبیاتو تاریخ" کے مصنف مسٹر صدیق اللّٰہ

رشتین نے اسی مناسبت سے اس کو پشتو کا بیدل اور مسٹر بلیو ایک انگریز مستشرق نے اس کے کلام کی سنجیدگی اور متانت کو دیکھ کر اسے پشتو کا سعدی کہا۔

حمید کے تخیلات کی بلند پروازی اور تشبیہات اور استعارات کی لطافت اور صنائع بدائع نے اس کی شاعری۔ عوام کے معیار سے بہت بلند کر دیا اور یہی وجہ ہے کہ عوام اس کی شاعری کو نہ سمجھ سکے۔ اور اس لئے وہ عوام میں مقبول نہ ہو سکا

عشق و محبت کا موضوع بہت پرانا ہے۔ اور ہر ایک جلائی کے ہاتھوں رو رہا ہے۔ لیکن حمید مہمند نے اس پامال موضوع کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر تنوع پیدا کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے شعرا نہ حسن سے واقف تھے نہ سوز و گداز سے

الٰهی د محبّت سوز و گداز را　　　پہ دِ او رکښ دَ ستی سمندر ساز را

اے خدا مجھے محبت کا سوز و گداز عطا کر۔ اس آگ میں سمندر کی طرح ہمیشہ رہنے والی زندگی دے

چہ دِ نوم پہ غوږ وواؤرم مسی ہ لمبہ شم

هو مره سوز را کښ پیدا کړے زما ربه

جونہی تیرا نام سنوں، ایک شعلہ بن جاؤں۔ اے خدا مجھ میں اتنا سوز پیدا کر دے اور یہ چیز صرف اپنے تک محدود نہیں رکھتا۔ بلکہ اوروں کو بھی یہ سوز حاصل کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

آرزومند دیار دَ درد دَ دوا مشه　　　بیگانه دَ چلو ښځو دره دا مشه

محبوب کے درد کی دوا مت مانگو۔ اپنوں میں اس بیگانگی کو مت لاؤ

اپنے اشعار کے متعلق وہ یوں کہتا ہے

شعر نه دے د خوناب بخما د زړه څمے　　　یا و تلے د ستی دم د خولے له حمیر د دِ

یہ شعر نہیں میرے دل کا خون ہے۔ یا کسی مرتے ہوئے کے منہ سے نکلی ہوئی آخری سانس ہے۔

ایک جگہ محبت کے دیوانوں کے مقام کو حسن کے مقام سے بھی اونچا سمجھتا ہے

ھنګامه د عشق زیاته لا له حسنه ... د مجنون د دړګی اشنا لیلی مشه

عشق کا ہنگامہ حسن سے کہیں زیادہ ہے ۔ مجنوں کے درکا گدا بن جا لیکن لیلے

نہ بن

حمید کی غزل اور غزل میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی دیکھئے ۔

له حیا یا اینه په مخ کښې آب شوه ... په هراق کښې لوزه زیړه د آفتاب شوه

حیا کے سبب تیرے چہرے کے سامنے آئینہ بھی آب آب ہو گیا اور تیری گلی

میں سورج کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا ۔

چه ئي ستا اتش شي په زړه کې ژړی ... څه عجب که د هغو سینه کباب شوه

جب تیرے آتشیں لب دل میں ہوں ۔ کیا عجب ہے کہ سینہ کباب ہو جائے

ستا د غم د ویره ادبه کوچه تل ژاړم ... د حمید خونه په مخکښې د سیلاب شوه

تیرے غم کی وجہ سے میں ہمیشہ روتا ہوں حمید کا گھر آنسوؤں کا سیلاب بہا

لے گیا

چه م یار د خوبه ویخ نکړې م نسیمه ... ګوره اوزه په درد په تلطف

خبردار ! میرے محبوب کو نیند سے مت جگانا ۔ اے باد نسیم ذرا چپکے سے

گذرنا

حمید بابا کی شاعری کا زور تو تب معلوم ہوگا کہ ان کے دیوان "دُرِ مرجان" کا مطالعہ کیا جائے ۔ اور اس کے علاوہ قصہ شاہ و گدا اور مثنوی نیرنگ عشق جیسی ادبی نظموں کو پڑھا جائے ۔ حمید نے ملا غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق کو پشتو میں ڈھالا ہے

الغرض حمید مہمند کی شاعری عوام میں مقبول نہیں یا عوام کے مذاق کا معیار حمید کی شاعری سے پست ہے ، لیکن خواص اور پشتو ادب سے دلچسپی رکھنے والے یہ جانتے ہیں ، کہ حمید رحمان اور خوشحال سے کچھ کم نہ تھا ۔ اگرچہ ہر ایک شاعر انفرادیت کا مالک ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ حمید نے پشتو ادب میں جس نازک خیالی نکتہ سنجی اور بلند

پروازی کو عروج دیا۔ وہ اس سے پہلے پشتو ادب میں نہ تھی۔ لیکن اس کے بعد کاظم خان شیدا نے اس پہلو کی طرف توجہ دی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حمید بابا کا مرتبہ خوشحال یا رحمان سے کم ہے۔ دراصل ہر ایک کا اپنا الگ الگ رنگ ہے جہاں تک پشتو شعر و شاعری میں (IDEALISM) اغراق و مبالغہ، شاعرانہ تلازمات، نادر استعارات لطیف تشبیہات اور ادبی اصطلاحات کا تعلق ہے۔ حمید نے خاص مقام حاصل کیا ہے جسے ہم اپنی طرز کا شاعر ضرور کہیں گے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حمید بابا نے فارسی ادب کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ مغلوں کی وجہ سے ہندوستان میں فارسی شاعری بام عروج پہ پہنچی۔ حمید نے کوشش کی کہ فارسی شاعری کی خصوصیات پشتو میں داخل کرے۔ فارسی اور عربی اثر نے پشتو کی روانی، سلاست اور سادگی اور خاص کر پشتو زبان کو بہت نقصان پہنچایا۔ لیکن موضوع اور معنی کے لحاظ سے پشتو کو کافی فائدہ پہنچایا۔ اور پشتو ادب کو اس وجہ سے کافی ترقی ہوئی۔ خاص کر حمید اور کاظم خان شیدا نے تو پشتو شعر و شاعری کو خوب رنگین بنا دیا۔

کاظم خان شیدا خٹک

حمید بابا نے نازک خیالی اور موشگافی کی جو طرح توڑ ڈالی تھی۔ کاظم خان شیدا نے اسے پروان چڑھایا تخیل کی گہرائی۔ نزاکتِ خیال، تلازمات، رعایات۔ استعارات تشبیہات اور الفاظ کی رنگینی ہر پہلو سے اس نے اپنی قادر الکلامی کا مظاہرہ کیا۔ وہ تخیل کی ان لطیف سرحدوں تک پہنچا۔ جہاں اگر قاری ذوق سے شعر کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے۔ تو وہ لطف حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی شاعری میں سادگی اور عام فہمی کا دخل نہیں۔ ہر شعر و تلازمات تشبیہات، استعارات اور نازک تخیل میں ایسا ڈوبا ہوا ہے کہ کبھی کبھی اس پر معمہ کا گمان ہوتا ہے۔ اس نے پشتو شعر کو معنوی لحاظ سے ایک بہت اونچے مقام تک پہنچایا۔ لیکن زورِ طبیعت استعداد علمی مہارت اور اس سے بھی زیادہ فارسی کے اثر نے اس کے اشعار کو قدرے مغلق بنا دیا۔ اس کے رنگین اور

حد درجہ نازک اشعار نے پشتو ادب کی تاریخ کے مصنف کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا، کہ شیدا کی ہر غزل اور اس کا ہر شعر پریوں کے دیس کی مصوری کرتا ہے، کاظم خاں شیدا خٹک قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اکوڑہ خٹک کا باشندہ تھا۔ افضل خاں کا بیٹا اور خوشحال خاں خٹک کا پوتا تھا۔ ۱۱۲۵ھ میں اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوا۔ اور جوانی ہی میں اپنے چچا اسد اللہ خاں کے ہاتھوں اپنا وطن چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

اس کا ایک نہایت قیمتی قلمی دیوان رہ گیا، جو اب اسلامیہ کالج کی لائبریری اور خان بہادر محمد زماں خان خٹک کی لائبریری میں موجود ہے۔

اس کے دیوان کا بیشتر حصہ درد انگیز ترانوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ درس عبرت بھی اس کی شاعری میں موجود ہے۔ شعری صنائع بدائع اور رنگین الفاظ کے لباس میں تنقید بھی کرتا ہے، میں نے شیدا کے دیوان کا مطالعہ کیا تو اس کی شاعری، مضمون آفرینی اور نازک خیالی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

زغول۔ ہم مکہ نے مصلحت نہ دے   پہ سینہ کبن م نالہ پویکدہ مستورہ

بانسری کی طرح مجھے نالہ و فریاد کرنے پر مجبور نہ کر۔ اگر یہ درد میرے دل ہی میں چھپا رہے تو اچھا ہے

پہ مزار م دکیاہ چناخوندنے شول   لام زیرہ پہ جوش دآہ دفغان پردے

مرے مرقد پر گھاس نے بانسری کی شکل اختیار کر لی ہے، حالانکہ نالہ و فریاد ابھی میرے دل ہی میں ہے

دصحرا پہ لورشمال تہ زلفے پنیسے   چہ سبزہ م د مزار گل وریحان کرے

صحرا کی طرف بادِ شمال کے رخ پر اپنی زلفیں پھیلا دو، کہ میرے مزار کا سبزہ بھی گل ریحاں بن جائے

دزلفینو میاہ ستیٔ وتنے گورہ   یو قدم پہ زمکہ نہ کیږدی بے دوشہ

زلفوں کی یہ مستی ملاحظہ ہو، کہ ایک قدم بھی بغیر دوش کا سہارا لئے نہیں چل سکتیں

شیدا ماته چپله مینه د راز پوشی کړه   په پرده کښ د نغمې په شان رسوا شوم

شیداؔ نے اپنی محبت کو چھپانے کی کوشش کی، لیکن پردے میں نغمے کی طرح رسوا ہو گیا۔

د آفتاب په کمند نه خیژم آسمان ته   نه یم د بار لکه شبنم په دوش د ګلو

آفتاب کی کرنوں کی کمند کے ذریعہ میں آسمان تک بھی نہیں جانا چاہتا اور شبنم کی طرح پھولوں کے دوش پر بوجھ بھی نہیں بننا چاہتا

سوال م خوښ نه دے له ابره افشانه ابره نشمے   صدف ورانه خپله خوله کړه په خوښتلو

میں دراَفشاں بادل سے موتی کی خواہش نہیں کرتا کیونکہ صدف نے بھی ایسا ہی سوال کر کے اپنا منہ تڑوایا

د تنور شعله به آب د فوارے شی   سوه جوشی که ورته یاده د ایام کړم

اگر میں زمانے کی سرد مہری کا ذکر چھیڑ دوں تو تنور کے شعلے بھی پانی کے فواروں کی شکل اختیار کریں

رحمان اور خوشحال کے بعد حمید اور کاظم خان شیداؔ نے پشتو ادب میں جو نئی رُوح پھونکی علی خان خٹک نے بھی ہمنوائی کی۔ اور یہ شاعر ایک طرف اپنے جدِ امجد خوشحال خاں کی طرح حبِ وطن اور اجتماعی اور اخلاقی افکار بیان کرتا ہے اور دوسری طرف تصوف اور عشق کے جذبات کی ترجمانی، اس نے سادگی اور عام فہمی میں رحمان بابا کی پیروی کی۔ باوجودیکہ نازک خیالی، صنائع بدائع، اور تلازماتِ شعری کے بیان کرنے میں وہ حمید اور شیدا سے پیچھے نہیں رہا۔ لیکن اس میں خوبی یہ ہے کہ وہ خالص پشتو الفاظ اور روزمرہ محاورات، ضرب الامثال، اور عام فہم زبان استعمال کرتا ہے پشتو ادب میں خالص پشتو الفاظ کو زندہ رکھنے کی مہم اسی نے شروع کی۔ یہی وجہ ہے کہ رحمان بابا کے بعد پشتون عوام میں علی خان زیادہ مقبول ہے، علی خان۔ کاظم خان شیدا کا بھائی اور خوشحال خان خٹک کا پوتا ہے، وہ ۱۱۳۸ھ تک زندہ رہا باپ کی وفات کے بعد یہ اکوڑہ خٹک میں خٹک قوم کا نواب بنا۔ اس کا دوسرا بھائی

سعد اللہ خاں اس وقت ٹیری کی گدی سنبھالے ہوئے تھا۔ بعد میں خاندانی جھگڑوں نے اسے اکوڑہ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ وہ ہشت نگر تیراہ اور پھر ہندوستان کو چلا گیا۔ اس کے بعد سے وہ آج تک لاپتہ ہے

علی خان کا صاحب دیوان تھا، اور آج کل اس کا دیوان تعلیمی اداروں میں باقاعدہ طور پر منظور ہو چکا ہے

اس مختصر مگر جامع دیوان میں ہر قسم کے افکار سادگی اور شاعرانہ لطافتوں کیساتھ پشتو کے خالص الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں

اس کا عشق کے متعلق یہ نظریہ ہے۔

چہ سودا د محبت کا پہ جہان کښې — د جہان د غم محنت یې اجارہ کړو

جو شخص دنیا میں محبت کا سودا کرتا ہے۔ وہ دنیا کے غموں کا اجارہ لے لیتا ہے۔

که د عشق نه دې پوهنه د ورته وایم — خو څکندن دې تر انجامه تر آغازه

اگر تمہیں عشق کا مطلب نہیں آتا تو سنو یہ آغاز سے انجام تک جان کنی کا سا عالم ہے۔

خټې د عاشق چه ازل آخر ملائکو — غم یې لہ نږدې ہسې راکړو پہ خپرو کښې

روز ازل کو جب عاشق کا مجسمہ تیار کرنے کے لئے فرشتوں نے مٹی اٹھائی تو اس میں بھس کے طور پر غم شامل کر دیا

علی خان کو محبت کی دنیا میں شیخ، محتسب اور ناصح سے بہت کد ہے۔ کہتا ہے۔

ما چه ناصحان لہ خپلہ عشقه اړوی — عشق یه مثال اور دے په پوکو یې سړوی

مجھے ناصح عشق کی راہ سے گمراہ ہونے پر مجبور کر رہے ہیں کتنے سادہ ہیں جلتی ہوئی آگ کو پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کرتے ہیں

شیخ راته تاروه، تاروه وئیل د نصیحت که — لاړم د پوهه د پاسه مالګې دوړه وي

شیخ مجھے ترش ترش نصیحتیں دے رہا ہے۔ کتنا احمق ہے کہ زخموں پر نمک چھڑک رہا ہے

شیخ اور محتسب سے جس قدر اسے کد ہے ساقی سے اتنی
ہی محبت رکھتا ہے

پورته شه ساقي قاضي معزول ملا کافر دی — راکړه پیالې ډکې نه لا داشته نه هغه

اٹھ ساقی قاضی معزول ہو چکا ہے، اور ملا مصروف کار ہے، بھر بھر کر پیالے
دے آج نہ یہ موجود ہے اور نہ وہ

علی خان کا یہ کمال تھا۔ کہ ایک ایسے دور میں جبکہ حمید اور رشید اس قدر استغراق اور گہرائی سے کام لیتے ہیں۔ علی خان اس قدر سادہ اور عام فہم طرز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ سادگی اور سلاست کے ساتھ فن کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

پشتو ادب نے جہاں علاقہ خٹک کی سنگلاخ سرزمین میں رشید اور علی خان جیسے فن کار پیش کئے، اور پشاور میں حمید جیسا موشگاف، سحر بیان شاعر پیدا کیا، وہاں سنہ ۱۱۲۲ھ میں یونس جیسے جمیل بھی پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام نور محمد خان تھا درہ خیبر کا رہنے والا تھا۔ ایک اچھا عالم اور ادیب، اور رحمان بابا کے سکول سے تعلق رکھتا تھا۔ اور جیسا کہ رحمان بابا تصوف میں ڈوبے ہوئے اشعار میں اندھی دنیا کو پند و نصائح سے مخاطب کرتے تھے۔ اسی طرح یونس نے بھی اس کی پیروی کی ہے لیکن کہیں کہیں رحمان بابا کی نسبت اس کے کلام میں مستی زیادہ ہے

خو به د خلوت تیاره کښې تاسته ایسې زاهده — سترګې خدای درکړې دي بهر شه ورباندې ګوره

اے زاہد کب تک خلوت کے اندھیرے میں رہے گا۔ خدا نے تمہیں آنکھیں دی
ہیں باہر نکل کر حسن کو دیکھو

کله کله به جلوه د دیدن موږ سره — راشه ځان د دلبرانو همسایه کړه

کبھی کبھی جلوہ دیدار سے تو مشرف ہو گے۔ آؤ اور حسینوں کے پڑوسی بن جاؤ

دیونس توبہ پہ مثل دَ دوژے دہ　　چہ هیش دوړے وی پہ بیگا ماتہ

یونس کی توبہ کی مثال روزہ کی ہے ۔ دن گذرتے ہی وہ روزہ توڑ دیتا ہے

مست د میو بہ بیدا شی پہ لیوہ وخت شی　　مست دَ مینے پہ هیچرے بیدا نہ شی

شراب کا مست کسی وقت تو ہوش میں آ ہی جاتا ہے ۔ لیکن مست محبت کبھی ہوش میں نہیں آسکتا ۔

یونس کے اشعار کی سادگی اور عام فہمی کم و بیش اسی طرح ہے جس طرح رحمان بابا کے مسلک کے شعرا کا خاصہ ہے ۔ یونس کے علاوہ خواجہ محمد بنگش قلندر آفریدی اور کامگار خٹک خوشحال اور رحمان کے عصر سے قریب گذرے ہیں ، اور ان کے دیوان موجود ہیں ۔ وہ اپنے عصر کے مشہور شاعر ہیں

جس وقت پختونخواہ کے جنوبی علاقے صوبہ سرحد میں پشتو ادب عروج کے مدارج طے کر رہا تھا ۔ تو اس وقت قندہار اور غزنی کے گرد و نواح میں بھی نامور شعراء اور فاضل ادیب پیدا ہوئے ان میں عبد الرحیم ہوتک کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔ وہ قندھار کا باشندہ تھا ۔ دس سال کی عمر میں اپنے وطن کو چھوڑ کر پچاس سال تک ترکستان میں رہا ۔ سنہ ۱۱۵۰ھ کے قریب وہ زندہ تھا ۔ وہ ایک جید عالم تھا ، اسی وجہ سے اس کے شعر میں علمی رنگ غالب ہے ۔ یہ بھی رحمان بابا کے مسلک کا شاعر تھا ۔ اس نے ۲۰۰ صفحات کا ایک دیوان چھوڑا ہے ، جو اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں موجود ہے ۔ اس کا نمونہ کلام یہ ہے

منبر او سوتیہ اور کبن شی ابادونبکہ　　در تہ وایم نہ خوژ ذیہ دلو آزادم اخلہ

منبر کو آگ لگا دو اور شراب پیو ۔ لیکن دلوں کی آہ مت لو

کہ زاهد ستا سترگے اولیدے پہ ستر گو　　اور بہ درست پہ ټول خانقاہ اوسکوی

اگر زاہد نے ایک دفعہ تمہاری آنکھیں دیکھ لیں ۔ تو وہ ساری خانقاہ کو جلا دے گا

پشتو ادب کی ترقی کے لئے قدرتاً ایسے وسیلے مہیا ہو گئے جس کی وجہ سے اس نے کالے پہاڑوں کی چوٹیاں ۔ وسیع اور خشک میدان ۔ درویشوں کی خانقاہیں

بادشاہوں کے دربار اور محل غرض ہر جگہ پشتو ادب کا جھنڈا لہرایا۔ اگر رحمان بابا نے زود نشی کی گدڑی میں دیوان مرتب کیا۔ تو احمد شاہ ابدالی نے دہلی اور قندھار کے تخت پر بیٹھ کر پشتو ادب کے لعل و گوہر لٹائے، احمد شاہ بابا ۱۱۳۵ھ میں ہرات میں پیدا ہوا اور پھر قندھار اور دہلی کے تخت کا مالک بنا۔ اور اس طرح ایشیا کی تاریخ میں ایک مشہور فاتح اور پشتو تاریخ میں عظیم احمد شاہ بابا کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ خوشحال کی طرح ایک طرف تلوار کا دھنی تھا۔ اس نے تلوار کے زور سے بخارا۔ خراسان۔ قندھار اور دہلی کو فتح کیا۔ لیکن اس کے قلم نے تین ہزار اشعار کا ایک بہترین دیوان بھی بطور یادگار چھوڑا، احمد شاہ بابا نے بہت وسیع پیمانے پر شاعری کی ہے۔ علو ہمتی سے لے کر عشق کی محتاجی اور تعلی سے سوز و گداز تک سب کچھ کہہ گیا۔ یہاں تک کہ تصوف کے میدان میں بھی اس نے قلم کے جوہر دکھائے، اس کا کلام نہایت موثر ہے، تمام صنائع بدائع اور دیگر ادبی اصناف بھی موجود ہیں

احمد شاہ بابا ایک طرف تمام داخلی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسری طرف اجتماعیات اور اخلاقیات کا درس بھی دیتا ہے، اور ملی وحدت پر اشعار بھی کہتا ہے۔ مثلاً

تول یو دی کہ غلجی کہ او درانی بند هغه چه نیئ شینه کزړه صفاوی

تمام ایک ہیں چاہے وہ غلزئی ہیں یا ابدالی، اچھا وہ ہے جس کا آئینۂ دل صاف ہو

نہ افغانیم ونے ترک و تتاریم

چمن زادیم و از یک شاخساریم (اقبال)

پښتانه دِ تول لاس سره یو کاندی چه مونږ غنی ارپو لوری هر خوا له

افغانوں کو متحد ہونا چاہیئے۔ کیونکہ آج ہر طرف جہاد ہے

حماسی اشعار یوں کہتا ہے

په بریښنا د تورو سره ژوند کوه احمد د بری جولان په تورو هسی دبار کړه

تلواروں کی چمک میں ہر وقت مگن رہ۔ اور فتح کے ڈنکے بجاتے جا

حب وطن پر ایک نظم اس کی شاعری کے نمونے کے لئے کافی ہے

دډهلی تخت هیرؤم چه دا یاد کړم   زما دَ ښکلے پښتون خوا دَ غرو سرونه

دہلی کا تخت مجھے بھول جاتا ہے۔ جب اپنے وطن کے پہاڑ یاد آ جاتے ہیں۔

احمد شاہ بابا نے ایک جامع اور کامل دیوان چھوڑا اور ۱۱۸۶ھ میں قندھار میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ بھی شاعر اور ادیب ہوا، وہ بھی صاحب دیوان تھا، احمد شاہ بابا سے کچھ عرصہ پہلے قندھار اور ژوب کی سرزمین نے پیر محمد کاکڑ جیسا نامور شاعر پیدا کیا۔

وہ ایک بہترین ادیب اور شاعر تھا۔ وہ قریباً ۱۱۲۰ھ میں پیدا ہوا اور ۱۱۹۶ھ تک زندہ رہا۔ اس نے ۱۱۹۶ھ میں اپنا دیوان مرتب کیا۔ یہ احمد شاہ بابا کے دربار کا ایک ممتاز رکن اور شہزادہ سلیمان کا اتالیق تھا۔ پیر محمد نے پانچ ہزار اشعار کا ایک دیوان چھوڑا۔ اس کے علاوہ سب سے پہلے پشتو صرف و نحو پر "معرفت الافغانی" نام کی ایک کتاب بھی اس نے تصنیف کی۔ آپ کا دیوان افغانستان میں چھپا ہے۔ لیکن وہ نامکمل ہے۔ اس کا ایک مکمل قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے جو مجھے محمد یوسف خاں آف بھانہ ماڑی نے عطا کیا، اس کے اشعار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے ہم عصر اور پرانے شاعروں کا اس نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد یہ کوشش کی ہے کہ اپنے کلام میں تمام اساتذہ کی خصوصیات کو جمع کر دے۔ چنانچہ وہ اپنی اس کوشش میں کچھ نہ کچھ کامیاب بھی ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے کلام میں ایک طرف تو سادگی، متانت اور سلاست ہے۔ جو رحمان اور خوشحال کی شاعری کا پرتو ہے۔ اور دوسری طرف حمید اور شیدا کی طرح رنگینی، بلند خیالی اور موشگافی کو بھی اس نے نہیں چھوڑا اور ساتھ ساتھ پشتو کے خالص الفاظ روزمرہ اور محاورہ کے التزام کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ اس لئے ہم اسے ایک متبحر شاعر اور قادر الکلام

ادیب کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی شاعری میں کوئی نیا موضوع نہیں لایا لیکن اس کی خصوصیات ہی اس کو اپنے ہمعصروں میں ممتاز کرتی ہیں۔ اس کے اشعار میں عشق و محبت کے جذبات کی فراوانی ہے۔

د فراق په توره شپه کښې لکه شمع   په ځان اور تر صبح دم مکوم
فراق کی سیاہ رات میں شمع کی مانند میں اپنے آپ کو تا سحر جلا رہا ہوں

څائي لرې که فلک توے لکه شبنم شي   چه په څپه م ورته ځي ساړه آهونه
اگر آسمان شبنم کی طرح قطروں کی صورت میں ٹپکنے لگے تو کوئی تعجب نہیں
کیونکہ تمام رات میری سرد آہیں اس تک پہنچتی رہتی ہیں

ما وخیال لره فرش کړي تور لیمه دي   ته بے نیازه قدم دے په زمین ږدے
میں نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں تیرے لئے فرش راہ کر دی ہیں۔ اے
بے پروا تو اس کے باوجود زمین پر پاؤں رکھتا ہے

اسی دور میں سوات کی پھولوں اور نرگس کے کھیتوں والی خوشبوؤں بھری وادی میں بھی ایک منفرد شاعر پیدا ہوا۔ حافظ الپوری کا اصلی نام معظم خان تھا۔ الپوری کا رہنے والا تھا۔ یہ ریاست سوات کے عوز بند کے پاس ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ پشتو ادب میں رحمان بابا کے بعد اس کی شاعری کو عوام و خواص میں قبولیت نصیب ہوئی، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حافظ کے کلام میں پند و موعظت — سلاست، روانی اور عام فہمی بھی ہے۔ اس کے ہاں تشبیہات خالص اپنے ماحول کی، سادہ اور عوام سے متعلق ملتی ہیں۔ وہ نظم میں بھی ایسے رنگ میں اپنے ماحول پر تنقید کرتا ہے — جو عوام کے دلوں میں کھب جاتی ہے۔ اس کے کلام میں مذہبی خیالات کا بہت اثر ہے۔ وہ عربی سے اتنا متاثر ہوا ہے۔ کہ اس کی انفرادیت۔ رواں دواں لہجہ اور لہجے کی مٹھاس آڑے نہ آتی تو اس کو یہ قبول عام ہرگز حاصل نہ ہوتی

حافظ نے طویل بحروں میں نظمیں لکھی ہیں، اور اپنی علمیت اور الفاظ کا

خوب خوب مظاہرہ کیا ہے، پشتو روزمرہ اور محاورات پر بھی اسے پوری قدرت حاصل تھی، اور اسی لئے اس کا کلام نہایت لطیف ہے

قلب د مومن کور رب مُلقّب یہ عرش اللہ دے — زار د آزار چہ یو چہ د زیہ کا یہ بازار بلوشی

قلب مومن عرش الٰہی ہے۔ جو دلوں کو دکھ دیتا ہے وہ عرش کو ہلا دیتا ہے

پہ ځنکدن کښې دِ توبہ رب تہ قبولہ نہ دہ — چہ پہ جہان کښې ئے تمام عمر وا ز نہ سوکنا د نکہ ے

حالت نزع میں توبہ قبول نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی نے زندگی بھر توبہ نہ کی ہو

مہ غولیگہ حافظہ دشمے دھر یہ یارانو — زھر بہ پکښې وی کہ شربت در کړی دګور ے

اے حافظ اس زمانے کے دوستوں پرا عتبار نہ کر۔ وہ تمہیں گڑ کے شربت میں زہر بھی دے سکتے ہیں

اس کے بعد عبد العظیم رانی زئی پیدا ہوا، وہ سوات کے رانی زئی قبیلہ سے تھا۔ سنہ ۱۱۶۰ھ میں پیدا ہوا لیکن اپنے" ترپوروں کے ہاتھوں اسے اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ اور پشاور کے ایک گاؤں "ترہکال" میں بسنے لگا۔ اس نے تحصیل علم بھی یہیں کی وہ ایک صوفی مشرب شاعر تھا۔ اس کا دیوان بھی رحمان بابا کے رنگ میں ہے۔ کبھی کبھی عشق و محبت کے راگ بھی الاپنے لگتا ہے

یاسمین بہ پر زرغون شی بے کلمنتہ — پہ هر ځائے چہ ستا د حسن باران پریوت

جہاں جہاں تیرے حسن کی پھوار پڑے گی وہاں وہاں یاسمین کے پھول کھلنے لگیں گے۔

د شیطان سرہ پښتو کوئے نشی — د ترپور عزیز چہ حق کښې لکہ اور ئے

تم شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن تم اپنے ترپوروں کے لئے آگ سے کم نہیں ہو۔

یہاں تک تو پشتو کے وسطی دور کا ذکر تھا۔ اور مضمون کے اختصار کے پیش نظر کئی ادبی شخصیتوں کا ذکر یہاں نہ آسکا۔ صرف ان ہستیوں کے تذکرے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک تو انفرادیت کے مالک تھے، دوسرے انہوں نے ادب میں انقلاب

پیدا کرنے کی کوشش کی اور پشتو ادب کو نئے نئے تقاضوں سے آشنا کیا۔ اگرچہ اب بھی میرے دل میں یہ بات کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے کہ میں سکندر خان خٹک، شاہ حسین ہوتک، پیر محمد ہوتک، محمد ہوتک، خوشحال خان شہید، افضل خان خٹک، کامگار خٹک، دوست محمد خٹک، مرزا حنان، حافظ رحمت خان، قاسم خان آفریدی، ایدی خان مہمند اور خواجہ رزق اللہ جیسے کئی ایک شعراء کو نظر انداز کر گیا۔

البتہ جدید دور کا ذکر کرنے سے پہلے اس وسطی دور کی شاعرات کا ذکر نہایت ضروری ہے۔

بیبی نازو

سلطان ملخی طوخی کی بیٹی تھی اور ۱۰۶۱ھ میں تازی کے مقام پر پیدا ہوئی اس کا باپ سلطان ملخی غزنی سے جلدک تک کے علاقے کا حکمران تھا۔ نازو نے پشتون عالمہ عورتوں اور کئی علماء و فضلا سے علم حاصل کیا۔ وہ نہایت شجاع اور سخی عورت تھی۔ قافلوں کے قافلے اس کے مسافر خانے میں ٹھہرتے اور مفت قیام و طعام اور لباس پاتے۔ وہ تمام پختونخواہ میں مشہور تھی۔ اس کا باپ جنگ میں مارا گیا اور اس کا بھائی دشمن سے انتقام لینے کے لئے گھر سے نکلا۔ چنانچہ اس کی غیر موجودگی میں نازو نے قلعہ اور شہر کا بندوبست اور حفاظت اپنے ذمہ لی۔ اور دشمن سے اسے محفوظ رکھا، یہ شجاع، عالمہ اور سخی عورت نہایت قابل ادیبہ اور شاعرہ تھی اس نے دو ہزار اشعار کا ایک جامع دیوان چھوڑا ہے۔ یہ مشہور و معروف ادیبہ ایک مشہور ملی قائد میرویس خان کی والدہ تھی۔ اس کے ادبی دیوان اور بلند پایہ اشعار سے ایک رباعی ہی سے اسکے ادبی معیار کا پتہ چل جاتا ہے

سحرګاه وه د نرګس لیمه لانده ‏ ‏ ‏ ‏ څاڅکه څاڅکه له سترګو څڅیده

ما وے څه دی ښکلے ګله ولے ژاړې ‏ ‏ ‏ ‏ ده وې ژوندون دی یو خوله خندیده

صبح نرگس کے رخسار بھیگے ہوئے تھے۔ ایک ایک قطرہ اس کی آنکھوں سے

ٹھیک رہا تھا۔

میں نے کہا اے حسین پھول کیوں رو رہے ہو۔ اس نے کہا میری زندگی چند لمحوں کی ہنسی کے سوا کچھ نہیں

سرزمین خٹک نے جہاں ایسے صاحب سیف و قلم پیدا کئے جن کی تلواروں کی جھنکاریں اب تک کانوں میں گونج رہی ہیں۔ اور جن کے ادبی موتیوں کی چمک اب بھی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے۔ وہاں انہوں نے حافظہ حلیمہ جیسی قابل اور عالمہ بیٹیاں بھی پیدا کیں۔ حافظہ حلیمہ خوشحال خان خٹک کی بیٹی اور عبدالقادر خان خٹک کی سگی بہن تھی۔ "پٹہ خزانہ" کے مصنف محمد ہوتک فرماتے ہیں کہ میرے والد کا کہنا ہے۔ کہ میرے عصر میں حلیمہ زندہ تھی۔ اس نے باپ کی زندگی ہی میں تمام مروجہ علوم حاصل کر لئے تھے۔ اور تحصیل علم کے بعد معرفت کی طالبہ بنی۔ اور شیخ سعدی لاہوری کی مرید بن گئی۔ اس نے اپنے بھائی عبدالقادر خان خٹک کے ہاتھوں پر بیعت کی، کیونکہ وہ شیخ صاحب کا خلیفہ تھا۔ حلیمہ نے تصوف اور طریقت کی بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔ وہ قرآن کی حافظہ بھی تھی۔ اُس نے شادی بالکل نہیں کی

رات دن عبادت میں مصروف رہتی۔ دوسری عورتوں کو درس و تدریس دیتی۔ یہ ایک اچھی ادیبہ اور شاعرہ بھی۔ تصوّف اور معرفت کے رنگ میں کئی اشعار کہے ہیں اپنی علمیت اور ادب میں واقفیت کی وجہ سے شعر میں اچھے صنائع بدائع اور نادر تشبیہات لائی ہے۔ اس کا ایک ایک شعر شرابِ معرفت سے معمور ہے۔ اس بی بی کا مزار اپنے باپ خوشحال خان کے مرقد سے تقریباً بیس پچیس گز جنوب کی طرف اسوڑی (اکوڑہ خٹک) کے تاریخی مقبرے میں ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

دھر چا دتہ چہ گورم دا یہ دے ئے   دَجمال پہ ننداوے ئے شادمان شوم

جدھر دیکھتی ہوں وہی نظر آتا ہے۔ میں اس کے نظارہ جمال سے شادماں ہوں۔

غیر فکر ونه ېرله زړه نه د ابهرشو ‏ ‏ په خلیل او په عدو با ندیکساں شوم

دوسرے تمام افکار میرے ذہن سے نکل گئے ہیں۔ دوست اور دشمن اب میری نظروں میں ایک ہیں

حلیمې دغا زمکه له حده زیات شو ‏ ‏ چه د یېل له یاره نکړه په گمان شم

اے حلیمہ! زمانے کی چالبازیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ کہیں یہ تمہیں اپنے محبوب سے جدا نہ کر دے۔

بی بی نیک بختہ

یہ عورت شیخ اللہ داد محمد زئی کی بیٹی تھی۔ اور ہشت نگر (چارسدہ) میں پیدا ہوئی، اس کا باپ محمد زئیوں کا مرشد تھا۔ یہ بھی عارفہ و عالمہ تھی۔ عبادت اور ریاضت میں تمام عمر بتا دی۔ اس نے ارشاد الفقراء نامی کتاب ۹۶۹ھ میں لکھی محمد ہوتک مصنف "پٹہ خزانہ" نے اس کتاب کے متعلق لکھا ہے۔ کہ وہ اس کے باپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اور اس میں سے کئی ایک اشعار نقل کئے۔ جو مختصر بحر میں پند و نصائح پر مشتمل ایک مثنوی ہے

په زړه بناد اوسه موصینه ‏ ‏ په ظاهر په باطن سپینه

اگر تیرا ظاہر و باطن بے داغ ہے۔ تو اے مومن یہی سب سے بڑی خوشی ہے

ظاهر زهد په اخلاص کړه ‏ ‏ په زړه ټینګ شه له یقینه

ظاہری طور پر زہد کر۔ اور باطن میں اس پر یقین محکم رکھ

ان عارفہ، باعصمت وعفت بی بیوں کے علاوہ میرمن زینب حاجی ویس خان کی بیٹی بھی ایک عابدہ اور شاعرہ گذری ہے۔ اور بی بی زرغنہ جو ملا دین محمد کاکڑ کی بیٹی تھی۔ ایک اچھی فاضلہ ادیبہ تھی۔ اسی نے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک دیوان چھوڑا ہے۔ رابعہ بی بی بھی ایک اچھی شاعرہ گذری ہے۔

پشتو کے اس دور کو ہم ایک روشن دور کہیں تو بالکل بجا ہے۔ کیونکہ یہ دور

پشتو ادب میں جدت اور ہر قسم کا انقلاب پیدا کرتا ہے۔

اس کے بعد پشتو ادب کا ایک ایسا دور آجاتا ہے۔ کہ شاعر ہر قبیلہ اور خطے میں موجود ہیں۔ اور اچھے اچھے صاحب دیوان شعراء بھی ہیں جیسے شاہ زار خان خٹک سردار پردل خان دوست محمد، شیر محمد قندھاری، ولی محمد سواتی، غلام خان خٹک، ملا احمد، میاں حبیب گل امیر علی خان خٹک، محمد زمان خٹک اس وقت جب کہ میں پشتو ادب کی تاریخ مرتب کر رہا ہوں۔ تو سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش مد نظر ہے نیز یہ ادب کی تاریخ ہے، شخصیات کی نہیں، اس لئے میں صرف اس ایک شعر کہنے والے کے ذکر کو ترجیح دوں گا جس نے ادب میں کوئی بات پیدا کی، اور ان ہزاروں اشعار کہنے والوں کو خارج از بحث کر دینے کو برا نہ جانوں گا۔ جنہوں نے محض شعر لکھے۔ اس لئے میں گرامی قارئین سے معافی کا خواستگار ہوں۔

یہاں پشتو ادب کی اس ملی شاعری کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں جسے عوامی شاعری یا اردو کی اصطلاح میں لوک گیت کہتے ہیں۔ لوک گیت جدید شاعری سے یکسر الگ ہوتے ہیں۔ یہ عوامی طبقوں میں بہت زیادہ مقبول اور پشتو ادب اور موسیقی کا اہم جزو ہیں۔ جوان شیر و شکار میں ہوں۔ کسان ہل چلا رہے ہوں، گڈریئے بھیڑیں چرا رہے ہوں۔ بچے گھاس کاٹ رہے ہوں۔ کنواری لڑکیاں چکی چلا رہی ہوں حجروں میں، کھلیانوں پر غرض سرحد کا کوئی علاقہ ہو ہر جگہ یہ عوامی گیت سنائی دیں گے۔ یہ پشتو کے اپنے ملی رجحانات کے ساتھ ایسی موافقت رکھتے ہیں۔ کہ لوگ اسے علمی شاعری سے زیادہ پسند کرتے اور وقعت دیتے ہیں۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ بڑے بڑے گاؤں یا علمی طبقوں کے بغیر کسی مجلس میں بیٹھ جائیے تو چاربیتہ۔ رباعی۔ غزل۔ بدلہ۔ لنڈی۔ نیمکی۔ بھگتی آپ سنیں گے اور پھر خاصکر پشتو کی موسیقی تو جدید رنگ سے بہت کم آشنا ہے۔ یہاں تو اب تک انہیں لوک گیتوں کا دور ہے۔ اور ہم بلا دھڑک کہہ سکتے ہیں۔ کہ پشتو ادب نے اگر ایک طرف فارسی اور عربی سے متاثر ہو کر ایک مرکب (نیم عروضی) شکل کی

شعر و شاعری کو جگہ دی۔ تو دوسری طرف اس نے اپنی ملی شاعری پر بیرونی اثر نہ ہونے دیا۔ اور خالص ملی اوزان، اور اصناف سخن کو اپنی تمام خصوصیات سمیت اس حال میں بھی زندہ رکھا۔ کہ کئی سو سال سے فارسی اس کی سیاسی اور ادبی فضا پر مکمل طور پر مسلط رہی۔ اور آج تک ہم پشتو ادب کے اپنے خاص سندر رول "لوک گیتوں" کو اپنی منفرد صورت میں دیکھتے ہیں۔ اس مقالہ میں لوک گیتوں کے متعلق کچھ زیادہ بحث نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے متعلق مفصل تاریخی معلومات مہیا نہیں ہو سکتیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے گیت ہمیشہ سینہ بہ سینہ چلے آتے رہے۔ کبھی انہیں صفحہ قرطاس پر نہیں لایا گیا۔ چنانچہ ان کے جمع اور یکجا نہ ہونے کی وجہ محض یہی ہے۔ البتہ کہیں کہیں کسی مشہور ٹپاریتہ کے ساتھ ہی اس کے مصنف کا نام بھی زندہ رہ گیا۔ اس روشنی میں لوک گیت کی تاریخ پر ایک علیحدہ مقالہ لکھا جا سکتا ہے لیکن یہاں اسکا محل نہیں ہے۔ اس صنف کے شاعروں میں سے نورالدین۔ ملا مقصود۔ توکل، میرا، کمال بابا، نور دز، محمد دین استاد۔ احمد دین طالب اور رستم بابا بہت مشہور ہیں۔

ادب کا یہ کارواں اسی طرح تیرھویں صدی ہجری تک پہنچ جاتا ہے۔ اس دور میں رومانی اور افسانوی نظموں کا رواج زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس فن میں عبدالعظیم۔ گل احمد ابو علی شاہ، مولوی احمد فیاض احمد جان وغیرہ نے کئی ایک کہانیاں نظم کی ہیں۔ لیکن اس فن کی استادی کا درجہ نعمت اللہ اخون اور سید راحت اللہ زاخیلی کو حاصل ہے۔ نعمت اللہ اخون صرف قصہ گو ہی نہیں بلکہ ایک متبحر عالم اور فاضل ادیب بھی ہے۔ اور اسی لئے پٹھانوں میں اخون اور ملا کے ناموں سے مشہور ہے۔ قصوں اور رومانی افسانوی نظموں کے علاوہ اس کے اشعار کا دیوان بھی ہے۔ اس مقتدر صاحب فن کے بارے میں پشتو ادب کی تاریخ کے مصنف صدیق اللہ خان رشتین نے لکھا ہے کہ وہ پشتو کا مکمل اور زبردست قصہ گو شاعر ہے۔ اور استادی کا درجہ رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ صنف شاعری پہلے سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن مولوی نعمت اللہ نے اسے

اونچے معیار پر پہنچا دیا۔ اور اس نے قصے کہانیوں کے لئے ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ اس لحاظ سے اسے ہم منظوم کہانیوں کا استاد کہتے ہیں۔ اس نے بہت سی رزمیہ اور رومانوی کہانیوں کو منظوم کیا۔ یہ ہر کہانی سے پہلے چند اشعار تشبیب کے طور پر لاتا ہے جس میں ایک ساحرانہ کیف ہوتا ہے گا۔

مولانا صاحب نے مذہب۔ اخلاقیات۔ اجتماعیات۔ آداب مجالس۔ طب اور رومانی افسانوں کی تقریباً ۱۷ کتابیں پشتو مثنوی طرز کی نظم میں لکھی ہیں۔ جو سب کی سب چھپ چکی ہیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل کتابیں میں نے خود دیکھی اور پڑھی ہیں

(۱) قصہ الف لیلے۔ (۲) شاہ نامہ (۳) رفیق الواعظین (۴) تفسیر سورہ ملک (۵) تفسیر سورۂ رحمان (۶) مجموعۂ اکساب (۷) آداب النساء (۸) ریل نامہ (۹) فالنامہ (۱۰) واسع نامہ (۱۱) طب بوعلی سینا (۱۲) خواب نامہ (۱۳) طوطی نامہ (۱۴) سونی مہینوال (۱۵) قصہ چہار درویش (۱۶) قصہ خجستہ مالو (۱۷) ہشت بہشت (۱۸) مقدمہ عاشق معشوق (۱۹) باغ و بہار (۲۰) لیلے مجنوں (۲۱) موسے خاں گل مکئی (۲۲) آدم درخانی (۲۳) رابیا فتح خاں (۲۴) مکر زناں (۲۵) رستم و سہراب (۲۶) بمبولا تیمبولا (۲۷) جنگنامہ حضرت علیؓ (۲۸) جنگ نامہ حضرت امام حسینؓ وغیرہ

سید راحت اللہ زاخیلی

اس شاعر کو اگر ہم ایک طرف پشتو کے منظوم افسانوں اور داستان گوئی کا استاد مانتے ہیں تو دوسری طرف ایک اچھے ادیب کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر شعر و شاعری کے میدان میں دیکھیں۔ تو وہ اپنے ہمعصر شعرا میں ایک بلند مرتبے کا مالک ہے۔ اس کے رواں دواں اور عام فہم اشعار کا ایک حسین دیوان بھی ہے۔ جس میں عشق و محبت کے پرسوز گیت اور زمانے کے تلخ تجربوں کا نئے انداز میں اظہار ملتا ہے، جہاں تک سادگی اور عام فہمی کا تعلق ہے، راحت بہت حد تک اس صنف میں کامیاب ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی رنگینیٔ تخیل اور صنائع بدائع کا استعمال بھی کرتا ہے۔ ایک

بہترین نثر نگار بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا پشتو ناول اور افسانہ اسی نے لکھا۔ اس کے علاوہ پشتو کا سب سے پہلا اخبار "افغان" اسی نے مرتب کیا۔

۱۹۳۱ء میں استرطہ مشی نامی ایک ماہنامہ بھی راحت نے جاری کیا۔ جو بعد میں بند کر دیا گیا۔ بہرحال یہ بحث نثر کے باب میں آئے گی۔ اس وقت اس کی شاعری کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔

راحت داستان گوئی اور قصہ نویسی مثنوی کی طرز میں کہتا ہے۔ اور اس میں سادگی، روانی، اور رنگینی کو یکجا کر دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ پشتو زبان سے کماحقہٗ واقف اور پشتو محاورہ اور روزمرہ پر حاوی ادیب کے بغیر اور کوئی نہیں کر سکتا

راحت ۴ رجب ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سیف الملوک اس کا شاہکار ہے

اسی دور میں فضل احمد کوبی افغان (سرخ ڈھیری) اور صاحبزادہ علی حیدر شاہ جیسی ادبی شخصیتیں بھی پیدا ہوئیں افغان نے حب وطن سے بھرپور نظمیں کہیں، اور صاحبزادہ نے عالمانہ اور حکیمانہ اشعار کہے۔

اس دور میں انگریزی سیاست اور تہذیب و تمدن کا اثر روز افزوں ترقی پر تھا۔ ہر نئی صبح اپنے دامن میں کوئی نہ کوئی بات مستعار لاتی ہے۔ جہاں ہندوستان کے اور حصے اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ وہاں لازمی طور پر صوبہ سرحد پر بھی اس کا غیر معمولی اثر ہوا۔ اور جوں جوں انگریزوں کا سیاسی رسوخ بڑھتا گیا۔ تعلیمی اور ادبی اثر بھی پھیلتا گیا۔ اور لوگوں کے دلوں میں یہ اثر رچ اور بس گیا۔ سائنسی ارتقا اور طباعت کی آسانیوں نے اس کی اشاعت میں گرانقدر حصہ لیا

مغلوں کے دور نے جبکہ فارسی کو بام عروج پر پہنچایا اور دہلی سے پشاور اور کابل تک کا ماحول اس سے آشنا ہوگیا۔ اور پھر اردو نے ایک عالمگیر زبان کی حیثیت سے فارسی کے دوش بدوش ارتقائی منازل طے کئے۔ اور ادھر انگریزوں کے سیاسی انقلاب کے بعد تعلیمی اور ذہنی انقلاب بھی شروع ہوگیا۔ مدرسے سکول

اورکا یچ کھل گئے۔ تو ان سب انقلابات کا اثر پشتو ادب پر یہ ہوا۔ کہ اس میں بھی تنوع پیدا ہوگیا۔ اور پشتو نے اس ماحول میں ایک نیا قدم بڑھایا۔ اس دور میں ایک طرف ہمیں نیم عروضی زمانے کے اشعار کی ارتقائی کڑی کی صورت میں امیر حمزہ خان شنواری کے صوفیانہ فلسفیانہ اور حکیمانہ اشعار اور دوسری طرف اس نیم عروضی دور کے اشعار کی آخری ارتقائی صورت میں سمندر خان بدرشوی کے عروضی اشعار ملتے ہیں۔ اور اسی دور میں ہمیں سید رسول رسا، فضل حق شیدا، حبیبی اور بینوا جیسے آفاقی ادب کے علمبردار شعرا نظر آتے ہیں۔ مفتون۔ یوسف خلیل جیسے رومانی شاعر۔ عبدالاکبر خان اکبر اور گلباد شاہ الفت جیسے بیداری کے پیامبر۔ عبدالغفران بیکس جیسے رنگین خیال اور عبدالغنی خان غنی جیسے طنز و مزاح نگار اہل قلم میدان ادب میں جولانیاں کرتے نظر آتے ہیں ارباب ہدایت اللہ خان ۔۔ بھی اسی دور کی پیداوار ہے جس نے پشتو ادب کو نظم معرا سے آشنا کیا۔ الف جانہ خٹکہ اور میرمن حمیدہ جیسی نغز گو شاعرات بھی اسی دور میں پیدا ہوئیں

الغرض یہ وہ دور ہے، کہ اس میں ادب کا قافلہ دوسرے دور کی سرحدوں کو پار کرکے ایک تیسرے لیکن نئے اور متنوع دور میں قدم رکھتا ہے۔ اور یہاں سے ادب میں جدت اور ارتقا کا ایک نیا اور عظیم انقلاب شروع ہوتا ہے۔ اس دور کو ہم دور جدید کہہ سکتے ہیں یہ دور سنہ ۱۳ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے اس دور نے پشتو ادب میں مختلف . . . . مدرسہ ہائے فکر تخلیق کئے، ہر سکول نے اپنی مخصوص فکری اور ادبی طرز کے شعرا پیدا کئے۔ اس لئے بہتر یہ ہے۔ کہ میں بھی اس دور کو مختلف سکولوں میں تقسیم کر کے پیش کردوں

۱۔ جدید تعلیم یافتہ حلقہ

سر صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم کی جان کاری اور محنت کے حاصل یعنی اسلامیہ کالج نے جہاں صوبہ سرحد کے ظلمت کدے میں تعلیم کی روشنی پھیلائی۔ اور پٹھانوں کی علمی

ذہنی۔ تہذیبی اور تمدنی قدروں میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کیا۔ وہاں پٹھانوں کو بیرونی زبانوں کے ادب اور علوم سے بھی آشنا کیا۔ اور خیبر کے دہانے پر واقع اس روشنی کے مینار نے ان کو اپنی مادری زبان کو ترقی دینے کی راہیں بتا دیں اور پھر انہوں نے اس کی روشنی میں اپنے پشتو ادب کو نئی نئی قدروں اور زاویہ ہائے فکر سے روشناس کیا اسلامیہ کالج کے ان عزت مند نوجوانوں میں جس پر دارالعلوم کو بجا طور پر فخر ہے۔ سید رسول رسا، فضل حق شیدا، محمد اشرف مفتون، شوکت اللہ خان اکبر اور یونس خان خلیل کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح ایڈورڈ کالج پشاور نے بھی ایک نوجوان پیدا کیا، یہ ارباب ہدایت اللہ خان ہے۔ اس سکول کی خصوصیات گنوانے کے لئے ایک علیحدہ سیر حاصل مقالے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انہوں نے پشتو ادب میں وہ فکری انقلاب پیدا کیا۔ کہ تاریخ کے صفحات پر سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس حلقہ نے پشتو ادب کو آفاقی قدروں سے آشنا کیا، مغربی تخیل کے عکس اور فکر کے اثر نے انہیں زلف و عارض کی دنیا سے نکال کر کہیں سرائی کے ساتھ گیت (شرابی سندرہ) گانے پر مصروف کیا۔ اور کہیں خوبصورت بھکارن کو دیکھتے دیکھتے زمانے پر تنقید کی طرف متوجہ کر دیا۔ نظم یوں تو پشتو ادب میں پہلے بھی موجود تھی۔ لیکن رسا نے اس قسم کی نظمیں قاری کو اپنے رنگین پردل میں سمیٹ کر لطیف اور اچھوتی تشبیہوں کے گلستانوں میں سیر کراتی ہیں۔ ان نظموں کے لہجے میں بانسریوں کی شیرینی اور نازک لہریں گھلی ہوتی ہیں۔ اور اس حالت میں قاری کو وہ ایسی جگہ پہنچا دیتی ہیں۔ کہ وہ دل ہی دل میں متاثر ہوتا جاتا ہے۔ جب وہ اس مقام پر پہنچتا ہے۔ تو سخت سے سخت تنقید اور تلخ سے تلخ حقیقت بھی اس پر بوجھ نہیں بنتی۔ بلکہ وہ اسے سنتا ہے۔ سننے پر مجبور رہتا ہے۔ رسا کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔ کہ وہ دھیرے دھیرے، چپکے چپکے ذہن میں رنگتی ہوئی نس نس اور رگ رگ میں رچ اور بس جاتی ہیں۔ اور قاری کو نشتر بھی پھول معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی نظمیں اور ایسی تنقید پشتو ادب میں اس سے پہلے موجود نہ تھی

اور پھر اس کی نظم "سوغات" پشتو ادب میں تخیل اور ذریعہ اظہار کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے۔

رسا نے اپنی کتاب "د بیدیا گلونہ" میں اپنی نظموں کے متعلق یوں کہا ہے

"میں نے مختلف زبانوں کے شعراء، ادبا اور فلسفیوں کی کتابیں پڑھیں۔ میری نظمیں ان کتابوں اور ان کے مندرجات سے متاثر ہیں، اور کچھ میرے شاعرانہ مشاہدات اور تجربات کا اظہار ہیں"

رسا نے ایک صاف دل ادیب کی طرح خود ہی یہاں اس کا اقرار کر لیا ہے۔ کہ اس کی نظموں میں جو فلسفیانہ رنگ، جزئیات نگاری اور فکری انقلاب ہے۔ وہ بیرونی زبانوں کے مطالعہ اور ان کے ادب کا اثر ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کے شاعرانہ مشاہدات اور احساسات کا اظہار ہے۔ اگر رسا یہ نہ بھی کہتے تو بھی پشتو ادب پر بحث کرنے والے اس مقام پر پہنچ کر رسا کی نظموں کا فلسفیانہ رنگ، ممتاز رنگین بیانی زمانے کی عکاسی، خیالی بلند پروازی اور تنقید ادر پشتو ادب میں آنا عظیم انقلاب دیکھ کر جب ان کے عوامل پر غور کرتے تو اس نتیجہ پر پہنچ ہی جاتے۔

بہرطور اس اقرار و انکار سے کوئی غرض اور بحث نہیں۔ اگر ہم کاظم خان شیدا۔ اور عبید حمیند جنہوں نے فارسی کے رنگ میں صنائع بدائع، شعری لوازمات لطیف استعارات و تشبیہات کو رواج دیا۔ اپنے دور اور طرز کے استاد مانتے ہیں۔ تو سید رسول رسا۔ فضل حق شیدا۔ محمد اشرف مفتون، اور ارباب ہدایت اللہ کو جنہوں نے دور جدید میں آفاقی ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد پشتو ادب میں تنوع پیدا کیا۔ کیوں نہ پشتو ادب کا محسن کہیں۔

انگریزی تعلیم کا اثر ہے یا فلسفیانہ ادب کے مطالعہ کا نتیجہ۔ جو کچھ بھی ہمیں دیکھنا یہ ہے۔ کہ موجودہ زمانہ اور ترقیات کے ساتھ ساتھ پشتو ادب میں کس حد تک جدت اور آفاقیت پیدا ہوئی، اور آج پشتو کے جدید ترقی یافتہ دور میں رسا کی "د بیدیا گلونہ" (صحرائی پھول) شیدا کے شاعرانہ جواہر ریزے، یا مفتون کی "شاعری

دنیا" کاروان اور نزاکت اور پولش قلیل کا" لالہ زار" پیش کرتے ہوئے ہم فخر سے اپنا سر اٹھا سکتے ہیں۔ اس سکول کا پیشرو رسا ہی ہے۔

اس سکول کا حساس ترین محب وطن اور اعلیٰ پایہ کا نقاد فضل حق شیدا ہے۔ شیدا نے پشتو ادب کی دنیا میں ایسا نام پیدا کیا ہے۔ کہ بقول کسے کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو پشتو ادب سے واقف ہو۔ اور شیدا اور اس کی شاعری سے ناواقف، شیدا ایک عالم، فاضل تخلیقی نقادانہ صلاحیتوں کا مالک ہے۔ وہ ایک پڑھا لکھا ادیب ہے۔ اپنے ادب کے ساتھ ساتھ بیرونی ادب سے بھی کافی حد تک واقف ہے۔ اسی لئے اس کی سوز و گداز سے لبریز شاعری میں صوری اور معنوی جدت پائی جاتی ہے۔ داخلی جذبات نگاری کرتے وقت قاری کو محسوس ہوتا ہے۔ کہ جیسے زخموں کے منہ کھل گئے ہیں۔ اور اس میں سے سوز اور درد الفاظ کی صورت میں رس رہا ہے۔ اس کے علاوہ شیدا اس قدر حساس شاعر ہے۔ کہ گردے پسینے کا ایک قطرہ بھی اس کے احساسات کی دنیا میں طوفان بپا کر کے اسے جھنجھوڑ سکتا ہے، شیدا نے گل و بلبل کے طلسم سے ہٹ کر عوام کے دکھ اور درد کو بھی محسوس کیا ہے اور اس نے ان کے لئے بھی نظمیں لکھی ہیں، ایسی نظموں میں مزدور کا ترانہ" یتیمہ بچہ اور رقاصہ جیسی تعمیری ولولوں سے بھرپور نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے اس عوامی اور صحت مند نظریئے نے انہیں ترقی پسند شاعروں کی صف اول میں لا کھڑا کیا ہے

اسی طرح اسی سکول کا ایک اور نوجوان شاعر محمد اشرف مفتون بھی ہے جو خود ایک مجسم شعر ہے۔ پشتو ادب میں رومان اور رنگین شاعری کی ترقی میں مفتون کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ کبھی عارف کی خلوت میں آپ کو کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اور کبھی اپنا خواب یوں بیان کرتا ہے۔ کہ اگر آپ رومان کے دور سے گزر چکے ہوں۔ تو یہ خواب آپ کو حقیقت دکھائی دے گا۔ کبھی وہ زہرہ کے ساتھ محو تکلم ہوتا ہے اور کبھی ستار کے آنسوؤں اور درد میں ڈوبے ہوئے نغموں میں

کھویا ہوا نظر آتا ہے۔ اب تو وہ فلسفہ کی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا ہے۔ اور پشتو ادب کا وسیع دامن مشتاقانہ انداز میں اس کے فلسفیانہ جواہر ریزوں کے لئے پھیلا ہوا ہے۔

یونس خلیل نے اپنی پرسوز زندگی کے حسرت ناک لمحات کو "لالہ زار" میں پیش کیا ہے۔ اور پشتو میں رومانوی سوز و گداز کا اضافہ کیا ہے

جہاں رسا، شیدا، مفتوں، خلیل جیسے بلند مرتبت شعرا نے فکری اور معنوی جدت پیدا کی، وہاں ارباب ہدایت اللہ خان نے ایک تو پشتو ادب کو پہلی بار نظم معرا سے آشنا کیا۔ اور پھر اس صنف نظم میں وہ تنوع اور رنگینیٔ بیان بھر دی جو یقیناً قابل ذکر اور قابل تعریف ہے۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ وہ شہرت پسندی اور اشاعت پر گوشہ نشینی اور خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس وجہ سے پشتو ادب کو ان سے گلہ رہے گا۔

نظم معرا کے ادبی مرتبے سے غیر پشتو ادب کے آشنا واقف ہیں۔ البتہ یہ پشتو کے لئے ایک نئی چیز ہے۔ اور بغیر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے دوسرا کوئی بھی اس کی اہمیت نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی اسے مغرب کی تقلید کہتا ہے اور کوئی سستی شہرت کا ذریعہ لیکن در اصل اگر آدمی کی فطرت شاعرانہ اور تخلیقی نہ ہو اور زبان میں بلند تخیل اور لطیف احساسات کے لئے اسی نسبت سے رنگین الفاظ نہ ہوں تو ایسی نظم لکھنی بہت مشکل ہے۔ ارباب کے علاوہ اور بھی چند ایک نئے شعرا نے آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن ارباب کی نظمیں انداز، ذریعہ اظہار اور فنی لحاظ سے کچھ اور ہی مقام رکھتی ہیں

اب آئیے کہ اس سکول کے شعرا کے کلام کو پرکھیں

سید رسول رسا کی ایک نظم "طوائف سے خطاب" سے چند ایک اشعار

تہ خو منزہ نہ سبنہ ئے، تہ پہ جار عصمت فروشہ ئے

تہ خو منزہ نہ سبنہ ئے، تہ پہ جار حسن فروشہ ئے

تو ہم سے اچھی ہے، کہ سر بازار عصمت فروشی کرتی ہے۔ تو ہم سے اچھی ہے کہ سر بازار حسن فروشی کرتی ہے۔

موږ له ستا نه بد یو موږ په غلا ایمان فروشه یو
موږ ستا نه بد یو موږ په غلا وطن فروشه یو

ہم تجھ سے برے ہیں، جو چوری چھپے ایمان بیچتے ہیں۔ ہم تجھ سے بھی برے
ہیں، جو چوری چھپے اپنا وطن بیچتے ہیں۔

ته که ځان خرڅوې خو باک یې نشته موږ ایمان خرڅوو
ته یې په بازار موږ یې خلوت کښې ډیر ارزان خرڅوو

تو اپنا آپ بیچتی ہے تو اس میں کیا ہرج ہے ہم تو ایمان بیچتے ہیں۔ تو بازار
میں سرِعام لیکن ہم خلوت میں اور نہایت سستے داموں بیچتے ہیں۔

ستا جرم بس دا دے، چه ګناه ته برملا کوې
نه چه لکه ته څو موږ پټان ګناه په غلا کوو

تیرا جرم صرف یہ ہے کہ تو برملا گناہ کرتی ہے۔ ہماری طرح چوری چھپے
گناہ کی مرتکب نہیں ہوتی

ستا رزق حرام دے ولې ته حرام په جار کوې
ته سنګار په جار د ګناه کار سر بازار کوې

تیرا رزق حرام ہے۔ کیونکہ تو ظاہر میں حرام کا کام کرتی ہے۔ تیرا سنگار
اور تیرے گناہ کا کام بھی سربازار ہوتا ہے

موږ حرام خواره یو خو حرام څو موږ پټ پناه
موږ هم ګناهګار یو، خو ګناه کوو پناه په غلا

ہم بھی حرام خور ہیں لیکن ہمارا حرام چوری چھپے ہوتا ہے۔ ہم بھی گناہگار
ہیں لیکن گناہ چوری چھپے کرتے ہیں۔

موږ له سیاه کاره منافق یو، منافق او سو
کله په ګناه کښې ستا په شان آزاد صادق او سو

ہم سیاہ کار ہیں منافق ہیں تمہاری طرح گناہ میں آزادانہ طور پر کس طرح سچے رہ سکتے ہیں

دا څه اخلاق دي۔ چه په پټه مونږ ګناه کوو

داشو په ظاهر کښ، بيا خبرے د الله کوو

یہ کیا اخلاق ہے کہ ہم خلوت میں تو گناہ کرتے پھرتے ہیں۔ اور جب باہر آتے ہیں تو منہ پر اللہ اللہ ہوتا ہے۔

محمد اشرف خاں مفتون کی نظم "خواب" کے چند اشعار

ترنګا شو ټنګ پېنزېب يې په پښو کښې	رنګا رنګ لباس کښې پټه
پاؤں میں مترنم پازیب	رنگین لباس میں لپٹی لپٹائی
دلفريب حسن لرونکې	دلربا داسته ګډيږي

دلفریب حسن کی ملکہ۔ ایک دلربا میرے سامنے ناچ رہی ہے

پټ پټو نه سره کاندو۔ کله هلته کله دلته

چه زه پټ د بر په شاشم۔ دارا بيلو کښ پټيږي

ہم آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں کبھی یہاں ہیں تو کبھی وہاں۔ جب میں بڑ کی اوٹ میں ہو جاتا ہوں تو وہ موتیا کی جھاڑی کی آڑ لے لیتی ہے

زه د غلو په قدم ورشم۔ ناګهانه په يو ټوګ کسېږم

ساه نيولې حق حيرانه دا په مارا اوغورځيږي

میں چپکے چپکے جاتا ہوں۔ اچانک بو کی آواز نکالتا ہوں۔ وہ سانس بند کئے حیران و پریشان اپنے آپ کو مجھ پر گرا دیتی ہے

زه ېږے په غېږه لوچته واخلم۔ د چمبے په خوا کښ ئے کېږدم

چه د ګلو بوئيں پرې لګي۔ دا په هوش راولېږي

میں اسے اپنے آغوش میں اٹھا لیتا ہوں۔ چنبیلی کے سائے میں لٹا دیتا ہوں۔ جب اس پر پھولوں کی خوشبو برساتی ہے۔ تو وہ ہوش میں آجاتی ہے۔

په آسمان توري وريځې۔ چپان چپان او بنان او بنان ده
وا ىزى ىزئي پوىنه دي ۔ يه هر هره فدرېږي
آسمان پہ کالی گھٹائیں چھائی ہیں۔ بادلوں سے عجیب عجیب شکلیں بنتی
جارہی ہیں ۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے
کله ځان سپوږمۍ له شرمه، دَ وريځ نقاب کښې پټ کړي
کله لرې لږ پټه کړي ۔ دَ بېرپه نازا داخندېږي
کبھی شرم کے مارے چاندنی بادلوں میں چھپ جاتی ہے کبھی آنچل
ہٹا دیتی ہے ۔ اور بڑے نازوادا سے ہنس دیتی ہے
دصنم په تورو زلفو ۔ دا سپين پشم داسې ښکاري
لکه تورو کا نړو کښې څوک کوهي ۔ دَ شپې ځليږي
محبوب کی کالی زلفوں پر ۔ یہ پھواریوں نظر آتی ہے ۔ جیسے کالے پتھروں میں
رات کے وقت موتی چمک رہے ہوں

غمگین یاد (یونس خلیل)

خپل برباد الفت م ياد شي   خپل ناكام قسمت م ياد شي
اپنی برباد محبت یاد آتی ہے ۔ اپنی ناکام قسمت یاد آتی ہے
چه تخاشي او برېښنا شي په شيبو باران وريږي
جب تیز ہوائیں چلتی ہیں ۔ کوندے لپکتے ہیں اور موسلادھار بارش ہوتی ہے
ناګهانه چه يو تندر په يو ځاله د وغورزېږي
اور اچانک کسی آشیانے پر بجلی گرتی ہے
په دَ شپې د ليلا زلفې په جهان دَ خورېدو شي
جب لیلائے شب کی زلفیں ساری دنیا پر پھیل جاتی ہیں

په حسوت حسوت چه ګوری زېړے غځ په لمېن دشي
جب لرزتا ہوا پیلا سورج مغرب میں ڈوبتے ہوئے حسرت سے دیکھتا ہے

سوزېدلی وېلی شمع د سحاچه په سلګو شي
جب جلی اور پگھلی ہوئی شمع دمِ سحر ٹھنڈی آہوں پر اتر آتی ہے۔

په سلګو سلګو چه مړه شي او د لمبے تو په ختو شي
اور جب وہ سسک سسک کر بجھ جاتی ہے اور اس دھوئیں کی ایک لکیر طلب ہوتی ہے

په وچ شوی ګل چه رو رو د خزان هوا لګېږی
جب ایک مرجھائے ہوئے پھول پر آہستہ آہستہ بادِ خزاں چلنے لگتی ہے

او چے شوی زېړے پاڼړے تر نه او روجه دوډېږی
اور جب اس پھول کی زرد اور خشک پتیاں ایک ایک کرکے جھڑنے لگتی ہیں

د سحر تته رڼرا چه په جهان باندې خورېږی
جب سحر کی دھندلی روشنی دنیا پر پھیلنے لگتی ہے

د رڼرا کفن په ستورو دله مشوق نه چه غوړېږی
جب ستاروں پر مشرق سے ابھرتا ہوا روشنی کا کفن پھیلنے لگتا ہے

خپل برباد قسمت م یاد شي خپل ناکام الفت م لوشي
مجھے اپنی برباد قسمت یاد آتی ہے مجھے اپنی ناکام محبت یاد آ

ارباب ہدایت اللہ خان

"ستوری ته" — "ستارے سے"

اے بربېښے ملغلرے — اے عریاں جوہر
ستا رڼرا به کمه نشي — تیری روشنی کبھی کم نہ ہوگی
که د اد نغارم ایږدکېنی — چاہے میں تجھے راکھ میں ہی کیوں نہ چھپا دوں
ته جوهرم د چا نه بېل ئے — تیری ساخت سب سے انوکھی ہے

چه دستو کے نه ړنګاگی د زړو دا ښکو تار ونه	تیری آنکھوں سے روشنی کے آنسوؤں کے تار ٹپک رہے ہیں

کاش!

چه ستا په ځائے خوزه وے	تیری جگہ میں ہوتا
چه لیده ے م هغه هم خوک	اور میں اس کو دیکھتا
چه اوس تاو ته به کوری	جواب تمہیں دیکھے گی

عروضی مکتب

پشتو ادب کی تاریخ نے اب تک ہمیں جتنے اشعار دیئے۔ ان میں کوئی بھی علم عروض کے اصول پر باقاعدہ طور پر نہیں لکھا گیا تھا۔ ملی اوزان کا دور تو چھوڑ دیجیے اس کے تو الگ اوزان اور طرز ہیں۔ دوسرا دور جس کو پشتانہ شعرا کے مصنف نے عروضی دور سے موسوم کیا ہے۔ اور زیر نظر مقالہ میں اسے نیم عروضی دور سے منسوب کیا گیا ہے۔ میں بھی ایک شعر ایسا نہیں ملتا جس کو امام احمد بن حنبل کے موضوعہ عروض پر منطبق کیا جا سکے۔ پشتو شعر و شاعری نے علم ادب کے دیگر صنائع بدائع کی طرف توجہ کی اور فارسی عربی شاعری کے تمام صنائع بدائع علم بیان اور معانی کے دیگر اصولوں اور فروعات کو اپنایا لیکن عروض کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی۔ جو کوئی آیا اپنے طبعی ذوق کے مطابق اشعار موزوں کیئے جدید دور میں بدرستی کے ریتلے میدان میں سمندر پیدا ہوا۔ اس نے ایک طرف تو نیم عروضی دور کے اشعار کی طرز پر "ایلم شوکہ" (کوہ ایلم کی چوٹی) اور قہران ثریا جیسی معرکۃ الآرا نظمیں لکھیں۔ ان میں "د ایلم شوکہ" تخیل کی بلند پروازی اور نزاکت، فطرت کے مناظر اور محاکات کا ایک بہترین شاہکار ہے۔ جو نظم کتابی صورت میں بھی آ چکی ہے۔ "د قہران ثریا" (قہران کی فریاد) ایک طرف آئینہ عبرت ہے۔ اور دوسری طرف رزمی شاعری کی ایک ایسی بلند پایہ تصویر ہے۔ الفاظ کے زور، جنگی مناظر کی تصویر کشی اور صوت بندی کی وجہ سے فردوسی سے بھی داد طلب کرتی ہے۔ "لیت و لا" بھی سمندر کی اسی قسم

کی مختلف نظموں کا مجموعہ ہے۔ دوسری طرف سمندر نے پشتو شاعری کو عروضی اشعار سے آشنا کیا، فارسی اور عربی کے تمام بحور پر نئی غزلیں اور نظمیں موزون کیں، اور پشتو میں ہزار دل موزون اشعار کا کلیات اور دیوان پہلی دفعہ مرتب کیا، اور ساتھ ہی نثر میں علم عروض پر ایک جامع اور تحقیقی کتاب "ژدر سمندر" (گوہر سمندر) لکھی۔ اس عروضی انقلاب کے علاوہ سمندر خاں نے پشتو نظم کو اس معیار پر پہنچا دیا کہ دنیا کی تاریخ میں ملک الشعرا کا خطاب شاعروں کو بادشاہ یا حاکم وقت کی طرف سے ملتا تھا، لیکن ان کو تمام علاقہ سرحد اور افغانستان کے مستند اور مشہور بڑے بڑے شعرا نے مل کر ایک ادبی محفل میں ان کی ایک نظم "تصویر جاناں" سن کر یہ خطاب دیا۔

یہاں میں سمندر خاں پر مقالہ نہیں لکھ رہا، ورنہ اس کا ادب میں جو مقام ہے اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تو مجھے شاعری کی ان خصوصیات سے غرض ہے جن سے ادب کے دامن میں نئی نئی گلکاریاں ہوئیں۔

سمندر خاں پشتو نظم میں موضوع اور معنی کے بیان کی حیثیت سے ایک ممتاز حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اور پشتو ادب میں عروضی شاعری کا بانی بھی۔ اور اس لحاظ سے سمندر پشتو ادب میں انفرادیت کا مالک ہے۔ اس کے اشعار سے میں چند ایک عروضی اشعار کے نمونے پیش کرتا ہوں

۱۔ ایک مشہور اور مشکل ترین بحر جس پر غالب نے طبع آزمائی کی یہ ہے

بحر منسرح مثمن مطوی منحور

مفتعلن، فاعلات، مفتعلن فع

ے آکہ مری جاں کو قرار نہیں ہے
طاقت بیداد انتظار نہیں ہے

سمندر نے اس بحر میں نو اشعار کی غزل لکھی ہے جس کا ایک شعر یہ ہے

ے عشقه رسا! خواپه خوا دِ کړ پلے منزل
ما اولیدل پلے شهسوار دَ دُنیا

اے عشق رسا! تونے پیادہ پا کو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ لیکن میں
نے دیکھا کہ شہسوار اس دنیا میں رہ گئے۔

۲۔ ایک اور بحر فاعلاتن مفاعلن فعلن

قدم سے پاؤں آہستہ رکھ کر رستے ہیں
دردمندوں نے دل بکھیرے ہیں

سمندر سے قال کخونہ جو پہ ادغو دزیدو
نن تو قاصد یہ زنکیں و راشے

قاصد یوں جھومتا جھامتا آرہا ہے، جیسے میرے محبوب کی زلفوں کے
جھولے سے گر پڑا ہو۔

۳۔ پشتو لوک گیت کی مشہور صنف چاربیتہ کے لئے سمندر نے یہ بحر معلوم کی ہے
مفتعلن، مفتعلن، مفتعلن، فاعلن = رجز مثمن مسطوی مخبول

چاربیتہ: ۔چشم دو نیشل کارسا خانے تیر انداز سے دی
توسے سوری، دوغے سینے نشتہ پہ دنیا صنم

تیری آنکھیں تیرانداز ہیں ۔ اور ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔
یہی وجہ ہے کہ دنیا میں سب کے سینے چھلنی ہیں

اگرچہ حمزہ شنواری اپنے مدرسۂ فکر کا استاد ہے۔ لیکن یہاں سمندر خاں کے
عروضی مکتب کو بھی تقویت پہنچاتا ہے ۔ اور اس نے بھی فارسی عربی بحور پر علم عروض
کے مطابق اشعار کہے ہیں۔

صوفیانہ مدرسۂ فکر

صوفیانہ شاعری تو دولت اور مرزا خاں انصاری کے زمانے سے پشتو ادب
میں داخل ہوئی اور رحمان بابا نے اسے بام عروج پر پہنچایا، لیکن شنواری کے پہاڑوں
میں ایک اعلیٰ موجودہ علوم اور فلسفہ کی ترقی اور جدت کے دور میں پیدا ہوا۔ یہ

امیر حمزہ خان ہے۔ وہ تخلیقی فطرت اور خداداد فطانت کا مالک ہے۔ ادب فلسفہ تاریخ۔ نفسیات، اخلاقیات اور اجتماعیات میں پوری دسترس رکھتا ہے۔ اہل دل کی صحبتوں نے اسے تصوف کے عارفانہ رموز سے واقف کر دیا وہ علم موسیقی سے بھی فنی اور خاص کر علمی طور پر واقف ہے۔ اس نے پشتو شاعری میں معنوی لحاظ سے ایک ایسے باب کا اضافہ کیا ہے۔ کہ پشتو ادب کی تاریخ اسے نہایت عزت کے ساتھ صاحب فن اساتذہ کی صف میں جگہ دیتی ہے اور خصوصاً غزل نہایت بلند پایہ لکھی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر پشتو ادب نے کوئی رئیس المتغزلین پیدا کیا ہے۔ تو وہ امیر حمزہ خان ہے۔

میں نے امیر حمزہ خان کی شاعری کا مطالعہ شروع کیا تو اسے ایک حکیم شاعر سمجھا۔ اور جب کچھ اور مطالعہ کیا تو وہ ایک ڈوبا ہوا فلسفی نظر آیا، لیکن جب کچھ اور آگے بڑھا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مست الست صوفی شاعر ہے۔

امیر حمزہ کے مخصوص رنگ تغزل کی خصوصیات اگر اس مضمون کے مطابق اختصار سے لکھی جائیں تو میرا خیال یہ ہے

"شاعرانہ نازک خیالی، حکیمانہ نکات فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ رموز کے ساتھ ان کا اپنا طرز بیان جدید ترین تراکیب ان کی انفرادیت ہے۔"

ان کی غزل کا نمونہ یہ ہے

ستا یمہ څکہ خو دِ ستا یمہ زہ ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ کہ دَ هر چا یَم تہ خو ستا یمہ زہ

چاہے میں کسی کا ہوں لیکن تمہارا ہوں۔ چونکہ تمہارا ہوں اس لئے تمہاری تعریف کر رہا ہوں

حلقہ بگوش دِ یہ رشتیا یمہ زہ ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ ستا د کاکل یہ سلاسل ہم قسم

تیرے کاکل کے سلاسل کی قسم۔ میں حقیقت میں تیرا حلقہ بگوش ہوں

ستا یہ ګکو کښ یہ خندا یمہ زہ ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ ستا یہ نظر کښ چہ پرېښنا بنکاری

تیری نظروں میں جو کوندوں کی لپک ہے وہ تو میں تیری آنکھوں کی پتلیوں میں ہنس رہا ہوں

ھغہ م ھیر شوتہ چہ راغلے اشنا دادی راياد چہ سہ خو وايمہ زہ

جب تم آئے تو مجھے وہ سب کچھ بھول گیا بس صرف اتنا یاد ہے کہ
میں کچھ کہہ رہا ہوں۔

داچہ ھر مخ راتہ اشنا ښکاری دا بہ د تاسرہ اشنا یمہ زہ

یہ جو ہر ایک چہرہ مجھے شناسا معلوم ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ محض یہ
ہے۔ کہ میں تجھ سے آشنا ہو چکا ہوں

حمزہ وحدت چہ د ښائست م اولیدہ ھلتہ خبر شم چہ د چا یمہ زہ

اے حمزہ، جب میں نے حسن کی وحدت دیکھ لی تب معلوم ہوا کہ میں
کس کا ہوں

یوں تو نظم میں بھی حمزہ شنواری نے تمام پختونخواہ میں نام پیدا کیا ہے لیکن غزل کے علاوہ اس نے اپنی حکیمانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ شاعری کے لئے جیسا کہ عام طور سے دستور ہے۔ رباعی کو ذریعہ اظہار بنایا، حمزہ خان نے رباعی پر کافی توجہ دی۔ وہ کبھی کبھی تو ایسی رباعی کہہ جاتا ہے۔ جو کئی دیوانوں پر بھاری ہوتی ہے۔ اس وقت مجھے ایک رباعی یاد ہے۔

ھستی تیرہ ده بکښی نور د ژوند فطرت لکہ د ے ښپے بکښی سحر د ژوند

ہستی ظلمت ہی ظلمت ہے اور زندگی اس میں سورج کی مثال ہے فطرت
رات ہے اور زندگی سحر ہے۔

چاپیرہ تر دا رہ شپہ روز چورلی پوھیگے حوادثو لہ محور د ژوند

اس کے گرد راتیں اور دن گھومتے ہیں۔ جانتے ہو حوادث کے لئے
زندگی ایک محور ہے

حمزہ صاحب کے علاوہ اس مدرسہ فکر کے لکھنے والوں میں محمد اکرم فاروقی بادشاہ گل نیازی۔ محمد اکرم مسعود۔ لال زادہ ناظر۔ میر حسین صدیقی کے نام قابل ذکر

ہیں۔

سیاسی مدارسِ فکر

انگریزوں کے سیاسی غلبہ کے ردِّ عمل سے پٹھانوں میں اصلاحِ افاغنہ اور پھر سُرخ پوش تحریک کے نام سے جو سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ تو اس اصلاحی اور پھر سیاسی سٹیج نے بھی چند نہایت شعلہ نوا ادبا اور شعرا پیدا کئے۔ جنہوں نے قوم کی بیداری کے لئے ترانے۔ غلامی کا شدید احساس دلانے کے لئے آتش بار نظمیں اور جانبازی کا درس دینے والے شعر کہے۔ ان شعراء میں خادم محمد اکبر عبدالخالق خلیق، عبدالاکبر اکبر، فضل محمود مخفی، فضل رحیم ساقی۔ عبدالمالک خان قدا عبدالغنی خان غنی (دیونے فلسفی) امیر نواز خان جلیا۔ محمد اسلم خان شرر۔ عبدالحکیم خان ستی۔ میاں احمد شاہ بیرسٹر۔ ولی محمد طوفان اور کرامت شاہ فولاد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یوں تو یہ سب شعرا اپنے طور پر آتش نوا ہیں۔ لیکن خاص طور پر خادم کا خطیبانہ کلام عبدالخالق خلیق کے حکیمانہ اشعار اور فضل محمود مخفی کی سنجیدہ اور پُر معنی نظموں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن میں ادب کی تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے عبدالاکبر خان اکبر کی مخصوص طنزیہ طرز اور عبدالغنی خان کی مزاحیہ نظموں پر بحث کروں گا۔ عبدالاکبر خان سادہ پشتو زبان، عوامی لہجے۔ نہایت سنجیدگی اور پرکاری کے ساتھ ساتھ طنز میں بھی یکتا ہے۔ اس کی نظمیں سننے کے بعد تاثر کا یہ عالم ہوتا کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح عبدالغنی خان غنی نے اگرچہ عشق و محبت کے نازک ترین اور لطیف احساسات کو بھی شعر کے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ وطن کے جذبوں کے زیرِ اثر نہایت اچھی اچھی نظمیں کہی ہیں۔ لیکن پشتو ادب میں وہ "دیونے فلسفی" (دیوانہ فلسفی) کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس نے دیونے فلسفی کے نام سے مزاح اور طنز کی ایسی بھرپور اور شاہکار نظمیں لکھی ہیں۔ کہ جب کبھی رسالہ "پشتون" کوئی پڑھتا تو

سب سے پہلے فہرست میں وہ لیونے طسفی گے کے نام کو ڈھونڈتا۔

ان دو فنکاروں کے علاوہ اس سکول کی ایک اور پردہ نشین خاتون الف جان خٹک جو بیری بانڈہ ضلع کوہاٹ کی رہنے والی ہیں۔ نہایت اچھا لکھنے والی ہیں۔ اور میں اسے ادبی گلستان کے اس گوشہ کی ایک کلی اس لئے سمجھتا ہوں کہ اس کے فکری اور تخیلی جو ہر اسی ہوا سے نکھرے اور پھولے پھلے ہیں۔ ادبی دنیا نے بھی اسی مکتبہ فکر کے شاعروں کا ہم نوا ہی اسے پہچانا ہے۔ اور اگر اب بھی مجلہ "پشتون" کی فائیل دیکھی جائے اور الف جان خٹک کی نظموں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے۔ تو نہیں کہا جا سکے گا۔ کہ یہ تحریرسات پردوں میں ڈھکی چھپی ایک خاتون نے لکھی ہے۔ بلکہ سیاسی میدان کے ایک ایسے سر تیز نوجوان کے احساسات کا عکس جھلکتا نظر آئے گا جو اس سکول کے شاعروں کی صف اوّل میں جا رہا ہو۔ اس لئے میں ہی اسے اس سکول کی ایک بلند اور نغز گو شاعرہ تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ کوئی پٹھان شاعر ایسا نہیں جو الف جان خٹک کی ادبی عظمت کا منکر ہو۔

اس سکول کے مندرجہ بالا فن کاروں کا کلام ملاحظہ ہو :۔

نمونہ کلام۔ عبدالاکبر خان اکبر

بُغض، حسد، کینه، د پښتو دا تود ه وینه

خدایه کړې بدله دا د خپل ورور کې په مینه

ترجمہ ۔ اے خدا، پٹھانوں کے اس گرم لہو میں کھولتے ہوئے بغض، کینہ اور حسد کو اپنے بھائیوں کی محبت میں بدل دے

دا د زړه آینه د خود غرضۍ په دوړو ډکه

بیا د محبت په نور رڼا کړے تکه سپینه

ترجمہ ۔ یہ (ان کے) دل کا آئینہ جو ۔ خود غرضی کی گرد سے مکدر ہے۔ محبت کے نور سے منور کر۔

مینه، مینه، مینه م د تمام د درد علاج دے
خو په زړه کے پڅو ټه ټه هم په دے واکوشیر شینه

ترجمہ۔ محبت، محبت اور محبت ہی میری قوم کے درد کا علاج ہے۔ میرا پارہ پارہ دل اسی سے جڑ سکتا ہے

کته رانته ساحب د بلبلے په ناړو کښی
یا که پتنګ وریت کړی د ځان د شمع لمبو کښی
زارکه لو سپوږ سی شو هځما ځا په دې میرو کښ
خلق کړی صحت د ښه ورو په ججړه کښ

ترجمہ۔ بلبل کے چہچہوں سے کیا فائدہ۔ یا اگر پروانہ شعلوں میں جلتا ہے تو کیا حاصل۔ اسی طرح "پیکو" نامی مٹیالے رنگ کا پرندہ بھی اگر صحرائی چاند پر نثار ہو جاتا ہے۔ تو کیا ہوا۔

باز دے که باښه یا د شاهین په سر د رو کښ
کته د هغو د ه چه لری مېړو ګه کلله
وقو۔ وقب۔ وقه

ترجمہ۔ ججروں میں تو تیز پنجوں والے پرندوں کی تعریفیں ہوتی ہیں، اور وہ باز۔ جرہ اور شاہین ہیں۔ جو دروں میں رہتے ہیں۔ (یعنی) کامیاب وہ ہیں جن کی چونچ مضبوط اور طاقتور ہے

۱۲) سر م شین کړو شو نیرے م پرینو   تمهید م کیښو د لیډرۍ دی

میں نے اپنے بال بنوا لئے۔ اور نوکدار داڑھی بنوالی۔ یہ لیڈری کی تمہید ہے

خو زړه هسے د مستی نا ډیری   تبه م کیږی نوی نوی

لیکن میرے دل میں بدستور مستانہ وار امنگیں اٹھتی ہیں۔ اور جیسے جیسے بخار ہوتا ہے۔

لیونے فلسفی

خوار لوهار ته لا لا دایه   چه تیره دې ته سپار کړه
غریب لوہار کو آقا "دلالہ" سمجھو ۔ کیونکہ وہ تمہارے ہل کا پھل تیز کرتا ہے

سرکار کار چه چا نه اخلي   یو کپتان بل صوبه دار کړه
جب حکومت کسی سے کام لینے پر آتی ہے ۔ تو کسی کو کپتان اور کسی کو صوبہ دار بناديتی ہے۔

چه میږې ته خدائے په قار شي   وزرونه ورته تیار کړه
خدا جب چیونٹی پر غضبناک ہو جاتا ہے ۔ تو اسے پر دیتا ہے

چه پښتون ته خدائے په قار شي   ورته ملک یې د سرکار کړه
جب پٹھان پر خدا غضبناک ہوتا ہے ۔ تو وہ اسے حکومت کا ملک بنا دیتا ہے

چه په چا د مرګ پیلا زو شي   ورته دغه کښې ئې ملک دودکار کړه
اگر تو چاہے کہ کسی کو موت آجائے ۔ تو اسے اس ملک میں مرد و دبنا دو

زړه کړه د زهرو خوله لذیذه   خره! راشه ځان هوښیار کړه
دل میں زہر لیکن منہ پر شیرینی لاؤ ۔ بیوقوف! دیکھو کچھ سمجھو

لیونی نه که خفه یې   دوره خدائے یې تهانے دار کړه
اگر تم دیوانے سے ناراض ہو ۔ تو جاؤ خدا تمہیں تھانے دار بنادے

الف جان خٹک

دا م مطلب نه دے چه ظلم د خپل پلار او ښایم
زړونه ورته د خپلو خوېندو په انکار او بنایم
میرا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے باپ کے ظلم کی تشہیر کروں ۔ بلکہ میں اپنی بہنوں

کے جلے ہوئے دلوں کی ترجمانی کرنا چاہتی ہوں

زہ ہم داغوا پری چہ ړاندہ سماج تہ لار راوښایم
د رواجی پردے نقصونہ تار پہ تار او ښایم

میرا جی چاہتا ہے کہ اندھے سماج کو راستہ دکھاؤں۔ اور رواجی پردے
کے نقائص کھول کھول کر بیان کروں

خدایه د ژبے طلاقت د زړه طاقت راکړے
که په غلط لار روان یم نو ته هدایت راکړے

اے خدا مجھے زبان کی گویائی اور دل کی استقامت عطا کر۔ اور اگر میں
غلط راستے پر ہوں تو مجھے ہدایت دے۔

ښځے هم زړونه لری زړونو کښ خواهشات لری
سر کښ ماغزه لری ماغزو کښ احساسات لری

عورت کا بھی دل ہوتا ہے اور دل میں آرزوئیں۔ سر میں دماغ اور دماغ
میں احساسات

کاڼړی خو نه دی هم داستا پشان جذبات لری
بند خیالات لری، بلکه دستا نه زیات لری

وہ پتھر تو نہیں، تمہاری طرح جذبات رکھتی ہیں۔ وہ اچھے خیالات کی
مالک ہیں تم سے بھی زیادہ

دا بے گناه مرغئ دِ ولے بنده کړه پنجرے کښ دے
وایه کړے ښځے دِ ژوندئ ولے ښخه کړے گور کښ وسے

تم نے اس بے گناہ پرندے کو کیوں پنجرے میں بند کر رکھا ہے۔ بولو!
عورت کو تم نے کیوں زندہ درگور کر رکھا ہے۔

ان فکری سکولوں کے علاوہ چند ایک شعرا ایسے بھی ہیں جنہوں نے ہر رنگ میں طبع
آزمائی کی ہے۔ اور وہ ان میں نہایت کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ اپنی انفرادیت سے

قطع نظر شاعری کے میدان میں انھوں نے خوب نام پیدا کیا ہے۔ ان کے ہاں نرم و نازک اور نہایت لطیف قسم کی رومانیت بھی ہے۔ اور جدت طرازی بھی — ان کی نظمیں ملی اور وطنی محبت کے امڈتے ہوئے جذبات سے بھی بھرپور ہیں اور اخلاقی اور اجتماعی رجحانات کی آئینہ دار۔ ان کے ہاں صوفیانہ خیالات اور رنگین بیانی کے علاوہ ترقی پسندانہ رجحانات بھی ملتے ہیں۔ ان شعرا میں عبداللہ، میاں مسرور گل، تاج محمد خان، زیب سراد یب سوات جیسے شہرۂ آفاق اہل قلم حضرت بے نوم، حضرت بادشاہ گل صاحب، میر حسین صدیقی جیسے صوفیانہ خیالات کے شعرا عبدالغفور بیکس جیسا رنگین خیال بہادر شاہ ظفر جیسا سنجیدہ بیان —

عبداللہ جان اسیر اور شبیر محمد خان مینوش جیسے نغز گو شعرا، عبدالحلیم اثر افغانی اور محمد نواز خان خٹک جیسے پختہ کار — نادر خان بزتی اور رضا خان ہمندی جیسے ترقی پسند غلام سرور خان ہمند اور خان میر ہلالی جیسے محب وطن اور سراج الاسلام سراج، حبیب الرحمان کسکر جیسے ابھرتے ہوئے نوجوان شعرا بھی موجود ہیں

ان کے علاوہ ایسے شعرا کا بھی ایک حلقہ موجود ہے، جو عوام کے جذبات کے معیار پر اپنے فن کا اظہار کرتے ہیں۔ انھوں نے پشتو کے خالص لوک گیتوں کو زندہ رکھنے میں بہت کام کیا ہے۔ ان شعرا میں گلستان استاد، عبدالمطہر فدا نور محمد استاد۔ غالب گل۔ شان گل۔ میاں برہان، فیاض خان خٹک، علی حیدر جوشی، مستری عبدالحمید، عبدالوہاب شبنم قابل ذکر ہیں۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا۔ یہ صرف نظم کے متعلق تھا۔ اور ظاہر ہے کہ نثر کے بغیر یہ موضوع تشنہ رہے گا۔ اس لئے اب ادب کی دوسری صنف یعنی نثر کا اجمالی جائزہ پیش کرتا ہوں

بہتر یہی ہوگا کہ نثر کے متعلق قیاس آرائیوں کی بجائے بحث کا آغاز اس نثر سے کروں جس کا انکشاف تذکرۃ الاولیا" نامی کتاب کے دستیاب ہونے سے ہوا ہے۔

یہ بحث کہ اس سے پہلے پشتو نثر موجود تھی یا نہیں؟ اور اگر تھی تو کس نہج پر اور کس رسم الخط میں تھی۔ کافی بحث طلب ہے اور موجودہ مقالہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ پشتو کا موجودہ رسم الخط قاضی سیف اللہ نے محمود غزنوی کے زمانے میں وضع کیا ہے۔ اور محمود چوتھی صدی ہجری میں افغانستان کا بادشاہ تھا۔ تو پھر یہ بات یقینی ہے کہ چوتھی صدی ہجری سے موجودہ رسم الخط میں پشتو تحریر موجود تھی اور اسی طرح عین ممکن ہے کہ تذکرۃ الاولیاء ۶۱۲ھ سے پہلے بھی پشتو نثر موجود تھی جو ہمیں آج تک دستیاب نہیں ہو سکی

بہرحال ہم اس بحث کی ابتدا اسی معلوم شدہ کتاب یعنی تذکرۃ الاولیاء سے کرتے ہیں یہ کتاب ۶۱۲ھ میں سلیمان ماکو نے لکھی ہے جو بارک خان صابزئی کا بیٹا اور قندہار کا باشندہ تھا۔ اس کتاب کے صرف آٹھ صفحے مسٹر عبدالحی خان حبیبی قندہاری کو ملے۔ اور انہوں نے اپنی تصنیف پختانہ شعرا میں ان صفحات کا عکس شائع کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ سلیمان ماکو خود بھی ایک عارف اور صوفی منش عالم تھا اور اس نے اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے معلوم ہوتا ہے۔ اولیاء و صوفیا کے تذکرے اور حالات قلم بند کئے ہیں۔

اس کتاب کی نثر اگرچہ ابتدائی حالت میں ہے۔ جملوں کی ترکیب اور الفاظ کے تقدم تاخیر کے لحاظ سے اس پر عربی نثر کی تقلید کا رنگ غالب ہے مگر بار وزمان کے زمانے کی نثر سلیس، رواں دواں۔ سادہ اور عام فہم ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو۔

(وایم حمد، وسپاس دلوئے خاوند۔ او درود پہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جہ دے بادار دکو نیکو او رحمت دَ ثقلینو۔ لوی دوئے رحمتونہ دِدی دھغہ اُستاذی پہ آل او یارانو چہ دوا یہ جہا پرودوئ دی رہ بنان

لفظی ترجمہ اپنی تراکیب کے لحاظ سے (کہتا ہوں حمد و سپاس خدا کی - اور درود محمد صلعم پر کہ ہے وہ سردار کونین کا اور رحمت ثقلین کی بہت بہت رحمتیں اس پیغمبر کے آل اور دوستوں پر کہ دونوں جہان اُن سے ہیں منور ہیں -

اس عبارت میں حمد، سپاس - درود کونین، رحمت ثقلین، وغیرہ کئی عربی الفاظ سے اس نثر پر عربی لغات کا اثر صاف ظاہر ہے - دوسری طرف ترکیب اور الفاظ کی تقدیم و تاخیر بھی عربی "نحو" کے مطابق ہے -

پشتو نظم کی تاریخ میں تو ہمیں امیر کروڑ اور اس کے بعد کئی شاعری سے پشتو نظم کے خالص اوزان، لحن، اور طرز کا پتہ چل جاتا ہے جس سے ہم خالص پشتو شاعری اور بیرونی اثر میں حد و د قائم کر لیتے ہیں - لیکن نثر میں معاملہ دیگر گوں ہے یعنی یہاں ہمیں سلیمان ماکو سے پہلے نثر کی کوئی مثال یا نمونہ نہیں ملتا جس کو دیکھ کر ہم پشتو خالص نثر اور اس پر بیرونی اثرات کو زیر بحث لا سکیں - اس لئے مزید کچھ لکھنے کی بجائے، اسی نثر کو پشتو نثر کی پہلی کڑی ماننا پڑے گا - البتہ بعد میں مرور ایام سے خود پشتونوں کے طبعی ماحول، زبان اور حلق کی ساخت، طبعی ذوق و سلاست نے نثر کو حسن و دلگیر لا کھڑا کیا - اس سے آپ خود اندازہ لگا سکیں گے کہ یہ ابتدائی نثر کتنی مانوس یا غیر مانوس اور پشتو محاورہ اور روزمرہ کے مطابق یا غیر مطابق ہے -

سلیمان ماکو کے بعد تاریخ سوری، لرغونی پښتانہ، د شیخ ملی دفتر، کجورانی زئی کی تاریخ کے نام سے پشتو ادب میں کئی نثر کی کتابیں ملتی ہیں - مثلاً امیر کروڑ کی نظم کے متعلق محمد ہوتک مصنف "پٹہ خزانہ" نے لکھا ہے کہ یہ نظم شیخ کٹہ متی زئی غوریا خیل نے اپنی کتاب "لرغونی پښتانہ" قدیمی پٹھان" میں تاریخ سوری سے نقل کی ہے (تاریخ سوری ... محمد بن علی البستی کی لکھی ہوئی کتاب ہے) اس طرح "د شیخ ملی دفتر" خوشحال خان خٹک نے علاقہ سوات کی ایک کتاب کے طور پر ذکر کیا ہے - اسی طرح تاریخ مرصع اور مخزن اخون درویزہ میں بھی ذکر ہے -

یورپین مستشرقین مارگن شیرون لکھتا ہے۔ کہ مسٹر راورٹی کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے شیخ ملی کی کتاب دیکھی ہے۔ شیخ ملی یوسف زئی قبیلے کا ایک بزرگ اور سوات کا رہنے والا تھا۔ مسٹر راورٹی نے تو یہاں تک لکھا ہے۔ کہ یہ کتاب ۱۴۱۷ء میں لکھی گئی۔ اسی طرح خان کجو رانی زئی کی تاریخ کا بھی مسٹر راورٹی نے ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ کتاب ۱۴۹۴ء میں لکھی گئی ہے۔ مگر اب یہ چاروں کتابیں ناپید ہیں۔ اور ان کے صرف نام باقی ہیں۔

ان کے ناموں نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سب تاریخی کتابیں تھیں اور ان میں تاریخی لحاظ سے ادبی شخصیتوں اور اُن کے ادب کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ان کی نثر یا عبارت کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ تذکرۃ الاولیا کے بعد دوسری کتاب خیرالبیان نامی ملتی ہے۔ جو تقریباً ۹۴۹ھ میں لکھی گئی۔ یہ پیر روخان نامی بزرگ کی تصنیف ہے۔ پیر روخان ایک مذہبی مبلغ اور پیرو مرشد تھا۔ وہ علاقہ وزیرستان کے کانی گرم کا رہنے والا تھا۔ اس نے دینی تبلیغ اور اپنے عقائد کی اشاعت کے لئے عربی، اردو، پشتو اور فارسی میں یہ کتاب لکھی۔ جس کے قلمی نسخے مستشرقین نے سنبھال لئے ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ انڈیا آفس برطانیہ میں موجود ہے۔ اس کتاب کی نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

(که څوک آس اسپے لری، کال تیرشی تمام۔ څښتن یې اختیار لری چه یو دینار دِ درکه دَهر حیوان۔ یا د بهایې۔ له دوو سوو درمو دپنځه ورکی تمام)

ترجمہ (اگر کوئی گھوڑے گھوڑیاں پالتا ہو۔ ایک سال مکمل گزر جائے + (تو) مالک کو اختیار ہے کہ ایک دینار ایک حیوان کے حساب سے ادا کرے۔ یا اُس کی قیمت لگا کر دوسو درم کے پیچھے پانچ درم دے دے)

معنوی لحاظ سے یہ نثر مذہبی احکام پر مشتمل ہے۔ اور پیر روخان نے اس کتاب کے ذریعے سے پٹھانوں کو اپنے عقیدے کے مطابق مذہبی احکام سے آگاہ

کرنے کی سعی کی ہے۔

اور صوری لحاظ سے یہ نثر مقفّٰی قسم کی نثر میں شمار کی جا سکتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہ تکلف اس میں نظم کا رنگ اور قوافی لانے کی کوشش کی گئی ہے یہاں تک کہ کچھ عرصہ تک تو اکثر لوگ اسے نیم مصنوعی شعر کہتے آتے ہیں۔ اور آج بھی بعض نثر کہتے ہیں۔ اور بعض نظم۔ لیکن چونکہ صرف قافیہ بندی نظم نہیں ہے۔ اور اس لئے اگر اس نثر میں قافیہ ہے بھی تو ہم اسے نظم نہیں کہہ سکتے۔ البتہ مقفّٰی اور مجع مگر وہ بھی بے ترتیب نثر کہہ سکتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خیرالبیان کی عبارت نہ نثر ہے اور نہ نظم۔ اور چونکہ نظم نہیں ہے اس لئے مجبوراً اسے نثر کہنا پڑے گا۔ ورنہ اس کے طویل جملوں اور الٹ پلٹ تراکیب اور قوافی کی جا وبے جا پابندی نے اس کو ان دونوں سے مختلف کر دیا ہے۔ اس سے قبل تذکرۃ الاولیاء کی نثر بھی اگرچہ ابتدائی حالت میں ہے۔ لیکن وہ اس سے بدرجہا کامیاب نثر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیر روخان نے تکلف سے کام لے کر بزعم خود ایک رنگین اور کامیاب نثر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ نثر کی اس طرز کو جو سلیمان ماکو نے اختیار کی تھی۔ اس نے اپنانے کی کوشش نہ کی۔ اور ایک جداگانہ روش اختیار کر لی جسے بعد میں اس کے معتقدین اور ہم عصروں نے بھی اختیار کیا۔ اخون درویزہ پیر روخان کا ایک ہم عصر بزرگ اور ایک متشرع عالم تھا۔ یہ بزرگ پیر روخان کے مسلک اور طریقے کے مخالف تھا۔ اور دونوں کے درمیان کافی حد تک مخالفت تھی۔ چنانچہ اس نے جہاں تبلیغ اور خطابت سے اس کے مقابلے اور عقیدے کی تردید میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی وہاں اس کی مذہبی کتاب خیرالبیان کے جواب میں مخزن الاسلام نامی مذہبی کتاب لکھی۔ یہ صاحب اگرچہ روخان کے مسلک اور خیالات کا مخالف تھا مگر نثر میں اسی کا تتبع کرتا نظر آتا ہے۔ البتہ اس نے کسی قدر جدت سے کام لیا۔ اور وہ یہ کہ روخان کی نثر صرف قافیہ دار ہے لیکن اس نے اپنی نثر میں لحن اور وزن پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

پہلا فقرہ ۔ دھر شیز اصل ثابت دے۔ ځکه توم یاندې نمیږي،
دوسرا جملہ ۔ هم په عقل راکیږي۔ هم دا عقل وررسیږي،
تیسرا جملہ ۔ دَ اشیا اصل ثابت دے ۔ اوهام نه دي + ته آگاه شه،
چه او هام شیز دي نه هلي سود ورنه نه یې زیان د بله رسیږي +

(۱) ہر ایک چیز کا اصل ثابت ہے ۔ اِس لئے اِن کے نام لئے جاتے ہیں ۔
(۲) وہ عقل میں بھی آ سکتی ہیں ۔ اور عقل کی اُن تک رسائی بھی ہے ۔
(۳) چیزوں کی اصل ثابت ہے ۔ اوہام نہیں ہیں + تجھے خبردار رہنا چاہیئے +
کہ وہاں میں نفع نہیں ۔ اور نہ ان سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہے ۔

اِس نثر میں پیر روخان کی نثر کی طرح قافیہ بندی بھی ہے ۔ اور جیسا اوپر ذکر کیا گیا ۔ وزن پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے ۔ اگرچہ جملوں کے اختصار اور طوالت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ۔ البتہ جملہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو ۔ اخوند درویزہ بابا نے قاری کی آسانی کے لئے اسے مختلف مرکبات میں تقسیم کرکے "خیر البیان" کی نثر سے مختلف صورت دی ہے ۔ اس کی یہ کوشش اُس وقت کے مطابق شاید قابلِ داد بھی ہو لیکن نثر کی اصلیت اور بنیادی خصوصیات کے لحاظ سے ہمارے لئے اس نثر کی خیر البیان کی نثر سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں ۔ اور اسی طرح اخوند قاسم ؁۹۶۷ھ کی "فوائد الشریعہ" اور نور محمد کی "نافع المسلمین" کی نثر بھی اِسی قبیل کی نثر ہے ۔ اس قسم کی نثر میں قافیہ بندی، الٹ پلٹ تراکیب، اور جا و بے جا وزن پیدا کرنے کی کوشش کے علاوہ عربی الفاظ کی بھی کافی بھرمار ہے ۔ اور اُس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ مذہبی لوگ تھے ۔ اور مذہبی کتابوں ہی کو ترجمہ کرتے تھے ۔ جس کا اثر اِن کے ترجمے میں باقی رہ گیا ۔

اسی طرح پیر روخان کی اِس ادھوری قسم کی نثر کا دور دورہ تھا ۔ کہ اتنے میں کوہستان خٹک کی پتھریلی گود میں "بابائے پشتو" خوشحال خان خٹک نے جنم لیا ۔ اور اس نے اپنی خداداد فطانت کی بدولت جہاں پشتو نظم میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کیا ۔ اور پشتو نظم کو نئی شاہراہوں سے آشنا کیا ۔ وہاں پشتو نثر میں بھی اصلاح کرکے جدّت اور روانی

پیدا کی۔ اور پیر روخان وغیرہ کی نامکمل قسم کی نثر کو ترک کر کے تحریری نثر کو عوام کی روز مرہ بول چال کے مطابق عام فہم، بلا تکلف، اور آسان کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خوشحال بابا اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ اور قدیم نثر کے برعکس انہوں نے ایک نئی قسم کی آسان اور رواں نثر کی ابتدا کی اور پھر اس میں انوار سہیلی کا ترجمہ کر کے "عیار دانش" نام کی کتاب مرتب کر لی جس کا نمونہ یہ ہے۔

دیوہ ورځ د باغ څښتن ناست وو یه تماشه د ګلونو۔ ملیده ئې اُولیده۔ چه مخ به ئې یه ګلو ږدي په باغ کښې + او په خریاد فریاد به ئې یسے ناوے وهلے + ورق ورق زرنګار د ګل به ئې چه مبنوګه یو تر بل جدا کاوه +)

ترجمہ۔ ایک دن باغ کا مالک بیٹھا پھولوں کی سیر کر رہا تھا۔ اس نے ایک بلبل دیکھا۔ جو اپنا منہ پھول کی پنکھڑیوں پر مل رہا تھا۔ اور فریاد کر رہا تھا۔ وہ پھول کی زرنگار پتیوں کو اپنی چونچ سے جدا کر رہا تھا)

خوشحال بابا کی نثر خیر البیان۔ اور مخزن وغیرہ کی نثر سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔ نہ قافیے کا التزام ہے۔ نہ طویل جملے ہیں۔ اور نہ اس قدر الفاظ اور تراکیب کی تقدیم و تاخیر۔ اس طرح خوشحال بابا نے سب سے پہلے روخان کی بے ترتیب اور نامکمل نثر کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ اور اُسے پھلنے پھولنے نہ دیا۔ بلکہ اس کی جگہ رواں نثر کو رواج دیا۔

عیار دانش کے علاوہ خوشحال بابا نے کئی ایک کتابیں تصنیف و ترجمہ کی ہیں جن میں اکثر کے صرف نام ہی تاریخ کے صفحات پر باقی رہ گئے ہیں۔

ان کتابوں میں دستار نامہ نہایت مشہور قابل ذکر اور ہر لحاظ سے اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے متعلق خوشحال خان بابا خود لکھتا ہے کہ میری طبیعت بہت غمگین اور پریشان تھی۔ حجرے سے جی اکتا گیا تھا۔ اور تنہائی میں بیٹھا رہتا۔ تو طبیعت بہلانے کے لئے بغیر کسی خاص مطالعے کے" دستار نامہ" لکھنے لگا۔

اس کتاب کی ابتداء میں انہوں نے یہ شعر لکھا ہے:-

چه دستار تړی هزار وی
پگڑی باندھنے والے تو ہزاروں ہیں
د دستار سړی په شمار دی
لیکن پگڑی کے قابل صرف چند ہیں

تو انہوں نے اس کتاب کے چالیس ابواب میں ان فضائل او خصوصیات کا بہ تشریح ذکر کیا ہے۔ جن کے باوصف آدمی کو دستار زیب دیتی ہے (دستار باندھنے کے قابل ہیں) یعنی ایک معزز اور مہذب پشتون میں جو صفات خوشحال بابا کے نظریئے کے مطابق ہونی چاہئیں۔ اس کتاب میں ان کا ذکر ہے۔ اس کتاب کی نثر کے متعلق پشتو کے شہرہ آفاق ادیب سمندر خان کا نظریہ ہے کہ خوشحال بابا کی نظم کے مطالعے کرنے کے بعد ان کی قابلیت اور ادبی حیثیت کا جو مرتبہ میرے دل میں تھا "دستار نامہ" پڑھنے کے بعد وہ کئی گنا بڑھ گیا۔ اور حق یہ ہے کہ دستار نامے کی نثر لفظی اور معنوی لحاظ سے فارسی کے سعدی سے کسی طرح کم نہیں۔ خوشحال بابا نے دستار نامہ کو ظاہری اور معنوی ہر لحاظ سے کافی قابل قدر حیثیت سے پیش کیا ہے (اب یہ کتاب مستقل قریب میں عبدالشکور خان مہتمم مجلس کتب خانہ پشاور چھاپ رہے ہیں) اس کی نثر بھی اسی قسم کی ہے جو معیار دانش کی ہے نمونہ ملاحظہ ہو:-

"نور چه تر خوارلس کاله اوړی وخت یئے۔ د حق پوره کوي بوده۔ په حال چه داشي۔ نو یه چه څلور ستره اوسیي (اول) ستر د ځان دے چه سایه یئے هم نا محرم او نه وینی (دوئم) د غوږونو دے چه د نامحرم مذاکور نام ورته څوك وانخلی (دریم) د ستر کو ستر۔ چه شے په کنج کښي د کور کښینی چه نن یئے په چا او نه لگیږي۔ په لور ځائے ور یدل۔ په بام ختل په غولی کښې کر خیدل۔ داد

هرگز نه دي - څلورم ستو دا ژبے دے چه بے موره - خوره کړوړ
لا محرم خد تمکارے خبرے د چاسره اونه کا ؎

ترجمہ : لڑکی جب چودہ سال کی ہو جائے - تو اُس پر حقوق کی ادائیگی واجب ہو جاتی ہے - جب بالغ ہو جائے تو اُسے چار قسم کا پردہ چاہیئے - اوّل جسمانی پردہ - کہ اس کا سایہ تک بھی نامحرم نہ دیکھے دوم کانوں کا پردہ یعنی اس کے سامنے کسی نامحرم کا نام تک نہ لیا جائے - سوم - آنکھوں کا پردہ یعنی گھر کے کسی ایسے گوشے میں بیٹھا کرے کہ اُس کی نظریں نامحرم پر نہ پڑیں - اونچی جگہ پر کھڑی نہ ہو - چھت پر نہ چڑھے - صحن میں آزادانہ نہ پھرے - چہارم زبان کا پردہ - یعنی بغیر ماں - بھائی - بہن اور خادمہ کے کسی کے ساتھ باتیں نہ کرے ؎

اگرچہ خوشحال خان بابا کی نثر میں بھی فارسی - عربی تراکیب اور الفاظ کا کچھ رنگ ضرور پایا جاتا ہے - جو اس دور اور ترجمے کا اثر ہے - مگر جب ہم اس کا مقابلہ اس دور کی دوسری نثر سے کرتے ہیں - تو اس کو ہم کافی رواں، سلیس، بلاتکلف اور روزمرہ بول چال کے مطابق پاتے ہیں ۔ اور چونکہ یہ اپنی قسم کی پہلی نثر ہے اس لئے یہ تھوڑا بہت اثر ناگزیر تھا -

بہرحال ہم خوشحال بابا کی نثر کو اصل اور مکمل نثر کہہ سکتے ہیں اور یہاں سے پشتو نثر کا اصل اور دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے - خوشحال بابا کے بعد اس کے بیٹے عبدالقادر خان سنہ ۱۰۶۳-۱۱۱۹ھ نے "گلستان سعدیؒ" کا ترجمہ کر کے "گلدستہ" نام رکھا - یہ اس کتاب میں اپنے باپ کی طرز کی نثر کو رواج بھی دیتا ہے - اور اُس کے مسلک کو تقویت بھی پہنچاتا ہے - عبدالقادر خانؒ نثر کو روانی کی طرف لے جانے میں ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے - اور باپ کی طرز کو پروان چڑھانے کی کوشش کی ہے - چنانچہ لکھتا ہے ۔

ریو بادشاه په کښتۍ کښې ناست وو - یو حرمے عجمي هم ورسره

پہ خدمت حاضر وو - ھغہ ئی کلہ سیند لیدلے نہ وو او د کشتی ناستہ یے آزمیلی نہ وہ - ژړا زاری فریاد یے آغاز کړو)

ترجمہ :- ایک بادشاہ کشتی میں بیٹھا تھا - ایک عجمی غلام بھی ساتھ تھا - غلام نے کبھی دریا نہیں دیکھا تھا - اسے کشتی میں بیٹھنے کا بھی کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا اسنے گریہ و فریاد اور آہ و زاری شروع کر دی)

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالقادر خان کی نثر میں روانی اور روزمرہ نسبتاً خوشحال خان سے بھی زیادہ ہے - اور موجودہ نثر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں -

ان ایام میں کہ پشتو نثر خٹک خاندان کی بدولت جدید طرز پر ترقی کے منازل طے کر رہی تھی - قندھار کے نواح میں بمقام کوکران سنہ ۱۰۸۴ھ محمد ہوتک پیدا ہوا جس نے سنہ ۱۱۴۱ھ میں "پٹہ خزانہ" (گنج مخفی) کے نام سے پشتو نثر میں ایک ادبی اور تاریخی کتاب لکھنی شروع کی جو تاریخ ادب پشتو کے لئے واقعی گنج مخفی ثابت ہوئی - اس کتاب نے پشتو ادب کی تاریخ کے بہت سے نامعلوم گوشے بے نقاب کئے - اور اگر یہ کتاب نہ ملتی - تو ۳۰۰ھ سے قبل پشتو ادب کا کوئی تاریخی ثبوت ہمارے پاس نہ ہوتا - محمد ہوتک اپنی کتاب میں ۱۳۹ھ سے لے کر اپنے دور یعنی سنہ ۱۱۴۱ھ تک تقریباً پچاس ادبی شخصیتوں اور اُن کی ادبیات کو ہم سے متعارف کراتا ہے - اور اس لحاظ سے یہ کتاب پشتو ادبیات میں کافی اہم اور قابل قدر ہے -

پٹہ خزانہ جہاں ادبی اور تاریخی لحاظ سے کافی اہمیت کی مالک ہے - وہاں اس کی نثر بھی اُس دور کی نثر کے مقابلے میں کم اہم نہیں - اس سے پہلے خوشحال بابا نے روخانیوں کی نثر پر خطِ تنسیخ کھینچ کر جس روان اور عام فہم نثر کی ابتدا کی تھی - محمد نے اسے اور سلیس اور عام محاورے کے قریب تر لا کر ایک کامیاب نثر نگار کی حیثیت سے پشتو ادب میں نام پیدا کیا - آپ کی نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

زہ چہ محمد هوتک یم - او پہ اصل پښتون قندهار کښ اوسم لہ ډیرہ دہ چہ پہ دیلو دواسے ویناؤ بخت یم - او شپے او ورځ ۳۰

هم غم کار دے ہودا دیو وختونہ تیوسول - چہ ما غوښتہ چہ زہ
دَ پښتو شاعرانو تذکرہ وکاږم)

(میں کہ محمد ہوتک ہوں - اور نسلاً پشتون - قندہار کا باشندہ ہوں - اور کافی
عرصہ سے اس قسم کی باتوں میں معروف ہوں - دن رات میرا یہی کام ہے
اور کافی عرصہ بیت گیا - کہ میں چاہتا تھا کہ پشتون شعرا کا تذکرہ لکھوں)

یہ نثر اگرچہ پشاوری اور یوسف زئی لب و لہجہ کی نسبت کچھ ثقیل معلوم ہوتی ہے مگر
قندھاری محاورے کے عین مطابق ہے - اور نسبتاً فارسی عربی لغات کا اثر بھی کم ہے
اس لحاظ سے ہم محمد ہوتک کی نثر کو اُس دور کی کامیاب ترین نثر کہہ سکتے ہیں۔

اس اثنا میں افضل خان خٹک کے کہنے پر محمد مظفر نامی ایک پشتون اہل قلم نے
"تاریخ اعثم کوفی" کا پشتو میں ترجمہ کیا ہے - اس کتاب کو مستشرقین افضل خان
خٹک سے منسوب کرتے ہیں - مگر اس کا اصل نسخہ جو خان فتح محمد خان خٹک ایم اے
کے پاس موجود ہے - اُس سے معلوم ہوتا ہے - کہ یہ تاریخ محمد مظفر نے ۱۱۲۰ھ میں ترجمہ
کی ہے - اور چونکہ خان افضل خان کے لئے ترجمہ کی گئی ہے - اس لئے مستشرقین غلط
فہمی میں رہے ہیں - اس کتاب کی نثر بھی خوشحال اور عبدالقادر خان کی طرح سے
اور فاضل افضل خان کی نثر سے کافی مشابہت رکھتی ہے

اسی طرح افضل خان خٹک بھی جو اشرف خان ہجری کا بیٹا اور خوشحال بابا
کا پوتا ہے اسی میدان کا ایک نامور شہسوار ہے - اور اپنے دور کے نثر نویسوں
میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے - اس نے "تاریخ مرصع" اور "علم خانہ دانش" لکھی ہیں
اور خاص کر تاریخ مرصع تو پشتو ادب اور تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے -
اس کتاب میں پشتون قوم کی اجمالاً اور خٹک قبیلے کی تفصیلاً تاریخ لکھی گئی ہے
یہ کتاب ایک سے زیادہ جلدوں پر مشتمل تھی - اس کا ایک نسخہ خان بہادر محمد زمان خان
نے "پبلک لائبریری لاہور" میں دیکھا تھا - اور ایک نسخہ خوانین ٹیری کے پاس
تھا - جن کی نقلیں خان بہادر موصوف کے پاس محفوظ ہیں - اس کے علاوہ مستشرقین

نے بھی اِس کتاب کو دیکھا اور پڑھا ہے۔ چنانچہ گلشن زادہ" اور کلید افغانی" میں اس کے چند ابواب چھپے ہیں۔ صدیق اللہ خاں اشتین نے اپنی کتاب "دَ پښتو ادب تاریخ" میں لکھا ہے۔ کہ تاریخ مرصع کے تین نسخے لندن میوزیم میں بھی موجود ہیں۔

خان بہادر زمان خان صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے جو نسخہ لاہور کی پبلک لائبریری میں دیکھا تھا وہ اُس نسخے سے مختلف ہے۔ جو خوانین ٹیری کے پاس بعد میں دیکھا گیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ مرصع کئی جلدوں میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ خوانین امیر کلی (نظام پور) کے پاس بھی ایک نسخہ تھا۔ جو بعد میں نواب آف ہوتی (نواب سر محمد اکبر خان) کی لائبریری کی زینت بنا۔ معلوم نہیں۔ کہ وہ نسخہ اب تک نواب صاحب موصوف کے پاس ہے یا نہیں۔ تاریخ مرصع کی نثر کا نمونہ یہ ہے:۔

(اخون درویزه چه دَ دلازاکو په هغه آوان په میره ولنگر کوټ استوګنه وه - او یوسف زوئ په هشتنغر وه - او په دا سبب چه دلازاکو دَ لنګر کوټ ګردو نواحی سوه ینولی دو - چه به دَ یوسف زو مال مواشی میرے ته په څرا کاه ورغلل تاخت و تاراج به ئے کړه)

ترجمہ (نقل ہے اخون درویزہ سے کہ دلازاک اُس وقت لنگر کوٹ کے صحرا میں رہائش پذیر تھے۔ اور یوسف زئی ہشت نگر میں۔ اور چونکہ دلازاک لنگر کوٹ کی گرد و نواح پر قابض تھے۔ (اس لئے) جب بھی یوسف زئی کے مال مویشی چرنے کے لئے صحرا میں آجاتے یہ تاخت و تاراج کر دیتے)

جیسا کہ صاف ہے۔ افضل خان خٹک کی نثر اپنے عصر کی کامیاب ترین نثر ہے۔ اور پشتو نثر کی تاریخ میں ہر لحاظ سے اسے فوقیت حاصل ہے۔ خوشحال بابا نے جس نثر کی ابتدا کر کے پشتو ادب کو روخان اور درویزہ بابا کی عجیب و غریب نثر سے بچایا۔ افضل خان نے ایک ماہر اور رفیع نثار کی حیثیت سے اُسے خوب پروان چڑھایا۔ اور اسی طرح جہاں پشتو نظم کے دوسرے دور کی ترقی اور کامیابی

خوشحال خان اور اُس کی اولاد کی مرہونِ منت ہے۔ وہاں پشتو نثر کا بھی دوسرا دور خٹک خاندان کی کاوش اور جان کاوی کی بدولت روشن اور پشتو ادب کی تاریخ میں قابلِ قدر ہے۔

افضل خان خٹک سنہ ۱۱۸۲ھ تک زندہ تھا۔ اِس کی نثر پر اگرچہ فارسی لغات کا اثر ہے۔ لیکن جملوں کی ترکیب اور نحوی لحاظ سے پشتو ادب کی کامیاب نثر ہے۔ اس کی دوسری کتاب کلیلہ دمنہ کا ترجمہ "علم خانۂ دانش" بھی اس دور کی نثر کی شاہکار ہیں۔ مگر چونکہ یہ کتاب ترجمہ ہے۔ اس لئے اس کی نثر تاریخ مرصع کی نثر سے کچھ کم معیاری ہے

اِن دِنوں مسعود نامی ایک ادیب نے پشتون تاریخ کی ایک رومانی داستان آدم دُرخانی کے نام سے قلم بند کی۔ آدم خان عاشق تھا اور دُرخانی اُس کی معشوق اس وجہ سے ان کی داستانِ معاشقہ کو "آدم دُرخانی" کے نام سے موسوم کیا گیا جیسے۔ لیلے مجنوں اور ہیر سیال وغیرہ یہ قصہ عبدالقادر خان خٹک نے بھی لکھا ہے لیکن اُس کا کوئی نسخہ ابھی تک دستیاب نہ ہو سکا۔

مسعود کی نثر کا نمونہ

(پہ تیر زمانہ کښې پہ یوسف زو کښې یو ځوان پیدا شو چہ آدم خان نومانده و۔ د حسن خان ځوئے وو۔ او یوه ښځہ پیدا شوه چہ دُرخو نومانده وه۔ دہ د طاؤس خان لُور وه)

ترجمہ۔ گزشتہ زمانے میں علاقہ یوسف زئی میں ایک جوان پیدا ہُوا جس کا نام آدم خان تھا۔ وہ حسن خان کا بیٹا تھا۔ اور ایک عورت پیدا ہوئی جس کا نام دُرخو تھا۔ وہ طاؤس خان کی بیٹی تھی)

مسعود نثر میں خٹک خاندان کا پیرو ہے۔ اور اُس نے انہی کی طرح نثر لکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہے۔ اگرچہ اس کی نثر میں پختگی کم ہے لیکن ہم اس کی نثر کو بھی کامیاب نثر کہہ سکتے ہیں۔

مسعود کی نثر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خٹک خاندان کی نثر کا رنگ پختونخواہ میں عام ہو گیا تھا۔ اور اِس کی ظاہری اور معنوی خوبیوں نے سب لکھنے والوں کو اپنی

طرف متوجہ کیا تھا۔ مسعود افضل خان خٹک کا ہم عصر یا اس کے قریبی زمانے کا ادیب ہے ان کے بعد ہی نثر پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی نظر آتی ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۲۰۰ھ میں امیر محمد انصاری گلستان سعدی کا پشتو ترجمہ اسی طرح کامیاب نثر میں کرتا ہے چونکہ سعدی کی شخصیت، اور واعظانہ اور خطیبانہ قسم کی شاعری فارسی کے اثر کے ساتھ یہاں کافی حد تک مقبول تھی اور اُس کے اخلاقی اور اجتماعی افکار زمانہ کو مرغوب تھے۔ اور اس کی کتابوں کو درسی حیثیت حاصل تھی۔ اِس لئے امیر محمد انصاری نے اُس کے سنجیدہ اور کار آمد اشعار و اذکار کا پشتو میں ترجمہ کیا۔ انصاری صاحب کلکتہ میں رہائش پذیر تھے۔ اِن کے بعد نواب محبت خان ۱۲۲۱ھ میں "ریاض المحبت" کے نام سے ایک علمی کتاب تصنیف کرتا ہے۔ جس کے ایک باب میں پشتو افعال کی گردانیں وغیرہ اور دوسری میں لغات پر بحث ہے۔ اور اسی طرح نواب مستجاب خان "گلستان رحمت" نامی کتاب لکھتا ہے۔ ۱۲۸۲ھ کی نواحی میں مراد علی خان کاموی کی تفسیر یسیر اور ۱۲۹۰ھ کے قریب دوست محمد خان خٹک کی کتاب تفسیر "بدر منیر" جو تفسیر حسینی کا ترجمہ ہے۔ یہی اِسی قسم کی نثر کے شاہکار ہیں۔

اِن دنوں اللہ یار خان نامی ایک ادیب نے عجائب اللغات نامی پشتو زبان کی لغات پر ایک کتاب بھی لکھی۔ جو لندن میوزیم میں محفوظ ہے۔

اِس طرح نئی قسم کی نثر ترقی کر رہی تھی۔ اور اپنے اپنے دور کے ادیب اِس میں کتابیں لکھتے جا رہے تھے۔ حالات کے ردوبدل اور انقلابات کے ساتھ ساتھ پشتو نثر پر بھی اثر پڑتا رہا۔ اور جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے پشتو نثر پر خوشگوار اثر ہوتا رہا اگرچہ پشتو کے خالص ٹھیٹھ الفاظ آہستہ آہستہ ترک ہوتے جا رہے تھے۔ اور ان کی جگہ بیرونی زبانوں کے الفاظ آ رہے تھے۔ لیکن سیاسی حالات اور علمی اور ادبی فضا پر اُن کے تسلط کا تقاضا یہی تھا۔ ہمیں اِس کا افسوس بلکہ دُکھ ضرور ہے۔ کہ پشتو کے خالص الفاظ کا ذخیرہ زمانہ اپنے ساتھ ہمارے ٹکسال سے نکالتا جا رہا تھا۔ اور جہاں تک "لغات" کا تعلق ہے۔ پشتو زبان کو کافی نقصان

پہنچا۔ لیکن اِس کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ پشتو نثر عوامی لب و لہجے اور محاورے کے قریب تر آ رہی ہے۔ روانی اور عام فہمی میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ صرف و نحو کے لحاظ سے پشتو اپنی اصلیت نہیں چھوڑتی۔ جملوں کی بناوٹ اور تراکیب کی تقدیم و تاخیر پر کسی بیرونی اثر کو برداشت نہیں کرتی۔ بلکہ عربی اور فارسی کا جو اثر رو خانیوں وغیرہ کی نثر پر غالب تھا۔ وہ کالعدم ہوتا جا رہا ہے۔ طویل اور پیچیدہ جملوں کی جگہ مختصر اور سادہ جملوں کا رواج ہو رہا ہے۔ محاورے اور ضرب الامثال کا استعمال روز افزوں ہے اور پشتو نثر بالکل عام بول چال کے قریب آ رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پشتو زبان کا صحت مند معدہ نو وارد الفاظ ہضم کرتا جاتا ہے۔ اور جو الفاظ بھی باہر آ جاتے ہیں پشتو نہایت تیزی سے اُنہیں اپنا لیتی ہے۔

اِس حالت میں پشتو نثر تیرھویں صدی کی سرحد عبور کر کے چودھویں صدی میں قدم رکھتی ہے۔ تو یہاں میاں نعمان الدین کاکاخیل سفرنامہ ابن بطوطہ کا ترجمہ کر کے اِس کی نثر کی تاریخ میں ایک ارتقائی کڑی کا اضافہ کر جاتا ہے۔ اور اِسی طرح میاں محمد یوسف (سرڈیری) توبۃ النصوح کا پشتو میں ترجمہ کر لیتا ہے۔ توبۃ النصوح کی نثر روانی، عام بول چال کے ساتھ مطابقت روزمرہ محاورات اور ضرب الامثال کے استعمال میں تدیمی نثر میں ممتاز حیثیت کی مالک اور سب سے کامیاب نثر ہے۔ یہ کتاب ۱۳۱۲ھ میں چھپی ہے اور میرے پاس لائبریری میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ جس کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ اس سے پہلے نثر کی جتنی کتابیں ہیں۔ سب سے کامیاب اس کتاب کی نثر ہے۔

ان دنوں عنوان الدین کاکاخیل (سرڈیری) بھی ایک بہترین نثار گزرا ہے۔ جنہوں نے اخلاقِ محسنی کا عنوان النصائح کے نام سے پشتو میں ترجمہ کیا ہے۔ اِن کے علاوہ قاضی خیر اللہ مصنف خیر اللغات بھی اِس دَور کا مشہور نثر نگار ہے۔ بابو امیر علی خان خٹک جہانگیرہ دی بھی اسی دور کے مشہور نثار ہوئے ہیں۔ اور اِن کی قلمی کتابیں جو آج کل ان کی اپنی لائبریری میں ان کے گھر محفوظ ہیں میں نے دیکھی ہیں۔ اور ان کے مطالعے

سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ آپ نہ صرف پشتو بلکہ عربی فارسی کے بھی ادیب اور انگریزی سے بھی واقف تھے۔ پشتو کی کتابوں میں نظم اور نثر دونوں شامل ہیں۔ اور خاص کر نثر تو نہایت کامیاب اور سلیس لکھتے ہیں۔ امثال اور اشعار سے عبارت کو مزین کرتے اور سلجھے ہوئے فقرات سے نثر کو آراستہ کرتے ہیں۔ آپ بھی اپنے دور کے کامیاب اہل علم ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل کتب آپ نے ترجمہ تالیف و تصنیف کی ہیں

(۱) نریہ خوبنے مسلمان (۲) کچکول (۳) ترجمہ اخوان الصفا (۴) سحرنے ستورے (۵) مقامات امیر (۶) پینے خبورے (۷) موحد کل (۸) خوبنہ او رورہ۔

چودھویں صدی ہجری کے شروع شروع میں جن پشتو ادیبوں نے نثر کو ترقی دینے اور اس میں ادبی ذخیرہ پیدا کرنے کی کوشش اور کاوش کی ہے۔ اُن میں مولوی احمد صاحب۔ قاضی میر احمد۔ شاہ رضوانی۔ قاضی رحیم اللہ۔ منشی احمد جان، سید راحت اللہ راحت قابل ذکر ہیں۔

ان اصحاب نے پشتو نثر سے وہ تمام تکلفات، غیر مانوس ترکیبات، اور بیرونی زبانوں کا رنگ نکال دیا۔ اور نثر کو طبعی لہجے اور روزمرہ بول چال کے مطابق کر دیا۔ یہاں تک کہ اس میں عربی فارسی کا اثر بھی نہ رہا۔ آسان، سادہ اور عام فہم نثر رائج ہو گئی۔ عواطف حروف وغیرکی جا و بے جا تقدیم و تاخیر اور مرکبات میں فارسی عربی کی نقل کی بجائے شستگی روانی اور اصلیت پیدا ہو گئی۔

اور پشتو نثر ہر قسم کی قیود سے آزاد ہو کر صحیح معنوں میں پشتو کی کامیاب نثر بن گئی۔

مولوی احمد صاحب آف تنگی

یہ صاحب تیرھویں صدی کے آخری حصے کی وہ قابل قدر ہستی ہیں۔ جنہوں نے پشتو نثر کو گذشتہ تمام نثروں سے بہتر سلجھا ہوا۔ رنگین، عام فہم اور پشتو روزمرہ اور محاورہ کے مطابق بنایا محاورات اور ضرب الامثال وغیرہ کے استعمال سے عبارت کو دلچسپ بنانے میں آپ کو کمال مہارت حاصل ہے۔ خالص اور ٹھیٹھ زبان کے سلیس فقروں میں اظہارِ

خیال کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اور متانت اِن کی نثر کا خاص رنگ ہے، آپکی طرزِ عبارت پشتو نثر کی بہترین مثال اور ایک کامیاب ترین نمونہ ہے۔ اور آپ ہی ہیں جن کی بدولت پشتو نثر دوسری زبانوں کے اثر۔ عواطف کی تقدیم و تاخیر۔ جملوں کی غیر مانوس تراکیب اور ترجمے کے رنگ سے بالکل پاک ہوئی یہاں سے پشتو نثر کے کامیاب ترین اور روشن دور کا آغاز ہوتا ہے۔

مولوی احمد جان منشی احمد جان کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ ادبیات پشتو" کے مصنف صدیق اللہ خان رشتین (افغانستان) کو بھی یہ غلط فہمی ہوئی۔ اور اس نے اِن کو اور خان بہادر منشی احمد جان کو ایک شخصیت سمجھا۔ اس نقطہ نظر سے نثر کے اِس دور کے متعلق بحث کرتے ہوئے وہ مولوی احمد کی بعض خصوصیات بھی خان بہادر منشی احمد جان سے وابستہ کرتے ہیں۔ مولوی احمد ایک بہت بڑے عالم اور محدث شخص تھے۔ آپ نے مندرجہ ذیل تصانیف کی ہیں۔ (۱) کلید افغانی جو پادری ہیوز نے شائع کرائی ہے۔ وہ اسی مولوی احمد صاحب نے لکھی۔ اور "گنج پشتو" اس کا ایک بہترین حصہ ہے (۲) قصہ عجمہ اور بادشاہ" جو ۱۲۹۲ھ میں شائع ہوا ہے (۳) ترجمہ قرآن شریف جس کا پہلا پارہ ۱۳۰۵ھ میں چھپا ہے (۴) مفتاح القرآن (۵) علم غیب جن میں بدعتوں پر مفصل بحث ہے (۶) مناجات حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم (۷) بیان اور خاصیت اسماء خداوندیا" ۔

قاضی میر احمد شاہ

قاضی میر احمد شاہ رضوانی نے پشتو گرامر وافیہ کے نام سے مرتب کی۔ اور شکرستان اور بہارستان دو کتابیں لکھیں ۔ جو قدیم اور جدید شعرا کی نظم و نثر کا انتخاب ہے۔ یہ کتاب چھپ کر تعلیمی اداروں میں منظور کرائی اس طرح آپکی کوششوں سے پشتو زبان فارسی عربی اور اردو وغیرہ جیسے دوسری زبانوں کی بدولت پنجاب یونیورسٹی میں داخل ہوگئی۔

قاضی صاحب کو اپنی ادبی اور علمی خدمات کی بنا پر حکومت کی جانب سے شمس العلما

کا خطاب بھی ملا۔ آپ نے مذکورہ کتب کے علاوہ یہ کتابیں لکھیں (۱) جندری (۲) تاریخ کافرستان (۳) تاریخ آفریدہ (۴) آثار قدیمہ (۵) سفرنامہ رضوانی (۶) تجربات رضوانی (۷) التحقیق الامر (۸) دیوان رضوانی

قاضی رحیم اللہ

قاضی رحیم اللہ موضع آبدرہ تحصیل و ضلع پشاور کے باشندے تھے۔ آپ عالم و فاضل بزرگ۔ اور پشتو کے بہترین ادیب اور نثار ہوئے ہیں۔ نوی روشنی، ہمت دو مشہور پشتو ڈرامے آپ کی تصنیف ہیں۔ اس کے علاوہ مکتوبات افغانی پشتو خط و طنولیسی بھی آپ ہی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ آپ کی نثر اور عبارت بھی شستہ عام فہم اور جدت کی آئینہ دار۔

خان بہادر منشی احمد جان خان

آپ اس دور کے بہترین نثار اور پشتو زبان کے وقیع عالم ہیں۔ تمام پشتون قبائل کی زبان لب و لہجہ اور لغات سے کامل واقفیت رکھتے ہیں۔ آپ نے پشتو زبان اور ادب کو یورپ کے لوگوں سے متعارف کرانے میں تمام عمر گذاری اور اس طرح حکومت وقت کی وہ گراں قدر خدمات انجام دیں۔ جن کی بنا پر آپ کو خان بہادر۔ او بی ای اور دیگر اعزازی خطابات دیئے گئے۔ مگر ان تمام باتوں سے زیادہ قابل قدر نتیجہ جو ان کی خدمات سے حاصل ہوا ہے۔ وہ ان کی کتابیں اور علمی اور معلوماتی مجموعے ہیں۔ جو پشتو ادب کے لئے بہترین سرمایہ ہیں۔ جن میں (۱) تاریخ افغانستان (۲) قصہ خوانی گپ اور (۳) قصہ د غزا ہیت زیادہ مشہور اور بلند ادبی حیثیت کی حامل ہیں۔ آپ بھی مولوی احمد آخند کی طرح نہایت سادہ سلیس رواں اور عام فہم نثر لکھتے ہیں جو پشتو کے روزمرہ محاورات اور ضرب الامثال کی وجہ سے نہایت دلچسپ ہوتی ہے اس کے علاوہ آپ نے انگریزی میں بھی پشتو پر چند کتابیں لکھی ہیں جو ہماری بحث سے

باہر شیا -

پروفیسر عبدالمجید افغانی

پروفیسر صاحب عربی فارسی اردو اور پشتو کے جید عالم تھے - اور پشاور ایڈورڈ کالج میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر تھے - آپ نے پشتو درسی کتابوں کا ایک کورس "رہبر اخلاق" کے نام سے لکھا - جو طالب علموں کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح کے ساتھ ساتھ بہترین ادبی اور علمی مضامین کے مجموعے تھے - یہ کتابیں پانچویں سے لے کر آٹھویں تک پڑھائی جاتی تھیں - مگر اب نہیں ہیں - آپ نے اس کے علاوہ "جمال الدین افغانی" نامی کتاب بھی لکھی - آپ کی نثر بھی بہترین نثروں میں شمار کی جاتی ہے اور خاص کر "جمال الدین افغانی" کی عبارت تو نہایت سنجیدہ اور سلجھی ہوئی ہے - آپ اردو فارسی میں بھی شعر کہتے تھے

سید راحت اللہ زاخیلی

نظم کے حصے میں آپ کا تعارف بحیثیت ایک صاحب طرز شاعر کے ہو چکا ہے - جس طرح آپ پشتو نظم میں ایک جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں - اسی طرح آپ نثر میں بھی . . . اپنی مثال آپ ہیں - شاعر و ادیب ہونے کے علاوہ آپ پشتو کے مشہور صحافی اور پشتو کے سب سے پہلے اخبار "افغان" کے ایڈیٹر ہیں - اس کے علاوہ سرحد کے تمام پشتو جرائد میں آپ کا کلام نظم و نثر باقاعدہ چھپتا رہتا ہے - ۱۹۳۰ء سے "ستورے" نامی ماہوار رسالہ چلایا - جو بعد میں بند ہو گیا - راحت صاحب نے ۱۳۲۵ھ میں عربی صرف و نحو کا پشتو ترجمہ لکھ کر شائع کیا - اور اسی طرح "شرح کافیہ" کا پشتو ترجمہ بھی کیا - "لغات افغانی" کے نام سے آپ نے پشتو لغت کی کتاب بھی لکھ کر شائع کی - اور اسی طرح سب سے پہلے آپ ہی نے پشتو میں "ناول" کی بھی ابتدا کی چنانچہ ۱۹۰۹ء میں "نتیجہ عشق" نامی ناول لکھا اور چھاپا - اور اگرچہ پشتو میں منظوم رومانی قصے اور منثور کہانیاں قدیم زمانے سے موجود ہیں - لیکن وہ صنف

جسے ہم فنی لحاظ سے افسانہ کہتے ہیں۔ آپ ہی نے سب سے پہلے ۱۹۰۸ء کے قریب "شلیدلی پانہرہ" کے نام سے "افغان" اور پھر "سرحد" میں شائع کیا۔

راحت صاحب پشتو کے مشہور ترین بلکہ اولین صحافیوں میں ہیں اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ صوبہ سرحد میں پشتو صحافت اور راحت صاحب کا تعلق پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں اور اردو صحافت کی طرح ہے۔ ہاں فرق اتنا ہے کہ راحت صاحب صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے ہیں۔ جہاں "ادب و صحافت" کے قدردان نفی کے برابر ہیں۔ اگر بیداری کی موجودہ رفتار بحال رہی تو انشاء اللہ العزیز پشتو کی تاریخ میں راحت صاحب کا نام زرین الفاظ میں لکھا جائے گا۔

آپ نہایت سلیس عام فہم اور بامحاورہ نثر لکھتے ہیں پشتو محاورہ اور ضرب الامثال پر کافی عبور کی وجہ سے عبارت کو رنگین بنا لیتے ہیں۔ سنجیدہ مضمون نگاری میں بھی آپ کو خاصہ ملکہ حاصل ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ یار کے نام سے افغان کے صفحات پر مزاح و طنز کے شاہکار بھی آپ ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے آپ کی عمر اس وقت ۷۵ سال کے لگ بھگ ہے۔ مگر پشتو ادب کی خدمت کے لیے ابھی تک آپ کی ہمت جوان اور قلم رواں دواں ہے۔ میں آپ سے جب بھی ملا آپ کو مسکراتا ہوا پایا۔ اور جس موضوع پر گفتگو کی۔ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ آپ آج کل روزنامہ "شہباز" میں پشتو کے ایڈیٹر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب "صرف و نحو پشتو" ابھی ابھی چھپ چکی ہے۔

اسی طرح پشتو نثر کی گذشتہ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور تک پشتو نثر مفہوم کے لحاظ سے قصوں، کہانیوں یا مذہبی تعلیمات، اور بزرگوں کی تاریخ تک محدود تھی۔ ان کہانیوں میں اوہام پرستی اور جناتی اعتقادات کا زور اور اسی طرح تاریخ میں وسیع النظری اور جزئیات نگاری مفقود تھی۔ اس دور میں مولوی احمد صاحب نے پشتو نثر اور عبارت کو اوج کمال تک پہنچایا۔ امیر علی خان خٹک نے مقامات امیر وغیرہ لکھ کر سیاحت نامہ کی ابتدا کی۔

قاضی میر احمد خان نے پشتو کو درسی زبان بنانے کی کوشش کی۔ اور ساتھ ہی "کافیہ" پشتو گرامر لکھ کر پشتو نثری ادب میں ایک علمی دروازہ کھولا۔ منشی احمد جان نے تاریخ افغانستان" کو انگریزی سے ترجمہ کر کے پشتو زبان کو جدید تاریخی قدروں سے روشناس کیا۔ قاضی خیر اللہ اور اس کے بعد راحت اللہ نے پشتو لغات لکھیں۔ راحت اللہ راحت نے افسانہ اور ناول جیسے مشہور اصناف کی ابتدا کی۔ اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ پشتو زبان کا سب سے پہلا اخبار بھی شائع ہوا۔ یہ افغان۔ ہفتہ وار افغان" ۱۹۰۹ء میں جاری ہوا۔ اور اس کا ایڈیٹر سید عبد اللہ شاہ تھا۔ سید عبداللہ شاہ مشہور ادیب سید انوار الحق مصنف انوار اللغات (زیر ترتیب) کا بڑا بھائی تھا۔

افغانستان کے سراج الاخبار اور اتحاد مشرقی وغیرہ اس کے بعد شائع ہوئے افغان نہ صرف اس لحاظ سے قابل قدر ہے۔ کہ یہ پشتو کا پہلا اخبار ہے۔ بلکہ اس نے پشتو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور یہ معلوم کر کے تو اس کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ کہ حالات اور واقعات کے کئی ہیر پھیر اور تغیر و تبدل کے باوجود اس کی ادبی پالیسی میں کوئی ناخوشگوار تبدیلی نہ ہوئی۔ اور خاص کر راحت نے جب اس اخبار کا قلمدان ادارت سنبھالا ہے تو اس دن سے اس نے پشتو ادب کی نمایاں خدمات کی ہیں

الغرض تیرھویں صدی کا آخری اور چودھویں صدی کا ابتدائی زمانہ جس طرح پشتو نظم کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح نثر میں بھی کچھ کم اہمیت کا مالک نہیں سیاسی اور تمدنی انقلابات نے پشتو نثر میں بھی ایک عالمگیر انقلاب پیدا کیا۔ آفاقی ادب کے مطالعے اور بیرونی زبانوں سے واقفیت نے پشتو اہل قلم کو بھی ادب کی اُن قدروں سے روشناس کیا جن کی بدولت ادب زندگی کے قریب اور ادب برائے زندگی کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ احساس غلامی اور غلامی کی بنیادی کمزوری جہالت کے احساس نے قلم کو رنگین بیانی اور خوشنوائی کی جگہ ترش و تلخ

حقائق کی طرف متوجہ کیا۔ رسم و رواج اور بوسیدہ روایات میں گھرے ہوئے سماج کو راہ بتلانے کی امنگیں جاگ اٹھیں۔

اور پشتون ادیبوں میں بھی وہ احساس کروٹیں لینے لگا۔ جس کی بدولت ادب میں آفاقیت اور افادیت آجاتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان متذکرہ بالا بزرگوں کے دور کے ساتھ ساتھ ادب میں معنوی جدت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک طرف افغانستان میں پشتو ٹولنہ (PASHTO TOLANA) نے ایک ایسا بیدار مغز اور نوجوان طبقہ پیدا کیا ہے جس نے پشتو ادبیات میں قابل تعریف تیز رفتاری کے ساتھ عروج کے انتہائی مدارج طے کئے۔ اس ادارے نے پشتو زبان کی وہ گراں قدر خدمات کیں جس سے پشتو کی ہمہ گیری اور مکمل زبان ہونے کے علاوہ اس کی ادبی اور علمی . . . . . . حیثیت کو بھی چار چاند لگا دیئے پشتو ٹولنہ کی ادبی خدمات پشتو ادب کی تاریخ کا ایک روشن ترین باب ہے، اور پشتو ادب کی تاریخ پر کوئی بحث اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ مگر چونکہ سرحد بغیر میں صرف سرحد کے متعلقات سے بحث کر سکتے ہیں۔ اس لئے پشتو ادب کی تاریخ کا جو حصہ پشتو ٹولنہ سے تعلق رکھتا ہے اس مقالے سے خارج کیا جاتا ہے) دوسری طرف صوبہ سرحد کے ادبی حلقوں میں جدت پسندانہ رجحانات پیدا ہوئے۔ اور ادب کی نئی قدریں پھلنے پھولنے لگیں۔

اب ادب صرف تعشق و تصوف۔ وصال و ہجر کے انفرادی جذبات کے علاوہ اجتماعی افکار مثلاً تنقیدی اصلاحی۔ اخلاقی، علمی اور ادبی موضوعات بھی ادب میں آ داخل ہوئے۔ بیرونی زبانوں کے ادب کے ترجمے بھی کئے گئے۔ اور نظم کی طرح نثر میں بھی موضوع اور فن دونوں کے لحاظ سے کافی وسعت اور جدت پیدا ہو گئی۔ اور ادب کی وہ اصناف جو آج تک پشتو ادب میں رائج نہ تھیں یا اپنی فنی خصوصیات کے باوصف ابھی مقبول نہ ہوئی تھیں۔ اس دور میں ادب میں اُن کا رواج ہو گیا اور ابھی ترقی ترقی ہیں۔ ان میں مقالہ، افسانہ ناول، ڈرامہ، رپورتاژ، تنقید، مزاح، طنز۔ شامل ہیں۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی نثر کے متعلق ان اصناف پر علیحدہ علیحدہ بحث کی جائے

مقالہ نگاری

پشتو ادب کی جس نثر سے ہم روشناس ہو سکے ہیں۔ اس میں اکثر مسلسل ایک موضوع پر کتابیں ترجمے تاریخی قصے کہانیاں مذہبی مسائل۔ بزرگوں کے عقیدت سے بھرپور حالات، یا اس قسم کی دوسری ایسی تحریریں ہیں جنہیں ہم مقالہ نہیں کہہ سکتے۔ مقالہ اور جواب مضمون جو میرے خیال میں کسی ایک موضوع پر بالاختصار اور جامع اظہار خیال کو کہتے ہیں پشتو ادب میں دورِ جدید سے قبل اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور جہاں تک میرا اندازہ ہے "مقالہ نگاری" اور "اخبار" پشتو ادب میں توام ھیں۔ یعنی جب سے پشتو اخبار جاری ہوا ہے۔ تب سے مقالہ نگاری بھی شروع ہوئی۔ اور اس طرح اس صنف کی عمر یہاں ۴۰ سال سے آگے نہیں بڑھتی۔

بہر حال آج جب ہم اس صنعت کو دیکھتے ہیں۔ تو بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں۔ کہ پشتو ادب میں یہ خوب پھلی پھولی۔ اور کامیابی کے مدارج طے کرتی۔ آج ارتقائی عروج پر ہے۔ مقالہ نگاری کی ترقی میں ریڈیو کا بھی بہت بڑا حصہ ہے

افغان کی ابتدائی اشاعتوں سے لے کر سرحد، سیلاب، انگار، آزاد پشتون اور پشتون وغیرہ کے صفحات پر بے شمار سیاسی علمی ادبی، اخلاقی اور علم کے دیگر شعبوں سے متعلق مقالات دیکھنے سے اس دور کی مقالہ نگاری پر خوب روشنی پڑ سکتی ہے۔ اور خاص کر "ن پہ دن" دہلی "پشتون" اتمان زئی "ژوندون" دہلی۔ "افغان" پشاور "جمہوریت" اور "انقلاب" . . . . . . میں پشتو مقالہ نگاری کے بہترین شاہکار شائع ہوتے رہے . . . . . رہیں۔ ان کے علاوہ خادم محمد اکبر چارسدہ نے اپنے مقالات کو کتابی صورت میں ترتیب دے رکھا ہے۔ جن میں "گلدستہ" کافی مشہور ہے۔ اس کے علاوہ مقالات یا مضامین کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔ اخبارات ورسائل میں جو بہترین مقالات شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہر مقالہ شناس اندازہ کر سکتا ہے۔ آج کل پشتو کے بہترین مقالہ نگار یہ ہیں

ڈاکٹر احسان اللہ خاں ایم۔ ڈی۔ ماسٹر عبد الکریم۔ عبد الاکبر خان اکبر عبد الحق

خلیق - مولانا عبدالقادر - عبدالحلیم اثر - مولانا حافظ محمد ادریس - ڈاکٹر سید انوارالحق - نصراللہ جان بیرسٹر - امیر حمزہ خان حمزہ - ممند رخان بدرشوی - میاں سید رسول رسا - فضل حق شیدا - میاں بہادر شاہ ظفر - سید عظیم شاہ خیال - محمد اسلم خان خٹک - محمد نواز خان خٹک - دوست محمد خان کامل -

افسانہ

اگرچہ بعض حضرات پشتو رومانوں کو جو دوسری قوموں کی طرح پشتون کی روایات میں بھی قدیم زمانے سے چلی آرہی ہیں "افسانہ" کہنے میں تامل نہیں کرتے - مگر جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں انہیں ہم رومانی قصہ یا داستان ضرور کہہ سکتے ہیں - لیکن وہ افسانہ نہیں ہیں - یا اس قسم کے دوسرے قصے جو عام طور پر زبان زد خلائق ہیں - اور رات کو حجروں اور محفلوں میں بیان ہوتے رہتے ہیں - بعض انہیں بھی افسانہ کہیں گے لیکن وہ بھی افسانہ میں شامل نہیں - افسانہ بھی پشتو ادب میں دور جدید کی پیداوار ہے اور کافی تحقیق و تدقیق کے بعد مجھے سید راحت زاخیلی کا "شلیدلی پٹکہ" یعنی پھٹا ہوا دوپٹا سب سے پرانا اور پہلا افسانہ معلوم ہوا ہے - جو انہوں نے ۱۹۲۵ء میں لکھا اور "سرحد اور افغان" میں شائع کرایا - اس کے بعد راحت صاحب اور دوسرے ادیبوں نے بے شمار افسانے لکھے - اور چونکہ افسانہ ایک دلچسپ اور عام پسند صنف ہے اس لئے پشتون اہل قلم بھی اس طرف نسبتاً زیادہ متوجہ ہیں - جدید تعلیم یافتہ طبقہ یا بیرونی ادب کے مطالعہ رکھنے والے اور عام طور پر کالجوں اور ہائی سکولوں کے طالب علموں میں افسانہ نویسی کا شوق زیادہ ہے - اور اس لحاظ سے افسانہ لکھنے والے بہت زیادہ ہیں - مگر جتنے افسانے آج تک میری نظر سے گذرے ہیں - ان کے مطالعے سے میں اور میرے اور ادیب دوست اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ افسانے کی فنی حدود اور ٹکنیک سے ابھی پشتو ادیبوں کا ایک محدود طبقہ ہی واقف ہے - اور کم ہی کے اہل قلم افسانہ کو بحیثیت افسانہ لکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں - موجودہ دور کے افسانہ نویسوں میں

مندرجہ ذیل اصحاب کا نام قابل ذکر ہے (۱) عبدالکریم ماسٹر (۲) عبدالغفران بیکس (۳) احمد خان سمندر (۴) امیر حمزہ خان - رضا ہمندی - نادر خان بزنی

ناول

افسانے کی طرح ناول بھی پشتو ادب میں دورِ جدید کی پیداوار ہے۔ اور اس سے پہلے جو داستانیں قصے اور رومان پشتو ادب میں چلے آرہے ہیں۔ وہ اس موضوع سے باہر ہیں چاہیئے تو یہ تھا کہ مختصر طور پر ناول اور افسانہ کے فن پر کچھ بحث ہو جاتی۔ اور ساتھ ہی پشتو کی رائج داستانوں۔ کہانیوں اور رومانوں کا اس کی روشنی میں موازنہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ وہ ناول یا افسانہ میں تو شامل نہیں۔ البتہ قومی روایات اور کلچر کی بہترین مثالیں دلچسپ رومان اور پر لطف دلعزیز داستانیں ضرور ہیں۔ لیکن اس تاریخی مبحث میں فنی باریکیوں کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔

امید کہ تمام فن کار میرے ہمنوا ہوں گے۔ اور کسی کو ناول کے دورِ جدید کی پیداوار ہونے میں تامل نہیں ہوگا۔ چنانچہ سب سے پہلا ناول راحت زاخیلی کا "نتیجۂ عشق" ہے یہاں اس سے بحث نہیں کہ راحت ناول میں کہاں تک کامیابی حاصل کر سکے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ نتیجۂ عشق ناول ہے۔ چنانچہ پشتو ادب کی تاریخ میں ناول کی عمر ۴۰ سال تک متعین کرنے میں طالب علم کے پاس یہی ایک زندہ ثبوت ہے۔ راحت کے بعد ناول لکھے گئے یا نہیں اس پر خاطر خواہ بحث اس لئے نہیں ہو سکتی کہ پشتو کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست میں ہمیں کوئی ناول نظر نہیں آتا۔ اور دوسری طرف کئی اصحاب کے پاس ناول کے قلمی مسودے موجود ہیں۔ اور کئی ایسے اصحاب بھی ہیں۔ جو ابھی ناول لکھ رہے ہیں۔ اس سے اتنا تو صرف معلوم ہوتا ہے۔ کہ پشتون ادیب ناول سے غافل نہیں۔ اور ناول نگاری کا فن پشتو ادب میں موجود ہے۔ لیکن کچھ تو تعلیم یافتہ طبقہ اپنی زبان اور اس کی ادبی کتابوں سے بے توجہی اور کچھ اہلِ قلم کی تنگدستی اس فن کی خاطر خواہ ترقی میں مانع ہے۔ اور جب تک ہمارے پاس کتابی شکل میں ناول موجود نہیں۔ ہم اس کی تاریخ اور فنی ترقی پر بحث نہیں کر سکتے

ڈرامہ

افسانے کی طرح ڈرامہ بھی پشتو ادب میں ابھی ابھی داخل ہوا ہے۔ اور دورِ جدید سے قبل اس کی مثال نہیں ملتی۔ جیسے روورز سکاؤٹس، انجمن اصلاح الافاغنہ کے اصلاحی پروگرام کالج کی انجمنوں، اور دیہات سدھار کی دوسری جماعتوں نے پروپیگنڈا کے لئے اس مؤثر اور دلچسپ ذریعے کی طرف متوجہ ہو کر پشتو ادب میں ڈرامہ کی ابتدا کی۔ مگر سب سے پہلا اور ہر لحاظ سے کامیاب ڈرامہ جو آج بھی کتابی شکل میں موجود ہے: "دہ وینو جام" "یعنی خون کا پیالہ" ہے۔ جو محمد اسلم خان خٹک ڈائرکٹر محکمہ تعلیم صوبہ سرحد کی تصنیف ہے اور ۱۹۲۵ء میں چھپا ہے۔

ڈرامہ "دہ وینو جام" سے پہلے "خونی منظر" نامی ڈرامہ بھی محمد اسلم خان خٹک ہی نے تصنیف کر کے ریڈیو سے نشر کیا۔ اور اسی طرح کئی اور ڈرامے بھی شاید ہوں گے جن سے پشتو ادب میں ڈرامے کی ابتدا پر روشنی پڑتی ہوگی۔ مگر چونکہ وہ صرف سٹیج یا فضائی لہروں تک محدود۔ یا ادیبوں کی فائلوں میں محفوظ رہے۔ اور ان کا نشان اب پشتو ادب کی تاریخ میں نہیں۔ اس لئے سب سے پہلا ڈرامہ محمد اسلم خان خٹک کا "دہ وینو جام" قرار دیکر اس سے پشتو ادب میں ڈرامے کی ابتدا کے بحث کا آغاز کیا جاتا ہے۔ جہاں تک "دہ وینو جام" کا تعلق ہے۔ پلاٹ، کردار، واقعات اور ماحول ہر لحاظ سے خٹک صاحب نے کامیابی حاصل کی۔ اور پشتون تہذیب و تمدن کی ایسی کامیاب عکاسی کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خٹک صاحب نے فن پر کافی دسترس کے باوصف اس کے لئے کافی مطالعہ کیا ہے۔ زبان ٹھیٹھ عام فہم اور ہر کردار کے ساتھ اُن کی مخصوص زبان اور محاورہ قابل داد اور فنی لحاظ سے قابل تعریف ہے "دہ وینو جام" سٹیج بھی ہوا اور ریڈیو سے نشر بھی ہوا۔ اس کے بعد خٹک صاحب کی سرپرستی میں ریڈیو نے پشتو ڈرامہ کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع دیا۔ اس وقت سے آج تک ریڈیو نے ریڈیائی قسم کے ڈراموں کو کافی فروغ دیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پشتو ڈرامے کی رفتار اور

عروج میں ریڈیو کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ ریڈیائی ڈراموں کے علاوہ اور سکاؤٹس سیاسی تحریکوں اور سکولوں اور کالجوں کی سوسائٹیوں نے سٹیج کے ڈراموں کو بھی ترقی دی۔ اور دیتو جام کے بعد دوسرا مشہور ڈرامہ "درس عبرت" عبداللہ جان اسیر کی تصنیف کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ بھی ایک کامیاب ڈرامہ ہے ـــــ اسی طرح عبدالخالق خلیق کی تصنیف ڈرامے "خوبنہ ژوندون" (میٹھی زندگی) اور شہیدہ سکینہ بھی کافی مشہور ڈرامے ہیں۔

قاضی رحیم اللہ صاحب کے تہمت اور نوی روشنی (نئی روشنی) بھی اسی دور کے قابلِ داد ڈرامے گنے جاتے ہیں۔ عبدالاکبر خان اکبر کا لکھا ہوا "جونگڑہ" نامی ڈرامہ۔ فضل رحیم ساقی کا "یسیرہ مرگئے" اور طلبا کی تصنیف "درد" بھی ڈرامے کی تاریخ کی ارتقائی کڑیاں ہیں۔ اور یہ سب کے سب سٹیج بھی ہوسکے ہیں۔ اور کتابی شکل میں بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ایک پشتو سٹیج ڈرامہ خیبر کی آواز بھی ہے۔ جو سید رشید علی صاحب نے انگریزی میں لکھا تھا۔ اور بعد میں سید موصوف اور نصراللہ جان نصر نے اسے پشتو میں ترجمہ کیا۔ یہ ڈرامہ کئی دفعہ ایڈورڈز کالج۔ اسلامیہ کالج اور تہکال میں سٹیج کیا گیا۔ ریڈیائی ڈراموں میں عبدالکریم خان مظلوم۔ امیر حمزہ خان شنواری۔ داؤد شاہ برق۔ سمندر خان سمندر سید رسول رسا اور راقم الحروف کے ڈرامے ریڈیو سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں عبدالکریم خان مظلوم نے چند ڈرامے "پیچرے" (چہرے) کے نام سے کتابی شکل میں شائع بھی کئے ہیں۔ عبدالخالق خلیق۔ رضا ہمندی۔ حافظ محمد ادریس۔ سید الابرار الحق۔ محمد حکیم خان بھی ریڈیائی ڈراموں میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان اصحاب کے علاوہ سید عظیم شاہ خیل بخاری میاں بہادر شاہ ظفر کاکاخیل۔ عبدالغفران بیکس اور اسی طرح کئی ایک ادبا سٹیج ڈرامہ لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ پشتو ادبا میں سے کئی ایک اور بھی ڈرامہ لکھنے والے موجود ہیں۔

طنز و مزاح:۔

یہ ایسی چیزیں ہیں کہ انسانی فطرت میں ہر وقت اور ہر دور میں موجود رہتے ہیں

اس لئے میرے خیال میں کسی زبان کے ادب میں اس موضوع پر بحث کرنے کا یہ مدعا ہے کہ اس زبان کی ادبی اصناف میں طنز یا مزاح ایسی فنی اقدار کب سے شروع ہوئیں۔ اور کہاں تک کامیاب ہے۔ تو اس لحاظ سے پشتو ادب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نظم میں تو خوشحال اور رحمان بابا کے دور سے لے کر آج تک بہت سے شعرا کے کلام میں طنز موجود ہے۔ اور اس دور میں یآر (راحت) لیونے فلسفیؒ (عبدالغنی خان) عبدالاکبر خان اکبر نے اس کو خوب چلا دی۔ اور نثر میں بھی دور جدید سے پہلے دینی تاریخی اور قصصی تحریروں میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ البتہ موجودہ دور کے سب سے بہترین نثار ماسٹر عبدالکریم کا مسلسل مقالہ "نئی دنیا" شیر را بناڈیری کے "بخیری" (انگارہ) کے عنوان سے مقالات" ۔ " ڈاکٹر ان زدہ کا کا جی" کے نام سے مضامین اور لیونی فلسفی کے دلچسپ بیانات طنز کی نہایت کامیاب مثالیں ہیں۔ یہ تمام کے تمام سیاسی رنگ کے ہیں۔

اسی طرح مزاح بھی پشتو شاعری میں قدیم ادوار سے رائج ہے اور خاص کر عوامی شعرا مثلاً گل ملا ۔ کچے ملا ۔ اور غوئے ملا وغیرہ نے تو اس فن کو کمال تک پہنچایا ہے۔ ان کے علاوہ رسالہ ژوندون (زندگی) دہلی میں لوطی خاں کے نام سے مزاح نگاری کے کامیاب ترین نمونے لکھے جاتے ہے۔ جن سے پشتو میں مزاح کے فن کو کافی فروغ ہوا اس کے علاوہ انتوان کے صفحات پر یآر اور پشتون میں لیونے فلسفی کا طنزیہ مزاح بھی کسی طرح کم نہیں تھا اور نثر میں رضا مہمندی کے مستے افسانے اور مقالے اس صنف میں شامل ہو سکتے ہیں۔ یآر اور خاص کر لیونے فلسفی کے مضامین مزاح کی بہترین مثالیں ہیں۔

سمندر خان بدرشوی کی طبیعت میں بھی مزاح کا رنگ غالب بھرا ہوا ہے جس سے ریڈیو سننے والے حضرات تو بخوبی واقف ہیں۔ البتہ اس ریڈیو کے "قاضی" اور قاضی ہدایت خان کے مکالمے لکھنے والے کو جو نہ پہچانتے ہوں۔ وہ ان کا متین اور سنجیدہ چہرہ دیکھ کر شاید یہ ماننے میں کچھ تامل کریں۔

اِن حضرات کے علاوہ مزاح نگاری اور طنز نگاری کے نمونے اور بھی کافی ہیں جن سے پشتو ادب میں مزاح اور طنز نگاری پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔

سیاحت:۔

سب سے پہلا سیاحت نامہ خوشحال خان خٹک نے سوات نامہ کے نام سے لکھا ہے اور وہاں کے ریاست سوات کے سفر کے حالات ہیں۔ یہ منظوم ہے۔ ان کے بعد اس صنف کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ البتہ نعمان الدین کاکاخیل نے ١٣٢١ھ میں سفرنامہ ابن بطوطہ کا پشتو میں ترجمہ کیا۔ جو اب ناپید ہے۔ اور پھر موجودہ دور تک ہمیں سیاحت نامہ یا سفرنامہ کی مثال نہیں ملتی۔ البتہ امیر علی خان خٹک نے مقامات امیر لکھ کر اس فن میں پشتو ادب کے لئے ایک کتاب چھوڑ دی۔ دورِ جدید میں نصراللہ خان نصر (ادبی لوے) نے "امب کا سفر" کے نام سے نثر میں ایک سیاحت نامہ لکھا۔ جو شائع بھی ہوا۔ اِس کے علاوہ موجودہ دور میں سیاحت نامہ کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی۔

دورِ جدید میں مندرجہ بالا اصنافِ ادب کے علاوہ بہت سی تاریخی۔ درسی۔ علمی اور اخلاقی کتابیں لکھی گئی ہیں جن کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے

(١) پیست اولار۔ سمندر خان بدرشوی کی چند نظموں کا مجموعہ (٢) دقران ڈیوا سمندر خان بدرشی کی ایک معرکتہ الآرا نظم جس میں رزم بزم۔ اسلامیات اور اخلاقیات سب پر روشنی ڈالی گئی۔ (٣) د ایلم پہ سوکہ" کوہِ ایلم کی چوٹی پر سمندر خان کی ایک بہترین نظم جو کتابی شکل میں شائع ہوئی ہے (٤) دشاعر دنیا "شاعر کی دنیا" محمد سرور خان مفتون کی فلسفیانہ غزلوں اور رومانی نظموں کا مجموعہ (٥) د بیں یا مکلونہ میاں سید رسول رسا کی بہترین نظموں کا مجموعہ (٦) فالہ زار۔ محمد یونس خان خلیل کے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے خیالات (٧) افکارِ خٹک خان بہادر میاں احمد زمان خان خٹک کے سنجیدہ خیالات کا مجموعہ (٨) "پاکستان" خادم محمد اکبر چارسدہ کے مخصوص طرز و فکر کی نظموں اور مضامین کا مجموعہ (٩) "خزانی شاعرہ" ادبی ٹولی برتہکال نے خزان

پر ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ اس مجموعہ میں وہ اشعار، غزلیں اور نظمیں ہیں۔ جو اس مشاعرے میں پڑھی گئیں۔ (۱۰) "جوشِ آفت" زیور شاہ آفت، چارسدہ کے اشعار کا مجموعہ۔

تعلیمی اور درسی کتب (۱) پشتو کورس قاعدہ اوّل سے لے کر چوتھی جماعت تک جو حکیم عبدالخالق خلیق نے مرتب کیا ہے (۲) عبدالمجید افغانی کا مڈل کلاسوں کے لئے کورس جو رہبر اخلاق کے نام سے موسوم تھا۔ خلیق صاحب کی کتابیں تو اب تک سکولوں میں رائج ہیں اور عبدالمجید افغانی کی کتابیں اب کورس سے خارج ہیں (۳) مولانا مولوی عبدالسلام نے "ادبی سوغات" کے نام سے بہترین مضامین اور نظموں کا مجموعہ تعلیمی اور درسی ضروریات کے ماتحت مرتب کیا ہے۔ جو شاید ابھی تک درسی حیثیت سے منظور نہیں ہوا۔ (۴) صرف و نحو" راحت زاخیلی نے پشتو گرامر پر ایک کتاب لکھی جو ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔

تاریخی:۔ (۱) سید جمال الدین افغانی کی سوانح حیات از مولانا عبدالمجید افغانی۔
(۲) "تاریخ ہندوستان" جو مولوی عبدالغفور قاسمی نے تاریخ فرشتہ سے ترجمہ کی ہے اور والئی سوات نے شائع کی

(۳) "تاریخ سوات" مولانا عبدالغفور قاسمی کی تصنیف

(۴) "تاریخ بغداد" پشتو نثر میں راحت زاخیلی کا ترجمہ

(۵) "موزرنامہ" تاج محمد زیب سر ادیب سوات کی تصنیف

(۶) "تاریخ پشتون" قاضی عطاء اللہ نے تالیف کی ہے اور ادارہ اشاعت سرحد نے شائع کی

(۷) "سید جمال الدین افغانی" فضل حق شیدا نے حال ہی میں لکھ کر شائع کرائی ہے

سیرۃ النبی

(۱) سیرۃ النبی جلد اول (مولانا شبلی) کا پشتو ترجمہ عبدالکریم خان مظلوم نے کیا

(۲) شکلے رسول۔ حاجی خانمیر ہلالی کی تالیف

(۳) نمونہ رسول ۔ پیر بخش خان ایڈوکیٹ نے لکھی ہے

لغات :۔

لغات افغانی سید راحت زاخیلی نے مرتب کی ہے

ان کے علاوہ "انوار سہیلی کا پشتو ترجمہ" جو مولانا عبدالغفور قاسمی نے کیا سدور والی سوات نے شائع کرایا ہے ۔

تصوف :۔

امیر حمزہ خان شنواری کی . . ایک جامع کتاب (تجلیات محمودیہ) تصوف کے رموز و اسرار پر ایک بہترین کتاب ہے ۔

ان شائع شدہ کتابوں کے علاوہ خوشحال خان خٹک کے مزار کے افتتاح کی تقریب میں جو ادبی کانفرنس اور مشاعرہ منعقد ہوا تھا اُس کے تمام اشعار، مضامین اور اس کے علاوہ خوشحال خان کے متعلق کئی ایک قابل تعریف نظموں اور مضامین کا مجموعہ "د تورے او قلم خاوند" کے نام سے ادبی جرگہ والے چھاپ رہے ہیں ۔ جو زیر طبع ہے ۔ سمندر خان سمندر کی غزلیات کا مجموعہ اور . نادر خان جرمی کے افسانے زیر طبع ہیں

ان کے علاوہ پشتو ٹپوں کا ایک بہترین اور ضخیم مجموعہ (د ژوند مور پہ وینو سو) (۲) پشتو محاورات و اصطلاحات اور صرف و نحو سید عظیم شاہ خیال سابق صدر پشتو بزم ادب ۔ پشتو شعر و شاعری پر تنقید و تبصرہ عبدالغفران بیکس ناظم اعلے پشتو بزم ادب قامی آئینہ (تاریخ پشتو) میاں بہادر شاہ ظفر پشتو بزم ادب ۔ علم عروض پر جامع اور مفصل کتاب رازِ عروض از سمندر خان بدرشوی جو ابھی منظر عام پر نہیں آئیں پشتو ادب کا قابل قدر سرمایہ ہیں۔

انوار اللغات: - ڈاکٹر سید انوار الحق (رشید د) تقریباً دس بارہ سال سے پشتو لغت لکھنے میں مصروف ہیں - جس کی وہ کئی جلدیں لکھ چکے ہیں - ان کے خیال کے مطابق اس لغت میں پچاس ہزار الفاظ آنے تھے - لیکن اب تو یہ تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے - ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش یقیناً گرانقدر اور بیش بہا ہے - پشتو زبان یقیناً اس لغت پر فخر کر سکے گی -

اخبارات و رسائل

گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے - کہ سب سے پہلا اخبار ہفتہ وار "افغان" تھا جو ۱۹۔۔ء میں جاری ہوا اور آج تک جاری ہے - آج کل اس کے ایڈیٹر سید راحت اللہ زاخیلی ہیں -

آزاد پشتون - زلمے پشتون، سرحد، انگار، سیلاب، پشتون، ستورے، ہشے، ژوند، نن پرون، سرانجام، خیبر میل، شیتور غلا وغیرہ کوئی کم عرصہ کوئی زیادہ شائع ہوئے اور بند ہوتے رہے

پشتون سب سے کامیاب اور کثیر الاشاعت ۔۔۔ روزہ رسالہ تھا - اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سرخپوش تحریک کا آرگن تھا - اس کے ایڈیٹر عبد الخالق خلیق تھے - اسی طرح نن پرون اور ژوند - حکومت نے پرچے تھے - لیکن ان کی ادبی خدمات قابل تعریف ہیں - آج کل افغان کے علاوہ جمہوریت پشاور جس کے . . . . ایڈیٹر خانمیر ہلالی اور انصاف مردان جس کے ایڈیٹر قاضی عبد الحلیم اثر افغانی ہیں - پشتو کے ہفتہ وار اخبار ہیں -

ماہناموں میں "عدل" قابل ذکر ہے جس کو تقریباً چھ ماہ تک راقم الحروف مرتب کرتا رہا اور اب . . . - میر محمد خان مشارق کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے - دوسرا ماہنامہ "اسلم" جس کے صرف دو پرچے نکلے ہیں - اور جس کو صنوبر حسین مومند جیسا قابل ادیب چلا رہا ہے +

فارغ بخاری

(خوشحال خان کی ایک نظم)

لالہ زار

پھر میری قوم کے جوانوں نے
اپنے ہاتھوں کو کر لیا ہے سرخ
جیسے شاہین صید سے اپنے
تیز پنجوں کو سرخ کرتا ہے
پھر میری قوم کے جواں ساتھی
اپنی براق و تیز تلواریں
دشمنوں کے لہو کی سرخی سے
لالہ گوں کر کے رقص کرتے ہیں
ہاڑ کے گرم و خشک موسم میں

فصل گل کا سماں نظر آیا
ہر طرف لالہ زار دیکھتا ہوں
میرے ایمل[1] کو اور دریا[2] کو
حق تعالےٰ امان میں رکھے
فرض اپنا انہوں نے پہچانا
سُرخ ہے آج وادیٔ خیبر
بکڑپہ[3] پہ بھی گرجتی ہیں توپیں
اور باجوڑ[4] کا یہ عالم ہے
جیسے میدانوں اور پہاڑوں پر
موت کا زلزلہ سا طاری ہے

●

ع۱ ع۲ ایمل خان اور دریا خاں خوشحال خان کے مشہور جرنیل
ع۳ ایک مقام کا نام ہے
ع۴ ریاست سوات کو باجوڑ بھی کہتے ہیں

(سید رسول رسا کی دو نظمیں)

باغی دہقان

ہمارا تمہارا خدا ایک ہے
جب کہ ہم دونوں ہی اس کے بندے ہیں تو پھر
یہ تفریق کیوں ہے یہ تقسیم کیوں ہے
یہ کیوں ہم گدا اور تم شاہ ہو
یہ کیوں بھوک سے ہم تڑپتے ہیں اور تم
خدا کی وسیع سرزمین کے اکیلے ہی وارث بنے ہو
یہ کیوں اتنے مجبور ہیں ہم کہ سجدہ تمہیں کر رہے ہیں
اسے بھول کر جس نے پیدا کیا ہے
تمہارا ستم اور انگریز کا ظلم سہتے ہیں ہم
کیوں کہ تم بھیڑیئے ہو
اور ہم بے زبان اور مظلوم بھیڑوں کے ریوڑ کی مانند خاموش ہیں
یہ کھیتی یہ دانے یہ برسات
ان سب کا مالک خدا ہے۔

جلا ان کو دیتی ہے محنت ہماری
مگر اس کے حاصل پہ قابض ہو تم یہ عجب ماجرا ہے
کبھی ہاڑ کی ہم ابلتی دوپہروں میں جلتے ہیں
اور پھر کبھی پوہ کی زہریلی فضاؤں میں دم توڑتے ہیں
مگر عیش و عشرت کی شاداب جنت میں تم پل رہے ہو
ہمارے ننھے سے معصوم بچے جو بھوکے ہیں ننگے ہیں بیمار ہیں
اور ہم ہیں کہ بیکس ہیں لاچار ہیں
ہمارے گھروں میں تو مٹی کا اک ٹمٹماتا دیا بھی نہیں ہے
یہاں تو اندھیرا ہی رہتا ہے اک دائمی اور بھیانک اندھیرا
ہمارے لہو سے تمہارے محل جگمگاتے ہیں ان میں چراغاں رہتا ہے ہر وقت
سدا عیش و عشرت میں تم ہو مگن اور ہم ہیں کہ محنت کے رتھ میں جتے ہیں
یہ پیمانہ ہاتھوں میں تھامے ہو جس کو ہمارے ہی سر سے بنایا ہے
ہمارے ہی خون سے یہ لبریز ہے
تم مئے سرخ کہہ کر جسے پی رہے ہو
ہمارا ہی دل بھون کر تم کرگس کی طرح کھا رہے ہو
تم نے شیروں کو گیدڑ بنایا ہے

زمیں یہ زمیں تو تمہاری نہیں ہے
زمیں یہ زمیں تو ہماری نہیں ہے
یہ سب کی ہے اور سارے وارث ہیں اس کے

رضا ہمدانی

خوار و زار مزدور

یہ کہنہ نظامِ جہاں جو مسلط ہے ہم پہ
اسے زر پرستوں نے تشکیل دی ہے
یہ مزدور کا خون پینے کا اک ڈھونگ ہے بس

یہ جاگیرداروں اور کارخانوں کے مالک
وہ گدھ ہیں جو مزدور کے گوشت پر پل رہے ہیں

یہ فاشسٹ جو زندگی کی مسرت پہ چھائے ہوئے ہیں
غریبوں کو ــــ کچھ بھیک دینا بھی ان کو گوارا نہیں ہے
اسی واسطے آج مزدور یوں خوار اور زار ہیں

یہ سرمایہ داروں کو پیغام دے دو
درانتی ہتھوڑا، ہتھوڑا درانتی
یہی دو نشاں ہیں یہاں مخلصوں کے
یہی توڑ ڈالیں گے اک دن تمہاری خدائی کے جھوٹے بتوں کو

رضا ہمدانی

(غنی خان کی دو نظمیں)

اے انقلاب

اے انقلاب آ تیرے قربان جلد آ
ہاتھوں میں حریت کی ضیا بار شمعیں لئے
آ جلد آ کہ ہم کو تیرا انتظار ہے
کبک دری کی طرح سے آ جھومتا ہوا
اے انقلاب تیرا مددگار ہر پٹھان، ہر جوان، سب جہان ہے
آ برق بن کے کہنہ نظاموں کو پھونک دے
جس طرح تو نے زار کو اور اس کے خانداں کو مٹایا تھا دہر سے
ویسے ہی پھر جلال میں۔ اور جوش قہر سے
سرحد کی سرزمین پہ بھی ہنگامہ گرم کر

●

ماں

ماں

اگر غلامی کی موت میں مر گیا تو آ کر
تو میرے سنگ مزار پر تھوکنا
اگر اس انگریز کی سپہ نے نہ ٹکڑے ٹکڑے کیا مری لاش کو
تو کس منہ سے تو میری موت پر اشکبار ہو گی
اگر میں اپنے لہو سے اپنے وطن کی خاطر نہیں نہایا
تو دیکھنا خانۂ خدا کو نہ غسل سے میرے کرنا ناپاک
میں اپنے پیارے وطن کو باغ عدن بنا کے رہوں گا اک دن
نہیں تو میرے حسین نغمے پٹھان بھائی نہ سن سکیں گے

●

خاطر غزنوی

(علی خان کی ایک پشتو نظم)

بیٹی

یہ بیٹی حقیقت میں اک حادثہ ہے
کہ بیٹی کے غم سے زیادہ جہاں میں کوئی غم نہیں ہے
خدایا! کسی پر نہ آئیں وہ لمحے — کہ بیٹی جنم لے
اگر خوشنما — حوروں سی رنگت
تو سمجھو اندھیروں پہ اب بھی اجالے کا ہلکا سا اک خول سمجھو
برائی تو چھوڑو اگر کوئی تعریف بھی اس کی کر دے
تو بیٹی کی یہ مدح بھی ہے لئے اپنے دامن میں طومار بے آبروئی
اگر جرم لڑکے کا ہو تب بھی رشتوں میں ملزم ٹھہرتے ہیں لڑکی کے وارث
اگر مل رہا ہو کہیں تخت شاہی بھی بیٹی کے بدلے میں آ دست در م پہ
ہزاروں کا یہ مہر ہے پھر بھی مہنگا
مرے ہاں نہ بیٹی نہ بیٹا ہے کوئی
مگر میں نے دیکھا سنا ہے یہ اکثر
کہ بیٹی کے غم سے زیادہ جہاں میں کوئی غم نہیں ہے

خدایا اماں دے مجھے بیٹیوں سے
اگرچہ جہاں میں کئی لوگ اب بھی طلبگار اس جنس کے دیکھتا ہوں

عبدالودود قمر

(غنی خاں کی کتاب "پٹھان" کے ایک افسانے کا ترجمہ)

پور[1]

شیر خاں کا باپ اپنے گاؤں کا خان تھا بڑا نیک اور پرہیزگار مگر کمزور —— گاؤں کی حکایت میں خان کے طاقتور تربور برابر کے شریک تھے۔ زیادہ اثر و رسوخ اور طاقت حاصل کرنے کے لئے ان کی آپس میں بڑی کشمکش رہتی۔ لیکن شیر خان کا والد کوئی پروا نہ کرتا۔ اس دنیا کی کمزوری کی تلافی آخرت کے حسین خوابوں سے کی جاتی ہے۔ شیر خاں کے والد کا بھی یہی حال تھا۔ گاؤں کا خان مگر فقیروں کے لباس میں رہتا۔ ریوالور کے بدلے تسبیح خرید لی اور حجرہ چھوڑ کر مسجد کا ہو رہا۔ وہ دن رات خوفِ خدا سے کانپ جاتا۔ پر سچ پوچھئے تو اس خوف کے پردے میں زیادہ تر تربوروں کا ڈر تھا۔ ایک خدا رسیدہ بزرگ بننے کی آرزو میں وہ اپنی زندہ دلی کھو بیٹھا وہ تمباکو اور نسوار کی برائیاں بیان کرتا اور اس وعظ کے دوران میں اپنی داڑھی سے کھیلے جاتا۔ اس کی ظاہرداری کمزوری بن کر رہ گئی جو اس کی بیوی کو ایک آنکھ نہ بھاتی اس کا بیٹا شیر خاں سچ مچ کا شیر تھا۔ ماں اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔ بچپن سے ہی باپ کو اس پر ہاتھ اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ انیسویں برس میں وہ بڑا دلیر، بدلگام اور سرکش ثابت ہوا۔ باپ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا اور ماں کو خاطر میں نہ لاتا ——

باپ کو اپنی زندگی کی کھوئی ہوئی خوبیاں بیٹے کی جوانی میں نظر آرہی تھیں۔ دوسروں پر چھا جانے والی طاقت، تحکمانہ لہجہ جاذبِ توجہ صورت اور ناچتی ہوئی شوخ چمکیلی آنکھیں —— ماں اپنے شوہر میں جن خوبیوں کی آرزو میں زندگی کے دن کاٹ چکی تھی۔ انہیں بیٹے میں دیکھ کر اسے کھوئی ہوئی دولت مل گئی۔ ماں باپ دونوں اس پر جان چھڑکتے اور وہ

[1] انتقام

انہیں خاطر میں نہ لاتا۔ البتہ اپنے گاؤں کے نوجوانوں سے وہ محبت پیار سے پیش آتا باہم گپیں اڑاتے، جوئے میں ہار جیت ہوتی اور اکثر ایک ہی چھت تلے سو رہتے ——

اس کے چچا دلیر خاں کی عقابی نگاہیں اپنے ہونہار بھتیجے کے جوہر تاڑ گئیں بکرالے ہوئے چہرے اور ہاتھی کی سی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا گرگ کہن سال دلیر خاں بڑا پیٹو، اچھا شکاری اور مانا ہوا خراج انسان تھا۔ وہ ہمیشہ مقروض رہتا تھا۔ وہ مہمان نواز بھی تھا خوشامدی اور مکار بھی —— اسے اپنے بڑے بھائی سے اس کی کمزوری کے باعث بے حد نفرت تھی۔ وہ اس سے برا برتاؤ کرتا —— اور یہی برتاؤ اس کے بھائی کو حجرے اور کھیتوں سے مسجد میں پہنچا دیتا۔ در اصل گاؤں کا خان تو دلیر خان ہی تھا اور اس کا بھائی تو مدلٹیا تھا وہ نمازیں پڑھاتا اور وعظ کئے جاتا۔ اور دلیر خاں شکار کھیلتا۔ قوالیاں کراتا اور لوگوں کو دعوتیں کھلاتا۔ ایک ہی گھرانے میں دو بھائیوں کے فرائض کی تقسیم اچھی تو تھی اور نبھے جا رہی تھی۔ مگر ایک بات نے اسے روک دیا۔ دلیر خاں کا بیٹا قربان خاں پڑوس کے گاؤں میں عمر قید کاٹنے کے بعد واپس آگیا تھا۔ یہ سزا اسے ایک ایسے قتل کے بدلے میں ملی تھی جو اس سے سرزد نہیں ہوا تھا۔ بہرحال وہ ایک مشہور فسادی تھا اور گاؤں کے لوگ اکثر اس کی بے مثال جرأت اور بلند ہمتی کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک جھگڑے میں قربان نے دلیر کے باپ یعنی اپنے چچا کی ٹانگ میں گولی مار دی تھی۔ بوڑھے چچا نے اسے معاف کر دیا کیونکہ یہ فعل اس سے عمداً سرزد نہیں ہوا تھا۔ لیکن قومی روایات اسے نہیں بھول سکتی تھیں۔ خون پکار رہا تھا اس کے باپ کا خون ——

قربان چودہ سال قید کاٹنے کے بعد یہ سمجھا تھا کہ اس نے اپنے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ وہ جیل سے پاک، دیانتدار اور رحمدل بن کر نکلا۔ گاؤں کے لوگ اس کے پاس اس لئے جمع ہوتے کہ وہ اپنے ہیرو کو دیکھیں لیکن بجائے سرکش اور بہادر قربان کے ان کو ایک سیدھا سادہ اور باتمیز انسان نظر آیا اور وہ اسے پہلے سے زیادہ پوجنے لگے۔

دلیر کے حجرے میں جمگھٹا کم ہونے لگا اور قربان کے ہاں زیادہ —— دلیر نے نہایت فراخدلی سے خرچ کرنا شروع کیا۔ وہ بہت زیادہ ضیافتیں کرنے لگا اور دل کھول

کر قرض لینے لگا۔ لیکن اس کے باوجود قربان ہی کا پلہ بھاری رہا۔ وہ ہر روز اپنے دسترخوان پر ایسے لوگ دیکھتا تھا جو اس کے بھنے ہوئے دنبوں پر ہی ہاتھ صاف کرتے آتے تھے۔ اس کے برعکس قربان کے ہاں کھانا بالکل سادہ ہوتا تھا۔ مہمان مخلص، وفادار ہوتے اور نوکر بہادر اور ایماندار ــــــ دلیر رفتہ رفتہ قربان کے ہنستے ہوئے چہرے اور اس کی شریفانہ طبیعت سے نفرت کرنے لگا۔ کیونکہ اس کی یہی خوبیاں دلیر کی ذلت کا موجب بن رہی تھیں۔

شیر بڑا ہوا تو وہ مضبوط، غیور اور خوبصورت جوان تھا۔ دلیر اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں جب جھانکتا تو وہ کانپ اٹھتا۔ دلیر جب قربان کے حجرے میں نوجوانوں کو سریلی آواز میں گاتے سنتا اور اپنے حجرے سے صرف بوڑھے ساتھیوں کی کھانسی اور خرخراہٹ کی آوازیں آتیں تو وہ غصے سے دیوانہ ہو کر اپنا ریوالور اٹھا لیتا اور اپنے پانچ سالہ بچے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے چھوٹے سے سانولے چہرے کو غم آلود نگاہوں سے دیکھتا اور کہتا ــــــ

"دلاور! میرے بچے۔ تمہیں اس گاؤں کا خان ضرور بننا ہوگا چاہے اس کے لئے مجھے اپنی جان کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔"

دلیر ایک دن شیر کو اپنے ہاں کھانے پر لایا اور اسے ایک پستول بطور تحفہ دیا جو سب سے قیمتی تحفہ جو ایک پٹھان دوسرے پٹھان کو دے سکتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے پیش آیا اور اس نے اس کے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا۔ اس پر شیر خان پھولے نہ سمایا اور چونکہ اپنے باپ کی خشک طبیعت سے تنگ آ چکا تھا اس لئے وہ اپنے چچا سے محبت کرنے لگا۔ دلیر خاں نے اپنے بھتیجے پر خوب دل کھول کر خرچ کیا۔ اس کے دوستوں کی تواضع میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا اور اپنے دوستوں سے بہت اچھے الفاظ میں اس کا تعارف کراتا۔ اسے شکار کے لئے دور دراز وادیوں اور جنگلوں میں لے جاتا۔ اس کی باتیں ایک دوست کی طرح سنتا اور اس کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتا۔ غرض کہ اس نے تھوڑے دنوں میں ہی شیر خاں کے دل کو موہ لیا۔ جب دلیر خاں کو یقین ہو گیا کہ شیر رام ہو گیا ہے تو وہ اس کے دادا کے متعلق اسے کہانیاں سنانے لگا۔ وہ شیر کو اپنے مرحوم باپ کی خوش خلقی، مہربانیوں اور رحمدلی کی داستانیں سناتا۔ وہ ان

کہانیوں میں ایسا رنگ بھرتا جو شیر کو مرغوب تھا۔ اور جب اسے یقین ہو گیا کہ شیر اپنے دادا کو پوچھنے لگا ہے تو ایک دن اس نے بتایا کہ قربان نے اسے گولی مار دی تھا۔ یہ سنتے ہی شیر غصے کے مارے لال بھبوکا ہو گیا اور اس نے غضبناک ہو کر کہا:-

"تم اتنے ڈرپوک نکلے کہ اپنے دادا کا انتقام نہ لے سکے۔"

ولیہ نے محبت سے اپنی باہیں اس کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے کہا۔ میرے بیٹے جب سے وہ تیرے کا تذکرہ کیا ہے رات کی نیند اور دن کا چین مجھ پر حرام ہے۔ آج تم سے رخصت ہونے کے لئے ہی میں نے تمہیں بلایا ہے۔"

شیر نے جھنجلا کر کہا۔ اب تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں اور وہ چل دیا۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں کاٹی۔ اپنے دادا مرحوم کی بابت سوچتا رہا اور اپنی بیوی کی اسے خبر تک نہ رہی جو اس کے پہلو میں پڑی ہوئی تھی۔

ایک افسردہ شام کو جب کہ کافی سردی تھی اور رات ہی ہونا بارش بھی ہو رہی تھی قربان انگاروں کو الٹ پلٹ رہا تھا اور ساتھ اپنے کاشتکاروں کو ایک کہانی سنا رہا تھا۔

"تم جانتے ہو جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ میں بھی ایک زمانے میں جوان تھا اور خیال کرتا تھا کہ دنیا میرے لئے ہے۔ جو کوئی میرا ہم خیال نہ ہوتا تھا اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ ایک شام کسی زنگی نے میرے ساتھ جھگڑا کیا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اسے قتل کر دوں گا۔ دوسرے ہی دن میں قتل پیدا کرنے کے لئے نکلا۔ لیکن غلطی سے میں نے اپنے پیارے چچے کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ جب مجھے اس کا علم ہوا تو میرے حواس جاتے رہے اور میں مارے ندامت کے خودکشی پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن میرے بزرگ اور اچھے چچا جان نے مجھے معاف کر دیا لیکن اس کے باوجود میری روح کرب سے تڑپ رہی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک مہینے کے بعد کسی نے زنگی کو مار دیا۔ چونکہ میں نے کھلے بازار میں زنگی کو قتل کی دھمکی دی تھی اس لئے اس کے بھائیوں نے مجھ پر مخبری کر دی۔ میں نے چپ سادھ لی اور زنگی کے قتل کی پاداش میں اپنے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے عمر قید کی سزا گوارا کر لی ——"

ی دوران میں دو مہمان اندر داخل ہوئے جن کے پاس بندوقیں تھیں۔ قربان خان نے مسکرا کر ان سے پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہو ہو؟"

"ہم بیر گاؤں سے گمشدہ خچر کی تلاش میں آئے ہیں" ——— یہ کہہ کر وہ ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد دیگر سب لوگ چلے گئے۔ قربان بھی باہر نکل گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ایک خوانچے لے کر اندر داخل ہوا جس میں کھانے کی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے نہایت مہربانی سے انہیں کھانے کے لئے بلایا۔ ایک مہمان نے اپنی بندوق اٹھا کر اس کی آنکھوں میں گولی مار دی اور دوسرے نے سینے میں ———
قربان لڑکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر آرہا۔

دونوں مہمان باہر بھاگے اور شیر خان سے آملے۔ جو قریب ہی کھیتوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ پگڈنڈیوں اور کھڑی فصلوں سے بھاگتے ہوئے اپنے گھوڑوں تک پہنچے۔ اور سوار ہو کر اندھیری رات میں تحلیل ہو گئے۔

دوسرے دن دلیر نے قربان کے بھائیوں سے کہا کہ قربان کو شیر خان نے قتل کیا ہے۔ شیر خان گرفتار کر لیا گیا اور اسے چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔ سات سال قید کاٹنے کے بعد شیر خان کو باقی میعاد کی معافی مل گئی۔ وہ زیادہ مضبوط اور تنومند ہو کر جیل سے باہر آیا۔ دلیر نے اس کے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت دی۔ شیر نے دعوت قبول کر لی کیونکہ وہ اپنے چچا پیر رحیم نے اسے بیوقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کیا تھا) اپنی نفرت کا اظہار نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دلیر سے کنزا کے گاؤں کا مطالبہ کیا جس کا وہ مستحق تھا۔ دلیر نے پستول پر ہاتھ رکھتے ہوئے تن کر کہا "میرے جوان بھتیجے۔ تم یہ بھول گئے ہو کہ ایک پٹھان اپنی جان دے دیتا ہے لیکن اپنی زمین یا عورت سے دستبردار نہیں ہوتا کیونکہ یہ دونوں اس کے لئے متبرک چیزیں ہیں۔"

دوسرے ہی لمحے شیر کے پستول کی گولی دلیر کے سینے کو چھیدتی ہوئی حجرے کی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ دلیر کا ہاتھ اپنے پستول پر دھرے کا دھرا رہ گیا اور وہ اپنی زمین کی حفاظت کے لئے سچ مچ اپنی جان پر کھیل گیا ———

شیر قانونی چارہ جوئی سے بچنے کے لئے مفرور ہوگیا۔ اور غیر علاقے کے ایک اجڑے ہوئے گاؤں میں زندگی کے دن گذارنے لگا۔

اس واقعے کو پندرہ برس کا طویل عرصہ گذر چکا ہے۔ شیر خان کے قوی مضمحل ہو چکے ہیں وہ اپنے کئے پر بے حد پشیمان ہے اور خلوت میں پہروں افسوس کرتا ہے۔

دلیر خان کا بیٹا جوان ہو چکا ہے وہ شیر خان کی طرح مضبوط، جری اور خوبصورت ہے۔ وہ اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لئے شیر خان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ایک دن ان دونوں نے ضرور ملنا ہوگا ——— بدلہ اور موت ——— موت اور بدلہ یہی پٹھان کی زندگی کا محور ہیں اور ایک لامتناہی سلسلہ ——— !

•

لیٹے ہوئے شیر کی نسبت چلتا پھرتا گیدڑ اچھا ہوتا ہے۔

پشتون غیرت کی صفت سے پہچانا جاتا ہے۔

جب ہاتھ ٹوٹ جائے تو اسے گلے سے لگا لیتے ہیں

(پشتو ضرب الامثال)

خاطر غزنوی

پن چکی

(امیر حمزہ خاں کے ایک پشتو ریڈیائی ڈرامے کا ترجمہ)

افراد

پسنہارا	راوی
شیر گل	گندم پسوانے والا لڑکا
قاسم خاں	گاؤں کا عیاش ملک
کلیم کاکا	قاسم خان کا ایک بوڑھا کارندہ
منور خان	قاسم خان کا ایک اور کارندہ
حکیم خان	گاؤں کا ایک غریب کسان
جمیلے	حکیم خان کی نوجوان اور خوبصورت لڑکی
نعمت خان	حکیم خان کا بھتیجا اور جمیلے کا منگیتر
صحبت	ایک غنڈہ۔
جمال خان	ہوس خیل گاؤں کا ملک

اور کچھ دوسرے لوگ

پہلا نظارہ

[پن چکی چل رہی ہے۔ اور لوگوں کی بات چیت بھی سنائی دے رہی ہے]

شیر گل: پسہارا بابا۔ پسنہارا بابا!!

پسنہارا: کیا ہے بیٹا (آواز سے بڑھاپا جھلک رہا ہے)

شیر گل: مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بہت دور سے آیا ہوں، ذرا جلدی باری دیجیے۔

پسنہارا: بیٹا چاہے بیٹا ہو چاہے باپ کی ہو لیکن کام اپنی باری پر ہوگا۔ میں نے تمہیں ایک بار تو کہہ دیا۔ اچھا لیکن تم ہو کہ . . . . .

شیر گل: اچھا بابا، آپ ناراض نہ ہوں لیکن آخر یہ کمبخت باری کب آئے گی

پسنہارا: ان ز بوریوں کی گنتی ہو بس جائے تو پھر تمہاری باری ہے۔

شیر گل: لیکن یہ تین بوریاں تو شام تک بھی نہ پس سکیں گی

پسنہارا: تو قصہ ورس کا ہے۔ تم ذرا جلدی آجاتے، تو سویرے ہی فارغ ہی ہو جاتے۔ یوں بھی تو یہی ہے۔ چاہے باپ کی ہو لیکن . . . .

شیر گل: یوں معلوم ہوتا ہے کہ میری آج کی رات یہیں کٹے گی آپ کا مہمان بن کر۔

پسنہارا: دونوں آنکھوں پر، اس دنیا کے رہنے والے سبھی مہمان ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ میزبان کون ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنا رزق ملتا ہے

کوئی بھی ایک دوسرے پر بوجھ نہیں۔ مہمان کی آمد پر ناراضگی کا اظہار اپنے عقیدے کی کمزوری کا اظہار ہے۔

شیر گل! بابا جی! آپ تو بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں

پسنہارا! بیٹا! آدمی بڑا ہو جائے۔ تو جوانوں کے دلوں کی باتیں کر سکتا ہے۔ تم التفات نہیں؟ میں اتنے میں چند ایک شعر سناتا ہوں

شیر گل! ضرور سنائیے، کیوں نہیں۔ وہ ان کی تو انتہاء ہو تو بڑی چاہیئے ضرور سنائیے

پسنہارا! دنیا کی چکی پر ہم سب دانوں کی صورت آتے ہیں۔ اور آٹے کی صورت پس کر چلے جاتے ہیں۔ اگر تم آسمان کی طرح بلند اور پہاڑ کی طرح بھاری ہو جاؤ۔ لیکن آسمان کی چکی میں تم گندم کی طرح پس جاؤ گے۔ اگر حقیقت کی ندی کا رخ پھر جائے۔ تو انسان ٹھہری ہوئی پن چکی کی طرح بے جان ہو کر رہ جائے۔ چکی کی طرح پتھر بن جاؤ۔ اور دوسروں کا غلہ اپنے پاس نہ رکھو

شیر گل! سبحان اللہ بابا! بہت خوب

لوگ! بہت اچھے۔ بہت اچھے

پسنہارا! لڑکو! لے لو تمہاری گندم تو پس گئی۔ اب شام ہے نماز کے لئے تیاری کریں۔ کیوں جوان! ہاں سچ تمہارا نام کیا ہے۔

شیر گل! خاکسار شیر گل کہلاتا ہے

پسنہارا! شیر گل! خوب، تو شیر گل بیٹا نماز پڑھ لیں چلو۔ تمہاری باری ہو گئی ناراض تو نہیں ہو۔

شیر گل! نہیں بابا! آپ سے کون ناراض ہو سکتا ہے۔

ایک لڑکا! بابا یہ مزدوری تو لے لو

پسنہارا (جاتے جاتے) بیٹا! اس ٹوکری میں ڈال دینا

(چکی چلنے کی آواز بند ہو جاتی ہے)

دوسرا لڑکا! (اپنے آپ سے) کتنا ایماندار ہے۔ اس کا خیال ہی نہیں کرتا کہ کوئی

کچھ اٹھا لے جائے گا بامزہ دروں کم غوے دے گا واقعی یہ شخص سچا مسلمان ہے۔

دوسرا نظارہ

پسنہارا! اب چائے کا وقت ہے چائے بھی پیئیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔ کیوں شیر گل۔

شیر گل! ٹھیک ہے بابا، لیکن میری گندم؟

پسنہارا! ہاں میں نے پانی کا رخ پھیر دیا تھا۔ ٹھہرو اس کا رخ پھر سے بدل دوں

شیر گل! آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں ہی پانی کا رخ بدل دیتا ہوں

پسنہارا! اچھا جاؤ! میں تمہاری گندم پیسنے کے لئے تیار کرتا ہوں

(کچھ دیر وقفہ۔ پھر سے پن چکی چلنے کی آواز آتی ہے)

پسنہارا! شیر گل بیٹا اب آجاؤ! (سرسر داخل)

شیر گل! آتا ہوں بابا (آتا ہے)

پسنہارا! بیٹھ جاؤ

شیر گل! اچھا! پن چکی بھی چلتی رہے گی، چائے بھی تیار ہوتی رہے گی لیکن اگر میں ایک بات پوچھ لوں تو ناراض تو نہ ہوں گے آپ

پسنہارا! نہیں بیٹا ناراضگی کس بات کی، کہو کیا کہنا چاہتے ہو

شیر گل! بابا! آپ کی شکل و شباہت معمولی آدمیوں کی طرح دکھائی نہیں دیتی آپ کی باتوں سے بھی بڑے آدمیوں کی بو آتی ہے۔ اگر میرا خیال غلط نہیں تو پھر آپ کا اس پن چکی میں کیا کام؟

پسنہارا! (ٹھنڈی آہ بھر کر) بیٹا تمہارا خیال غلط نہیں، میں اگر یہ کام چھوڑ دوں تب بھی خدا کا فضل ہے سب کچھ اللہ نے دیا ہوا ہے لیکن ایک تو میں اس پن چکی پر عاشق ہوں۔ کیونکہ میں نے اسی پن چکی سے انسانیت کا راز پایا اور دوسری بات یہ ہے کہ میں اپنے خویش و اقارب کے لئے مر چکا ہوں۔ انہوں

نے میری قاں، چالیسواں اور برسی، سب کچھ کر دیا ہے۔ اب میرے جانے کا
کوئی فائدہ بھی نہیں!

شیر گل! کیا آپ مجھے اپنی سرگذشت نہ سنائیں گے

پسنہارا! تمہیں سب کچھ سچ سچ کہہ دوں گا۔ لیکن یہ نہ پوچھنا کہ میں کون ہوں
اور کہاں کا رہنے والا ہوں

شیر گل! اچھا نہیں پوچھوں گا

پسنہارا! اس کہانی کا ایک کردار میں بھی ہوں

شیر گل! ہونہہ ——

پسنہارا! سارے کام خدا کے، ایک دفعہ کا ذکر ہے، کہ پٹھانوں کے علاقے کے ایک
گاؤں میں۔ ۔

(پن چکی کی آواز پس منظر میں ڈوب جائے)

پہلا نظارہ

قاسم! کلیم کاکا! کیا خبر لائے

کلیم! قاسم امرخ کی دیسی ایک ٹانگ، حکیم اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے

قاسم! (غصے سے) اچھا! حکیم اب اتنا بڑا آدمی ہو گیا ہے کہ مجھ سے خوشامد و منت
کی توقع رکھتا ہے۔ ہونہہ! چیونٹے کی موت آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے
ہیں

کلیم! خان جی میں نے اسے بہت کچھ کہا سنا، سمجھایا کہ تمہاری بیٹی ملکہ بن جائیگی
تم بھی اس کے طفیل مزے کرو گے۔ لیکن وہ کہتا ہے۔ کہ میں نے اُسے بچپن
ہی میں اپنے بھتیجے نعمت خاں سے منسوب کر دیا ہے۔ اور دوسرے یہ بھی
کہتا ہے کہ میں اپنی بیٹی سوت پر نہیں دینا چاہتا

قاسم! بکتے ہیں کہ بکری دودھ تو دے گی۔ لیکن مینگنیوں بھرا! لاٹھی کے مسلمان

یہ باتوں کا اثر نہیں ہوتا

کلیم ! ہاں خان! کسی نے کہا ہے، جہاں تاب نہیں وہاں تو اب نہیں

قاسم ! ذرا سوچو! حکیما ایک معمولی کسان، رات کے کھانے کو ہے صبح کچھ نہیں، میں اس سے بیٹی مانگتا ہوں۔ اس پر خدا کا شکر نہیں کرتا الٹا انکار کرتا ہے

کلیم ! اور انکار بھی شریفانہ طور پر نہیں

قاسم ! میرا تو خیال تھا کہ سیدھا ہو جائے گا۔ لیکن اب اسے سیدھا کرنا پڑے گا

کلیم ! ہاں قاسم خان! ٹیڑھی تلوار کے لئے ٹیڑھی نیام بنتی ہے

قاسم ! کلیم کاکا! باہر جاکر ذرا منور خاں کو بھجوا دو

کلیم ! بہت اچھا ——— (جاتا ہے)

قاسم ! (اپنے آپ سے) اتنا غرور! مٹھی بھر مٹی اور نظر آسمان کی طرف، جب غریب بھی ہو اور مغرور بھی، تو خدا واسطے کا دشمن، ایسے بُرے آدمی کا خاتمہ کر دینا ہی بہتر ہے

(منور خاں آتا ہے) آؤ منور خاں

منور خاں ! قاسم لالہ! خیر باشد

قاسم ! دیکھو نا! اس کم بخت حکیمے نے پھر انکار کر دیا

منور ! تو پھر کیا علاج کیا جائے، وہ بڑا ٹیڑھا آدمی ہے۔ بالکل کتے کی دم! برسوں سانچے میں رکھو! پھر ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔

قاسم ! تو پھر ایسے آدمی کا علاج ہونا چاہیے۔

منور ! موت سے اچھا اور کیا علاج ہے

قاسم ! تو بس پھر ختم کر ڈالو اسے

منور ! لالہ ایک بات کہوں

قاسم ! کہو

منور ! اب گاؤں میں گھر گھر یہ خبر پھیلی ہوئی ہے کہ حکیم نے قاسم خان کے

ساتھ بیٹی بیاہنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان حالات میں اگر ہم اسے قتل کر دیں۔ تو اپنے پرایوں میں ذلیل ہو جائیں گے، ایسا کام کریں کہ سانپ بھی مر جائے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

قاسم! منور، تم ہمیشہ میرے کاموں میں میں میخ نکالتے ہو

منور! لالہ یہ آپ کی بدگمانی ہے۔ ورنہ مجھے آپ کا ہر حکم یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اپنے باپ کا! اور اگر میں کبھی آپکو کوئی رائے دیتا ہوں، تو اس میں بدنیتی کا شائبہ تک نہیں ہوتا، ذرا آپ سن اور سوچ لیں۔ اگر پسند آئے تو خیر ورنہ حکم کیجئے۔ جو کہیے گا۔ وہی ہوگا

قاسم! اچھا کہو! بات ختم کرو

منور! آپ کا یہی مطلب ہے ناکہ حکیم راستے سے ہٹ جائے یا اور کچھ

قاسم! ہاں یہی چاہتا ہوں

منور! تو یہ کام ہم کسی دوسرے کی مدد سے بھی کر سکتے ہیں سا اگر شہد سے کام چلتا ہے تو زہر دینے کی کیا حاجت

قاسم! تو کیا پھر لوگ یہ نہ کہیں گے کہ قاسم نے روپے دے کر حکیم کو مروا ڈالا

منور! کہیں گے تو ضرور! لیکن ہمارے قتل کرنے کے سے تو یہی بہتر ہوگا! لیکن لالہ ایک بات اور بھی ہے

قاسم! دوسری کیا بات ہے؟

منور! چلئے فرض کیا ہم نے حکیم کو مار ڈالا۔ اس کا کام تمام ہو گیا۔ اور اس کی بیٹی رہ گئی۔ لیکن اس کا منگیتر نعمت خاں جاب جوان ہے، کیا وہ اپنی منگیتر کو چھوڑ دے گا۔ اس لئے جو کام حکیم کے مار ڈالنے سے بھی نہیں ہوتا اسکا فائدہ؟

قاسم! تو پھر بہتر یہی ہے کہ نعمت خاں کو مار ڈالا جائے

منور! وہ بالکل بے گناہ ہے۔ اور پھر نہایت خوبصورت جوان ہے
قاسم! اگر تم سے یہ کام نہیں ہو سکتا تو تم نہیں دوسرا، دوسرا نہیں تیسرا سہی
میرے پاس روپیہ ہے اور روپیہ پہاڑوں کو بھی تہ و بالا کر سکتا ہے
منور! میں انکار نہیں کرتا لیکن مجھے موقعہ دیجئے کہ میں حکیم پر کسی دوسرے ذریعے
سے دباؤ ڈالوں۔ دیکھئے شاید سیدھے راستے پر آ جائے۔
قاسم! کتنے دنوں میں یہ کام ہو جائے گا
منور! کوئی میں دن تو چاہئیں
قاسم! بہت اچھا کر لو کوشش
منور! آپ بے فکر رہیں

دوسرا نظارہ

(حکیم اپنے بھتیجے سے باتیں کر رہا ہے)

حکیم! نعمت خاں بیٹا
نعمت! کیوں کاکا جی
حکیم! جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کس لئے بلایا ہے
نعمت! نہیں کاکا جی! خیر تو ہے نا
حکیم! ہاں خیر ہی ہے، خدا کے سبھی کام خیریت ہی کے ہوتے ہیں۔ لیکن بات صرف
اتنی ہوتی ہے کہ ہم اپنے نفع نقصان کو نہیں سمجھ سکتے۔
نعمت! جی ——— ؟
حکیم! بات یہ ہے کہ ہم نے دس سال اللہ داد کی زمین میں کھیتی باڑی کی اور
اپنی غربت کی زندگی نہایت عسرت کے ساتھ گذاری۔ لیکن اب
شاید قسمت میں یہ نہ ہو
نعمت! یعنی اللہ داد نے جواب دے دیا

حکیم! ہاں بیٹا! آج اللہ دادنے جواب دے دیا، اور کہہ دیا کہ دو دنوں کے اندر اندر میرا مکان بھی خالی کر دو

نعمت! لیکن اللہ دلو کے ساتھ تو آپ کے بڑے اچھے تعلقات تھے، آخر یہ سب کچھ کس بات پر — ؟

حکیم! اس نے قاسم کی طرف داری کرتے ہوئے یہ کام کیا۔

نعمت! قاسم خان کی وجہ سے ؟ — آپ کو کیسے پتہ چلا کاکا جی

حکیم! اس نے مجھے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر قاسم خان کے ساتھ رشتہ کر دو تو بہتر ورنہ —

نعمت! قاسم کو اگر خدا نے جائیداد اور خانی دی ہے تو اب وہ غریبوں پر ظلم کرنے لگا ہے۔ بڑا ہی وائی خصلت کا ——

حکیم! بیٹا غصہ مت کرو۔ ہماری مثال مکی کے اس دلنے کی سی ہے۔ جو چکی میں شور تو بہت کرتا ہے۔ لیکن چکی کو توڑ نہیں سکتا۔ ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ سچ پر قائم رہیں اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیں

نعمت! تو اب کیا کرنا چاہیئے۔

حکیم! پہلی بات یہ ہے۔ کہ میں نے تمہارے باپ کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا۔ کہ جمیلے کی شادی تمہارے ساتھ کر دوں گا اور الحمدللہ کہ اب تم دونوں جوان ہو۔ قاسم خان کی نیت اچھی نہیں، اور وہ اپنی طرف سے حتی الامکان دباؤ ڈال چکا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آج ہی تم دونوں کا نکاح پڑھوا دیا جائے تاکہ قاسم خان کا بخار بھی ٹوٹ جائے۔

نعمت! (خاموشی)

حکیم! اس کے متعلق قاسم خان کو پتہ چلا تو میں جانتا ہوں کہ وہ بدلہ لینے کی کوشش شروع کرے گا۔ جو ہوگا وہ ہوگا۔ کسی کے ڈر اور دباؤ سے ہم اپنا اصول نہیں چھوڑ سکتے سیدھے راستے سے ہٹنا ایک مسلمان کا کام نہیں سب

کام خدا کے ہیں اور اسی سے پناہ مانگنی چاہیئے ـــــ ہمارا دوسرا کام یہ ہے کہ کل صبح ہی اس گاؤں سے چل دیں۔

نعمت! کاکاجی! کہاں جائیں گے۔

حکیم! خدا کی زمین بہت وسیع ہے بیٹا، فقیر کے لئے ایک در بند ہزار در کھلے
مزدوری کرنی ہے، جہاں ہمارا رزق مقرر ہو گا وہیں جائیں گے

نعمت! آخر کوئی نہ کوئی جگہ تو آپ کی نظر میں ہو گی ہی

حکیم! ہاں میرا خیال ہے کہ ہوس خیل چلے جائیں۔ وہاں جمال خاں کے پاس
رہیں گے۔

نعمت! بہتر، جو آپ کی مرضی

(باہر سے آواز آتی ہے)

آواز! حکیم کاکا! ذرا باہر آنا

حکیم! آؤ بیٹا باہر جائیں (باہر جاتے ہیں) منور خاں! اچھے تو ہو

منور خاں! شکریہ آپ بھی تو اچھے ہیں نا۔ حکیم کاکا

حکیم! بیٹا نعمت خاں! ذرا چلم بھرنا۔ خان کیا خدمت کر دں

منور! خوش رہو! ـــ بس یونہی تمہیں دیکھنے کے لئے چلا آیا تھا

حکیم! بڑا کرم کیا۔ ہم آپ کے خدمت گار ہیں

نعمت! (چلم کا دھواں نکالتے ہوئے) لیجئے خان

منور! (چلم پیتا ہے) مہربانی، تمہاری عمر دراز ہو بیٹا (کھانستا ہے) حکیم کاکا!
آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں

حکیم! بہت اچھا! فرمایئے

منور! مجھے آج پتہ چلا ہے کہ اللہ داد نے تمہیں بے دخل کر دیا ہے

حکیم! ہ۔ ہاں درست

منور! تو پھر کیا ارادہ ہے تمہارا

حکیم ! بندے کا کیا ارادہ ہو سکتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہو وہی ہوتا ہے
منور ! پھر بھی کچھ سوچا ہو گا تم نے
حکیم ! ہاں جب تک انسان زندہ ہے۔ ہاتھ پاؤں تو ہلاتا ہی رہے گا
منور ! اگر تم چاہو تو میں قاسم خاں سے تمہارے لئے زمین اور کنواں مانگ لوں گا
حکیم ! خدا تمہیں برکت دے۔ (ہلکی سی ہنسی) وہاں تو......
منور ! کیوں وہاں کیا عیب ہے۔۔ اب تم کہاں مارے مارے پھرو گے، اور کس کس کے دروازے پر دستک دو گے۔ یہ تو گھر کی بات ہے
حکیم ! منور خاں بھائی ! بات یہ ہے کہ قاسم خاں کے ساتھ میرا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ میرے تعلقات اچھے نہیں رہ سکتے
منور ! لیکن تعلقات اچھے رکھنا تو تمہارے اپنے بس میں ہے
حکیم ! یہ میرے بس میں ہے ؟ مگر میرے بس میں نہیں، میں نے اپنی بیٹی اپنے بھتیجے سے منسوب کر دی ہے۔ اب میں اپنے اقرار سے کیسے پھر سکتا ہوں
منور ! بچپن کے اقرار بھی کیا ہوتے ہیں۔ ہم تمہارے بھتیجے کو راضی کر لیں گے۔ اور اس کے لئے دوسری شادی کا بندوبست کر دیں گے
حکیم ! یہ ناممکن ہے۔ میرا بھتیجا اس کے لئے کبھی تیار نہ ہو گا۔
منور ! بہر حال تمہاری اس میں سلامتی نظر نہیں آتی
حکیم ! سلامتی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ انسان نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان
منور ! اتنا غرور مت کرو، تمہاری حیثیت ہی کیا ہے
حکیم ! میں اپنے خیال میں مغرور نہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو سچا سمجھتا ہوں۔ اور اگر میں سچا نہیں تو خدا مجھے ہدایت دے۔ باقی رہی دنیاوی حیثیت ! تو واقعی میری کوئی حیثیت نہیں۔ اور نہ میں اس کا دعویٰ کرتا ہوں
منور ! آخر ایک دن تم نے میری ہی بات پر آنا ہے۔ طاقت سب کچھ کرا لیتی ہے

حکیم! تسلیم! لیکن طاقت کا سرچشمہ خدا ہی ہے

منور! اور اسی خدا نے قاسم خان کو طاقت دی ہے

حکیم! اگر خدا نے اسے طاقت دی ہے تو ہمیں بھی صبر عطا کیا ہے

منور! حکیم کاکا! پھر بھی سوچ لو، تم بھول رہے ہو

حکیم! میں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے، نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے

منور! اچھا تو تم جانو اور تمہارے کام، میں جا رہا ہوں۔ (جاتا ہے)

حکیم! خدا حافظ! ——— گیا، نعمت خاں بیٹا! تیاری شروع کر دو کل صبح ہم جائیں گے

نعمت خاں! بہت اچھا بابا ———

تیسرا نظارہ

حکیم! جمیلے بیٹی (تم اور حکیم آہستہ آہستہ پیچھے آؤ۔ میں آگے آگے چلوں گا)

نعمت! کیوں کاکا جی!

حکیم! میرا خیال ہے کہ قاسم اور منور ہماری روانگی سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ وہ ضرور ہماری گھات میں ہوں گے، تم پیچھے ہی رہو تو بہتر۔ خدانخواستہ اگر پھر ایسی ویسی بات ہو گئی تو میرے ساتھ ہی ہو گی۔ میں یوں بھی بوڑھا ہوں، عمر گذار چکا ہوں

نعمت! کاکا جی! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، میں زندہ ہوں اور آپ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھے، خدا کی قسم میں ———

حکیم! (بات کاٹتے ہوئے) بیٹا قسم مت اٹھاؤ، جوانی کے پہاڑ کی چوٹی سے ہر چیز قریب دکھائی دیتی ہے لیکن اس تک پہنچتے پہنچتے آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے، جوش اور غصے کی حالت میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ میں جو کچھ تمہیں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو

نعمت! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ دونوں پیچھے پیچھے آئیں اور میں آگے آگے

جاؤں گا

حکیم: نہیں جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ٹھیک ہے، تم آہستہ آہستہ آؤ۔ (چلتے ہیں)

(راستے میں)

نعمت: جمیلے یہاں بیٹھ جاؤ ذرا سستا لیں، ہمارا گدھا بھی کمزور ہے۔ خیر سامان بھی کوئی اتنا زیادہ نہیں۔ لیکن کاکا جی —

جمیلے: چاہئیے تو یہ تھا کہ آپ آگے آگے چلتے، لیکن بابا جی کی بات ماننے سے انکار بھی ممکن نہیں، اچھا خدا خیر کرے

نعمت: پہلے تو کچھ بھی نہیں اور فرض کیا کچھ ایسی ویسی بات ہوئی بھی تو دیکھیں گے اللہ خیر کرے گا۔

جمیلے: وہ دیکھئے! میرے بابا جی درختوں کی اوٹ میں ہو گئے

نعمت: تو پھر چلو! کہ ہم اُن کے پیچھے چلیں (گدھے کو ہانکتا ہے) تمہارا سامان تو بھاری ہو گا —

جمیلے: نہیں نہیں کوئی اتنے زیادہ برتن نہیں ہیں

نعمت: لاؤ لاؤ میں اٹھا لوں

جمیلے: نہیں نہیں میرے پاس ہی رہیں (فائر کی آواز)

نعمت: گولی کی آواز سنی کیا — ؟

جمیلے: گولی ہی کی آواز ہے — خدایا خیر کرنا

نعمت: جمیلے! میں جاتا ہوں! تم یہیں رہنا

جمیلے: جاتے ہو — ؟

نعمت: ہاں کاکا جی کی زندگی ہم سے زیادہ قیمتی ہے، اچھا خدا حافظ (دوڑتا ہے — پھر فائرنگ ہوتی ہے)

جمیلے: (روتے ہوئے) یا اللہ خیر۔ خدایا خیر

چوتھا نظارہ

صحبت! منور خاں! حکیم تو ٹھنڈا ہو چکا اب کیا کریں
منور! صحبت! نعمت خاں اور حکیم کی بیٹی بھی پیچھے آ رہے ہیں۔ راستے کے ادھر اُدھر بیٹھ جاؤ اور سنو
نعمت! (دور سے) کاکا جی — کاکا جی —— میں آ رہا ہوں میں آ رہا ہوں)
منور! وہ نعمت خاں تو آگیا' بیدار رہو کہیں زندہ نہ نکل جائے
صحبت! بے فکر رہو — موت اسے سیدھا یہیں کھینچ کر لا رہی ہے
نعمت! کاکا جی (آتا ہے) اف — کاکا جی تو مرے پڑے ہیں — او ظالمو — یہ تم نے کیا کیا؟ نہتے کو مار ڈالا' اب کہاں چھپے بیٹھے ہو' ذرا سامنے تو آؤ' بے غیرتو — کافرو! (فائر کی آواز: — آہ — اللہ (گر پڑتا ہے)
منور و صحبت! چلو! چلو آؤ! حکیم کی بیٹی ضرور راستے میں ہوگی' کہیں نکل نہ جائے۔
صحبت! چلو (جاتے ہیں)
منور! (چونک کر) ٹھہرو — وہ سامنے دیکھو! وہ ایک پورا گروہ
صحبت! واقعی! خدا کی قسم! ارے وہ لڑکی بھی ان کے ساتھ ہے
منور! افسوس بچ گئی' یہ تو کوئی راہرو ہیں' اب کیا کریں
صحبت! کرنا کیا ہے' لڑیں گے ان کے ساتھ
منور! نہیں نہیں ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔ جانے دو انہیں پھر دیکھیں گے جلدی آؤ اور اِدھر اُدھر چھپ جاؤ
(دور سے بھیلہ کے رونے اور لوگوں کی باتوں کی آواز)

جمال خاں! بچی رو نہیں! تو میری بیٹی ہے ۔ میرا نام جمال خان ہے ۔ میں پوس
خیال کا رہنے والا ہوں ۔ میرے پیچھے پیچھے آتی جاؤ ۔ گھبراؤ نہیں ۔ ابھی سب پتہ چل جائیگا
۔۔ اے یہ ۔۔

جمیلے! یا خدا! یہ تو بابا جی ہے (روتی ہے) یا اللہ ۔۔ یہ کیا تھا اور کیا ہو گیا! یا خدا
تو نے مجھے کس کے سہارے دنیا میں اکیلا چھوڑ دیا ۔

جمال خاں! یہ نوجوان اس کے ساتھ کون ہے

جمیلے! (روتے ہوئے) یہ میرے ۔۔۔ ہے ۔۔۔ رے چچا کا بیٹا ہے

جمال! معلوم ہوتا ہے یہ تمہارا شوہر ہے ۔۔۔ جاؤ لڑکو! ۔۔ دو چارپائیاں
دوڑ کے لے آؤ

آواز! بہت اچھا خان

جمال! افسوس ظالموں نے ۔۔۔ اوہو ۔ یہ بوڑھا تو زندہ معلوم ہوتا ہے ۔

جمیلے! میرا بابا!

جمال! ہاں بیٹا! دیکھو نا ۔ نبض چل رہی ہے خدایا تیرا شکر! ٹھہرو
اس جوان کو دیکھتا ہوں ۔۔ (دیکھکر) بیٹا مبارک ہو یہ بھی ابھی تک زندہ ہے

جمیلے! خان کاکا! خدا تمہیں سلامت رکھے ۔۔ یا اللہ میرے بابا کو اچھا کر دو

پانچواں نظارہ

(پن چکی کی گڑگڑاہٹ)

شیر گل! اچھا! تو گویا دونوں موت سے بچ گئے ۔ شکر ہے ، سچ کہتے ہیں ۔ کہ جسے
خدا رکھے اسے کون چکھے ۔

لیسنہارا! ہاں! اور اسی پن چکی پر میرا یہ عقیدہ یقین میں بدل گیا کہ جو شخص اللہ
تعالیٰ کا ہو جاتے ، اللہ تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے

شیر گل! یہ کیسے بابا! کچھ مجھے بھی سمجھا دیجئے ۔

پسنہارا! وہ دیکھو! یہ دیکھ رہے ہو یہ جو پاٹوں کے عین درمیان سیدھی سی
میخ کھڑی ہوئی ہے۔

شیر گل! جی ہاں اسے قطب یا محور بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے آپ کا کیا مقصد
ہے؟

پسنہارا! مطلب یہ ہے بیٹا کہ چکی کے دونوں پاٹوں کو دونوں جہان کہہ دو
یا زمین آسمان سمجھ لو

شیر گل! اچھا

پسنہارا! اور اس میخ کو وحدت یا ایک اللہ پر یقین کرنے کی بنیاد سمجھ لو

شیر گل! سمجھ گیا ہوں

پسنہارا! مطلب یہ ہوا کہ دونوں جہانوں کا کارخانہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر چلتا ہے
اور یہ اوپر دیکھو، یہ ایک ایک دانہ جو اس میں گر رہا ہے۔

شیر گل! ہاں باباجی، دیکھ رہا ہوں۔

پسنہارا! انہیں خدا کی مخلوق سمجھو، جو یہاں آتی ہے اور پس جاتی ہے

شیر گل! بالکل ٹھیک کہا آپ نے

پسنہارا! لیکن جانتے ہو! چند دانے ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو چکی کے دانتوں
کی زد سے بچ جاتے ہیں۔

شیر گل! وہ کونسے دانے ہیں باباجی

پسنہارا! آؤ بیٹا، خود ہی دیکھ لو، وہ دانے جو چکی کی اس میخ کے ساتھ چمٹ
جاتے ہیں۔ یا قریب ہوتے ہیں۔ وہ پسنے سے بچ جاتے ہیں

شیر گل! ہاں ہاں — یہ رہے وہ دانے، دیکھ رہا ہوں —

پسنہارا! تو بیٹا! جو اللہ تعالیٰ کے قریب ہے، اور سچا انسان ہے۔ اس پر کسی
کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا

شیر گل! واقعی کسی کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتا — بابا خدا تمہیں سلامت رکھے

اور زیادہ سے زیادہ برکت دے۔ اچھا تو پھر حکیم نعمت خان اور جمیلے کا کیا بنا؟

پسنہارا! ہاں تو سنو — اس کے بعد —

چھٹا نظارہ

حکیم! جمال خان! خدا تمہیں اس نیکی کا اجر دے۔ تم نے میری اور میرے بھتیجے کی بڑی مدد کی اور میری بیٹی کو موت سے بچا لیا۔

جمال خان! یہ تو میرا فرض تھا حکیم کاکا! تمہاری ذات ہمارے گاؤں کے لئے رحمتِ خداوندی ہے۔ خدا تمہیں ہماری خاطر بہت عرصہ زندہ رکھے تاکہ تم ہمارے لئے دعا کر سکو۔

حکیم! میرے خیال میں اب میں اور نعمت تندرست ہیں — اور —

جمال! خیر اور باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی، لیکن یہ بتاؤ کہ تم دونوں پر قاتلانہ حملہ کس نے کیا تھا۔ پولیس بار بار پوچھ رہی ہے۔ اور مجھے تنگ کیا جا رہا ہے۔

حکیم! میں نے تو آپ سے کہہ دیا کہ میں نے کسی کو نہیں پہچانا، بس اتنا جانتا ہوں کہ جھاڑیوں کی اوٹ سے مجھ پر فائر ہوئے۔

جمال! اچھا تو میں پولیس سے کہہ دوں گا۔ کہ حکیم کاکا کسی پر دعوے کرنا نہیں چاہتا۔

حکیم! بہت اچھا ہو گا اگر آپ یہ کہہ دیں۔

جمال! اچھا تو میں جاتا ہوں — لوگ کہتے ہیں کہ قاسم —

حکیم! لوگ تو سب کچھ کہتے رہیں گے، جتنے منہ اتنی باتیں

جمال! اچھا تو السلام علیکم (جاتا ہے)

حکیم! وعلیکم السلام — خدا حافظ

نعمت! کاکا جی

حکیم! کیوں بیٹا

نعمت! جمال خان کو کہا ہوتا نا آپ نے

حکیم! بیٹا! لشکروں کے مقابلے میں کھڑا ہو جانا درست نہیں۔ اگر ہم قاسم پر دعویٰ کر دیں، تو اور زیادہ دشمنی بڑھ جائے گی

نعمت! تو بڑھ جائے نا دشمنی

حکیم! تم ابھی بچے ہو۔ صرف ہماری ہی نہیں بلکہ جمال خان کی بھی دشمنی ہو جائے گی

نعمت! یہ تو اچھا ہے، لوہا لوہے سے ٹکرائے گا

حکیم! نہیں بیٹا نہیں ہم سرمایہ دار خان یا نواب نہیں کہ اپنے اقتدار کے لئے دو انسانوں کو آپس میں لڑا ہیں۔ ہم غریب کسان ہیں۔ اور اپنی زندگی کے دن جوں توں کاٹ رہے ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ کے سہارے پر جی رہے ہیں

نعمت! اچھا بابا جی، جو آپ کی مرضی

ساتواں نظارہ

(جمیلے چشمے پہ پانی بھر رہی ہے۔ اور گنگنا رہی ہے)

جمیلے! چشمے سے جتنا پانی نکالو، آتا اور پھوٹتا آتا ہے

دنیا کے وہ غم جو گذر چکے انہیں بھول جا

بس اتنا یاد رہے کہ جب سے آنکھ کھولی، غم سامنے تھے۔

خدایا تیرا کرم ہے کہ جو دکھ کا جھونکا گذر جائے وہ بھول تو جاتا ہے

اگر خدا کا فضل شامل حال ہو تو پتھر کا دل بھی پسیج سکتا ہے

چشمے ہمیشہ پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور لوگ ان سے اپنی تشنگی بجھاتے ہیں

انسان کی عقل اور فکر تقدیر کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے

جو پرندہ زیادہ ہوشیار رہتا ہے وہی دام میں جلدی پھنستا ہے

(رک جاتی ہے)

ارے سب عورتیں چلی گئیں، ذرا بھی میرا انتظار نہ کیا — اُف یہ دوپہر —
اور میں اکیلی — اب چلنا چاہیئے۔

(گھڑا اٹھا کر چلتی ہے)

قاسم! ٹھہر لڑکی

جمیلے! تم کون ہو

قاسم! میں قاسم

جمیلے (گھبرا کر) تم — تم قاسم ہو

قاسم! ہاں میں قاسم ہوں —— ٹھہرو کہاں جاتی ہو

جمیلے! اوئی خدا — مجھے چھوڑو جانے دو

قاسم! آج تو میرے قابو میں آئی ہے۔

جمیلے! او ظالم۔ تمہارا کلیجہ اب تک ٹھنڈا نہیں ہوا۔ تو ہم غریبوں کا پیچھا کیوں
نہیں چھوڑتا۔ اللہ کے قہر سے ڈر

قاسم! لڑکو! — تیار ہو جاؤ! اس کی باتوں پر مت جاؤ

جمیلے! او قاسم! خدا سے ڈر! کسی کی شرم پر ہاتھ مت ڈال کیا تیرے گھر میں
کوئی تیاہ نہیں

قاسم! حکیم کی بیٹی! تیری زبان اپنے باپ سے بھی دو گز لمبی ہے۔ لیکن تو ان
باتوں پر چھوٹ نہیں سکتی

جمیلے! اچھا تو تُو مجھ سے کیا چاہتا ہے

قاسم! میں یہ چاہتا ہوں کہ تو قسمت کی جھونپڑی نہیں بلکہ میرے محل کی زینت بنے
میرے ساتھ چل

جمیلے! استغفراللہ! میں مسلمان! پٹھان اور پھر ایک نوجوان کی بیاہتا، اور

تمہارے ساتھ چل دوں" قاسم! تمہارا سونا چاندی میرے ایمان کی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ میں ایک مسلمان کی مسلمان اور ایک پٹھان کی پٹھان بیٹی ہوں، میرے لئے میرا نعمت خاں دنیا کی تمام نعمتوں سے اچھا ہے

قاسم! میں تمہیں زبردستی لے جاؤں گا

جمیلے! تو مجھے زبردستی لے جائے گا۔ لیکن تیری زبردستی میرے دل کو سیدھے راستے سے نہیں پھیر سکتی قاسم! اپنی قوت پر ناز نہ کر۔ مجھ سے بھی زیادہ زبردست خدا ہے۔ اس سے ڈر اور سوچ کہ ہم تیرے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ اور تو ہمارے ساتھ کیا کر رہا ہے

قاسم! (ہنس کر) تم نے میرے ساتھ کیا اچھا کیا ہے

جمیلے! میرا بابا یہ تو کر سکتا تھا نا کہ تم پر دعویٰ کر دیتا تو اس کا کیا بگڑ سکتا تھا، اب تو جمال خان اس کا محافظ ہے

قاسم! تو کیا اس نے دعوے نہیں کیا؟

جمیلے! نہیں، بلکہ اپنے بھتیجے کو بھی ایسا کرنے سے روکا ہے

قاسم! (خاموش)

جمیلے! جمال خاں نے اُسے کئی دفعہ کہا کہ دعویٰ دائر کر دو اور کسی کی پرواہ نہ کرو لیکن بابا نے کہا کہ میں نے حملہ آوروں کو پہچانا ہی نہیں

قاسم! اچھا!

جمیلے! اس نے بھتیجے کو کہا۔ کہ ہماری تو دشمنی ہو ہی جائے گی لیکن ہمارے ساتھ ہی قاسم خاں اور جمال خاں کی دشمنی بھی چل پڑے گی۔ ہمیں جو تکلیف پہنچی، وہ خدا کی طرف سے ہماری قسمت میں لکھی ہوگی۔ لیکن اوروں کو تکلیف میں ڈالنا بہت بڑا گناہ ہے۔

قاسم! اف ــــ یہ مجھے کیا ہو گیا، یہ میرا دل ایک دم سے کیوں بیٹھا جا رہا ہے

جمیلے! قاسم خان! اگرچہ میں اب تمہارے رشتے کے قابل نہیں، لیکن مسلمان تو

ہوں، مجھے اپنی بہن سمجھ لو، دیکھو میں ایک زندہ شوہر کی بیوی ہوں، خدا سے ڈرو، یہ مال اور دولت ہمیشہ تمہارا ساتھ نہ دیں گے۔ آخر ایک دن مرنا بھی تو ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا ۔۔۔

قاسم! بس جمیلے بس، مجھے اور زیادہ شرمندہ نہ کرو، میں آج کے بعد تمہیں اپنی بہن ہی سمجھوں گا اور ۔۔۔

(چکی کی آواز)

(پن چکی کا منظر)

شیر گل! ہا ہا ہا! یہ اچانک انقلاب؟

پسنہارا! ہاں بیٹا! اللہ تعالےٰ ہدایت دینے والا ہے۔ اور وہی پتھر دلوں کو رحم کے سانچے میں ڈالنے والا ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ لوگوں کے دل اللہ تعالےٰ کی انگلیوں میں ہوتے ہیں، جس طرف پھیر دے، وہ مالک ہے

شیر گل! بابا جی! جمیلہ بڑی نیک لڑکی تھی، خدا اس پر اپنی رحمت بھیجے

پسنہارا! میں یہ خیال کیا کرتا تھا، کہ مال اور دولت ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتا ہے، لیکن دو سچے محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنا ناممکن ہے۔ بلکہ جو تیسرا بھی ان کے درمیان آتا ہے اپنے آپ کو برباد کر دیتا ہے اس چکی کو دیکھو نا!

شیر گل! چکی تو دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اس سے آپ کا مطلب؟

پسنہارا! مطلب یہ ہے، کہ چکی کے یہ دونوں پاٹ ایک دوسرے کے گلے یوں ملے ہوئے ہیں جیسے دو سچے محبوب وصال کے لمحوں میں

شیر گل! ہوں ہوں!

پسنہارا! اور یہ دانے تیسری شخصیت سمجھ لو۔ جب بھی بیچ میں آ گئے۔ اور دو عاشقوں کے وصال میں خلل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تو پس کر یا ہر گر پڑے۔

شیر گل! درست ہے، لیکن قاسم خاں نے جمیلے کو بہن بنا لیا تو پھر کیا ہوا
پسنہارا! پھر — (ہنستا ہے) — پھر —

آٹھواں نظارہ

(قاسم خاں کا حجرہ)

قاسم! کلیم کاکا
کلیم! کیوں خان
قاسم! کیا تم جانتے ہو کہ میں نے جمیلے کو بہن کہہ دیا ہے
کلیم! ہاں خان! جب سے یہ سُنا ہے، میں حیرانگی کے دریا میں غرق ہوں
قاسم! وجہ؟
کلیم! حیران اس لئے ہوں کہ یہ بات ہی حیرانگی کی ہے، کہاں وہ وقت کہ تم نے اسے دلہن بنانے کے لئے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دیں، اور وہ تمہارے ہاتھ نہ آسکی۔ اور کہاں وہ وقت کہ وہ تمہارے ہاتھ آئی اور تم نے اسے بہن کہہ دیا۔
قاسم! وہ موقعہ ہی ایسا تھا کلیم کاکا! تمہیں کیا کہوں۔ اس کی باتوں میں اتنا اثر تھا کہ اس نے میرے سر سے دولت اور خانی کا نشہ اتار دیا۔ بس دل یہی کہتا تھا۔ کہ اس کے پاؤں پڑ جاؤں۔ اور زار زار روؤں
کلیم! ہاں خان! سچے مسلمان کی باتوں میں ضرور اثر ہوتا ہے
قاسم! اور وہ بہادر اتنی تھی، کہ خوف سے اس کی آنکھ تک نہ جھپکی
کلیم! یہ بھی ایک سچے مسلمان کی نشانی ہے
قاسم! خیر اب، جبکہ وہ میری بہن ہو چکی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ قاسم کی بہن غربت کی حالت میں رہے۔
کلیم! ہاں خان! ایسا تو نہیں ہونا چاہیئے

قاسم! تو بس میں نے اس کے نام سو جریب زمین لکھ دی۔ اور اب تیار ہو جاؤ کہ
حکیم کاکا کے پاس صلح کے لئے جائیں۔
کلیم! بہت اچھا۔

نواں نظارہ

(پن چکی کی گڑ گڑاہٹ)

شیر گل! ہوں! کہانی تو ختم ہوئی! یہ بتلایئے کہ وہ صلح ہو گئی، اور جمیلہ نے زمین
لینی منظور کر لی۔

پلسنہارا! ہاں زمین اُس نے منظور کر لی، اور وہ واپس آ گئے، ان کی وجہ سے
جمال خاں اور قاسم خاں کے تعلقات بھی اچھے ہو گئے — ارے بیٹا —
تمہاری گندم تو تقریباً ختم ہونے کو ہے، —— اور یہ چائے کا پیالہ ٹھنڈا
ہو رہا ہے — جلدی پی لو —
(پن چکی کی گڑگڑاہٹ آہستہ آہستہ فیڈ ہوتی جائے)

★

دنیا میں دو ہی کام ہیں یا اپنے مقصد کے لئے
تباہ ہو جانا اور یا کامیاب ہونا

دنیا میں آزاد ہو کر زندہ رہو اور آزاد ہو کر
مرو۔

(خوشحال خاں خٹک)

●

محسن بخاری

ہندکو ادب

"ہندکو" وہ بولی ہے جو پشاور اور اس کے قرب وجوار میں بولی جاتی ہے یہ "حرفی" سائیں احمد علی کی ہے جو اس بولی کا عظیم شاعر تھا اور جس نے اپریل ۱۹۲۵ء میں وفات پائی۔

(۱)

درداں دی ناؤ اُتے چاڑ دل نوں، عشق جا ٹھا بحر الم دے وچ!
کشتی نوح دی دے وانگ پئی کھاوے چکر پتلی چشم دی اتھکاں دے یم دے وچ
کسے تارک وصل دے دیدکارن پریشان رہندی چشم نم دے وچ!
داغ ہجر دے سائیاں سوغات بنڑ لیکے جاویں ملک عدم دے وچ

ترجمہ مجھے عشق نے درد کی ناؤ پر بٹھا کر غم کے سمندر میں ڈبو دیا ہے۔
میری آنکھ کی پتلی اشکوں کے طوفان میں کشتی نوح کی طرح
ڈول رہی ہے۔
اس کے انکار وصل کے باعث میری آنکھیں ہمیشہ ڈبڈبائی رہتی
ہیں۔
اے سائیں ملک عدم جاتے وقت داغہائے عشق بطور سوغات کے
ساتھ لے جانا۔

●

ضیا جعفری

فارسی ادب

از رہ گم شدن بیا رہ گذرِ نقا طلب نعرۂ عاشقانہ زن جام مئے بلا طلب

آتشِ نالہ تازہ کن ذوقِ غزل سرائے را باز زِ خاکِ خویشتن جامِ جہاں نما طلب

ابرِ بہار میکشد خیمہ ز کوہسار ہا فوجِ گل است موجِ مل صحبتِ آشنا طلب

اے کہ ز جوئے دیگراں موجِ سراب میکشی غوطہ بہ بحرِ خویش زن گوہرِ مدعا طلب

لالہ صفت بداغِ دل شبنمِ زندگی فشاں از نگۂ قلندرے نسخۂ کیمیا طلب

لالہ چمن چمن دمید بادہ قدح قدح بیار موئے شکن شکن ببیں لعلِ دوتا دوتا طلب

خاورِ تازہ سر زند از سحرِ نظارہ ات ہمچو افق ز جیبِ خود صبحِ جہاں کشا طلب

★

رضا ہمدانی

(نامعلوم شعراء)

چترالی ادب

کہ میرے دل میں درد ہے
لٹک رہی ہے میری جاں مصیبتوں کے درمیاں
ترا یہ دودھ جیسا ہاتھ ہے جو میرے ہاتھ میں
مرا یہ پہلوئے حزیں ترا یہ خندۂ جواں
یہی ہے میرے زخم دل کا مرہم حیات زا
کہ میرے دل میں درد ہے
نگاہوں میں جھلک رہے ہیں بے رخی کے جلوہ زار
ابھر رہے ہیں ابروؤں میں کج ادائیوں کے خمار
نثار تجھ پہ جان و دل
گذار دی ہے عمر میں نے ہجر کی گپھاؤں میں
تڑپ تڑپ کے قلب مضمحل بنا ہے نیم جاں

یہ عاشقوں کی ریت ہے — ؟
بجا، درست
مگر یہ راز تو بتا
کہ تجھ کو اس سے فائدا — ؟
جو مرے دل میں درد ہے

●

قریبی پڑوسی

قریبی پڑوسی سے پیارا ہے مجھ کو
وہ ارماں جو دل کے کسی دور گوشے میں خوابیدگی کے مزے لوٹتا ہو

●

عروسی!

وہ شادی کہ جس کا نتیجہ پشیمانیاں ہی پشیمانیاں ہوں
تو بہتر ہے اس سے کہ انساں تجرّد کی وادی میں ہی رہ کے جی لے

●

جوانی!

گلوں کی جوانی ہے اپنے پھبن پر

گلوں کی جوانی کو نیچا دکھاؤ
گلستاں کے سینے سے چھینو شگوفے
شگوفوں کا تاج معنبر بنا کر
جوانی کے سر پر سجاؤ تو کیا ہو

•

خوش الحان پنچھی

نہ گا اے خوش الحان پنچھی
میں صحرا میں ہوں، اے خوش، لحان پنچھی
میں پا در رکاب اسپ ابیض کی جولانیوں میں اڑے جا رہا ہوں
نہ گا اے خوش الحان پنچھی

•

میرے پاس ہوتا اگر رخش ابیض

تو رِشتہ کے ان بد سگالوں کو سجدے کراتا
وہ کتوں کی مانند آ کر ترے پاؤں پر اپنے سر کو رگڑتے
مرے پاس ہوتا اگر رخش ابیض

★

ٰ محبوب کا گاؤں

فارغ بخاری

سرحد میں اردو

آج اگر یہ کہا جائے کہ اردو کی جنم بھومی درحقیقت سرحد کا کوہستانی خطہ ہے تو ادبی حلقوں کو ضرور تعجب ہوگا۔ اور وہ ہماری اس جسارت کو چھوٹا منہ بڑی بات سمجھیں گے۔ اونچی قبروں پر پھول چڑھانا ہماری روایات میں داخل ہے۔ اور اس ترقی پسند دور میں بھی اپنی کہنہ روایات سے انحراف کی جرأت کو ایک ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا ہے۔

لیکن آج زمانہ ماضی کے تاریک اور گھناؤنے ماحول سے نکل کر تحقیق و تجسس کے روشن دور میں داخل ہو چکا ہے۔ اور آج کے بالغ نظر انسان سے روایات پرستوں کی اندھی عقیدت کے احترام کی توقع رکھنا خود فریبی کے مترادف ہے۔

دلی اور لکھنؤ کو اردو کے مراکز قرار دینے کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ مقامات شاہان وقت کے پایۂ تخت تھے۔ اور زبان کی نشوونما اور ترویج و ترقی کے اعتبار سے ان مراکز کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن اردو جو سنسکرت اور فارسی کے اختلاط کا نتیجہ تھی۔ اس کا خمیر سرحد کے سنگلاخ ماحول میں اس وقت سے تیار ہو رہا تھا جب ایرانیوں نے پہلے پہل ہندوستان کو سونے کی چڑیا جان کر اس پر دھاوے بولنے شروع کئے یہاں ایرانیوں کی آمد کا آغاز ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی کے حملوں سے ہوا اور تروتیں ی نادر شاہ درانی کے عہد تک مسلسل طور پر یلغار جاری رہی۔

ظاہر ہے کہ اجنبی حملہ آوروں کو اپنی رہنمائی کے لئے یہاں کے باشندوں سے مدد لینا پڑی۔ اور لسانی اجنبیت دور کرنے کے لئے ایک دوسرے سے قریب ہونا پڑا۔ آپس

کے ربط ضبط اور میل جول سے ایک دوسرے کے الفاظ سیکھنا پڑے۔ جس سے غیر ارادی طور پر ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑی۔ اور یہی بولی بعد میں ریختہ کہلائی۔

خاندانِ مغلیہ سے پیشتر گو بیرونی حملہ آوروں کی غرض و غایت محض لوٹ مار ہوا کرتی تھی۔ اور اُن کی آمد و رفت "آندھی اور بگولہ" سے کسی طرح کم نہ تھی۔ تاہم ہر حملہ میں ان کے کچھ کچھ افراد یہاں آباد ہوتے چلے گئے۔ یہ تمام حملے درۂ خیبر کی طرف سے ہوئے اور ادھر سے آنے والوں کو سرحد عبور کر کے اٹک پھاندنا پڑا۔

پشاور اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے ایک ایسا مقام تھا جہاں یہ لوگ دار دھڑ دی انتظامات کرنے اور تازہ دم ہونے کے لئے عموماً بہت دنوں تک ڈیرے ڈالے رہتے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے دوسرے مقامات کی نسبت زیادہ تر ایرانی النسل خاندان پشاور میں ہی آباد ہیں۔ جن میں سے قزلباش اور مغل قابلِ ذکر ہیں۔ اور ان خاندانوں کی کئی کئی نسلیں یہاں گزر چکی ہیں۔ اس لئے فارسی زبان وادب سے جو خطہ سب سے پہلے متاثر ہُوا وہ پشاور ہی تھا۔ اس شہر کی مقامی زبان کا جائزہ لیا جائے۔ تو یہ معاملہ اور بھی صاف ہو جاتا ہے۔ صوبہ سرحد کا سارا علاقہ پشتو بولنے والا ہے۔ لیکن پشاور اور کوہاٹ کی زبان ہندکو ہے۔ یہ ایک انوکھی سی زبان ہے۔ اسے عام طور پر "پنجابی" سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ ہندکو اردو سے اتنی قریب ہے۔ کہ اسے اردو کی ابتدائی صورت کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔

ہندکو میں جو خال خال پنجابی الفاظ نظر آتے ہیں وہ بھی سکھوں کے چالیس سالہ عہدِ حکومت کے اثرات ہیں۔ دوسرا ۱۹۰۳ء تک یہ صوبہ پنجاب سے ملحق رہا۔ اور ان کے تمدّن، معاشرت اور زبان سے متاثر ہوتا رہا۔ ورنہ اس سے پہلے ہندکو اردو کا ایک نہایت کامیاب خاکہ تھی۔ حالانکہ نہ تو اسے شاہجہان کے اردو بازار میں سنورنے کا موقع ملا اور نہ ہی دلی لکھنؤ اور حیدرآباد جیسے قدرشناس فرمانرواؤں کا آغوشِ شفقت، نصیب ہُوا۔ نہ یہ کسی خاص سکول میں پروان چڑھی۔ اور نہ ہی اس کی تربیت و پرداخت کی طرف کوئی توجہ کر سکا۔ بلکہ اگر اس کے ماحول کا جائزہ لیا جائے تو بتیس دانتوں میں

یہ فطری زبان قدرتی طور پر پھولتی پھلتی اور بڑھتی نظر آتی ہے۔ اردو کے ہزاروں الفاظ تو بعینہٖ ہندکو میں رائج نظر آتے ہیں۔ بعض الفاظ معمولی سی تبدیلی کے ساتھ یہاں پائے جاتے ہیں لیکن یہ تبدیلی انہیں فصیح بنا دیتی ہے۔ اکثر اردو محاورے بھی ہندکو میں ہلکی سی ترمیم کے ساتھ مستعمل ہیں۔

بہرحال یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ پشاور جو شروع سے ایرانی حملہ آوروں کی پہلی قیام گاہ رہا ہے۔ اس جگہ نو وارد عساکر کی لسانی اجنبیت دُور کرنے کی ضرورت نے باہم ربط و ضبط سے ایک مخلوط زبان کو جنم دیا جسے اردو کہا جاتا ہے۔ اور جس کی ابتدائی شکل اب بھی یہاں کی مقامی زبان 'ہندکو' کی صورت میں رائج ہے۔

پشاور میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کی نسبت زیادہ تر ایرانی النسل خاندان آباد ہیں۔ جن کی تہذیب اور زبان اب تک محفوظ ہے۔ اسی جگہ زیادہ تر فارسی گو شعراء گذرے اور اس وقت بھی فارسی شاعری کے نقوش یہاں دوسرے مقامات کی نسبت زیادہ اجاگر ہیں۔

آج بھی تحقیق کرنے پر یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے۔ کہ اردو زبان کی اولین درسگاہ پشاور رہے۔ جہاں ہندی آمیز فارسی کلام کے مسلم الثبوت اولین شاعر محمد قلی قطب شاہ متوفی سنہ ۱۶۱۲ء سے بھی بہت پہلے نہ صرف ہندی آمیز فارسی و پشتو کے نمونے ملتے ہیں بلکہ اردو کی ایک کامیاب ابتدائی شکل یہاں کی مقامی زبان کی صورت میں مروّج نظر آتی ہے

سولہویں صدی کے آغاز میں پشتو کا باوا آدم خوشحال خان خٹک گزرا ہے۔ جو بڑے درجے کا حریت پرست اور شہنشاہیت دشمن انسان تھا۔ اگرچہ صوبائی اور قومی محبت کی وجہ سے . . . . 'پشتو زبان کے مقابلہ میں کسی دوسری زبان کو اہمیت دینا اسے ہرگز گوارا نہ تھا۔ (جس کا اظہار اس کے کلام میں جگہ جگہ ملتا ہے) لیکن اس کے باوجود اردو کی حلاوت اور دلآویزی سے وہ دامن نہ بچا سکا۔

په سینه کښ م داوده مینه پیهجاگی
څما اوستا محبت گوره کیسے ہوگی

درقیب دنیا دِ یا دہ شوہ کہ ٹمہ شوہ
سپینہ خولہ پہ خندہ راکڑہ پھرمہاگی
پہ بازئے بازئے وجلے گتل نہ شے
ٹکہ ماپہ سضر وژنے بے ہاگی
زہ خوشحال چہ لالہ ورایہ دربکارہ شوم
پہ ختلئے وے چہ آؤ میرا یے راگی

اسی عہد میں عبدالرحمان بابا پشتو کے ایک بہت بڑے مشہور صوفی شاعر گزرے ہیں اُن کے دیوان میں اردو کی ایک غزل ملتی ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

بو صلے تو مارا کجا بات ہے   کہ وصلے تو خیلے بڑی بات ہے

یہ ایسی مثالیں ہیں کہ جن سے سرحد میں اردو کے آغاز کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تاریخ کی اوراق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ شمال مغربی صُوبہ سرحد کا دارالخلافہ جو اب پشاور کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا بانی ہوشنگ آبادہ پیشدادنبیرہ کیومرث بادشاہ فارس تھا پھر بعہد راجگان ہندو راجہ بگرام حاکم وقت نے ازسرِ نو اسے تعمیر کیا جس سے یہ قصبہ بگرام کہلانے لگا۔ اس کے بعد یہ قصبہ کئی بار آشوب زمانہ کا شکار رہوتا رہا۔ مٹتا اور بنتا — بنتا اور مٹتا رہا — حتےٰ کہ اس کا نام و نشان تک نہ رہا اور پھر جب آباد ہُوا تو پہلے سے کئی گنا شان و شوکت سے قصبہ سے شہر اور شہر سے صوبہ سرحد کا دارالخلافہ بنا دیا گیا۔

اِن انقلابات کے بے پناہ تھپیڑوں میں کسی مُلک کا ادبی لٹریچر کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اور اس کا ادب کیسے ترقی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی افراتفری میں دوسرے لوگوں کی طرح بے چارے ادیب بھی شہر بدر ہو کر جدھر راہ پائی چل دیئے اور پھر جب سالہا سال کے بعد دوبارا شہر آباد ہُوا۔ تو پہلے لوگ وہاں تھوڑے واپس آئے ہونگے ان وجوہات کی بنا پر اس جگہ ادب اور زبان کی تدریجی ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

عبدالرحمان بابا اور خوشحال خان کی اردو نما پشتو غزلوں کے بعد دو صدیوں تک (یعنی احمد شاہ ابدالی کے عہد تک) یہاں لسانی ترقی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اور کسی شاعر یا ادیب کے کلام کا کوئی ایسا نسخہ دستیاب نہیں ہوتا جس سے اس زمانے میں اردو ادب کے وجود کا یہاں امکان ہو سکے۔ البتہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ جو سنہ ۱۸۱۰ء میں لکھا گیا۔ یہ قاسم علی خان آفریدی کا دیوان ہے۔ جس میں فارسی اور پشتو کی غزلیں بھی شامل ہیں۔ لیکن زیادہ تر اردو کلام ہے۔ اردو نظم کا حصہ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں تقریباً دو سو غزلیات ہیں۔ شاعر کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۷۵۲ء معلوم ہوتی ہے۔ فارسی، پشتو، کشمیری، انگریزی اور ہندی کی مختصر سی لغت بھی دیوان کے ساتھ شامل ہے جس سے مصنف کے علم و فضل کا پتہ چلتا ہے دیوان کے شروع میں فارسی زبان میں دیباچہ سا ہے۔ جس میں مصنف کے خاندانی اور ذاتی حالات تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم علی خان آفریدی کا وطن مالوف آخور ضلع کوہاٹ تھا۔ مصنف لکھتا ہے۔ کہ اس کا والد برہان خان شاہجہان آباد میں اردوئے معلےٰ کا ماہر اور پشتو فارسی ترکی زبانوں کا بہت بڑا عالم تھا۔ محض کسب معاش کے لئے یہ لوگ ہندوستان میں مقیم تھے اور وقتاً فوقتاً اپنے وطن آتے رہتے تھے۔ چنانچہ قاسم علی خان آفریدی" آخور" میں ہی پیدا ہوا۔ اور جب ہوش سنبھالا تو والد کے ہمراہ ملازمت کے لئے شاہی فوج میں بھرتی ہونے چلا گیا

قاسم علی خاں کا والد برہان خان جس کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۷۲۱ء ہے شاہجہان آباد میں اردوئے معلےٰ کا ماہر تھا۔ حالانکہ اس وقت شاہجہان آباد میں اردوئے معلےٰ کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اور ایک ایسی زبان جو ابھی تجرباتی دور سے گذر رہی ہو۔ کسی کا اس میں ماہر ہونا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ وہ پہلے ہی سے اس زبان میں مہارت رکھتا تھا۔ اور پہلے سے مہارت اسے جبھی حاصل ہو سکتی ہے کہ اس کے اپنے ملک میں اس زبان کا رواج ہو۔ چنانچہ اس استدلال سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ برہان خان کو اردوئے معلےٰ میں جو مہارت حاصل تھی۔ یہ اس نے اپنے وطن (سرحد) میں ہی حاصل کی

تھی - جہاں اردو زبان شاہجہان آباد کی اردوئے معلّٰے سے بہت پہلے جنم لے چکی تھی۔ اور غالباً ایک فوجی آدمی کو شاہجہان آباد میں گراں قدر مشاہرہ پر اسی لئے رکھا گیا۔ کہ وہ اردو زبان کا ماہر تھا۔ اور اردوئے معلّٰے کے لئے جسے ابھی شاہجہان آباد میں ایک دودھ پیتے بچّے کی حیثیت حاصل تھی ایک ایسے ماہر استاد کی ضرورت تھی جو تلفظ، محاورے اور فصاحت کے آغوش میں اسے پروان چڑھائے۔

بہرحال برہان خان شاعر نہ تھا۔ کیونکہ اس کی شاعری کے متعلق قاسم علی خان آفریدی نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس دیباچے کا ایک حصّہ ضائع ہو چکا ہے۔ اگر یہ حصّہ ضائع نہ ہوتا۔ تو شاید ہمیں اس سے بہت کچھ مدد مل سکتی۔ قاسم علی خاں جس زمانے میں گذرا ہے۔ وہ ہندوستان میں میر و مرزا کا عہد تھا۔ عبدالقادر بیدل سے ملاقات کا ذکر اس نے کیا ہے۔ اور اس کی مشہور رباعی

ع چرا خود را اسیر غم ز فکر بیش و کم داری

انکی زبانی سن کر لکھی ہے۔ لیکن میر و مرزا اور اُن کے دوسرے ہمعصروں میں سے کسی کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ اردو زبان سے اسے زیادہ شغف تھا۔ دوسری زبانوں کی نسبت اردو شعر بھی اُس نے زیادہ کہے۔ اور ایک منقبت کی کتاب شفاعتِ آفریدی کا بھی حوالہ اس نے دیا ہے۔ جو شاید تلف شدہ حصّہ کے ساتھ منسلک ہو۔ اردو غزلیات بھی معیاری، صاف اور شستہ زبان میں ہیں۔ لہٰذا یہ ناممکن تھا کہ اتنا باذوق انسان شاہجہان آباد میں اتنی عمر گذارے اور ر . . . اپنے ہم مشرب لوگوں سے نہ ملے۔ اور اگر مل نہ سکتا تو کم از کم ان کا ذکر تو اس نے ضرور کیا ہوتا۔ اس لئے یہی ماننا پڑتا ہے کہ وہ تلف شدہ حصّہ بڑے کام کی چیز تھی۔ اور نہ جانے اس میں کیا کیا کچھ ہوگا۔

قاسم علی خان آفریدی کا کلام اتنا بلند پایہ ہے کہ اُسے سرحد کا پہلا اردو شاعر ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ گذشتہ دو صدیوں کے لسانی جمود کا حل اس کے کلام میں موجود ہے۔ اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ دو صدیاں رائیگاں نہیں گذریں۔

قاسم علی خاں کا کلام اس امر کا بیّن ثبوت ہے۔ کہ اردو کا پہلا شاعر اتنی صاف سلیس اور شیریں زبان نہیں لکھ سکتا۔ جب تک کہ پہلے سے تدریجی طور پر اس تک یہ ترکہ نہ پہنچا ہو۔ مثال کے طور پر نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

طفلکی جاتی رہی رخصت جوانی ہو گئی — موسم پیری ہیں اے کم بخت نیک اطوار ہو
ازل سے تا ابد تک آفریدی ساتھ ہے اسکے — میاں ان دوستاں صاحب سلامت ہو تو ایسی ہو
اس شوخ کے جب گھر سے اقدام نکلتے ہیں — تب قتل کے عاشق کے اعلام نکلتے ہیں
وہ آپ دکھانے کو صورت مجھے آتا ہے — جب اپنی نحوست کے ایام نکلتے ہیں
وحدت کا تماشا ہی کثرت کے مظاہر ہیں — آغاز سے ہر شئے کے انجام نکلتے ہیں
کسی سے میں تیری وصات کی التجا نہ کروں — مروں برشک پہ اظہار مدعا نہ کروں
ہُوا ہوں سادہ رخوں سے میں اسقدر بیزار — کہ آئینہ پہ بھی میں چشم اپنی وا نہ کروں

قاسم علی خان آفریدی کے عہد میں ایک اور سرحدی شاعر کا بھی ایک قلمی دستاویز سے پتہ چلتا ہے۔ لیکن افسوس کہ باوجود تلاش کے بھی اس کی کوئی تصنیف دستیاب نہ ہو سکی۔ یہ شخص مولوی محمد عثمان قیس ابن حافظ غلام شاہ خان ابن شرف الدین خان باجوڑی تلمیذ خلیفہ غیاث الدین عرف مصنف غیاث اللغات ہے فارسی عربی اور ہندی زبانوں کا جید عالم اور تینوں زبان کا شاعر ــــ قصائد بدر السجاد و گلگونہ اکبر کی شرح بھی اردو زبان میں لکھی ــــ ۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۲۴۰ھ مطابق سنہ ۱۸۲۸ء زخمی ہو کر ۶۷ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ قطعہ تاریخ جیب احمد سواں نے کہا۔

آوازہ در رفتاد کہ عثمان شہید شد

نمونۂ کلام :-

کچھ ایسے مرتبہ والا مرادہ شاہ ذی جاہ ہے — کہ ادنیٰ چاکر اس کا باج گیر حاکم تبت
ملک کرتے ہیں ذکر اس کا فلک تر تا ہے فکر اس کا — قضا اس کی طلب جو ہے قدر حاضر پئے منزلت

رخ پہ نور سے گیسو نہ ہٹے آج تلک   مجھ سیہ بخت کی قسمت میں سحر ہو نہ سکی

اس کے بعد کچھ عرصہ پھر سرحد میں اردو ادب کی تاریخ بے زبان معلوم ہوتی ہے یہ عرصہ بھی ایک تاریخی آشوب کا زمانہ تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد کے بعد انیسویں صدی کے وسط یعنی ۱۸۵۰ء میں یہاں منظم ادبی سرگرمیوں کے باقاعدہ حالات ملتے ہیں۔ اور اس کے بعد پھر کوئی تعطل واقع نہیں ہوتا۔

اس عرصہ میں صوبہ سرحد کا پورا علاقہ مکمل طور پر انگریزی عملداری میں شامل ہو چکا تھا۔ جو انگریز افسر یہاں متعین ہوئے وہ ہندوستان سے اپنی آسائش کے لئے بہرے، خانساماں بھی اپنے ساتھ لائے۔ ان بہروں، خانساموں میں اکثر اردو کے اچھے شاعر تھے جنہوں نے یہاں آ کر اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے مشاعروں کا انعقاد شروع کیا۔ اس وقت یہاں بیشتر شعراء محض فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ جو چند ایک اردو کے شاعر تھے وہ بھی ماحول موافق نہ ہونے کی وجہ سے گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان بیرونی شعراء کی ادبی سرگرمیوں نے مقامی لوگوں میں رقابت کا جذبہ پیدا کیا۔ اور ان سب نے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری بھی شروع کر دی مشاعرے بھی کرنے لگے۔ اور ادبی مجلسیں بھی منعقد ہونے لگیں۔

۱۸۸۶ء میں سید دلاور علی شاہ لاہوری اینگلو ورنیکلر گورنمنٹ سکول پشاور کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو کر آئے اور ان کے ہمراہ مولانا شیر محمد صاحب اورنٹیل ٹیچر بھی تشریف لائے جن کی ادب نوازی اور اردو پروری نے سکول کے طلباء اور بیرونی احباب میں اردو شاعری کا خوب چرچا کیا۔

۱۹۱۳ء میں صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم نے اسلامیہ کالج پشاور کی تاریخی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس وقت اہلِ سرحد کی تعلیمی حالت صفر کے برابر تھی۔ یہ کالج یہاں کی تیرہ و تار فضاؤں میں روشنی کا مینار ثابت ہوا اور اسی کی روشنی

سے آج سرحد کا گوشہ گوشہ منور نظر آتا ہے۔ صاحبزادہ مرحوم کی سامراج دوستی کے باوجود آج ان کا یہ کارنامہ سرحدی عوام پہ ایک اتنا عظیم احسان ہے۔ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامیہ کالج کی بنا پڑی تو پنجاب اور ہندوستان سے بڑے بڑے قابل پروفیسر منگوائے گئے جو علم دوست اور ادب نواز حضرات تھے۔ ان میں اردو زبان کے بلند پایہ ادیب بھی تھے اور نغز گو شاعر بھی۔ چنانچہ ان کے آنے سے یہاں اردو زبان دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔

سرحد میں صحیح معنوں میں اردو شاعری کا یہ اولین دور تھا۔ سائیں احمد علی شاہ مسجدی، خادم، غلام حیدر رسگر، عاصی سرحدی، مرزا علی محمد علی، بسمل پشاوری، دریا پشاوری، بیلی رام نشاط، حلیم، غلام محمد کلیم، محمد سلطان سلطان، مرزا محمد عباس عباس، مہتہ رادہا کشن، طالب پشاوری، مرزا غلام جیلانی سالم، دلاور خاں بیدل، برق گنجوی، خالص بیگ، جگر کاظمی، برق کوہاٹی، سید شیرازی، جعفری سرحدی اور حکیم بدر اس دور کے ممتاز شعراء تھے۔ جن میں سے جعفری، برق کوہاٹی اور جگر کاظمی اب بھی بقید حیات ہیں

یہ تمام حضرات انفرادی طور پر شغل بیکاری سمجھ کر شعر کہتے تھے۔ ان کی انفرادی کوششوں نے آخر اجتماعی شکل اختیار کی اور اس کا احسان سب سے پہلے سائیں احمد علی کو ہوا۔ سائیں مرحوم امی شاعر تھے۔ ذوق و وجدان کی دولت فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ شاعری سے طبعی لگاؤ تھا۔ مقامی زبان ہندکو میں شعر کہتے تھے ریختہ اردو میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے۔ سائیں مرحوم نے ان منتشر قوتوں کو ایک لڑی میں پرو کر منظم کیا۔ اور اسی جماعت کا نام بزم سخن رکھا۔ یہ انجمن ۱۹۰۳ء میں عالم وجود میں آئی۔ اور یہ مختصر محفلیں عظیم الشان مشاعروں کا رنگ اختیار کر گئیں۔ اس وقت کا رنگ سخن غزل گوئی ہی تھا۔ اور اس کے علاوہ دوسری کوئی صنف یہاں رائج نہ تھی۔

یہ دور اسی نہج پر قائم رہا۔ بظاہر ۱۹۲۵ء تک شعرا کا جتنا کلام بھی ملتا ہے۔ وہ صرف غزل گوئی اور قافیہ پیمائی پر ہی مشتمل ہے۔ لیکن ان ادبی ہنگاموں نے اردو کی نشر و اشاعت کے لئے بڑا کام کیا۔ اسی دوران میں بزم سخن کے علاوہ مزید ادبی انجمنیں بھی وجود میں آگئیں۔ اس ذوق آفرینی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور شہر کے گوشے گوشے میں ادبی ہنگامے ہونے لگے۔

۱۹۱۱ء میں رفعت بخاری کے فکر سخن میں بدلا ہوا رجحان ملتا ہے۔ اس کی غزل کا اسلوب بحیثیت مجموعی اگرچہ قدیم ہے۔ لیکن بعض اشعار جدید رجحانات کی غمازی کرتے ہیں۔

میر ولی اللہ شرارہ کی کہستانی دنیا کو اپنے نغموں سے گرما رہے تھے۔ ہرچند آپ آج کل کے ترقی پسند شعراء کی صف میں شامل نہیں کئے جا سکتے۔ تاہم انہیں سرحد کے نیچرل شاعروں کا پیشرو ضرور ماننا پڑتا ہے۔ ان کی نظمیں کشمیر، نشاط باغ اور ڈل وغیرہ نیچرل شاعری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

غرض یہ دور پچھلے ادوار کی نسبت رجحانات کے اعتبار سے حوصلہ افزا رہا اب تک جو تبدیلی بھی رجحان فکر میں واقع ہوئی وہ قابل ذکر تو ضرور ہے۔ لیکن بہت زیادہ جدت طرازی کی حامل نہیں۔

عراقی سے قطع نظر سرحد میں نظم کے بانی مبانی میر ولی اللہ اور رفعت بخاری ہیں اگرچہ اس وقت ان کی اس ادبی جرأت کو گستاخی اور کہنہ اقدار سے بغاوت سمجھا گیا لیکن جواں سال شعراء کو اس بغاوت نے گدگدایا اور نظم کہنے کا شعور کسی کسی گوشے سے سر اٹھانے لگا۔ ۱۹۳۰ء کے اوائل تک متعدد نظم گو شعراء پیدا ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد بزم سخن کے مشاعروں میں جہاں مصرع طرح ہوتا وہاں موضوع نظم بھی دیا جاتا۔ بزم سخن کی نشاط ثانیہ میں نظم گوئی کا آغاز ہوا۔ تو عشق، حسن، شمع، پروانہ نظموں کے عنوان تجویز ہوتے تھے۔ نذیر مرزا برلاس، ضیا جعفری، جعفری اور رسا بریلوی نظم کہنے والوں میں پیش پیش تھے۔ جعفری کا رجحان فکر کلاسیکل اور برلاس

ضیا، رسا کا میلان جدید تھا۔ اس دور میں غزل کا رجحان بھی تغیر پذیر ہوا۔ عام شعراء میں صحت مند جراثیم سرایت کرنے لگے۔ اور مشاق اور طباع شعراء اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ بزمِ ادب کے سرپرست قاضی محمد عمر قضا کا اندازِ فکر ثقافت و سنجیدگی کے اعتبار سے عروج پر نظر آتا ہے۔ اور سوقیانہ پن یا ابتذال سے وہ کوسوں دور ہیں۔ قضا صاحب آج بھی بقیدِ حیات ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال کے قریب ہوگی ضعیف ہو چکے ہیں لیکن طبیعت کی روانی اور بذلہ سنجی کا وہی عالم ہے۔ تمام عمر پڑھنے لکھنے میں گزار دی۔ لب و لہجہ اس قدر فصیح ہے اور بول چال میں اتنا روزمرہ اور گھلاوٹ ہے کہ بالکل اہلِ زبان معلوم ہوتے ہیں۔ ایک نہایت قیمتی ذاتی لائبریری بنا رکھی ہے اور شب و روز فکرِ سخن میں مستغرق رہتے ہیں۔ اردو فارسی دونوں زبانوں کے مستند شاعر ہیں عموماً غزل کہتے ہیں۔ آپ کے کلام میں تغزل کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں:۔

آؤ نا ہم بھی بھیس بدل کر ادھر چلیں
ہے ربط ان کے ناز کو نا آشنا کے ساتھ

یہ تیکھا پن اور طنزیہ رمزیت ان کے کلام کی جان ہے۔ اور یہی انفرادیت اپنے ہمعصروں میں انہیں ممتاز کرتی ہے۔

اس کے بعد آغا لال شاہ جگر کاظمی کے اسلوبِ سخن میں عام رجحانات سے ہٹ کر کچھ کہنے کی آرزو کروٹیں لیتی محسوس ہوتی ہے ؎

جوشِ وحشت نے یہاں تک پاؤں پھیلائے جگر
دونوں عالم بن گئے حلقہ میری زنجیر کا

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کو ہم اگر انقلابی رجحانات کا پیغام بر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ۱۳ مئی ۱۹۴۴ء کو آپ نے ستاسٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ آپ ایک سیاسی لیڈر اور دیوانگی کی حد تک آزادی کے پرستار تھے۔ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ قید و بند کے مصائب جھیلتے گزرا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کا سب کلام انقلابی رجحانات کا آئینہ دار ہے ؎

آشفتہ سروں میں بھی دھن کا وہی پکّا ہے
جو رنج فزوں چاہے اور درد سوا مانگے

بات ہی کیا ہے اگر آج ہوتے ہم برباد!
کیا کوئی اہلِ جنوں دہر میں آباد بھی تھا

یہاں اسی عہد کے ایک نغز گو شاعر برق کوہاٹی کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ آپ کے کلام میں بھی تغزّل کے پردے میں دبی دبی جرأت آمیزی کا احساس ہوتا ہے۔

ہم کو رہتا ہے تمہاری طبع نازک کا خیال
ورنہ کیا ہم داستانِ دل سنا سکتے نہیں

رجحان و فکر کا ارتقا اس منزل پر پہنچ کر رکا نہیں۔ بلکہ اس کے چہرے پر آگے بڑھنے کے عزائم شدّت سے نمایاں ہونے لگے۔ تفکّر کی جولانی کو بزمِ سخن اور دوسرے اداروں کا دائرہ تنگ نظر آیا۔ اور اسی احساس نے ۱۹۳۵ء میں دائرہ ادبیہ کی شکل اختیار کی جو ایک الوکھی صبح کی طرح سے ظاہر ہوا۔ اس نے اپنے تنوع کی روشنی سے کہنہ اقدار کے دھندلکوں کو اجال دیا۔ اور ذوق و وجدان کو جلا دے کر یہاں کے رجحان و فکر کو یکقلم منقلب کر کے رکھ دیا۔ سرحد کی ادبی دنیا کے رجحانات میں یہ پہلا شعوری انقلاب تھا جس نے بیمار ادب کی سسکتی ہوئی لاش کو دفن کر کے ہی دم لیا۔ پرانی قدروں سے ہٹ کر نئے ڈھنگ سے سوچنے کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اور نظم کے علاوہ ادبی اجتماعات میں افسانے، ڈرامے، مقالے بھی پیش کئے جانے لگے۔

اس عہد کے قافلہ سالار ضیا جعفری، نذیر مرزا برلاس، عبدالودود قمر اور مظہر گیلانی ہیں۔

ضیا جعفری نے دائرہ ادبیہ کی تشکیل کے ساتھ ہی اپنی سرگرمیوں کو نئے انداز نئے رنگ اور نئی کاوشوں کے ساتھ شروع کر دیا۔ ضیا نے پرانی قدروں کا ڈانڈا

نئی سوچ کے افق سے یوں ملا دیا کہ اس کی ترقی پسندی میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی۔

اس نے فرسودہ اور پامال گورستانی ذہنیت کے اندھے چراغوں کو بجھا دیا۔ اور نئے عزم و ہمت کی زندگی بخش مشعلیں لے کر بڑھا۔ اس نے تاریک لبادوں کو نوچ کر پھینک دیا۔ اور پیغام و بیان کی دنیا میں قدم رکھا۔ اس نے اپنے کلاسیکی مجسمے کو فکر کے نئے اسٹوڈیو میں لا کر جدت کے شوخ اور شنگ رنگوں سے اس کی نوک پلک درست کی۔ اور اس صناعی سے کہ دیکھنے والے اسے حال کا مصور سمجھنے لگے ؎

ہے سامنے انقلاب کا آئینہ ساقی　　فطرت کا دھڑک رہا ہے سینہ ساقی
اس دور میں مغرب نے روا رکھا ہے　　خونِ دل مزدور کا پینا ساقی

نذیر مرزا برلاس کے فکر و ذہن کی قوت اول سے ہی جدت آشنا تھی۔ اور شاید اسی لئے اس نے اپنے لئے غزل کا میدان پسند نہ کیا۔ اور جب وہ اپنی پسندیدہ صنف نظم کی طرف آیا تو اس میں اپنے لئے ایک منفرد مقام پیدا کر لیا جس پر وہ آج تک مستقل مزاجی سے ڈٹا ہے۔ سرحد کے اردو ادب کو انگریزی ادب سے آشنا کرنے والا اور رومانی شاعری کا علمبردار برلاس ہی ہے۔ اور برلاس کو سرحد کا پہلا ترقی پسند شاعر کہنے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔ پرانی ڈگر سے ہٹ کر نیا اسلوب اختیار کرنا اس وقت بھی بغاوت کے مترادف تھا۔ اور آج وہی فطری بغاوت ارتقا پذیر ہو کر برلاس کو انقلابی شاعر بنا چکی ہے ؎

ابھارتے ہیں بغاوت یہ وقت کے تیور
یہ ٹھاٹھیں مارتا سیلاب رک نہیں سکتا
جھکو زمانے کی توقیر کو سلام کرو
یہ سرکشی کا پھریرا ہے جھک نہیں سکتا

زمانے کی عظمت و توقیر کا احساس اسی کو ہو سکتا ہے۔ جو شعوری طور پر

ترقی پسند ہو۔ اور یہ کہنے میں ہمیں ذرا بھی باک نہیں کہ برلاس ہی نے سرحد میں اردو شاعری کو صحت مند قدروں سے آشنا کیا۔ اور اسی کے ذہن و فکر کی روشنی تھی۔ جس سے اکتساب کرکے آج نوجوان طبقہ ترقی پسندی کے افق کو چھو رہا ہے۔ عبدالودود قمر اور مظہر گیلانی بھی اس عہد کی ناقابلِ فراموش ادبی شخصیتیں ہیں۔ جن کی خدمات کو ادبیاتِ سرحد کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اس عہد میں کوہاٹ میں بھی ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ کوہاٹ کو ادبیاتِ سرحد میں اس لئے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اردو کا اوّلین سرحدی شاعر قاسم علی خان آفریدی اس سرزمین کا باشندہ تھا۔ ایک طویل درمیانی عرصہ یہاں بھی جمود طاری رہا لیکن جب اس مردم خیز زمین سے دوبارہ ادبی چشمہ پھوٹا تو پھر اس کے سوتے خشک نہ ہو سکے۔ اخگر سرحدی، اور اختر وارثی، جمیل راز بنگش، آذر سرحدی، محمود شوکت، اور خیر محمد جلالی یہاں کی ادبی تحریک کی روحِ رواں تھے۔ اور آج بھی انہی حضرات کے دم قدم سے وہاں ترقی پسند تحریک عروج پر نظر آرہی ہے۔ اخگر ایک سرگرم سیاسی کارکن اور ایک نڈر انقلابی شاعر ہے۔ کئی دفعہ قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں لیکن ببانگ دہل یہی کہتا رہا ہے

درماندۂ حیات کو فکرِ نجات ہے\
اہلِ نظر کو دعوتِ فکر و نظر ہے آج

اختر وارثی ایک نوجوان ترقی پسند شاعر اور انتھک ادبی کارکن ہے۔ وہ شروع ہی سے جدید رجحانات لے کر میدان میں آیا اور شعوری طور پر ترقی پسندی کا ساتھ دیا ہے

دورِ چمن کے دھوئیں کی طرح دور\
زندگی مزدور سے کترا گئی

جمیل راز بنگش، آذر سرحدی اور محمود شوکت بھی آزاد منش فن کار ہیں۔ اور جلالی صاحب ایک اچھے نثر نگار ۔۔۔ ملک کی انقلابی تحریکوں سے بھی وابستہ منسلک

رہ چکے ہیں۔ اور اسی لئے انداز تحریر اور سوچ پرولتاریہ ہے

کوہاٹ کے بعد ہزارے پر نظر پڑتی ہے۔ میر ولی اللہ اور جدون نظامی کے بعد ہری پور سے قتیل شفائی، الطاف پرواز اور حفیظ اثر تین نوجوان فنکار ابھرے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے قتیل نہ صرف اپنے ہم وطنوں بلکہ ہندوستان اور پاکستان میں اپنے تمام ہمعصروں کو پیچھے چھوڑتا ہوا اس بلندی پر پہنچ گیا۔ جو سرحد کے اردو شاعروں میں سے کسی کو کم ہی نصیب ہوئی۔ قتیل نے اپنی فنی عظمت کا لوہا ملک کے ادبی حلقوں سے منوایا اور بہت جلد ہندوستان گیر شہرت حاصل کر لی۔ قتیل نہ صرف گیتوں اور غزلوں کا شاعر ہے بلکہ اردو نظم کو بھی اس نے ایک نئے موڑ سے آشنا کیا۔ اور اس میں فن کے ساتھ ساتھ نئے نئے انقلابی موضوع تلاش کر کے، اس میں غریب اور بے بس انسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں سمو دیں۔

قیادت کے غلامو کیا یہی دور مسرت ہے — کہ اپنے خون کے قطرے اب آنسو بن کے بہتے ہیں
شہنشاہوں کے دامن کی ہوائیں پھانکنے والو — کہیں انساں بھی انسانوں سے اتنی دور رہتے ہیں

۱۹۳۶ء میں پشاور میں ایک ادبی ادارے کا وجود ملتا ہے۔ جہاں تک اس نئے مکتبۂ خیال کی ادبی سرگرمیوں کا تعلق ہے۔ وہ پہلے ادوار کی نسبت بہت زیادہ انقلابی تھیں ادبستان دراصل عروج تھا دائرہ ادبیہ کی اس تحریک کا جو اس نے ۱۹۲۵ء میں شروع کی رضا ہمدانی، مظہر گیلانی، فارغ بخاری، مضطر تاتاری، شمیم بھیروی اور عشرت سرحدی ادبستان کے جنم داتا تھے۔ ادبستان کے یہ مؤسسین ترقی پسند عناصر کا ایک ایسا گروہ تھا جو دائرہ ادبیہ اور بزم سخن کے روایتی بندھنوں سے گلو خلاصی چاہتا تھا۔ یہ ادب کی اس آزاد فضا میں سانس لینا چاہتا تھا۔ جہاں ادب بالکل زندگی کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ جہاں ادب زندگی کو سنوارتا ہے۔ ان مہلک پھوڑوں پر عمل جراحی کرتا ہے جو سماج کو گھن کی طرح کھا رہے ہوں اور جہاں ادب ایسے باغ کی آبیاری کرتا ہے جو انسانیت کو پھل دے سکے۔

ادبستانی دور سے سرحد کے ادب میں ایک تاریخی انقلاب آیا اور ادب کی گاڑی

بالکل نئی سڑک پر آگئی۔ اس نے جو ادب پیش کیا وہ بورژوا ذہنیت کی ضد اور جمہوری زندگی کا ترجمان تھا۔ سیاسی اور سماجی رجحانات کو اس میں خاصہ دخل تھا۔ اس نے جاگیردارانہ گھناؤنے ادب کی لاش پر مزدوروں کے جھونپڑوں کی کھپچیاں جمائیں اور ادب کو گھناؤنی اور پُر پیچ پگڈنڈی سے نکال کر زندگی کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ اور عام جلسوں میں ترقی پسندانہ مقالات پیش کرنے کے علاوہ خاص نشستوں میں بے لاگ تنقید کی بنیاد رکھی۔

رضا ہمدانی سرحد میں انقلابی تحریک کا بانی مبانی ہے یہ نوجوان لری پھندی صلاحیتوں کے ساتھ وارد ہوا اور اس کے جاندار اور توانا نغموں کی بازگشت سرحد میں ترقی پسند تحریک کا ایسا قیمتی اثاثہ ہے۔ جس پر ہم بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ اور آج بھی یہاں ترقی پسند تحریک اسی کی رہنمائی میں عروج و قوت حاصل کر رہی ہے ؎

بجھے بجھے ہیں ابھی تک چراغ لالہ و گل!
خزاں نہ ہوگی یہ لیکن بہار بھی تو نہیں
ہر ایک سینے سے اک ہوک اٹھ رہی ہے رضا
یہ گونج ایک نئے انقلاب کی تو نہیں

کلی کلی تو ابھی رنگ و بو کی پیاسی ہے
بھلا خزاں کو بہاروں کا نام کیسے دوں
ہے عہد نو کا جنہیں انتظار برسوں سے
رضا میں ان کو پرانا نظام کیسے دوں

مضمر تاتاری امی شاعر ہونے کے باوجود فطری طور پر ترقی پسندانہ رجحانات لے کر پیدا ہوا۔ اس کی نظمیں ندرتِ تخیل اور زورِ کلام کے باعث عوام میں بے حد مقبول ہیں ؎

مانگنے سے بھی بھلا حاصل ہوئے ہیں تخت و تاج   زور بازو ہو تو پھر پیش کرتے ہیں خراج

گوہر مقصود کے طالب بھنوروں میں کود پڑے　　　　موج کی جھولی سے موتی چھین طوفانوں سے لڑے

شمیم بھیروی قدیم بدعتوں سے دامن نہ چھڑا سکنے کے باوجود ہر دور میں ترقی پسند تحریک کا ہمنوا رہا - اور اس کا اکثر کلام بھی جدید رجحانات لئے ہے - نظم و نثر بے تکلف اور قلم برداشتہ لکھتا ہے اور خوب لکھتا ہے ؎

لٹا آئے سکون زندگانی عشق میں لیکن
جگر کا حوصلہ سمجھے نظر کا امتحاں سمجھے

تم ہی غم سے نامحرم ہو تم نے ہی ایجاد کیا ہے

عشرت سرحدی اس دور کا ممتاز شاعر ہے - اس کی غزلوں میں ایک نیا انداز اور انوکھا پن نظر آتا ہے ؎

جذبات کی کشتی کھینے کو طوفان سا امڈا آتا ہے
تا چند رہوں خاموش کہ ساقی رات گذرنے والی ہے

ادبستانی دور کو پچھلے ادوار پر جو خصوصیت حاصل ہے - وہ نہایت اہم ہے - اور درحقیقت یہی خصوصیت سرحد کے ادبی میلانات کو ارتقائی منازل تک پہنچانے میں ممد ثابت ہوئی -

ذہن و فکر کے انقلاب کے ساتھ غزل کی معیاری حیثیت، نظم کی ترقی پسندانہ ترتیب، تنقیدی مجالس کا انعقاد، اور مجلس مناظرہ کی تشکیل - مجلس مناظرہ میں سیاسی ملی، اور ادبی موضوعات پر بحث و تمحیص اور نشر و اشاعت کا سلسلہ ادب اردو کو ایسے مقام پر لے گیا جہاں پہنچکر ادب، زندگی کے لئے کارآمد اسلحہ بن جاتا ہے

ادبستان نے جس انقلابی تحریک کو جنم دیا - وہ ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی - یہی تحریک ۱۹۴۶ء میں انجمن ترقی اردو کے روپ میں سامنے آئی - خاطر غزنوی

مجید شاہد اور فرید عرش اس دور کی یادگار ہیں۔

خاطر غزنوی گیتوں اور نظموں کا شاعر ہے جس کے نغموں کی مہک سرحد کو پھاند کر پاکستان اور ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔

وہ اک کلی کہ جو ہے قید سبز پنجے میں ۔۔۔ تڑپ رہی ہے کہ کس وقت پھول بن جائے
بہت قریب بہت ہی قریب ہے وہ وقت ۔۔۔ کہ تند پنجہ فقط اڑتی دھول بن جائے

مجید شاہد جس نے غزل میں ایک نیا معیار قائم کیا اور اسے انقلابی رجحانات میں سمو کر پیش کیا ہے

فریب ذوق سفر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے ۔۔۔ حیات خواب نظر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
میرے ندیم میری کاوش نظر کا مآل ۔۔۔ چراغ راہگذر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

فرید عرش جس کی اٹھان ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق ہے

یہ سرخ سرخ دھندلکے ہیں عصر نو کی دلیل
ثبات چاہنے والو انہیں سلام کرو

اس عہد میں اردو سبھا اور اردو مجلس دو قابل ذکر انجمنوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جنہوں نے حتی المقدور قابل قدر خدمات انجام دیں اردو سبھا کی بنیاد شوکت واسطی نے رکھی۔ جو ایک ان تھک کام کرنے والا نوجوان تھا۔ اور نہایت پرگو شاعر

روش روش پہ چمن کی بچھے بچھے منظر ۔۔۔ یہ کہہ رہے ہیں یہاں سے بہار گذری ہے

مجلس اردو کے موسسین عشرت سرحدی، احمد فراز، یوسف رجا، مرزا محمود سرحدی اور محسن احسان تھے۔

احمد فراز کی شاعری انقلابی رجحانات کی واضح اور بے باک شاعری ہے۔ وہ شعوری طور پر ترقی پسند نوجوان ہے۔ لگی لپٹی نہیں جانتا

جلا کر آشیانے گلستاں میں ۔۔۔ بطرز نو چراغاں ہو چلے ہیں!
جہاں حائل تھی اک دیوار گل تک ۔۔۔ وہاں زنداں ہی زنداں ہو چلے ہیں

یوسف رجا۔ رجعت و ترقی کا سنگم بنانے کا آرزومند ہے اور پیام سے زیادہ فن کا دلدادہ ۔۔ اس کے باوجود ترقی پسندانہ رجحانات سے اس کا کلام مملو نظر آتا ہے ؎

مجھ پہ انسان سے نفرت کا غلط ہے الزام
لوگ شاید مرے معیار سے ناواقف ہیں

مرزا محمود سرحد کا واحد اور منفرد مزاح نگار ہے جسے اکبر سرحد کہنا بے جا نہ ہوگا ۔ اس کے اشعار طنز کے نشتروں سے بھرے ہوتے ہیں ۔ اور بے رحم جراح کی طرح وہ سماج اور فرسودہ نظام کے ناسوروں سے پھائے اٹھا اٹھا کر فاسد مادے سے انہیں پاک و صاف کرنے میں معروف رہتا ہے ؎

غریب کو کوئی حاتم کبھی نہیں کہتا جو تیرے نام پہ دے بھی تو فاقہ مست کہیں

تیرے کرم کی کوئی حد نہیں حساب نہیں چپلی کے نان شبینہ میں سوچتا ہی رہا
میں سوچتا ہی رہا کس طرف کو ساحل ہے کدھر چلا ہے سفینہ میں سوچتا ہی رہا

کیا کہوں گیسو بنانے میں وہ کتنے فرد ہیں پشت کی جانب سے عورت سامنے سے مرد ہیں

محسن احسان سرحد کا کمسن شاعر ۔۔۔ جس کی ہونہار طبیعت اس کے روشن مستقبل کی غماز ہے ؎

میں خون دیکھ کے آیا ہوں شاہراہوں پر
مجھے یقین دلاؤ بہار آئی ہے

یہ دور توانا اور صحت مند دور تھا۔ جس نے فرسودہ نقوش اور دم توڑتی ہوئی اقدار کو مٹا کر نئے مکتبۂ فکر کی داغ بیل ڈالی ۔ اور ادبی سرگرمیوں کو محض ہنگامی مشاعروں تک ہی محدود نہ رکھا ۔ بلکہ تنقیدی مجالس کے ذریعے اسے نئے موڑ سے آشنا

کیا۔ ایسا موڑ جو زندگی کا ترجمان بھی تھا۔ اور نقاد بھی ——

۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کے ساتھ یہاں نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کا آغاز یہاں ۱۹۴۶ء میں غیر رسمی طور پر ہو چکا تھا جس کے محرک شاہد نصیر، ثاقب رزمی، مقصود زاہدی، نذیر کاوش اور پرویز سلیم تھے۔ ان ترقی پسند نوجوانوں کو ملازمت کے سلسلے میں حسن اتفاق سے کچھ عرصہ پشاور میں قیام کا موقع ملا۔ اور انہوں نے اس مختصر وقفہ میں یہاں ترقی پسند تحریک کا سنگِ بنیاد رکھ کر ایک ایسا قابلِ یادگار کارنامہ کیا۔ جسے اہلِ سرحد کبھی فراموش نہیں کرتے۔ دو سال تک یہ تحریک غیر منظم طور پر اپنا کام کرتی رہی۔ اور جب اس انجمن کے کارپردازان کا شیرازہ بکھر گیا تو مقامی ادیبوں نے بڑھ کر تحریک کو سنبھالا۔ فروری ۱۹۴۹ء میں اس کی باقاعدہ تشکیل عمل میں لائی گئی۔ پوری سرگرمی سے کام شروع کر دیا گیا۔ اور نہایت قلیل عرصہ میں سرحد کے گوشے گوشے میں اس کی شاخیں پھیل گئیں

ترقی پسند مصنفین کے قیام سے یہاں کی ادبی فضا میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہوا۔ اور ایسے ادب کی تخلیق ہونے لگی جو انسانیت کا علمبردار ہے جو مزدوروں، دہقانوں اور محنت کشوں کا ترجمان ہے۔ جو عوامی انقلاب کا پیش خیمہ ہے

اردو نثر کے سلسلہ میں طویل بحث کی ضرورت ہے۔ نثر کی ان کتابوں سے قطع نظر جو پہلے چھپ چکی ہیں۔ اگر موجودہ دور کا بھی تجزیہ کیا جائے۔ تو نقاد امید افزا تاثرات نہیں پیش کر سکتا۔

میر ولی اللہ پہلا سرحدی فن کار ہے۔ جس نے نثر نگاری میں نام پیدا کیا۔ "ساقی" اور "نیرنگِ خیال" اپنے دور کے چند معیاری جرائد تھے۔ اور میر ولی اللہ ان جرائد کے مستقل لکھنے والے۔

پطرس سرحد کا ایک ایسا فنکار ہے۔ جس نے دو ایک مضامین سے ہی اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ اور آج بھی مزاح نگار اور نقاد دونوں حیثیتوں سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

سعدی افغانی، مظہر گیلانی، آذر سرحدی، ضیا سرحدی۔ ضیا جعفری۔ نذیر مرزا برلاس، فضل حق شیدا، حمزہ خاں، حافظ محمد ادریس، انوار الحق اور موسےٰ خاں کلیم کے نام یہاں کے نثر نگاروں کی فہرست میں گنوائے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی میں بھی انفرادیت نہیں ملتی اور یہ کہنے میں ہمیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ کہ نثر نگاری کے اعتبار سے ہم ابھی ابتدائی دور سے گزر رہے ہیں۔

نئے دور کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ تنقیدی مجالس کی وجہ سے یہاں ادبا میں روز بروز نثر نگاری کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اور نئی پود نظم کے ساتھ ساتھ نثر کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کر رہی ہے۔ چنانچہ آج خیبر بھیروی، قتیل شفائی، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، صادق ملک، فضل مالک، فرید عرش، بشیر ملک، عزیز اختر اور محمود شوکت رحمان ساحتی اور شفیع صابری کے افسانے، مقالے اور ڈرامے دیکھ کر ہماری ڈھارس بندھتی ہے۔ اور توقع ہوتی ہے کہ مستقبل قریب میں سرحد نثر نگاری میں بھی پاکستان کے دوسرے صوبوں سے پیچھے نہ رہے گا۔

مطبوعات کے ضمن میں یہ صوبہ پریس کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے نہایت پسماندہ رہا ہے۔ دلاور خان بیدل یہاں کا پہلا خوش نصیب شاعر ہے جس کا مجموعہ سوز بیدل اس کی زندگی میں ہی یعنی ۱۹۲۴ء میں ترتیب پا کر شائع ہوا۔ اور یہی دیوان یہاں کا اولین ادبی کارنامہ ہے۔ اس کے بعد میر ولی اللہ کی تصنیفات گلبانگ، بادۂ ناب، کاس الکرام — پطرس کی مضامین پطرس — سعدی افغانی کی صاحبزادہ عبد القیوم، کلید افغانی — یوسفی کی جمال الدین افغانی — نذیر مرزا برلاس کی طرح نو — قتیل شفائی کی ہریالی اور گجر — مظہر گیلانی کی بدنصیب سارہ، رنگین مشاہدے — فارغ بخاری کی عورت کا گناہ، آیات زندگی اور ضیا جعفری کی صبوحی یہاں کی اردو مطبوعات کا تمام و کمال اثاثہ ہے

اس کے علاوہ مختلف اوقات میں جو ادبی جرائد چھپتے رہے۔ ان میں سے تعلیم، آئینہ، ادیب، دوام، نغمۂ حیات، ندائے سفیر، سخن اور نو بہار کو کسی طرح نظر انداز

نہیں کیا جاسکتا۔

بالتعت پہلا ادبی مجلہ ہے جو ۱۹۲۵ء میں ہندوستان کے مشہور انشا پرداز مرزا فہیم بیگ چغتائی مرحوم کی ادارت میں پشاور سے جاری ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں سرحد کے نامور صحافی اللہ بخش یوسفی نے ماہنامہ سرحد کا اجرا کیا۔ جو اپنے دور کا ایک ترقی یافتہ جریدہ تھا۔ اور آخر میں سنگ میل جو ہندوستان اور پاکستان کے چیدہ معیاری پرچوں کے دوش بدوش ترقی پسند تحریک کی رہنمائی کا قابل فخر پارٹ ادا کر رہا ہے۔

صوبہ سرحد میں صحافت کا وجود ۱۹۱۲ء سے ملتا ہے۔ "افغان" یہاں کا پہلا اردو اخبار ہے۔ جو عیسائی مشنریوں نے اپنی مذہبی تبلیغ کے لئے جاری کیا۔ اور جو زیادہ دن نہ چل سکا۔ کچھ عرصہ بعد اسی نام سے ایک ہفتہ وار اخبار قاضی سید احمد صاحب کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ یہ مذہبی قسم کا پرچہ تھا۔ اور مشنریوں کے آرگن کا ردِ عمل ــــ اس دور کو ہم سرحد میں اردو صحافت کا پہلا دور کہہ سکتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں یہاں صحافت کے دوسرے دور کا آغاز ہفتہ وار "سرحد" کے اجرا سے ہوا۔ جو بعد میں روزنامہ بنا دیا گیا۔ یہ اخبار سرحد کا پہلا باوقار اخبار ہے۔ جو حکومت کی ترقیوں اور رضیلیوں کے باوجود نہایت حوصلہ مندی سے جاری رہا۔ اس کے ایڈیٹر سرحد کے مشہور سیاسی کارکن اللہ بخش یوسفی ہیں۔ جو بیک وقت صحافی بھی ہیں اور لیڈر بھی ــــ اور یہی وجہ ہے کہ "سرحد" کا اتنا قدیم اور ہردلعزیز اخبار ہونے کے باوجود یہ ہمیشہ موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا رہا۔ اور اب تو وہ محض سرکاری اشتہارات کی اجرت حاصل کرنے کے لئے کبھی کبھی صحیفے کی صورت میں نظر آجاتا ہے۔ اسی دور میں ہفتہ وار ترجمان سرحد کا اجرا امیر عالم اعوان نے کیا۔ یہ اخبار آج تک نہایت باقاعدگی سے جاری اور اس کی پالیسی شروع ہی سے ترقی پسندانہ رہی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ضیا جعفری کی ادارت میں اصلاح سرحد عالم وجود میں آیا۔ اس اخبار میں اشتراکی ادیب باری ملیگ بھی ایک عرصہ تک کام کرتا رہا۔ یہ دور سرحد میں

صحافت کے عروج کا دور تھا۔ اس دور نے اچھے اچھے اخبارات اور اخبار نویس پیدا کئے۔ یہ تحریک خلافت کا دور تھا۔ اور سرحد میں پہلی بار اس تحریک نے سیاسی بیداری پیدا کی۔

۱۹۲۷ء میں کانگریس کا اثر یہاں بڑھنے لگا۔ ملک کی فضا نے پلٹا کھایا۔ ہندوستان سے سوشلزم کی ہوائیں آنے لگیں۔ نوجوانوں کے جذبات برانگیختہ ہونے لگے ملک کے اس بدلتے ہوئے رجحان نے صحافت کا رنگ بھی بدل دیا۔ انگریز سامراج سے نفرت کا جذبہ اور آزادی کی امنگ نے عوام کے ذہنوں میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کر دی "فرانٹیئر ایڈووکیٹ" اور "نوجوان سرحد" انہی دنوں میں جاری کئے گئے۔

صحافت کا تیسرا دور یہاں ۱۹۳۰ء میں شروع ہوا یہ سرخ پوش تحریک کا عہد تھا۔ انگریزوں نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے انتہا درجہ انسانیت سوز مظالم کئے۔ لیکن جوش آزادی کی یہ لگن دبائی نہ جا سکی۔ اسی زمانے میں "انگار" کا اجراء ہوا جو سرخ پوش تحریک کا آرگن اور ہر لحاظ سے ایک ترقی پسند پرچہ تھا۔ امیر نواز جلیا اور ضیا جعفری اسے مرتب کرتے تھے۔ اس کے علاوہ رسالے عام سرحدی سماچار، روزنامہ اخوت، روزنامہ پربھات، روزنامہ آزاد، روزنامہ آزادی، ہفتہ وار ہمدم، پیغام جنگ اور حریت اسی دور کی یادگار ہیں

۱۹۳۷ء میں مظلوم دنیا، نوجوان افغان، شرر المشرقی، الفلاح اور ۲۸ء میں ہفتہ وار شباب کا اجراء عمل میں آیا۔ آخر الذکر ایک ترقی پسند جریدہ تھا جسے راقم الحروف اور اس کے شریک کار رضا ہمدانی ترتیب دیتے تھے۔ اس اخبار کو بہت جلد ہی یہاں کی مسموم فضا کی بھینٹ چڑھ گیا۔ سرحد کی صحافت میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس عہد میں روزنامہ ملت کا بھی اجراء ہوا جو مسلم لیگ کا نیم سرکاری آرگن تھا۔ اور رشید اختر ندوی اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس پرچے کی پشت پر ایک مضبوط جماعت اور بھاری سرمایہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود پنپ نہ سکا اس دور کا ایک قابل ذکر ترقی پسند پرچہ ہفتہ وار مجاہد ہے۔ جو ڈیرہ اسماعیل خان

سے جاری ہوا۔ اور جو جلد ہی حکومت کی نظرِ عنایت کا شکار ہو گیا۔

پاکستان بننے کے بعد حالات بدل گئے۔ لیکن صحافی فضا خوشگوار ہونے کے بجائے اور زیادہ گھٹ کر رہ گئی۔ ڈکلیریشن کی راہ میں اس قدر مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں۔ کہ سوائے وزارت پارٹی یا اس کے متعلقین کے کسی دوسرے کے لئے ڈکلریشن حاصل کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں ملک نورالٰہی نے روزنامہ شہباز کو لاہور سے یہاں منتقل کیا۔ شہباز پہلا روزنامہ ہے جو دو سال سے نہایت باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اساس مضبوط ہے اور وزارت پارٹی کی سرپرستی اسے حاصل ہے۔ اس کے اجراء سے یہاں ایک گونہ انقلاب بھی پیدا ہوا۔ ایسا انقلاب جس سے صحافت کا ذوق یہاں ترقی پذیر ہو رہا ہے۔ لیکن شہباز عوامی پرچہ نہیں وہ محض حکومت کی قصیدہ خوانی کے لئے وقف ہے اور صوبے کی ترقی و بہبودی اور یہاں کے باشندوں کے مفاد سے زیادہ اسے اجارہ مفاد پیشِ نظر ہے۔ اس کے علاوہ چند ایک قدیم ہفتہ وار اخبار بھی یہاں سے اب تک شائع ہو رہے ہیں جن میں سے ترجمان سرحد، جمہور، مظلوم دنیا، دوسرا سرحد، ملّم، الجمعیت، پیغام وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن موجودہ پابندی اور زبان بندی میں صحافت کے پنپنے اور ترقی کرنے کے امکانات یہاں بہت کم ہیں۔

طبقۂ نسواں کا تذکرہ اگر اس مقالہ میں نہ کیا جائے تو یقیناً یہ ایک نامکمل چیز متصور ہو گی۔ ادبیاتِ سرحد کے تیسرے دور تک صوبہ سرحد میں کسی اردو ادیبہ کا وجود نہیں تھا۔ پہلے ادوار میں فنکار خواتین ضرور گزری ہوں گی۔ لیکن پردہ کی شدت اور رواتی پابندیوں کی وجہ سے وہ پردۂ ظہور پر نہ آسکیں۔

دورِ جدید میں چند ایک لجائی لجائی، جھجکی جھجکی صورتیں نظر پڑتی ہیں۔ جو اگرچہ تعداد میں محض گنتی کی ہیں لیکن ان کے منظرِ عام پر آنے سے طبقۂ نسواں کی وہ رواتی جھجک ضرور دور ہو گئی جس کی وجہ سے ہم اب تک ان کے افکار سے محروم تھے۔ اس کے علاوہ ہم یہ اطمینان بھی محسوس کرتے ہیں۔ کہ مستقبل قریب میں ہماری یہ

لطیف صنف بھی ہمارے دوش بدوش علم و ادب کی خدمت میں حصہ لیکر ہمارا ہاتھ بٹا رہی ہیں

یہ عجیب بات ہے کہ جہاں ہم سرحدی فن کاروں میں نثر نگاروں کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ وہاں خواتین کی ابتداہی یہاں نثر نگاری سے ہوتی ہے۔ شعر کہنے والی خواتین میں یہاں مستور سرحدی، رشیدہ اختر، زہرہ خاتون، عصمت نسیم اور جمیلہ نسیم قابل ذکر ہیں۔ لیکن سوائے رشیدہ اختر کے ان سب کا کلام پرانی اور فرسودہ قدروں کا حامل ہے اور ان میں جدید رجحانات اور افادی نظریات کی تلاش بے سود ہے

البتہ نثر کے معاملہ میں اس طبقہ کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ مس س۔ ن۔ غ صمدانی سیدہ قانتہ بیگم، سعیدہ اختر، ایس بی طاہرہ، نسیم اختر مفتی، فہمیدہ اختر، زکیہ سلطانہ عصمت بیگم یہاں کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔

مس س۔ ن۔ غ صمدانی پشاور کے ایک معزز خاندان کی چشم و چراغ ہیں یہ خاندان اپنے علم و فضل کے لئے مشہور ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء ماہنامہ "خاتون سرحد" آپ نے پشاور سے جاری کیا۔ جو ایک عرصہ تک نہایت حسن خوبی سے شائع ہوتا رہا۔

سیدہ قانتہ بیگم میاں ضیاءالدین خاں بیرسٹر مشہور سیاسی کارکن کی ہمشیرہ محترمہ ہیں۔ ایک پختون گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ اور پشتو ماحول میں ہوش سنبھالا۔ لیکن اردو سے فطری رغبت ہے۔ بلندپایہ مضمون نگار ہیں۔ سعیدہ اختر ایس بی طاہرہ اور نسیم اختر مفتی انشا پردازی میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ فہمیدہ اختر اور زکیہ سلطانہ افسانے بھی لکھتی ہیں اور ڈرامے بھی۔ یہ بے پناہ سیاسی کارکن بھی ہیں۔ اور چوٹی کی فن کار بھی ——— ان کے رجحانات ترقی پسندانہ ہیں اور نئی قدروں کے حامل ———

یہاں ادبی میدان میں خواتین اگرچہ بہت دیر سے آئیں۔ لیکن وہ اس سرعت سے بڑھ رہی ہیں۔ اور ترقی کر رہی ہیں کہ ان کا مستقبل نہایت شاندار نظر آتا ہے

لسانی اعتبار سے سرحد میں پشاور، کوہاٹ، ہزارہ اور ڈیرہ اسماعیل خاں ہی ایسے مقامات ہیں جہاں اردو زبان کے پنپنے کے امکانات ہوسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ سرحد کا سارا علاقہ خالص پشتو بولنے والا ہے۔ اور کسی دوسری زبان کی وہاں کوئی گنجائش نہیں نظر آتی۔ اگرچہ ایک عرصے سے یہاں عدالتی زبان بھی اردو ہے۔ اور تعلیمی

واروں میں بھی اردو ہی رائج ہے۔ لیکن پٹھان کو فطرتاً اپنی مادری زبان سے دلی لاؤ ہے۔ اور اسی لئے وہ دوسری زبانوں پر حاوی ہونے کے باوجود بھی اپنی پشتو زبان ہی میں لکھنا اور بولنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے ہی اردو ادب سب سے بڑا مرکز پشاور ہی رہا۔ اور اس کے بعد اگر کہیں اردو کو نشوونما کا موقع ملا تو کوہاٹ۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ہزارہ تھا۔

تیسرے دور تک سرحد میں اردو شاعری پر منفی رجحانات کا تسلط رہا۔ کیونکہ اس فارسی شاعری کا اثر غالب تھا۔ پشتو شاعری کے رجحانات شروع ہی سے ترقی پسندانہ تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرحد کا ماحول بجائے خود رزمیہ ماحول تھا۔ اور یہاں کے باشندوں کی فطرت میں بغاوت کا عنصر ابتدا ہی سے موجود تھا۔ لیکن اردو شاعری ان سب سے ایک عرصہ تک اثر پذیر نہ ہوسکی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہی تھی کہ ہندوستان کی طرح یہاں بھی اردو شاعری نے فارسی کے آغوش میں جنم لیا۔ اور اسی کے زیرسایہ پھولی پھلی اور بڑھی۔ دوسرا یہاں جن علاقوں میں اردو شاعری پروان چڑھی وہ جغرافیائی اعتبار سے سرحد کے ساتھ منسلک ہوتے ہوئے بھی ذہنی طور پر اس سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ کیونکہ ان علاقوں کی غالب آبادی افغان نسل سے نہ تھی۔ اور ہندوستان کے باشندوں کی طرح یہ بھی غیر ملکیوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر پٹھانوں کو خونخوار قاتل اور ظالم لٹیرے ہی سمجھتے رہے اور ان سے میل جول رکھنے اور تعلقات بڑھانے سے ہمیشہ خائف رہے یہ لوگ وفادار قسم کے تھے اور حکمران طبقے کو ان کا پورا پورا تعاون و اعتماد حاصل تھا۔ برخلاف اس کے پٹھان کی انفرادیت پرستی اور ازلی سرکشی نے اسے کبھی بھی انگریز کا ہمنوا نہ ہونے دیا۔ اور وہ ہمیشہ ان سے برسرپیکار رہا۔ اس لئے ان دو متضاد ذہنیتوں میں کوئی قدر مشترک پیدا نہ ہوسکی اور اردو فن کاروں کو یہاں کے حریت سرشت باشندوں کے ادب اور نفسیات مطالعہ کا کم موقع ملا اور اسی لئے وہ فارسی کے روایتی تغزل کی تقلید سے اپنے فن کا دامن کافی مدت تک نہ چھڑا سکے۔

لیکن آج وہ خوف اور جھجک دور ہو چکی ہے اور آج کا ترقی پسند ادیب یہاں کے عوام کے باغیانہ اور سرکش جذبات کو اپنے فن کا موضوع بنانے کا فیشن کرچکا ہے۔

افسانے

ابو الفضل صدیقی

مہمانے آمد و مہمانے رفت

جبال خاں اور پلنگ خاں کے یہاں ان کا خالہ زاد بھائی ضرغام خان کابلی دو روز سے مقیم تھا اور اس کی خانم اس کے ساتھ تھی۔ عمر میں پہلی مرتبہ ضرغام خاں مع اپنی خانم کے ان کا مہمان ہوا تھا۔ خان اور اس کا سارا قبیلہ آنکھیں بچھائے ہوئے تھا۔ ان کی گڑھی بھی کچھ عجیب وضع کی تھی۔ آزاد قبائل کے تمام مسکنوں سے جداگانہ ساخت کی عمارت ایک بڑی اونچی پہاڑی کے زیرین حصّے پر جہاں ڈھال ختم ہو کر گھاٹی شروع ہوتی تھی۔ ایک بہت بڑی چٹان میں ایک پھاٹک نصب تھا اور پہاڑی کے ڈھال کے اوپر چھوٹی چھوٹی چٹانوں کی شکل میں برجیاں تھیں۔ جہاں گھاٹی کے اندر اور دائیں بائیں دونوں جانب اور اوپر فضا میں گولی چلانے کے لئے مورچے اور سوراخ تھے۔ جن میں سے گولی چلنے کے بعد گھاٹی کے اندر آواز اور پھر اس کی صدائے بازگشت بار بار گونجنے کے بعد یہ پتہ نہ چل سکتا تھا کہ گولی کدھر سے آئی۔ اور آواز کہاں سے پیدا ہو رہی ہے۔ پھاٹک بھی گھنے درختوں کے جھنڈوں اور چٹانوں کی نوکوں میں بالکل چھپا ہوا تھا۔ اور بادی النظر میں دائیں بائیں اوپر نیچے کہیں پرے بھی دیکھنے سے گڑھی کا کوئی نشان نہ معلوم ہوتا تھا۔ اور تمام عمارت چٹان کے اندر اور پہاڑی کے ڈھال میں تراشی ہوئی سی تھی۔ یہ تعمیر آفریدی قبیلے کے اس خاندان کی تھی۔ جو ہندوستان کی سرحد پر آباد تھا۔ اور انہیں اپنی خلقی خصوصیت یعنی دبکنے والی نیچر کے مطابق اپنے مسکن بھی چٹانوں اور گھاٹیوں کے دامنوں میں بالکل چھپے ہوئے بنانا پڑتے ہیں۔ یہ

لوگ بالعموم ہندوستان کی سرحد پار کرکے یا اپنی آبادیوں کے قریب سے گذرتی ہوئی سرکاری سڑکوں پر شبخون اور دھاوے مارتے ہیں۔ اس لئے مار کر چھپنا اور اسی ضرورت کے لحاظ سے اپنی جائے رہائش اور پناہ گاہ تعمیر کرنا ان کی عادت ثانیہ ہے۔ ہندوستانی فوج ان گھاٹیوں اور پہاڑیوں تک اوّل تو پہنچتی بڑی مشکل سے تھی۔ اور اگر پہنچ گئی تو گولیاں برستی تھیں۔ اور یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ کہ کدھر سے آرہی ہیں۔ اور نہ کسی آدمی کا نام و نشان ملتا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا کھانے سے فارغ ہو کر پلنگ خاں اور ضرغام خاں گڑھی کے وسطی کمرے میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ کہ یکدم اوپر کی کسی برجی سے خطرے کا الارم ہوا۔ سب لوگ طیار ہو گئے۔ شاید انگریزی فوج آ گئی۔ گڑھی میں ہر ایک مرد عورت نے اپنی اپنی رائفل سنبھالی اور ایک مشین کی تیزی کے ساتھ سب کے سب طیار ہو کر پھاٹک کی جانب بڑھے اور مورچوں پر لگ گئے۔ پلنگ خاں متعجب تھا۔ ضرغام خاں کا ماتھا ٹھنکا۔ کہ اتنے میں دوسرا الارم امن کا ہوا۔ اور ساتھ ہی خبر ملی کہ قبیلۂ آدم خیل کے سردار واسع خاں اور فیض دل آئے ہیں۔ اور ان کے ساتھ کابل کا مشہور تاجر اِلّا کا فر قبیلے کا خان بادام خان ہے۔ اور بادام خاں باریابی چاہتا ہے۔

بادام خاں کا نام سنتے ہی روحی خانم کی نبضیں چھوٹ گئیں ضرغام خاں کا چہرہ سفید ہو گیا۔ گردن نیچے کو جھک گئی۔ پلنگ خاں نے کہا " اہیں۔ بادام خاں کو واسع خاں اور فیض دل پھانس کر لائے ہیں۔ اچھا شکار ہے۔ جتنا روپیہ کنجر پیشے میں دنیا بھر سے ٹھگا ہے۔ اس کا آدھا منگا کر چھوڑیں گے۔

" بالکل ٹھیک لقمہ تر ہے" کسی نے مجمع میں سے کہا

پلنگ خان نے برفستانی چیتے کی طرح آنکھیں چمکا کر کہا " تو پھر میں حکم دیتا ہوں اپنے جوانوں کو" اور ایک کرسی نکال کر اپنا پستول کمر سے ہاتھ میں لے لیا۔ اور ہوا میں گھما کر تن کر کھڑا ہو گیا۔

" ٹھہرو بھیا پلنگ خاں ذرا!" ضرغام خاں نے اپنی متوحش اور ناگفتہ بہ دلی

کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: اتنی تیزی مت کرو"
"مگر بھئی ضرغام خاں۔ درکارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست" اور یہ تم اتنے
پریشان کیوں ہو؟ ایں! دیکھو ابھی فیصلہ ہوتا ہے"۔
"لیکن میاں تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کیوں آیا ہے؟" ضرغام خاں نے کہا
وہ اپنے غدار خائن ملازم کا پیچھا کرتا ہوا آیا ہے اور اس جلتی آگ میں کودا ہے۔ دراصل
وہ آپ کا مہمان ہے اس وقت اور میں آپ کا بھائی! اس کا نمک حرام خائن محسن
کش مفرور غلام جو اس کی عزت پر ڈاکہ مار کر بھاگا ہے۔
مہمان کے لفظ پر یکدم پلنگ خان کی شکار پر جھپٹتے ہوئے چیتے جیسی آنکھوں میں
میں ڈبنے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور اس نے بڑی عظمت کے احساس سے مرعوب
ہو کر کہا: مہمان! بھائی ضرغام خاں مہمان!! اور اس کے پستول والے ہاتھ کی تنی
ہوئی کلائی نیچے کو جھک گئی۔ اور گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اور اس نے دو مرتبہ زیر لب
"مہمان! مہمان!!" کہا اس کا تنا ہوا سینہ اور کھنچا ہوا قد ڈھیلا ہو گیا: ہاں میں اس
کا کو زمک ملازم ہوں اور اس کی خوش اعتقادی اور اعتبار سے ناجائز فائدہ اٹھا
کر اور اس کی عزت پر چھاپہ مار کر بھاگا ہوا مجرم! اگرچہ خدا گواہ ہے کہ میں نے اس
کی امانت میں خیانت نہیں کی ہے۔ اور میں اس کی بیٹی کو صرف لے کر چل دینے کا
مجرم ہوں۔ اور بھائی جبال خاں میرے لئے اب بہترین صورت یہی ہے کہ میں راہ
فرار اختیار کروں اور آپ لوگ بادام خاں کی امانت جُوں کی توں اسے سونپ دیں۔
میں بادام خاں اور اس کے سماج کا گنہگار ہوں۔ مگر خدا اور اس کے رسول صلعم
کا گنہگار نہیں
روحی خانم جو قریب کھڑی ہوئی یہ سب کچھ ایک انتشار کے عالم میں سن رہی تھی
بول پڑی: پیارے ضرغام! کیا تم مجھے چھوڑے جا رہے ہو!؟ برچھوں اور خنجروں کی
نوکوں اور دھاروں پر مجھے پیٹھ دے رہے ہو
"پیاری روحی! احساسِ فرض تمہیں چھوڑ رہا ہے!! ایک نمک حرامی کے بعد دوسری

نمک حرامی!؟

دوسری نمک حرامی کیا؟ آخر یہ لوگ تمہیں پناہ دیں گے یا نہیں؟ — تو پھر آخر مجھے کیوں چھوڑ رہے ہو؟

شاید تم یہ نہیں سمجھیں اب تک کہ اگر یہ لوگ تمہیں بادام خاں کے حوالہ نہیں کریں گے تو بادام خاں بہس پر ابھی کٹ مرے گا۔ اور عجب نہیں کہ وہ ان لوگوں سے تمہارے ساتھ میرا بھی مطالبہ کرے۔"

"خیر تمہارا مطالبہ کیا کر سکتے ہیں وہ لوگ۔ مگر اس کے یہ معنی ہوئے کہ تم نام نہاد اخلاقی دباؤ کے ذہنی احساس میں گرفتار ہو کر مجھے مفت میں ذلت اور تباہی، موت و مصیبت کے چنگل میں چھوڑے جاتے ہو اور دیکھو ضرغام یہ مرد کی شان کے خلاف ہے۔

"مگر روحی طاقت رکھتے ہوئے حق کے سامنے سر جھکانا عین بہادری اور مردانگی ہے۔ اس میں شک نہیں اگر میں ابھی چاہوں تو بادام خاں کی بوٹیاں یہ لوگ چیل کوؤں کو کھلا دیں۔ مگر اتنی بڑی نمک حرامی کے بعد تو تم کو بھی حاصل کرنے میں مجھے گھاٹا معلوم ہوتا ہے۔"

"لیکن ضرغام خاں صاحب بہادر طاقت رکھتے ہوئے سر جھکانا بزدلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔"

"مگر حق کے مقابلہ پر طاقت صرف کرنے میں بزدلی دکھانا ہی بہادری سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ تم کو لے کر فرار ہو جاؤں اور نتیجہ یہاں یہ ہو کہ کشت و خون و جدال و قتال میں انہیں چھوڑ دوں۔ اور وہ لوگ مع بادام خاں کے ایک ایک چن چن کر قتل ہوں۔"

"خوب! ضمیر ملامت کر رہا ہے! کیا کہنے! تمہارا ضمیر تمہیں اس پر ملامت نہیں کرتا کہ ساری عمر کا پیمانِ وفا باندھ کر ایک کمزور ہستی کے ساتھ بیوفائی کر رہے ہو؟ تمہاری آنکھ اس پر خجل نہیں ہوتی کہ ایک عورت کو زبان دے کر پلٹتے ہو؟! اور پھر اپنے آپ کو

آزاد سپاہی کا خون بہاتے ہوئے"

اور فرغام خاں کے چہرے پر ایک رنگ سا آیا۔ اُس نے پھر سنبھل کر کہا "دیکھو ذی خان! یہ سب کچھ ہے مگر اس وقت آقا بادام خاں اپنی جان پر کھیل کر اپنی عزت بچانے آیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے دماغ میں یہ چیز ہو کہ اگر اس نے تم کو پا لیا۔ تو یہ واقعہ کابل کے اندر عام ہوئے پائیگا۔ ظاہر بات ہے کہ اگر میں تم کو لے کر اس وقت چل دوں گا تو خان ان لوگوں سے سختی کے ساتھ تمہارا مطالبہ کرے گا۔ اس کا یہاں پہنچنا ہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ یا تو تمہیں لے کر جائے گا۔ یا جان دیکر ہٹے گا۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ کچھ اپنے آدمی اور ایک معتمد قبیلہ کے سردار ہیں لازمی طور پر کشت و خون ہو گا۔ یہ لوگ بھی کہیں گے کہ اچھے جنیا آئے سب گھر کو اپنے عشق کی بھینٹ چڑھا دیا"۔ ۔ ۔

پلنگ خاں نے بات کاٹ کر کہا "بھائی فرغام آپ ہماری فکر نہ کریں۔ موت کی ۔۔۔ کھیل ڈالنا اور خون کے سیلاب پیرنا ہمارا کھیل ہے۔ بس آپ کے اشارے کی دیر ہے اور ابھی بادام خاں اور اس کے سارے ساتھیوں کی دھجیاں اڑی ہوئی۔ وہ ایک چھوڑ سات قبیلوں کے سردار اس کی رہبری نہیں سپہ سالاری کرتے کیوں نہ آئیں

جبال خاں نے جواب تک چپ چاپ کھڑا تمام مکالمہ سن رہا تھا خشمگیں ہو کر پلنگ خاں سے کہا "تم لڑکے ہو۔ تیزی مت دکھاؤ۔ غور سے سنو۔ معاملات کتنی نازک شکل اختیار کر رہے ہیں۔ اوّل تو بادام خاں سرحدی قبائل کے تمام آداب سے خود بھی واقف ہے پھر اس کی راہنمائی کے لئے واسع خاں اور فیض دل ساتھ ہیں۔ اگر اُس نے تم سے مہمان بن کر رحم کی بھیک طلب کی تو تمہاری کتنی کی رہ جائے گی۔ اور وہ اس وقت سفید جھنڈا لئے مہمان بنے کھڑے ہی جو ہیں اور پھر یوں بھی آدم خیل سے ہماری صلح ہے۔ اور ان کے لئے ہمیشہ سے ہمارا دروازہ کھلا ہوا ہے یاد رکھو تم کو ایک مہمان پر ہاتھ اٹھانا پڑے گا۔ جس کی نظیر آج تک آزاد قبائل کی تاریخ میں تو ملے گی نہیں"

"مگر بھائی صاحب یہ تو غور فرمائیے ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ہرچہ بادا باد مہمان بن کر آئے غریب خانہ حاضر ہے۔ دشمن بن کر آئے اور مہمان پکارتا جائے گولی طیار ہے"

پلنگ خاں نے کہا اور تن کر گردن بانکپن کے ساتھ موڑلی اور مونچھیں بٹنے لگا
جبال خاں نے نہایت پرسکون انداز میں کہا: "مگر میاں یہ کون دیکھتا ہے کہ مہمان کے نام سے لڑنے آیا تھا۔ اول تو یہ آدم خیلئے اس کا ساتھ دیں گے ورنہ پھر کم از کم ہمیں بدنام کرنے میں تو کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے ۔"
پلنگ خاں کی تیوری پر پھر بل آگئے اس کی گردن پھر اکڑ گئی۔ اس نے دو مرتبہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور حقارت آمیز نگاہوں سے دروازے کی سمت دیکھ کر کہا: "بھائی جان یہ آپ کیا فرماتے ہیں یہ آدم خیلئے بے چارے کس گنتی شمار میں ہیں۔ تین میں نہ تیرہ میں۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ! —
کیوں نہیں صاحب سب کچھ ہیں، اچھا مان لیا کہ کچھ بھی نہیں تو بدنام کرنے کو تو بہت ہیں کہ آفریدیوں نے مہمان مار گرائے — "ضرغام خاں نے جبال خاں کے مونہہ سے بات لے کر کہا: "نہیں بھائی جان درحقیقت وہ تمہارا مہمان ہے۔ اور تمہاری امان میں ہے۔ میری رگوں میں شریف خون ہے ۔ میں جانتا ہوں بادام خاں کن جذبات اور مصالح کے تحت جان پر کھیل کر یہاں تک آیا ہے۔ اب تک جو کچھ ہوا وہی بہت ہے چہ جائیکہ اور زیادہ" — اور یہ کہکر ضرغام خانم کو ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ جو امید وبیم کا مرکز بنی ذرا علیحدہ کھڑی گویا اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کی منتظر تھی۔ دیکھو خانم یہ رگ جتنے جابر اور قانون شکن ہیں موقع پڑتے ہی رحم دل اور امن پسند ہیں۔ اس وقت ان پر بادام خاں کی دلجوئی بھی اتنی ہی فرض ہو گئی جتنی ہماری —— اس لئے کہ وہ خود بھی مہمان بن کر آیا ہے۔"
"مگر تم نے ہی تو مہمان تسلیم کرادیا ورنہ —" اور خانم کی آواز حلق میں بند ہو گئی۔
ہاں! ہاں میں نے تسلیم کرا دیا۔ اور میرا یہ دوسرا رخ تھا۔ اول تو اقبال جرم کے بعد شائد یہ لوگ بھی تمہیں میرے ساتھ بھیجنا گوارا نہ کریں گے۔ اور پھر خانم میں تم سے ان انسانیت، شرافت اور نمک حلالی کے پاک ناموں پر اپنی رخصت کی بھیک طلب کرتا ہوں میری روح میرے سینے میں بھی محبت کی آگ اتنی ہی تیزی سے بھڑک رہی ہے جتنی تمہارے

دل میں۔ مگر میں مرد ہوں اور یہ میری تمہاری صلاحیتوں اور استعداد کا فرق ہے۔ کہ احساسِ فرض اس پر غالب آ رہا ہے۔"

"ہوں! احساسِ فرض! ۔۔۔ ایک عورت کی جسمانی حفاظت کا احساسِ فرض کوئی چیز ہے یا نہیں۔ تم تو مرد ہو۔ اور پھر سپاہی خون اپنی رگوں میں بتاتے ہو۔ اور عورت کی استعداد اور صلاحیتوں سے تمہاری استعداد اور صلاحیتیں بہت بڑی ہوتی ہیں نا۔"

"مگر تم کو یہ لوگ اس طرح باوام خاں کے حوالے نہ کریں گے" ضرغام خاں نے جیسے دو تین چانٹوں کی پیہم ضربات سے اپنے چہرے کو سنبھالتے ہوئے ذرا ٹھہر کر کہا "یہ لوگ تمہاری جسمانی حفاظت کی ذمہ داری لیتے ہوئے اپنی امانت بنا کر دیں گے۔ اور تم میرا انتظار کرنا اس وقت تک جب تک کہ ہندوستان سے انشاء اللہ اس قابل ہو کر پلٹوں۔ کہ باوام خاں تمہیں میرے حوالے کرنے میں فخر سمجھیں"

"مگر ضرغام مجھے اپنی حفاظت کی ذمہ داری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں بغیر تمہارے زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میں خان کے سامنے جانے سے پیشتر موت چاہتی ہوں۔ موت ضرغام بس تم جا سکتے ہو مگر ایک گولی" اور وہ سینہ تان کر ضرغام کی جانب ایک قدم کھسک گئی۔

"دیکھو روحی! ذرا دل کو قابو میں رکھو۔ مجھے دیکھ کر یہی سوچو کہ محض ذہنی احساسات کی بنا پر اپنے دل پر کتنا جبر کر رہا ہوں۔ اور تم سب کچھ سمجھتی ہو اور پھر بھی تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ اب اس ... سرزمین میں سانس لینے کے لئے میرے لئے ہوا نہیں ہے۔ وادیٔ تیراہ مجھ پر تنگ ہے۔ بس روحی انتظار کرو ...."

"بالکل بزدلی!" روحی نے بات کاٹ کر کہا۔

"عین بہادری!" ضرغام نے برجستہ جواب دیا

اور ایک منٹ فضا ساکت رہی۔ بزدلی و بہادری کا توازن ہوتا رہا مگر مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد! اور ضرغام کے قدم بجائے صدر پھاٹک کی جانب سینہ تانے ہوئے بڑھنے کے سمٹے سکڑے ہوئے عقبی چور دروازے کی جانب اٹھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس کی ابلتی ہوئی آنکھیں پلٹ کر خانم کی پُرنم آنکھوں سے چار ہوئیں۔ الوداع ۔۔۔ الوداع

— تم میرا انتظار کرنا۔ اس وقت تک جب تک کہ ہندوستان سے انشاء اللہ اس قابل ہو کر پلٹوں کہ بادام خاں تمہیں میرے حوالے کرنے میں فخر سمجھیں جیسے روحی کے کانوں میں آواز گونجی۔ اور جیسے اندر سے کوئی پکار اٹھا ہو

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک! ؟ —

"خدا حافظ!" روحی نے باچشم نم طنزیہ انداز میں کہا۔ اور اس وقت تک ضرغام خاں کو دیکھتی رہی۔ جب تک کہ وہ چور دروازے سے نکلنے کے لئے دو مسلح آدمیوں کی معیت میں گڑھی کے ایک تاریک گوشہ میں غائب نہ ہو گیا۔ اور پلنگ خاں و جیال خان وعلیکم السلام کہکر نئے مہمان کے استقبال کے لئے صدر دروازے کی جانب رجوع ہوئے جہاں پر سب لوگ ان کے منتظر تھے۔

علیک سلیک کے بعد واسع خاں اور فیض دل تو یہ کہکر علیحدہ ہو گئے کہ سوداگر بادام خاں آپ کے مہمان ہونا چاہتے ہیں۔ اور آپ سے مدد کے طالب ہیں۔ ہم سے آپ کی گڑھی تک رہبری کے طالب ہوئے تھے۔

زہے نصیب! آپ اور بادام خاں!! غریب خانہ حاضر ہے شرف میزبانی سے سرفراز فرمایئے"

بادام خاں نے انداز تشکر بنایا اور پھر کہا "مگر پیشتر اس کے کہ شرف مہمانی حاصل کروں یہ عرض کرنا ہے۔ کہ آپ کی گڑھی کے اندر میرا غدار مقیم ہے۔ جو میری سات پشت کی ناموس پر ڈاکہ مار کر فرار ہوا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی رگوں میں تیرا ہی خون رکھتا ہے۔ مگر وہ تیرا ہی نسل کی گالی ہے اور آفریدی خون کا کالا دھبہ!"

"اچھا! تو پھر! آپ کا مطلب؟ —" جیال خاں نے مجسم سوال بن کر کہا۔

"خان! میرا مطالبہ وہی ہے جو ایک عالی ظرف بہادر سپاہی سے ایک عاجز و بے بس کا ہو سکتا ہے۔ ایک متواضع میزبان سے غریب الوطن مہمان کا ہو سکتا ہے — آپ میرے مجرموں کو میرے حوالے کریں —"

"ہاں! مگر یہ کیونکر؟ — آپ کا مجرم غدار خائن جو کچھ بھی کہیئے وہ بھی تو میرے

گھر میں مہمان ہی کی حیثیت سے داخل ہُوا۔ مجھے جس قاعدہ کی رُو سے آپ کا پاس و لحاظ ہے اس قاعدہ سے اس کا بھی لحاظ ہے۔ میرے لئے تو آپ اور وہ دونوں برابر ہیں۔"

"دیکھئے خان ــــ آپ کو یقیناً اس چیز کا احساس ہوگا کہ میں تنہا بے یار و مددگار صرف آپ کے ظرف اور بہادری پر اطمینان کر کے یوں شیر کی کچھار میں داخل ہُوا ہُوں اور اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہوں۔ اگر آپ میرے مجرموں کو مجھے نہیں دیں گے تو اگر مارنے کی طاقت نہیں رکھتا تو آپ کے اِس آہنی پھاٹک سے سر ٹکرا کر مر جانے کے تو قابل ہوں۔

"دیکھئے ہم آپ کو مہمان تسلیم کر چکے مارنے مرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا مجھو پڑا صدائے لبیک دے رہا ہے مگر آپ سے پیشتر ضرغام خاں اور روحی خانم کو داخل کر چکا۔ مجھے افسوس ہے کہ باوجود ہمارے قبائل کی جملہ روایات سے واقفیت رکھتے ہوئے آپ ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ اپنے ایک مہمان کو دوسرے مہمان کے حوالے! مہمان تو درکنار کوئی آفریدی اپنے مہمان کو اپنے باپ کے حوالے بھی قصاص کے لئے نہ کریگا برادر!"

"مگر یہ بھی تو آفریدی کی شان کے خلاف ہے۔ کہ اس کے سامنے اپنا انتقام لینے کے لئے کوئی بے کس و مجبور مدد کی بھیک طلب کرے تو وہ پہلو تہی کرے۔"

"مگر مہمان مہمان کے درمیان آفریدی ایک کے مقابلہ پر دوسرے کی دادرسی کرنے سے عاجز ہے۔ ذرا بتایئے تو آپ کو اپنی داہنی آنکھ زیادہ عزیز ہے یا بائیں"

"البتہ اگر طرفین کسی معاملہ میں پنچایت کرائیں تو طرفین کی رضامندی سے انصاف کر سکتا ہے۔" پلنگ خاں نے کہا۔

"اچھا پلنگ خان میں انصاف چاہتا ہوں سب سے زیادہ طاقتور جنگل اس وقت تمہارا ہے۔ لہٰذا تم ہی انصاف کے لئے موزوں ہو۔"

"ہم ضرغام خاں کا انصاف کر چکے بلکہ وہ خود ہی بے چارہ انصاف کر کے چلا گیا۔

جان بچانا ہر ذی روح کا فرض ہے اور بنی نوع انسان کے ساتھ حفظِ زندگی ہی سب سے بڑا انصاف ہے۔ اب آپ کی بہترین داد رسی یہ ہو سکتی ہے۔ کہ آپ کی لڑکی آپ کے حوالے کر دی جائے۔ مگر ہماری امانت کے بطور۔"

"آپ کی امانت کے بطور! ــــ مگر خان یہ کبھی نہ ہو سکے گا۔ میں روجی خانم کو ہرگز زندہ نہ چھوڑوں گا" سوداگر خاں نے کہا۔

"جی بادام خاں! ہاں میری امانت کے بطور۔ ورنہ میں اپنے مہمان کو آپ کے حوالے ہرگز زندہ نہ چھوڑنے کے لئے کبھی نہ کروں گا" سپاہی خان نے جواب دیا۔

اور پتنگ خاں نے کہا "ویسے غریب خانہ حاضر ہے۔ حتی الوسع مہمانداری اور میزبانی کے جملہ آداب پورے ہوں گے۔ مگر جب میں آپ کے حوالہ آپ کی مہمانداری کے دباؤ میں ایک دوسرے مہمان کو بقول آپ کے ہرگز زندہ نہ چھوڑنے کے لئے کر دوں۔ تو پھر مجھ پر بحیثیت میزبان آپ ہی کی تکریم کب فرض رہی۔ آپ کا مطالبہ اپنی تردید خود اپنے اندر مضمر رکھتا ہے۔ وہ آپ کے نزدیک لاکھ غدار اور ناخلف سہی مگر میرے لئے تو مہمان ہیں اور میں اپنے قبضہ سے جب ہی علیحدہ کر سکتا ہوں جب اس کی حفاظت کا تیقن کر لوں ورنہ مجھ پر بھی غدار اور مہمان کش کے الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے۔"

اور جیال خاں نے اس کے منہ سے بات لے کر کہا "آپ کے ساتھ خیانت، بڑی تی سب ہی کچھ ہوئی۔ ہمیں تسلیم ہے مگر آپ ہمیں خائن اور غدار بنا کر اپنا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اور مہمانی کے خود ساتھ دوسرے مہمان کے مقابلہ پر۔ بادام خاں آپ کا یہ مطالبہ تو مہمان اور میزبان کے الفاظ ہی کو بے معنی بتاتا ہے۔ بادام خان نے اپنی تاجرانہ گفتگو میں اپنا بھاؤ پھر پور بڑھا لیا جسے سپاہی خانوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ تقریباً دو تین منٹ مکمل سکوت رہا۔ یہاں تک کہ جیال خان بول اٹھا "بادام خاں لڑکی آپ کی حاضر ہے۔ مگر آپ کی لڑکی اور ہماری امانت بن کر تا زیست! ورنہ وہ دیکھئے وہ دور گھاٹی کے اس پار دو جوانوں کے ساتھ ایک آدمی جا رہا ہے۔ روجی خانم بھی وہیں پہنچ چکی ہوتی۔ جہاں افغانی سماج کا افغانی قانون اور افغانی گولی کوئی چیز کارگر نہیں ہوتی۔"

اور ذرا جوش میں آکر پلنگ خاں نے لقمہ دیا" اور جس شرافت کا مظاہرہ ابھی ہمارے سامنے فرغام خاں نے کیا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے آپ نے ہمیں روحی خانم کی حفاظت کا حلف نہیں دیا۔ تو یہ بھی چوبیس گھنٹہ کے اندر وہیں ہوگی جہاں وہ ہے"

"جی ویسے آپ ہمارے مہمان ہیں۔ اور ابھی ہم عرض کر چکے کہ آپ کی ہر مدارات و تعمیل حکم ہم پر فرض ہے۔ بجز اس کے کہ ہم دوسرے مہمان کی گردن آپ کے ہاتھ میں چھری پھیرنے کے لئے دیدیں البتہ ہماری اپنی جان حاضر ہے۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی" جبال خاں نے کہا اور قدرے گردن جھکائی۔

پورا پورا سودا کرنے کے بعد اور جوالے بھالے سپاہی خان پر اپنی تاجرانہ گفتگو سے خوب رعب ڈال کر کہا" اچھا آپ لوگ مجبور کرتے ہیں تو میں ایک بے غیرتی کی زندگی جینے کے لئے روحی خانم کو زندہ رکھوں گا۔ اور آپ کی امانت سمجھوں گا — کاش خودکشی حرام نہ ہوتی! — افسوس"

پلنگ خاں نے کہا" جی خان! اور ہمارے پاس بھی خانم پاک امانت ہے بہادری اور شرافت کی — جو اپنے مقدس عمل سے آج خود مٹ کر آفریدی قبیلے کی روایات کو زندہ رکھ گیا۔ اور اپنے چند روز پیشتر والے تاریک فعل کی پوری پوری تلافی مافات کر گیا۔ ورنہ آٹھ گھنٹے کے اندر اندر کوئی چیز اسے اپنی محبوبہ کے ساتھ ہندوستان کی سرزمین پر پہنچنے سے روک نہیں سکتی تھی۔

فیض دل جو چپ چاپ کھڑا سب کچھ غور سے سن رہا تھا بولا" اور بھیا جبل خاں انہیں بھلا یہاں سے کہیں بھی جانے کی کیا ضرورت تھی۔ جب وہ تمہاری پناہ میں تھے تو بھلا انہیں یہاں کون ستا سکتا یا پاسکتا تھا۔ یہ کہو کہ یہ تمہاری اور اس کی دونوں کی شرافت اور بہادری تھی"

واسع خاں نے کہا" نہیں بھائی پلنگ خاں آپ نے اس وقت بڑی بے تکی اور بے باک جرأت کا مظاہرہ کیا اور آفریدیوں کی سب روایات زندہ کر دکھائیں"

جبال خان نے کہا" بھائی صاحبان درحقیقت اس وقت فرغام خاں نے

بڑی زبردست حق کوشی اور ایثار کا ثبوت دیا۔ مجھے خواتین کے ذریعہ اصل واقعہ کی سن گن مل چکی تھی۔ اور یہ پلنگ تماں تو شروع سے آخر تک تمام مدارج میں فرغام کا شریک کار رہے تھے۔ میں تو اندر یہ سن کر کہ بادام خاں آپ کی ہمراہی میں تشریف لاتے ہیں سکتہ سا ہو گیا تھا۔ عجیب چکیم میں گرفتار تھا۔ کچھ سمجھ کام نہیں کرتی تھی کہ کیا کروں مگر اس نے ہماری پوزیشن کا اندازہ کرکے آج آپ سب کے روبرو مجھے سرخرو کیا۔

اُدھر اپنے دونوں رہبروں کے ساتھ فرغام خاں گھاٹی کے ڈھال پر چڑھ کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ چکا تھا۔ ادھر بادام خاں خوش دل اور داسع خاں ساتھ پھاٹک میں داخل ہو رہا تھا۔ اُدھر فرغام خاں چوٹی سے دوسری گھاٹی میں مڑ مڑ کر اس گاؤں آمد و خر رفت کے منظر کو دیکھتا آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ اور زیر پا سے

نہ تو شیشہ ہی ملا اور نہ ساغر پایا ساقیا لے تری محفل سے چلے بے مایا

کی راگنی کا تا جا رہا تھا ادھر بادام خاں جیسے کسی بھاری سودے میں خاطر خواہ نفع اٹھا کر اپنے کارخانے سے گھر آ رہا ہو۔ جبال خاں کی گڑھی میں داخل ہو رہا تھا — بارود کارتوسوں میں مشتعل ہوتے ہوتے اور خنجر میانوں سے اچھلتے اچھلتے رہ گئے۔ اور سپاہی اور سوداگر خان کے درمیان معاملات خوبصورتی سے طے ہو گئے۔ اور افغانی اور تیراہی خون اندر ہی اندر جوش کھا کر اور سنسنا کر ٹھنڈا ہو گیا —

(زیر ترتیب ناول بازگشت کا ایک باب)

★

قتیل شفائی

خوبانیاں

خوبانیوں کے پیڑ اپنی تھکی ہوئی باہوں سے پیلے پیلے پھلوں کا بوجھ اتار پھینکنا چاہتے تھے۔ لیکن آندھی کے بے جان تھپیڑے ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ اور خلاؤں میں چکراتا ہوا گرد و غبار بارش کے ٹھنڈے ٹھنڈے چھینٹوں میں گھل مل کے رہ گیا۔

نوروز نے اپنے بھیگے ہوئے کرتے کا دامن نچوڑتے ہوئے ربانی کی آنکھوں میں کچھ اس ادا سے آنکھیں ڈال دیں، جیسے کہہ رہا ہو ”کیوں بیٹا! دیکھ لیا نا پیر بابا کی دعاؤں کا اثر، آندھی کا جگر پانی کر دیا ہے آندھی کا“ اور یہی احساسِ فتحمندی تھا جس نے گھڑی بھر میں وہ تمام لہرئے مٹا دیئے تھے۔ جو ربانی کے جوان خیالات نے نوروز کے توہم آلود عقیدوں کی سطح پہ بنا دیئے تھے۔ نوروز کا ذہن کچھ دنوں سے گنڈے تعویذ اور منت مراد سے ہٹ کر محنت و مشقت اور علم و عمل کے دریچے سے جھانکنے لگا تھا لیکن اس نئے واقعہ نے یہ دریچہ بھی کھٹ سے بند کر دیا ــــ

نوروز پرانی وضع کا ایک متوکل اور با اخلاق انسان تھا۔ جسے شروع شروع میں گاؤں کے بڑے مولوی صاحب کی تعلیمات نے متاثر کیا۔ اور وہ مسجد کا تنکا بن کے رہ گیا۔ گرمی ہو یا سردی، طوفان ہو یا بھونچال، اسے مسجد کی سیڑھیاں پانچ وقت باقاعدگی سے آتے جاتے دیکھا کرتیں، وہ منہ اندھیرے گھر سے نکلتا، اڑوس پڑوس کے نمازیوں کو ساتھ لیتا۔ اور پھر امام صاحب کے پیچھے صفیں باندھے ہوئے مقتدیوں میں امتیازی شان سے ”اقامت“ کا فرض ادا کرتا۔ اُسے عبادت سے اس حد تک رغبت

ہو چکی تھی ۔کہ وہ اکثر اوقات سب سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کے وسائل پر غور کیا کرتا جیب عصر کی نماز میں اُسے باقی نمازیوں کا انتظار کرنا پڑتا۔ تو وہ بیکار بیٹھنے کی بجائے یا تو مسجد کے صحن میں جھاڑو دینے لگتا۔ یا تسبیح کے دانوں پر لمبے لمبے وظیفے دہرانے میں مشغول ہو جاتا۔ اور جب لوگ مسجد میں آنے شروع ہوتے تو وہ انہیں یادِ الٰہی سے جی چرانے کی سزائیں گنواتا ۔ انہیں وقت پر نماز ادا کرنے کی فضیلتیں سمجھاتا ۔

نوروز جب مذہب کے سانچے میں پوری طرح ڈھل چکا ۔ تو اُس کے ذہن پر ایک نیا راستہ ابھرا ۔ کلامِ الٰہی سے آفاتِ سماوی پر قابو پانا ۔ اور اب وہ جب کبھی شہر جاتا واپسی پر عملیاتِ روحانی کے سلسلے کی ایک آدھ کتاب ضرور ساتھ لاتا۔ اس نے بڑے بوڑھوں سے بچپن میں اُن دیوؤں اور جنوں کی لاتعداد کہانیاں سن رکھی تھیں ۔ جو گاؤں والوں کو پریشان کرنے کے لئے کبھی بکری کے روپ میں نمودار ہوتے تھے ۔ اور کبھی روئی کے گالے کی شکل میں ۔ اُسے ان خدا رسیدہ بزرگوں کے معجزے بھی ازبر تھے جو بڑے سے بڑے جن کو مٹی کے چھوٹے سے کوزے میں بند کر دیا کرتے تھے ۔ اور پہاڑ پہاڑ جتنے دیوؤں کو مکھی بنا کر دیوار پر چپکا دیتے تھے ۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا اگر کوئی ایسا ہی عمل اس کے ہاتھ میں آجائے تو کیسی رہے ؟ اس نے کتابوں کی کتابیں چاٹ ماریں ۔ وظیفے پہ وظیفہ حفظ کر لیا ۔ لیکن بقول نانی اماں کے مرشدِ کامل کے بغیر یہ کرامت کیسے حاصل ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ نوروز کے جوشِ عقیدت نے "ملنگ بابا کا غازی" کی خاکِ پا کو سرمۂ چشمِ بصیرت بنایا اور شب و روز وہ ان کی خدمت میں مصروف رہنے لگا۔ حتیٰ کہ پیر بابا کی برکت سے وہ باری کے بخار کا علاج تعویذوں کی مدد سے کرنے لگا ۔ اور خدا کی شان کہ اس کے تعویذ کا کچھ کچھ اثر دو تین باریوں کے بعد مریض کو محسوس ہونے لگتا ۔ اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد مریض سراپا تشکر بن کر نذر نیاز لئے نوروز کے حجرے میں آ پہنچتا جسے دیکھ کر نوروز کا سر فخر سے اور بھی اونچا ہو جاتا ۔ اور حجرے میں بیٹھے ہوئے کسان ایک تازہ معجزاتی افسانے کی امید میں نوروز کا منہ دیکھنے لگتے ۔ نوروز کہتا ۔ "میں تو پیر بابا کا ادنیٰ غلام ہوں۔ ان کے در کا کتا ہوں ۔ اگر پیر بابا کے سفر چترال کا واقعہ سناؤں ۔ تو آپ لوگ حیران رہ جائیں ۔ اور جب وہ نسوار کی بھرپور

چلکی منہ میں رکھتے ہوئے واقعہ بیان کرنے لگتا۔ تو چاروں طرف ایک سناٹا چھا جاتا۔ وہ کہتا۔ مہتر چترال نے پیر بابا کی کرامت کا حال سنا تو اس نے اپنا ایلچی بھیج کر پیر بابا کو بڑی عزت سے چترال بلا بھیجا۔ لیکن صاحبو! بادشاہ اور فقیر میں کیا نسبت؟ پیر بابا نے چترال جانے سے صاف انکار کر دیا۔ جب چترال کے بادشاہ کو اس بات کا علم ہوا۔ تو اس نے دوسری بار معمولی ایلچی کی بجائے اپنے وزیر کو بھیجا۔ وزیر نے بادشاہ کا چغہ پیر بابا کے قدموں میں ڈال دیا اور کہا۔ "پیر و مرشد! چترال کا بادشاہ حضور کے ایک ادنیٰ غلام کی حیثیت سے التجا کرتا ہے۔ کہ حضور صرف چند دنوں کے لئے چترال تشریف لائیں۔ تاکہ وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت ہونے کا شرف حاصل کر سکے" یہ سننا تھا۔ کہ پیر بابا جلال میں آ گئے۔ اور انہوں نے چترال کی طرف رُخ کر کے بآواز بلند فرمایا۔ "اے چترال کے بادشاہ کیا تو یہ سمجھتا ہے۔ کہ میں تیرے مال و دولت اور جاہ و جلال سے مرعوب ہو کر تیرے پاس چلا آؤں گا؟ اگر تجھے میری ضرورت ہے تو تجھے خود میرے در پہ آ کے جھکنا ہو گا۔"

چنانچہ کہنے والے کہتے ہیں۔ کہ عین اس وقت جب پیر بابا کے منہ سے یہ کلمات جاری تھے مہتر چترال اپنی ملکہ سے باتیں کرتے کرتے اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھ کر یوں اڑا کہ سینکڑوں میل کا سفر بغیر کچھ کھائے پیئے طے کرتا ہوا دوسرے ہی روز پیر بابا کے قدموں میں جا گرا۔ پیر بابا کی منت سماجت کی اور اپنے کیے کی معافی مانگنے کے بعد انہیں سفر چترال پر رضامند کر لیا۔ فقیر کا دل موم ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ اسی دن چترال کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

راستے میں ایک خوفناک جنگل پڑتا تھا۔ رات سر پر آ پہنچی تھی، تھکن سے چور ہو کر بادشاہ نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ اور اپنے وزیر کو پانی کی تلاش میں کہیں دور بھیج دیا۔ ابھی آدھ ہی گھنٹہ گزرا ہو گا۔ کہ پیر بابا نے کسی ان دیکھی چیز کو للکارتے ہوئے کہا۔ "ہٹ پلید دور ہو جا" اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹی کا کوزہ خلا میں دے مارا جو خدا جانے کہاں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وزیر واپس آیا تو اس نے بتایا کہ وہ پانی کی تلاش میں جب ایک برساتی چھپر کے پاس پہنچا تو اچانک ایک شیر نے اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن فوراً ہی ایک غیبی آواز آئی

نیست پلید دُور ہو جائے "اور مٹی کا ایک کونہ شیر کے ماتھے پر اس زور سے لگا کہ شیر کا سر پھٹ گیا۔"

تو صاحبو! ایسی ایسی بیسیوں کرامتیں دکھاتے ہوئے جب پیر بابا چترال پہنچے تو معلوم ہوا۔ کہ بادشاہ کے اچانک غائب ہو جانے کی خبر سُن کر کافرستان کے لال کافروں نے چترال پہ حملہ بول دیا ہے۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ اور بے چاری ملکہ اپنے شہزادوں کو سینے سے لگائے محل میں چھپی بیٹھی تھی۔ جب پیر بابا نے یہ حال دیکھا۔ تو ان کے غصّے کی انتہا ہو گئی۔ انھوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور صرف اتنا کہا — "الٰہی میرے پرستاروں سے یہ سلوک؟" اتنا کہنا تھا کہ آسمان سے کالے کالے اژدہوں کی بارش شروع ہو گئی۔ جن کو دیکھ کر مخلوق خدا کے اوسان خطا ہو گئے۔ لیکن پیر بابا کی کرامت تھی کہ اژدہوں نے چترال کے کسی بھی باشندے کو کچھ نہ کہا۔ اور لال کافروں کے ایک ایک فرد کو چُن چُن کر نگل گئے۔" اس واقعہ کے بعد چترال کا ایک ایک باشندہ پیر بابا کا مرید ہو گیا۔ اور اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی آج تک کافرستان کے کسی کافر کو چترال کی طرف آنکھ اٹھانے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی —

"تو صاحبو" — نوروز گلا صاف کرتے ہوئے کہتا۔ "اس خادم نے اُسی آستانہ پاک کی خاک چاٹی ہے جس پر ایک دنیا کا سر جھک چکا ہے۔ بھلا یہ چھوٹے موٹے بخار کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ پیر بابا کی دُعا سے — اگر طاعون بھی ہو تو پھونکوں سے اڑا دوں اس بارگاہ پاک کی برکت سے —" اور حجرے میں بیٹھے ہوئے لوگ دیر دیر تک انہیں باتوں میں کھوئے رہتے۔

ربانی نوروز کے ایک شہری دوست کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ جو کالج سے فارغ ہو کر کوئی مہینہ بھر سے نوروز کے ہاں مقیم تھا۔ ربانی کے باپ نے اسے آرام کرنے کی خاطر نوروز کے پاس بھیج دیا تھا۔ لیکن ربانی کی تعلیم و تربیت اور نوروز کے روحانیت پرست ماحول میں کوئی مطابقت نہ تھی۔ اسی لئے ان دونوں میں رہ رہ کر ہلکا ہلکا سا ٹکراؤ پیدا ہونے لگا — ربانی نے دنیا کا جدید ترین ادب، سائنس کے نئے نئے کارنامے، اور زندگی کے وسیع مسائل اپنے ذہن پر طاری کر رکھے تھے اور نوروز ابھی تک اَن دیکھی طاقتوں اور سُنی سنائی باتوں کے ریلے میں بہہ رہا تھا۔ ربانی اُسے ٹیلی ویژن اور ایٹم بم کی باتیں

سناتا اور نوروز جنّوں کو مطیع کرنے کے تعویذوں اور دشمن کو زیر کرنے کے وظیفوں کے قصّے لے بیٹھتا۔ ربّانی کہتا — چچا تم بھی کتنے بھولے ہو یہ باری کا بخار تو دو چار باریوں کے بعد خود بخود جاتا رہتا ہے۔ بھلا اس میں تعویذ گنڈے کا کیا کمال ہے —" اور نوروز کہتا —" بیٹا ربّانی تم ابھی بچّے ہو۔ اگر تعویذ نہ دیا جائے۔ تو خدا جانے بخار کتنی طوالت پکڑ جائے —" ربّانی کہتا —" اس سے تو کونین ہی اچھی ہے چچا۔ جو تعویذ سے کم عرصے میں مریض کو اچھا کر دیتی ہے —" لیکن نوروز بڑے مشفقانہ لہجے میں کہتا —" بھلا تم کیا جانو کونین اور تعویذ کا فرق! ذرا دنیا کو گھوم پھر کر دیکھ لو۔ تو پھر ہم سے بات کرنا — کیا تم نے وہ قصّہ نہیں سنا . . . . . اور نوروز اپنے پیر بابا کا ایک نیا معجزہ سنانے لگتا — اور جب وہ اپنی لمبی چوڑی داستان ختم کر چکتا تو ربّانی بول اٹھتا —" چچا تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ اگر یہ ذرا سی بات معجزہ قرار دی جا سکتی ہے۔ تو پھر یہ ریڈیو، یہ سینما اور یہ ہوائی جہاز کیا کم معجزے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ تمہارے اپنے زمانے میں بڑے سیدھے سادے انداز میں نہ پیش کر دیئے گئے ہوتے بلکہ تمہیں صرف ان کی باتیں سنا دی جاتیں، تو یقیناً تم انہیں بھی بہت بڑا معجزہ سمجھنے لگتے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ چیزیں کسی روحانی طاقت کا کرشمہ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ میرے تمہارے جیسے عام انسانوں کے ذہنی تجسّس کا نتیجہ ہیں۔ جو تمہارے پیر بابا کی داستانوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہیں۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ یوروپ کا ایک سائنس دان مُردہ جسموں میں جان ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہے اور . . . . . ربّانی سائنس کے ایک ایک تجربے پر تفصیل سے روشنی ڈالنے لگتا جس سے نوروز کے بنے بنائے اعتقادات کے رنگ محل لرزنے لگتے۔ اور وہ رفتہ رفتہ ربّانی کی دلیل بازی میں دلچسپی لینے لگا — جیسے نوروز کی آنکھوں پر بندھی ہوئی توہمات کی پٹی کھلنے ہی والی ہو۔

خوبانیوں کا موسم جوبن پر تھا۔ نوروز کے باغوں میں اب کے اتنا پھل لگا تھا کہ پیڑوں کی ڈالیاں زمین کو چھو رہی تھیں۔ لیکن تجربہ کار باغبان جانتا ہے کہ اس

موسم میں آندھیوں کے تھپیڑے خوبانیوں کی فصل کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ شام ہی کو جب نوروز نے آسمان کا بدلا ہوا رنگ دیکھا تو وہ جان گیا کہ رات تک ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہیگا ۔۔ ربانی نے بھی موسم کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تائید کی تو باتوں باتوں میں نوروز نے کہا ۔۔۔ "بیٹا تم مجھے توہم پرست تو ضرور سمجھو گے لیکن اس کے باوجود مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نے پیر بابا سے دعا نہ کرائی تو آج رات یہ تمام باغ اجڑ کر رہ جائیں گے ۔ اگر کہو تو پیر بابا کے آستانے سے ہو تا آؤں ۔۔" اور ربانی نے یوں محسوس کیا جیسے وہ کالج کے اس طویل مباحثے میں ہار گیا ہے ۔ جس میں وہ پورے ایک مہینے سے دنیا جہان کی دلیلیں دے دے کر مد مقابل کو شکست دینے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اور جب رات کو آندھی آتے آتے ٹل گئی ۔ اور تمام کا تمام پھل تباہ ہونے سے بچ گیا تو ربانی کے ذہن میں پیر بابا کا سایہ بڑی بڑی تیزی سے چکر کاٹنے لگا ۔ ٹیلی ویژن ، ایٹم بم ، ریڈیو ، سینما ، ہوائی جہاز اور سائنس کی تمام ایجادیں پیر ۔۔ کی لٹوں میں الجھ کر رہ گئیں ۔۔۔ "کیوں بیٹا دیکھ لیا نا پیر بابا کی دعاؤں کا اثر ، آندھی کو پانی کر دیا ہے آندھی کو ۔۔" جب نوروز نے اپنے بھیگے ہوئے کرتے کو نچوڑتے ہوئے ربانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو ربانی کو اپنا پورا بدن تعویذ کے ایک پرزے میں لپٹا ہوا محسوس ہونے لگا ۔۔ نوروز نے ایک مشفق بزرگ کی طرح اس کی پیٹھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ "خدا رسیدہ بزرگ کیا کچھ نہیں کر سکتے بیٹا ۔۔۔ اگر وہ چاہیں تو دریاؤں کے بہاؤ کا رخ بدل دیں ۔ اگر وہ حکم دیں تو پہاڑ اپنی جگہ سے سرک جائیں ۔۔" ربانی کے دماغ پر نوروز کی باتیں ہتھوڑے بن بن کر برس رہی تھیں ۔۔۔ وہ رات گئے تک بے چین رہا ۔ لیکن پو پھٹتے ہی مغربی افق سے جو گرد و غبار کا ایک نیا طوفان لپکا تو خوبانیوں کے ایک ایک پیڑ نے سارے کا سارا پھل زمین پہ بچھا دیا ۔ اور ربانی کو یوں محسوس ہوا ۔ جیسے کالج کے مباحثے کا فیصلہ سناتے ہوئے جج سے جس غلطی کا ارتکاب ہوا تھا اُسے جج نے فوراً ہی محسوس کر لیا ہے ۔۔۔۔

کنہیا لال کپور

موسے خان

جب موسے خاں۔ اس کا بیٹا سرفراز اور اس کے ساتھی پٹھان بھاری بھرکم شلواریں اور کالی کالی واسکٹیں پہنے۔ بیلچے اٹھائے گاؤں میں داخل ہوتے۔ تو ہم سب بچے یہ سوچنے لگتے۔ کہ اب سردی کا موسم آگیا۔ پٹھانوں کے آنے سے بلوچوں کی بستی میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی۔ دائرے کی شکل میں حقہ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے بلوچوں کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھتے

السلام علیکم!

وعلیکم سلام۔ موسے خاں۔ کیا حال ہے

خدا کا فضل اے۔ تمارا کیا حال اے

اللہ کی مہربانی ہے۔ تڑا موشے

خو! تڑا موشے!! تڑا موشے!!! موسے خاں۔ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگتا۔ اور اس کے ساتھی ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے

موسے خان دوہرے بدن کا خوبرو پٹھان تھا۔ سرخ چہرہ۔ عقابی آنکھیں بدن میں غضب کی چستی۔ اُسے قرآن شریف کی بہت سی آیتیں یاد تھیں۔ وہ نہایت خوش الحان مؤذن تھا۔ گاؤں کی مسجد میں جب وہ اذان دینے کے لئے کھڑا ہوتا اُس کی آواز کے زیر و بم پر مومنوں کے دل خوشی سے جھومنے لگتے۔ اپنے ساتھیوں میں وہ مولوی موسے خاں کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن دراصل وہ مزدور

تھا۔ جو سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ہر سال بلوچوں کی بستی میں آتا۔ اور بلوچوں کے لئے مٹی اور گارے کے مکان تیار کرتا۔ پنجابی مزدوروں کے مقابلے میں وہ بہت کم مزدوری طلب کرتا۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ اس کے آنے پر بلوچوں کی باچھیں کھِل جاتیں۔ اور وہ سردی کے تین چار مہینوں میں پرانے مکانوں کی مرمت یا نئے مکانوں کی تعمیر کا کام اس کے سپرد کر دیتے۔

موسئے خاں اور اس کے ساتھی نہایت جفاکش مزدور تھے۔ علی الصبح جب سارا گاؤں دُھند اور کہرے کی چادر میں لپٹا ہوا سو رہا ہوتا۔ وہ تالاب پر پہنچ جاتے ان میں سے ایک پانی میں کھڑا ہو کر ایک لوہے کے برتن سے زور زور سے نالی میں پانی اُچھالنے لگتا۔ باقی نالی سے چند گز کے فاصلے پر بیلچوں سے مٹی کھودتے۔ اور جب پانی وہاں پہنچ جاتا۔ تو گارا بنانا شروع کر دیتے۔ دن چڑھنے سے پہلے وہ کئی فٹ لمبی اور ایک فٹ اونچی دیوار تیار کر لیتے۔ موسئے خاں اُچک کر دیوار کے اوپر جا بیٹھتا۔ اس کے ساتھی بیلچوں سے گارا اٹھا اٹھا کر اُسے دیتے جاتے۔ وہ اس پھرتی سے دیوار بناتا کہ گاؤں کے راج اور مزدور اس کا منہ تکتے رہ جاتے۔ اس وقت صرف شلوار اور قمیض پہنے ہوتا۔ اور کبھی کبھی اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے ہوتے

سردی سے کانپتے اور ٹھٹھرتے بلوچ جو جنوری کے مہینے میں دو دو کمبل اوڑھ کر باہر نکلتے۔ موسئے خاں اور اُس کے ساتھیوں کو اتنی سخت سردی میں کام کرتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ جاتے

"موسئے خاں تمہیں سردی نہیں لگتی ؟"

سردی ؟ یہ اور سردی نہیں ہوتا۔ سردی تو ہمارے ملک میں ہوتا ہے"

"موسئے خاں آگ تاپ لو۔ ایک نوجوان الاؤ کی طرف اُسے مدعو کرتے ہوئے کہتا۔

"خو ! تم کیسا جوان ہے "۔ موسئے خاں ہنستے ہوئے جواب دیتا

"ماموُلی سردی برداشت نہیں کرتا۔ کابل میں ہوتا تو سردی سے مرجاتا"

موسے خاں اور اُس کے ساتھی سارا دن کام کرتے اور رات کو مسجد میں آرام کرنے کے لئے چلے جاتے۔ ہر رات وہ بہت دیر تک اونچی آواز میں پشتو گانا گاتے . . . . . اور اس کے بعد مسجد کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں زمین پر سو جاتے۔ موسے خاں کے علاوہ باقی پٹھان رات کا کھانا مانگ کر کھاتے۔ "مائی بابا۔ خدا کے واسطے ایک روٹی" رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی جب اُن میں سے کسی کی صدا سنائی دیتی۔ تو ہم چھوٹے چھوٹے بچے دبک کر بستر میں گھس جاتے۔ اگر ہمیں پٹھان کو روٹی دینے کے لئے کہا جاتا تو ہم انکار کر دیتے۔ "نہ بابا وہ ہمیں اٹھائے جائے گا۔"

موسے خاں کو بھیک مانگنے سے عار تھی۔ وہ ہر شام ایک لوہے کی "باٹی" میں آٹا گوندھ کر بھٹیارن سے چار روٹیاں پکوا لیتا جسے وہ اور اس کا بیٹا سالن کے بغیر مسجد میں بیٹھ کر کھا لیتے۔

ہرچند کہ پٹھان نہایت شریف مزدور تھے۔ ہم نے انہیں کسی سے لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ہمیں اُن سے دہشت محسوس ہوتی تھی۔ خاص کر رات کے وقت تو وہ خوفناک کالے دیو معلوم ہوتے تھے۔ دن بھر ہم اُن کے قریب گلی ڈنڈا یا کبڈی کا کھیل کھیلتے۔ اور اکثر انہیں چڑانے کے لئے ایک پنجابی گیت دہرایا کرتے

پٹھان او پٹھان
تو تو پکا بے ایمان

مگر موسے خاں یہ اشتعال انگیز گیت سُن کر بھی ہنستا رہتا۔ کبھی کبھی وہ محض شرارت سے ایک آدھ ڈھیلا ہماری طرف پھینکتے ہوئے کہتا "چپ کرو۔ خنزیرو" اور ہم اُس کے اور قریب جا کر زور زور سے تالیاں بجا کر کہتے "خنزیر تم۔ خنزیر تم" اس وقت سرفراز ہماری طرف لپک کر دوڑتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ ہماری تکا بوٹی کر دے۔ لیکن موسے خاں اُسے روکتے ہوئے کہتا۔ "ونگا مت کرو سرفراز۔ خنزیروں کو شور مچانے دو"

سرفراز سے ہم سب لڑکوں کو نفرت تھی۔ وہ مضبوط ہاتھ پاؤں کا لڑکا تھا۔ اور

کبھی کبھی اپنے باپ کی آنکھ بچا کر ہم سب کو پیٹ دیا کرتا تھا۔ عموماً ہم اُسے اپنے ساتھ کھیلنے نہ دیتے۔ کیونکہ جب وہ کھیل میں ہار جاتا۔ تو پشتو میں ہمیں گالیاں دیتا اور ہاتھا پائی کرنے پر اُتر آتا۔ ہم سب نے اُس کے خلاف مشترکہ محاذ بنا رکھا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں ہم مزلے لے لے کر پٹھانوں کو بُرا بھلا کہتے: "یہ پٹھان بڑے چور ہوتے ہیں۔ اپنی ڈھیلی ڈھالی شلواروں میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھپا کر لے جاتے ہیں۔ اور اپنے ملک میں جا کر انہیں مار ڈالتے ہیں۔"

"پٹھان بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ بچے کا سر کاٹ کر اُسے آگ سے تپے ہوئے سرخ توے پر چڑھا دیتے ہیں۔ وہ جب ہوا میں اچھلتا ہے۔ تو اس کے ارد گرد جھوم جھوم کر ناچتے ہیں۔" پٹھان ڈاکو ہوتے ہیں۔ راہگیروں سے روپیہ چھین کر بھاگ جاتے ہیں۔"

اس قسم کے ہزاروں من گھڑت قصّے ہم ایک دوسرے کو سناتے

ایک سال کا ذکر ہے۔ موسے خاں نے گاؤں کے نمبردار کی حویلی بنانے کا ٹھیکہ لیا۔ نمبردار کی لڑکی کی شادی عنقریب ہونے والی تھی۔ اور وہ چاہتا تھا۔ کہ راتوں رات نئی حویلی کھڑی کر دی جائے۔ موسے خاں اور اُس کے ساتھی دن رات ایک کرکے کام کرنے لگے۔ چاندنی راتوں میں وہ قریب قریب دو بجے رات تک دیواریں بناتے۔ دن میں لمحہ بھر کے لئے بھی آرام نہ کرتے۔ حویلی بہت بڑی تھی۔ لیکن موسے خاں نے اُسے تین مہینوں میں تعمیر کر دیا۔ نمبردار نے اُسے خوش ہو کر اُجرت کے علاوہ پانچ روپے انعام دیا۔ موسے خاں اور اس کے بیٹے کے حصّے میں پچاس روپے اجرت کے آئے۔ اس دن وہ دونوں بہت خوش تھے۔ موسے خاں نے سب کے سامنے کہا۔ کہ وطن پہنچتے ہی سرفراز کو ایک کلاہ اور ایک نئی واسکٹ خرید دے گا سرفراز خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اور ہم سب کو بار بار چھیڑنے کے لئے کہتا: "میرے بابا کے پاس بوہت روپی اے۔ تم سب غریب چوکرا"

شام کی نماز پڑھنے کے بعد موسے خاں اور اس کا بیٹا اسٹیشن کی طرف روانہ

ہوسکے۔ باپ بیٹا کھیتوں میں سے جاتی ہوئی پگڈنڈی پر جھومتے جھامتے چلے جا رہے تھے۔ اور ہنس ہنس کر آپس میں پشتو میں باتیں کر رہے تھے۔ حالانکہ گاڑی کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ لیکن وہ اس خیال سے کہ گاڑی چھوٹ نہ جائے سرِشام ہی سٹیشن کی طرف چل پڑے تھے۔ اُس دن باقی سب پٹھان موسئے خاں کو الوداع کہہ کر ساتھ کے گاؤں میں چلے گئے۔ کیونکہ انہیں وہاں کام ملنے کی امید تھی۔ ہم سب بچے اپنے گھروں میں اطمینان سے سوتے۔ کہ کسی طرف سے مائی بابا خدا کے واسطے روٹی کی صدا سنائی نہ دی۔

صبح جب ہم اُٹھے۔ تو دیکھا کہ نمبردار کے گھر مجمع لگا ہوا ہے۔ بہت سے بلوچ اکٹھے ہیں۔ اور اُن کے درمیان موسئے خاں زور زور سے رو کر چلّا رہا ہے

" خان صاب۔ میں لُٹ گیا۔ اپنی ٹکٹ بھی نہیں خریدا تھا۔ کہ کسی بے ایمان نے میری جیب کاٹ لی۔"

اور نمبردار اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا "صبر کرو موسئے خاں صبر" سرفراز سر جھکائے موسئے خاں کے پاس کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ اُداس اور زرد تھا۔ اور اُس کی پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔ یک لخت اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "خان بابا۔ روؤ مت۔ میں کلاہ اور رواسکٹ نہیں لوں گا" موسئے خاں نے پرنم آنکھوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اور اُس کی بے بسی دیکھ کر ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

★

رضا ہمدانی

غوبلؔ[1]

"بے ایمانو! تم میں اتنی جرأت آ کہاں سے گئی؟ تمہارے منہ ٹوٹ کیوں نہ گئے —
"ہم بھوکوں مر رہے ہیں" — تو میں کیا کروں — ایک دانہ بھی زیادہ نہیں مل سکتا
— اگر موجودہ بٹائی منظور نہ ہو تو کھیت ویت چھوڑ دو نمکحرام ہمسائیو[2] اگر تم نے
اب بھی وہی رَٹ لگائی تو کھیتوں کے ساتھ گھروں سے بھی بے دخل کر دیئے جاؤ گے
— نکل جاؤ میرے حجرے سے" —

کف در دہاں خان نے، زمین پر الٹی بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھے ہوئے مزارعوں کو انتہائی حقارت سے کہا۔ اور وہ دل شکستہ ہو کر اٹھے۔ اور اپنی اپنی کھدر کی میلی چادریں شانوں پہ ڈالے بھیگی بلیوں کی طرح ایک ایک کر کے نکلنے لگے۔

لیکن گلاب کاکا ایک دم پھر پلٹا جیسے بجلی کے کسی بٹن نے اسے ایک دم مشرق سے مغرب کی طرف موڑ دیا ہو

"خان یاد رکھو۔ ہمارا یہ مطالبہ تم رد نہیں کر سکتے۔ بخوشی یا بجبر، تمہیں ماننا ہی

---

[1] پشتو میں گناہ کرنے کو غوبل کہتے ہیں۔ ویسے دھاندلی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

[2] خان کے گھروں میں رہنے والے مزارع ہمسائیے کہلاتے ہیں جنہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور جن کو خان ہر وقت بے دخل کر سکتا ہے

پڑے گا۔"

مڑتے ہی گلاب کاکا نے اپنے دل کا بخار نکال دیا۔

"تمہارا ہاتھ آزاد ہے۔ جو مرضی ہے کر لینا۔ میں دیکھوں گا تم کمینوں میں کتنی طاقت ہے۔"

خان کے ان الفاظ میں گھن گرج تکبر کی آخری حد تک تھی

"عزت ہر ایک کی اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے خان۔ ذرا زبان سنبھال کر بات کرو ہم غریب ہی لیکن بے غیرت نہیں۔ ہماری رگوں میں بھی پختون خون ہے۔" ___ گلاب کاکا نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

"جولاہے کمیں کے بدتمیز، نمک حرام، میں کہتا ہوں نکل جاؤ میرے حجرے سے آنا جوش کرے ہے تمہارے پاس" ___ خان نے طنز کا ایک تیر گلاب کاکا کے سینے میں پیوست کر دیا۔

اور گلاب کاکا حجرے کے باہر منتظر ساتھیوں سے جا ملا۔

حجرے میں موت کا سکوت مسلط ہو چکا تھا۔ خان ... کی تند و ترش بھویں غصے میں بچھو کے ڈنک کی طرح سکڑ کر حلقوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ چہرہ ٹماٹر کی مانند سرخ ہو گیا تھا۔ اور لمبی لمبی موٹی اور کالی مونچھوں کی لویں کانپ رہی تھیں۔ وہ غصے سے یوں پھول گئیں تھیں جیسے جونکوں نے خون پی لیا ہو

___ "چلم پلاؤ غنڈل" خان کی قہر آلود آواز نے حجرے کے سکوت کو تہ و بالا کر دیا۔

گرڈر ___ گرڈر ___ خان نے کھانستے ہوئے۔ غلیظ بلغم کا ایک لوتھڑا اپنے دونوں پاؤں کے درمیان دھول میں پھینک دیا ___ اور دوسرے لمحے غنڈل نے نسوار کی ڈبیہ پیش کر دی۔ کیونکہ خان چلم کے فوراً بعد نسوار کا عادی تھا۔ اور خان نے ایک موٹی سی چٹکی لیکر نچلے ہونٹ اور مسوڑوں کے درمیان ٹھونس دی۔ اور گہری سوچ میں چلا گیا ___ اس کی سوچ کا انداز گہرا ہوتا گیا۔ اور جب اس نے آنکھیں

بند کر لیں۔ تو اس کا سینہ شدتِ جذبات سے دھونکنی بنا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کی "خانیت" کے دل میں نیزہ مار دیا ہو اور وہ اپنی اس توہین کا خطرناک انتقام لینا چاہتا ہو۔

" غندل ایک اور چلم پلاؤ"۔ خان نے بدستور گرجتے ہوئے کہا۔ اور تھوڑی دیر بعد غندل کے ہاتھ میں مٹی کی روغنی چلم پکڑی ہوئی تھی۔ اور خان کے ہونٹ سنہری روپہلی تاروں سے منڈھی ہوئی عمودی نہال پر تھے۔ گرڑڑ۔ گرڑڑ۔ اور جب غندل نے نسوار کی ڈبیہ معمول کے طور پر پیش کی۔ تو خان نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ـــ" کم بخت تمبا کو بھرا تھا یا بھُس۔ ایک اور بھرو اور ہاں دیکھو۔ ایک گولی بھی ملا دینا"۔

چلم سے چنگاریاں نکل رہی تھیں ـــ خان بے تحاشا چلم کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ دھواں اس کے منہ سے اس طرح نکل رہا تھا۔ جیسے کسی مل کی چمنی سے ـــ بھپھرا ہوا ـــ اور جیسے یہ ابھی آگ میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور پھر ان مزارعوں کے گھروندے اس کی لپیٹ میں آ کر بھُس کی طرح جل کر راکھ ہو جائیں گے

" ـــ خدا انہیں خوار کرے۔ احسان ناشناس، کیسے لوگ، میرا نمک ان کے اور ان کی آل اولاد کے رویں رویں میں رچا ہوا ہے۔ میں انہیں مزا چکھا دونگا۔ آئے ہیں بڑے افلاطون کے بچے حصّہ زیادہ لینے ـــ اگر ان کو ایک ایک دانے کے لئے نہ ترساؤں تو مجھے پختون نہیں بلا کہیں"ـــ

خان بڑبڑاتے ہوئے حجرہ سے باہر چلا گیا ـــ حجرے کی فضا غلیظ دھویں اور چرس کے تعفن سے بھر گئی۔ ۔ ۔ وہ چرسیوں کا تکیہ معلوم ہو رہا تھا ـــ خان کے چلے جانے کے بعد غنی، سرفراز اور روخان نے غندل کو گھیر لیا۔

کیا بات تھی غندل؟ ـــ روخان نے پوچھا۔ آج پھر کس بچارے کی شامت آئی ہے۔ آج پھر جوا ہارا ہوگا۔ خان نے۔ یا بٹیر بھاگ گیا ہوگا۔ لیکن آج جمعہ بھی تو نہیں ـــ سرفراز نے کہا۔

کہنے کی بات نہیں یار --- غنندل نے سرگوشی کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ آج تو خان کے دماغ سے دھوآں نکال دیا ہے۔ نر کے بچوں نے --- اچھا ہی ہوا کیا یاد کرے گا یہ خان بھی کہ کسی غریب جوار نیے سے واسطہ پڑا تھا۔ یہ تو قسمت کی بات ہے۔ فرض تو نہیں کہ خان ہی ہر روز جیتے --- یہ بھی کوئی زمین یا جائداد ہے جو ہمیشہ اسی کی رہے گی --- غنی نے خوش ہو کر کہا ---

"چھوڑو بھی یار، اس بکواس کو۔ بات تو کچھ اور ہی ہے۔"

غنندل نے غنی کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آج شمروز گڑھی والے پھر آئے تھے۔

اچھا میں اب سمجھا --- تو پھر کیا ہوا --- ہونا کیا تھا --- شمروز گڑھی والے چھوڑا گر وہاں کا شہید بابا بھی قبر سے اٹھ کر آجائے۔ جب بھی خان نہیں ماننے کا --- غنی نے تیقن کے ساتھ کہا ---

لیکن کب تک نہیں مانے گا۔ آخر انصاف بھی کوئی چیز ہے یا نہ۔ کیا مسلمانی یہی ہے جو خان کرتا ہے --- دن رات پوہ ماگھ کی سردی اور ہاڑ کی تپتی ہوئی گرمی میں تو کسان ٹھٹھریں۔ اور جلیں لیکن فصل تیار ہونے پر دو دن پیٹ بھر روٹی بھی نہ کھا سکیں۔"

رو خان جب یہ کہہ رہا تھا۔ تو اس کے سیاہی مائل لمبوترے چہرے پر سرخی آگئی تھی۔ اور اس کی زردی مائل سفید داڑھی جوش میں بھر رہی تھی۔

"--- اچھا بھئی اب اٹھو دیر ہو رہی ہے" ہم نے تو آج لو[^1] کرنا ہے۔ غنی نے کہا۔

اے بیٹھو یار۔ کیا جلدی ہے۔ کٹائی کرو نہ کرو۔ ایک ہی بات ہے۔ تمہیں تو اتنا ہی ملے گا۔ جتنا خان نے تمہاری قسمت میں لکھ دیا ہے۔ رو خان نے بے اعتنا

---

[^1]: فصل کی کٹائی کو پشتو میں "لو" کہتے ہیں۔ "دو" کے وزن پر

سے کہا۔

تو تمہارا مطلب ہے جتنا حصہ اب ملتا ہے۔ اس سے بھی ہاتھ دھو لیں۔ کچھ بھی ہو اب تو کشائی کرنا ہی پڑے گی۔ غنی نے جواب دیا

ان باتوں کو اب رہنے دو۔ کہیں خان سن نہ لے۔ غنی ترل نے سرگوشی میں کہا۔

چلچلاتی دھوپ میں کٹی ہوئی گندم کھلیانوں پر ڈھیر کر دی گئی۔ تمام کھلیان سونے کے ڈھیروں سے بھر گئے۔ اور سورج کی کرنیں ان سنہری انباروں پر نچھاور ہونے لگیں۔ . . . . لیکن یہ دولت ان بھوکے کسانوں کے لئے نہیں جنہوں نے اپنے ننگے بدن پر کرنوں کی گرم و سرخ سلاخوں کی اذیت کو برداشت کیا۔ اور جن کے مساموں نے تحت گیلن پسینے کے اگلے۔ اور جن کا خون اس گرمی میں کھول کر دماغ اور آنکھوں تک اچھلا۔ اور جن کے ننگ دھڑنگ بچے برستی آگ میں ان کے لئے لسی اور جوار کی روٹی لے کر آئے جن میں سے بہتیرے اس چلچلاتی دھوپ اور آگ برساتی گرمی کی تاب نہ لا سکے۔ مر گئے۔ باپ کھیت میں موم کی طرح پگھلتا رہا اور بچے کھری چارپائی پر دم توڑتے رہے۔ ان کی آنکھیں باپ کے انتظار میں دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے کھلی رہ گئیں ۔۔۔ جن کے جنازے کے ساتھ مسجد کے امام نے بھی بے اعتنائی برتی اور جنازہ نماز کے لئے "چنترڑی"[1] ہی کو بھیجنا کافی سمجھا۔

کھلیانوں پر لگے ہوئے سونے کے یہ ڈھیر اس وقت تک ان کسانوں کے تھے جب تک کھیت میں تھے۔ اسے کیا معلوم کہ کھیت سے کھلیان پر آنے کے بعد کسانوں کا حق ملکیت فسخ ہو جاتا ہے۔ پھر تو یہ سونے کے دانے قارون اپنے کھتوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ جہاں سے کیڑے مکوڑے تو کھا سکتے ہیں لیکن کسان یا اس کا بچہ ان میں سے ایک دانہ بھی نہیں کھا سکتا۔

کھلیانوں پر چمکتے ہوئے سونے کے یہ انبار کسانوں کے لئے سراب کی طرح ہیں

---

[1] مسجد میں ملا کے پاس جو طالب علم ہوتا ہے۔ اسے مقامی زبان میں چنترڑی کہتے ہیں (ترچ کے بعد ت کو غنہ پڑھنا چاہیئے)

جو ڈر سے ان کی تسکین تو کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی پیاس نہیں بجھا سکتے۔ ان کی بھوک کا علاج نہیں کر سکتے۔ یہ لمبی لمبی سنہری بالیں، ان خوبصورت نمائشی مچھلیوں کی طرح ہیں۔ جو دیکھی تو جاتی ہیں۔ لیکن کھائی نہیں جاتیں۔ اور پھر گندم کے نمناک خوشے کرنوں کی حدت سے خشک ہو گئے۔ لمبی لمبی بالوں کی رگوں میں تری کا آخری قطرہ بھی سوکھ گیا۔ اور اب وہ وقت آ گیا کہ گندم کے جواہرات کو گھاس پھوس سے الگ کر کے بڑے بڑے زمیندار راجے بن جائیں گے۔ اور پھر یہی راجے خلق خدا کے ان داتا کہلائیں گے۔ پھر کیا ہوگا ـــ ؟ بھوک ـ فاقے! بلیک مارکیٹ ـ

بہرن خان نہ صرف اپنے گاؤں کا بہت بڑا خان تھا۔ بلکہ ضلع بھر کے تمام گاؤں میں بہت بڑا خان مانا جاتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ خان کے کھلیانوں پر دوسرے کھلیانوں سے زیادہ رونق رہتی۔ بعض کھلیانوں پر تو ہفتوں غوبل ہوتا رہتا۔

"شمروز گڑھی" والے غوبل کی تیاری کر رہے تھے۔ آج ان سب کے گھروں میں عید تھی۔ عورتیں خوش تھیں۔ وہ چھاجوں کو جھاڑ پونچھ رہی تھیں۔ مٹکوں، ہانڈیوں اور مٹی کے گھڑوں کو صاف کر کے انہیں دھوپ میں رکھ رہی تھیں۔ تاکہ غلہ بساندھ نہ پکڑ جائے۔ بچے خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وہ اس لئے خوش تھے کہ اب انہیں بھٹیوں میں بھنوانے کے لئے گیہوں ملیں گے۔ اور وہ ان دانوں کو گھر سے چرائے ہوئے گڑ کے ساتھ مزے لے لے کر کھائیں گے۔

گڑھی کے تمام لوگ آج صبح ہی سے کھلیان پر آنا شروع ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ اچھا خاصہ جمگھٹ لگ چکا تھا ـــ غنی ـــ پگڑی کے پلو سے نسوار کی ڈبی کھول کر آنے والوں کو تواضع کے طور پر پیش کر رہا تھا۔ اور جو نسوار کے عادی تھے۔ وہ چٹکیاں بھر بھر کر ہونٹوں میں ٹھونستے چلے جاتے تھے۔

"السلام علیکم" ـــ "وعلیکم السلام" ـــ "ستڑے مشے" (ماندہ نہ باشی) اور "پہ خیر راغلے" (خوش آمدید) کے الفاظ ہر لمحہ فضا میں شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ پیدا کر رہے تھے۔

جب نفری پوری ہو چکی تو بسم اللہ کر کے سونے کے انبار کو زمین پہ بکھیر دیا گیا۔ اور جب یہ انبار زمین پر بکھر چکا تو بیلوں کا پورا گلہ اس پر چھوڑ دیا گیا۔ بیلوں نے بڑی بے دردی سے زمین پر بکھرے ہوئے سونے کو روندنا شروع کیا۔ بیل روندنے میں اگر ذرا سی بھی سستی کا اظہار کرتے تو ہانکنے والے فوراً ان کی تواضع ڈنڈوں سے کرتے۔

" اللہ کے فضل اور پیر بابا کی برکت سے اب کے فصل خوب ہوئی ہے"۔ کھلیان کے ایک طرف بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے نے جو ذرا سستا رہا تھا۔ دوسرے سے کہا:۔

" جب سے یہ کم بخت جرمن کی لام شروع ہوئی تھی۔ اس سال آنکھوں نے اتنی بھرپور فصل دیکھی ہے"۔ دوسرے نے جواب دیا

" لیکن اس میں کسی کا کیا گناہ۔ پانی جو نہ ہو تو دانے کس طرح اگیں"۔ پہلا بولا

" ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر انصاف ہو اور خدا رسولؐ کا خوف ہو تو ہر چیز بہت ہے۔ اب تم ہی سوچو کہ پانی نہ تو میرا ہے اور نہ تمہارا اور نہ ہی خان کا۔ ظلم یہ ہے کہ خان اپنے کھیتوں کی طرف تو پانی چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے غریبوں کے کھیت پانی کی ایک بوند کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ خان کے ساتھ مقابلہ کون کرے۔ جس کا زور ہو وہی کر سکتا ہے مقابلہ ورنہ ہم تم ایسے غریب۔ یا محکر جیسے بھوکے ننگے خان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ جن کے پاس شلغےؔ[1] تک بھی نہیں ایک دو دفعہ انہوں نے شکایت بھی کی تھی۔ لیکن خان نے اسے وہ سنائیں کہ تو بہ ہی بھلی"۔ دوسرے بوڑھے نے کھانستے ہوئے اور بلغم دور ایک کھیت کی منڈیر پر پھینکتے ہوئے کہا۔

" تو کیا محکر نے پچھلے سال غوبل نہیں کیا تھا"۔ پہلے نے حیران ہو کر سوال کیا

— غوبل — تم غوبل کا پوچھ رہے ہو۔ اس کے تو بل کو بھی زنگ لگ چکا ہو گا

---

[1] شلغےؔ معمولی سی بندوق کو کہتے ہیں۔

سال بھر سے اس نے کچھ نہیں بویا۔ پچھلے برس جب بھی بچارے نے بونے کی کوشش کی۔ قرض فرض کر کے تخم لایا۔ زمین جوتی ہل چلایا اور جب پانی کی باری آئی۔ تو خان کے غنڈوں نے زبردستی پانی اس کے کھیت میں جانے نہیں دیا۔ بہتیری دفعہ دادفریاد کی۔ عرضی پرچہ بھی کیا۔ لیکن غریب کی کون سنتا ہے۔ آخر مجبور ہو کر بیٹھ رہا۔ پھنسوا بھی سیٹھ سے سات سو روپے قرض لے چکا تھا۔ سود سمیت ایک ہزار روپے بنتے تھے۔ وہ تو اللہ نے فضل کیا۔ کہ سیٹھ بچھو پاکستان سے دفان ہو گیا۔ ورنہ اب تک دو جریب زمین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا بچارا ـــ دوسرے نے جواب دیا ـــ لیکن آخر یہ کب تک برداشت کریں گے ہم ـــ سنا ہے اس دن شمرو زگرڑھی والے خان کے پاس گئے تھے۔ معلوم نہیں کیا فیصلہ ہوا ـــ؟ پہلے نے چلم کا ایک کش لگا کر کھانستے ہوئے کہا۔

کس چیز کا فیصلہ ـــ؟ وہی بیل والا معاملہ ہوگا۔ لیکن اس میں زودین کا کیا قصور۔ بیل اس نے تو نہیں مارا۔ وہ تو تقدیراً مر گیا۔ اجل آئی تھی اس کی۔ اور مرگ کا علاج تو تم جانتے ہو۔ لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا۔ خان اگر اس بیل کا تاوان مانگتا ہے تو ظلم کرتا ہے۔ سراسر بے انصافی ہے۔ زودین کو چاہیئے۔ مولوی صاحب کے پاس جا کر شریعت پر فیصلہ کرالے۔ شریعت ہو یا رواج کوئی بھی اس بیل کا تاوان خان کو نہیں دلوا سکتا ـــ؟ دوسرے نے کہا۔

لیکن یہ بیل والا معاملہ نہیں۔ یہ تو بٹائی کا جھگڑا ہے۔ بٹائی کا۔ گڑھی والوں نے اب کے یہ کہا ہے کہ موجودہ حصے پر ہمارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ زیادہ ہونا چاہیئے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ سچے ہیں۔ گذارہ ہو تو کس طرح ـــ اور تمہیں نہیں معلوم کہ پچھلے سال کتنا سخت قحط تھا۔ جواہرات کے ایک دانے کے بدلے بھی گندم کا ایک دانہ ملنا محال تھا۔ خان کے گھر کے سوا باقی سب مزارعوں کے گھروں میں اللہ کا نام تھا۔ میں نے خود بچوں کی ماں کے کپڑے بیچ کر پینتالیس روپے من جوار خریدی تھی خان سے۔ پہلے نے منہ میں معلوم کب سے پڑی ہوئی نسوار تھوکتے ہوئے کہا

"پھر تو انہیں فیصلہ ہونے تک غور بھی نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ بڑا ظالم ہے خان۔ ایک آنہ بھی زیادہ نہیں دے گا۔ بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے۔ کہ اب کے وہ شاید پہلا حصّہ دینے سے بھی انکار نہ کر دے۔ اصل میں وہ ہے بڑا لالچی اور ظالم"۔ دوسرے نے کہا۔

"ہاں کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو۔ لیکن اس کا فیصلہ ضرور ہونا چاہیئے۔ آخر یہ ظلم کب تک؟ رات دن کی شدید محنت اور مشقت کے بعد بھی ہم پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھا سکتے جتنی خدمت ہم خان کی کرتے ہیں اگر اتنی اپنے خدا کی کریں تو ولی بن جائیں"۔ پہلے نے جواب دیا۔

"فیصلہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم لوگ تو اب قبر کے کنارے بیٹھے ہیں۔ اپنی عمر جوں توں کر کے گذار ہی دی ہے ہم نے۔ لیکن ہمارے بچّے تو کم از کم آگے چل کر اچھی زندگی گذاریں ۔۔۔ آج ہی کچھ سوچنا پڑے گا ۔۔۔ ذرا بلانا تو گلاب کاکا کو ۔۔۔ اس کے ساتھ بات ہو جائے تو پھر ساری گرہ اس کے کہنے میں ہے"۔

"تم وہی کچھ آج کہہ رہے ہو جو کچھ میں ایک عرصے سے کہہ رہا ہوں۔ حق کبھی مانگنے سے بھی ملتا ہے؟۔ اور گھی تو کبھی سیدھی انگلی پر چڑھتا ہی نہیں۔ ہمیں اپنا حق چھین کر لینا ہو گا۔ ہم دھرتی کا سینہ چیر کر اس سے سونا نکالتے ہیں۔ لیکن سونا ہم سے چھین لیا جاتا ہے۔ اور اس کے عوض مٹی بھی پھانکنے کو نہیں ملتی۔ تم اگر کھیتی باڑی نہ کرو۔ تو یہ اونچے اونچے شملے ایک دم خاک میں مل جائیں ۔۔۔ میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔ اٹھو اور میرا ساتھ دو۔ زبان سے جو الفاظ تم نے نکالے ہیں اُن کا پاس کرو۔ کیونکہ "پختون ولی" اسی کو کہتے ہیں۔ بھیک مانگ کر کھانا پختون کے شایانِ شان نہیں۔ اگر تمہیں کوئی حقیر نظر سے دیکھے۔ تو ان کی آنکھیں نکال لو۔ چاہے وہ تمہارا باپ ہی کیوں نہ ہو"۔

گلاب کاکا۔ گرج رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور وہ بے خودی کے عالم میں افق کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم "یا پیر بابا" پکار اٹھا۔ اب اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ خوشی کی چمک۔ خوشحالی کی چمک، ایک ایسی

آنے والی خوشحالی جس میں کسان کی دکھی زندگی پر مسرت کے دروازے کھول دیئے جائینگے اور جس میں یہ اَن داتا۔ یہ دھرتی کا نباض۔ یہ زمین کے دل کی باتیں جاننے والا جنت کی کنجیاں۔ پٹے ہاتھ میں لئے کھڑا ہوگا۔ اور پھر جنت کو ان فاقہ کش مزدوروں اور بچوں پر لٹا دے گا۔

وہ ایک دم غوبل کی طرف دوڑا، اور اس نے لرزتے ہاتھ سے کسانوں کو غوبل روک دینے کا اشارہ کیا۔

ہانکے کی مسلسل آواز یک لخت جھن سے ٹوٹ گئی۔ جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے ایک بہت بھاری زنجیر کو توڑ دیا ہو۔ بیلوں اور آدمیوں کا مخلوط و متلاطم سمندر ایک اشارے کے ساتھ ہی رک گیا۔ جیسے بپھرے ہوئے خونیں دہارے کو کسی غیبی قوت نے لگام ڈال دی ہو۔ غوبل کا ہنگامہ سکون میں تبدیل تو ہوگیا لیکن لوگ گلاب کاکا کی اس حرکت کو بالکل نہ سمجھ سکے۔ اور پھٹے ہوئے انار کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف گم سم دیکھنے لگے۔ جیسے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ بھُس ملے غبار کے گھنے کہرے میں سب کھڑے ہوئے اس انتظار میں تھے۔ کہ گلاب کاکا کہنا کیا چاہتا ہے۔

"غوبل جلدی ختم کرو اور تمام غلہ آپس میں بانٹ لو۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ زمین اللہ کی ہے۔ بیج بھی اسی کا ہے۔ اور پانی بھی وہی بھیجتا ہے۔ ہماری محنت کا صلہ ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا"

گلاب کاکا کی اس گرجدار آواز نے بھُس اور مٹی کے غلیظ کہرے میں کھڑے نڈھال انسانوں کے چہروں پر جیسے گلال چھڑک دیا۔ ان کے لمبے لمبے۔ تسوار آلود اور نا صاف دانت پیپڑی زدہ ہونٹوں کے دریچوں سے اس طرح جھانک رہے تھے جیسے گاؤں میں کوئی سفری تھیئٹر کا تماشہ ہونے والا ہو۔ یا کوئی مداری آگیا ہو

"شاباش نرکے بچو۔ غوبل جلدی ختم کرو۔ یہ سب کچھ تمہارا ہی ہے" اور گلاب کاکا کی دوسری گرجدار آواز کے ساتھ ہی بیلوں کا گلہ اور کئی انسان دوبارہ حرکت میں آگئے۔ اب کے ان کی حرکت پہلے سے بہت تیز تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دھرتی

کے ولاں ایک ہی چکر میں دنیا کے گرتے کو تسخیر کرنے کا عزم کر چکے ہیں بیل بھی پہلے سے زیادہ مستعد تھے ۔ جیسے وہ بھی سمجھ گئے تھے ۔ کہ اب ان پر زمیندار کا کوئی عمل دخل نہیں رہا۔ اور اب آزاد کسانوں کے آزاد بیل ہیں ۔

اور رات کو حجرے میں گاؤں کے اس بہت بڑے اور تاریخی واقعے پر کسان خیال آرائی کر رہے تھے ۔

"گلاب کاکا نے اچھا نہیں کیا" ایک نے کھانستے ہوئے کہا

"کیا کہیں ہم تو کچھ کہہ نہیں سکتے ۔ بزرگ ہے" دوسرے نے چلم کا دھوآں چھوڑتے ہوئے کہا ۔

"بزرگ ہے کچھ سوچ کر ہی ایسا کیا ہوگا اس نے" تیسرے نے گڑ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا ۔

"جو کچھ بھی کیا گلاب کاکا نے ٹھیک ہی کیا ۔ تم لوگ اگر ہمیشہ اسی طرح ڈرتے رہے تو یاد رکھو تمہاری اولاد بھی تمہاری ہی طرح ذلیل و خوار رہے گی" دوسرا بولا۔

لیکن خان نے اگر سن لیا تو وہ بنیاد نکال دے گا تمہاری ۔ ایک اور نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کہا ۔

"بنیاد ایک ہی دفعہ نکلے گی ۔ پھر انشاء اللہ ہمیشہ کے لئے تم سب اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ گے" ایک جوشیلے نے چلم پر سے منہ ہٹاتے ہوئے کہا ۔

حجرے میں اس موضوع کے علاوہ کسی کو کوئی اور بات سوجھتی ہی نہ تھی ۔

امید و بیم کے جذبات کا جوار بھاٹا اپنے جوبن پر تھا ۔ خان کے ظلم و ستم کے خیال سے سہمے ہوئے افراد بھی تھے اور خان کو خاطر میں نہ لانے والے آزاد منش بھی ۔ لیکن اکثریت گلاب کاکا ہی کے ساتھ تھی ۔

اعتدال پسند گلاب کاکا کے ہم خیال تو تھے ۔ لیکن ان کے خیال میں یہ حرکت سینہ زوری کے مترادف تھی ۔ وہ پہلے خان کے ساتھ سمجھوتے کے قائل تھے

لیکن گلاب کاکا ۔ اس کا قائل تھا کہ زمین مزارع کی ہے ۔ وہ مزارع جس کے

باپ دادا کی ہڈیاں انہی کھیتوں میں کھاد کی جگہ استعمال کی گئیں - اور اب جس کا اپنا خون پانی کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ اس پر جتنا حق مزارع کا ہے اتنا زمیندار کا نہیں اور زمیندار کو بغیر کسی محنت کے اناج لے جانے کا کوئی حق نہیں۔

"السلام علیکم" - غندل نے حجرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام" "پخیر راغلے" - "استڑہ مشے" - کی مختلف آوازوں نے غندل کا استقبال کیا۔

"آؤ بھئی بیٹھو" - پرآز نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے غندل سے کہا اور غندل اپنی چادر کو کندھے سے اتار اور لپیٹ لپاٹ کر اپنے نیچے رکھ کر پرآز کی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"سناؤ بھائی غندل اچھے تو ہونا؟ بچے بیوی تو خیریت سے ہیں نا؟ آج کدھر تم نے غریبوں کو یاد کیا ہے" - پرآز نے غندل سے پوچھا۔

"خدا جانتا ہے کہ میرا بڑا دل چاہتا تھا۔ تم لوگوں سے ملنے کو مگر ہمارے خان کے اتنے جھنجھٹ ہیں کہ ان سے فرصت ہی کب ملتی ہے - آج بھی اسی کے کام سے آ رہا ہوں" غندل نے عذر معذرت کے بعد کہا۔

خان کا کام؟ - بھلا کیا کام پیش آگیا ان کو؟ - پرآز نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"خان نے کہا ہے کہ سمرد زرگڑھی کا غوبل میں اپنے سامنے کراؤں گا - لیکن کچھ دنوں کے بعد - چونکہ چھوٹے خان کا ختنہ ہے - اس لئے وہ مصروف ہیں مہمان جو آئیں گے - اور کھیل تماشے بھی ہوں گے - ختنے کے علاوہ گانے والی طوائفیں بھی لاہور سے آئیں گی - خان نے اپنا موٹر ان کے لئے بھیج دیا ہے - جب وہ اس کار خیر سے فارغ ہو لیں گے تو آکر سمرد زرگڑھی کا غوبل اپنے سامنے کرائیں گے" غندل نے جیسے سب کے کلیجے میں چھرا گھونپ دیا۔

"لیکن غندل خان ہم نے تو غوبل ختم کر لیا ہے" پرآز کے منہ سے یہ الفاظ

بجلی کی سرعت کے ساتھ نکل گئے۔

"سرکے بچو تم نے یہ کیا کیا۔ میرے خیال میں تو تم نے وہ کام کیا جو تمہارے باپ دادا بھی نہ کرسکے۔ لیکن اگر خان نے سن لیا تو"۔۔۔ ؟ غندل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن یاد رکھو اب ڈرنا نہیں۔ اگر تم نے ذرا بھی نرمی دکھلائی تو برباد کر دیئے جاؤ گے غندل نے تھوڑے سے توقف کے بعد سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"غندل خان ہم بھی پختون ہیں۔ اللہ کے فضل اور بغداد والے پیر کی برکت سے وہ مقابلہ کریں۔۔ کہ خان کو وقت پڑ جائے۔

پر آئی نے جب یہ کہا۔ تو فرطِ جوش سے اس کے کندھے پر سے چادر سرک کر زمین پر آگری۔

"سمروز گڑھی والوں نے غوبل کر کے دانے آپس میں تقسیم کر لئے ہیں"

اگر کوئی خان سے کہ دس ہزار روپے کے بٹیر کو ذبح کر ڈالتا۔ اگر کوئی خان کے قیمتی باز کو چھین کر آزاد کر دیتا۔ اگر کوئی خان سے قمار بازی کی ٹکڑی میں اس کا تلے والا کلاہ اور شہدی لنگی بھی جیت لیتا۔ اگر کوئی خان کے بیسیوں شکاری کتوں کو مار ڈالتا۔ اگر کوئی خان کے ہاتھوں سے عین نشے کی حالت میں شراب کا گلاس زمین پر پٹخ دیتا تو شاید خان کو اتنا دکھ نہ پہنچتا۔ اسے اتنا غصہ نہ آتا جتنا غندل کے اس ایک جملے سے۔

"اچھا ان خیرات خوروں کی اتنی جرأت کہ میرے بغیر ہی غوبل بھی کر لیا اور پھر تقسیم بھی۔۔۔ میں ان کتوں کے منہ سے ایک ایک دانہ چھینوں گا۔ میں ان کے بچوں کو روٹی کے عوض تھوہر کے تیلے کھلاؤں گا پانی کے بدلے ان کے منہ میں زہر ٹپکاؤں گا میں انہیں کڑکتی دھوپ میں ٹنوا کر ان کی ساری شیخی نکال دوں گا۔ اور گندم کی بجائے ان کے کوٹھوں اور سامان کا غوبل کراؤں گا۔ سؤر کے بچے یہ بھی کیا یاد کریں گے خان کے ساتھ مقابلہ ؟ "زمین اللہ کی ہے۔۔۔ ان کے باپ کی ہے۔۔۔ خان بک رہا تھا۔۔ تڑپ رہا تھا۔۔ گرج رہا تھا۔ زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ ایکے

منہ سے کف جاری تھی ۔۔ وہ اپنے حجرے میں بڑے شدید غصے کی حالت میں ٹہل رہا تھا۔ وہ کسی نیم پاگل کی طرح گھوم رہا تھا۔ اور دو ایک دفعہ اسی حالت میں حجرے کی چلم کے ساتھ اس کو ٹھوکر بھی لگی۔ اور آخری دفعہ تو اس نے اپنا سارا غصہ اسی چلم پر ٹھنڈا کیا۔ چلم کے ٹکڑے حجرے کی بڑی بڑی چارپائیوں پر بکھر چکے تھے۔ اور نیچے حجرے کے الاؤ میں اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔

اور پھر وہی کچھ ہوا جو کسانوں اور مزارعوں کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے ۔۔ برسوں کی خونیں روایت کو دہرایا گیا ۔۔ صدیوں کی بربریت کو بروئے کار لایا گیا۔ جیسے زمیندار کی قلبی قساوت جائز سمجھتی ہے

خان کے اجرتی غنڈوں نے رات کی سیاہی کا نقاب اوڑھ کر "شمروز گڑھی" پر دھاوا بول دیا۔ گولیوں کی مہیب آوازوں اور معصوم بچوں و عورتوں کی چیخوں نے "خونیں غوبل" مچا رکھا تھا۔

خان قہقہے لگا لگا کر غنڈوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

"نکال دو ان خبیثوں کو میرے گھروں سے۔ ایک بھی زندہ نہ بچنے پائے۔ ان کمینے لوگوں میں سے ۔۔ گلاب کو ڈھونڈو یہ سانپ کہیں زندہ نہ رہ جائے۔ اس کی موت ساری گڑھی کی موت ہے ۔۔ شاباش بہادرو" ۔۔

گلاب کاکا، ایک بہادر کی طرح مقابلہ کر رہا تھا۔ تمام مزارعے سینہ سپر ہو کر اینٹ کا جواب پتھر سے دے رہے تھے۔

اچانک ایک سنسناتی ہوئی گولی گلاب کاکا کی کنپٹی کو چیرتی ہوئی فضا میں ٹھنڈی ہو گئی۔ دھرتی نے اس کا ابلتا ہوا خون اپنے دامن میں لے لیا۔

گلاب کاکا کی خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاش کو دیکھ کر غندل کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور اس نے خان کے غنڈوں کو مخاطب کر کے کہا:۔

"بھائیو گلاب کاکا ہم سب کا باپ تھا۔ اس نے اس بڑھاپے میں گاؤں والوں کو فاقہ کشی، مفلسی اور بے عزتی سے نجات دلانے کے لئے اپنی جان

دیدی۔ ہم پٹھان ہیں۔ اور ہماری غیرت کا تقاضا ہے کہ اپنے باپ کے خون کا بدلہ خان سے لیں۔ خان اپنے لالچ اور حرص کے لئے ہمیں ہمارے بھائیوں سے لڑا رہا ہے آج اگر ہم نے خان کے کہنے پر اپنے بھائیوں کا گلا کاٹا تو کل اس ظالم انسان کے ہاتھوں ہمارا بھی یہی حشر ہو گا "

غنڈل کی اس پُر جوش تقریر کو سُن کر خان کے غنڈوں نے شمروز گڑھی والوں پہ گولیاں چلانا بند کر دیں۔ اور یہ بھرا ہوا ہجوم مل کر خان پر ٹوٹ پڑا۔ اور اس کی تکا بوٹی کر دی اس کے کھلیانوں کو لوٹ لیا۔ اور اس کے غلے سے بھرے ہوئے گوداموں کو آگ لگا دی

اگلے سال جب غوبل ہو رہا تھا۔ تو محنت کش کسانوں کے کھلے ہوئے ارغوانی چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ان کے تنو مند ابھرے ہوئے بازو اپنے کام میں مصروف تھے۔ اور ان کے لبوں پر گلاب کاکا کی شجاعت اور بہادری کے گیت تھے۔

"گلاب کاکا تو کبھی مر نہیں سکتا۔ تیرا دشمن آج فنا ہو چکا ہے۔ اور ہم تیرے بچے اپنی دھرتی کے مالک ہیں "

"اسے کون بے وقوف انسان مُردہ کہے گا۔ جس نے جان دے کر اپنی قوم کو زندہ کر دیا"

✦

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
(اقبال)

رحمان ساتھی

بہادر گل

سورج ڈوب گیا اور اس دن پہلی بار ندی کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے ہم ہندوستانی سپاہی۔ اپنے کیمپ کی جانب چل پڑے۔ ابھی ہم نے کوئی سو قدموں کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ کمانڈنٹ نے فوجی سیٹی بجائی .. ہم کیمپ کی جانب بڑھتے بڑھتے رک گئے۔ اور کیپٹن پیٹرسن کی جانب گھوم گئے۔ جو ساتھ والی پہاڑی پر کھڑا اپنے دائیں ہاتھ کے اشارے سے ہمیں اپنے پاس بلا رہا تھا۔ اس پہاڑی پر کیپٹن پیٹرسن اپنے خیمے میں رہتا تھا۔ وہ پہاڑی کے اوپر آزاد فضا میں رہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ کپتان تھا۔ اور ہماری کمپنی کا کمانڈنٹ تھا۔ لیکن ہم باقی سب کے سب پہاڑی سے پرے تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر ایک لمبی چوڑی جیل نما بارک میں رہا کرتے جس میں کبھی آزاد ہواؤں کا گزر نہ ہوا

یہ بارک آج سے بیس سال پیشتر اٹالین سپاہیوں نے بنائی تھی۔ اور اس لئے بنائی تھی کہ اس میں اٹالین سپاہی نہیں۔ بلکہ ان سپاہیوں کے گھوڑے بندھا کریں۔ اسی لئے اس بارک میں گھوڑوں کے لئے تھانوں کے نشانات آج بھی نظر آتے تھے۔ اور یہ نشانات اس امر کے شاہد تھے۔ یہ بارک چونے اور ریت کے مکسچر سے بنائی گئی تھی یہ تقریباً ۵۰ فٹ لانبی اور ۲۰ فٹ چوڑی ہوگی۔ لیکن چونے اور سیمنٹ سے تیار کردہ اس اتنی لمبی چوڑی بارک میں کمرہ کوئی نہ تھا۔

کہتے ہیں اس بارک میں اٹالین سپاہیوں نے گھوڑوں کی خاطر جو تھان بنائے تھے وہ ۱۹۴۱ سنہ کے وسط تک تو صحیح سلامت تھے۔ لیکن جب پہلی بار ہندوستانی

جنگی قیدیوں کو اس بارک میں محبوس کر دیا گیا۔ تو انہوں نے ان تھانوں کو توڑ پھوڑ کر فرش کو ہموار کر دیا۔ اس شہر کے رہنے والے کہا کرتے "انقلابات ہیں زمانے کے" کسی زمانے میں یہاں سکول ہوا کرتا تھا جس میں مقامی لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پایا کرتے۔ پھر ایک وقت آیا۔ کہ اٹلیو نے سنوسی کو شکست دے کر اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ اور جہاں عربوں کے کام کی ہر چیز مسمار کر دی گئی۔ وہاں اس سکول کو بھی مسمار کر کے گھوڑوں کو باندھنے کے لئے تھان بنا دیئے گئے۔ پھر ایک وقت آیا۔ کہ ہندوستانی جنگی قیدی اس میں محبوس رکھے گئے۔ زمانے نے پھر پلٹا کھایا۔ اور آج اس بارک میں ہندوستانی سپاہی آزادانہ طور پر رہ رہے ہیں۔ یہاں کے باشندے کہتے "آج کل ہندوستانی سپاہی اس بارک میں آزادانہ طور پر رہ رہے ہیں" اور اگر آزادی کے ساتھ رہنا اس کا نام ہے۔ تو اس آزادی کی تعریف سنیئے

اس بارک کے چاروں طرف تقریباً تین میلوں کے رقبے میں کانٹے دار تار آج بھی لگے تھے اور پورے کیمپ کے لئے صرف ایک دروازہ تھا۔ جہاں سے سپاہی بغیر" خاص اجازت" حاصل کئے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ اور اگر کوئی سپاہی ایسی جرأت بھی کرتا۔ تو پہرے دار سنتری زہریلی سنگین اس کے پیٹ کے آرپار نکال دیتا۔ کیمپ کے اندر دلبستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ کسی قسم کے کھیل تک کا بندوبست نہ تھا۔ اور نہانے کی خاطر کوئی خاطر خواہ بندوبست بھی نہ تھا۔ ہریالی۔ باغ۔ کھیت وغیرہ کی بجائے ایک گھٹن سی تھی۔ فضا میں ہر وقت مُردنی سی چھائی رہتی۔ جیسے کیمپ کے اندر کی یہ زمین صحرا اعظم لیبیا کی خشکی۔ ویرانگی اور غمناک حد تک خاموشی پر ماتم کر رہی ہو۔ . . . . . . اور ہم اس کیمپ کے اندر رہتے تھے۔ اسی کیمپ کی چار دیواری میں کام کیا کرتے۔ صبح کے وقت تقریباً چار بجے بیدار ہو جاتے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے۔ کیونکہ ہر آدمی ایک دوسرے سے پہلے اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کرتا۔ اس لئے کہ پورے کیمپ میں صرف ایک پانی کا نل اور ایک ہی پاخانہ تھا۔ جہاں پانچ بجے کے قریب اس قدر بھیڑ ہو جاتی کہ کوئی سپاہی پیچھے نہ رہتا اکثر اوقات ایسا ہوتا۔ کہ ادھر ڈیوٹی شروع ہونے کی سیٹی بج گئی۔ اور یہاں بہت سے سپاہی منہ ہاتھ دھونے ہی سے رہ گئے۔ ہم سب تعداد میں سو کے قریب تھے۔

ہندو، مسلمان اور سکھ جو ہندوستان اور اب پاکستان کے تقریباً ہر صوبے اور ریاست کی نمائندگی کرتے۔ ہم لوگ اتوار یا کسی تہوار کے دن کے علاوہ ہر روز شام کے پانچ بجے تک ڈیوٹی پر رہتے۔ بیچ میں بارہ بجے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوا کرتی۔ تاکہ ہم لوگ کھانا کھا سکیں۔ اور اس کے بعد وقت سے کچھ پہلے ہی ڈیوٹی پر پہنچ جائیں۔ پانچ بجنے کے کچھ منٹوں بعد ہماری چھٹی ہو جاتی۔ اور ہم بارک کی جانب چل دیتے۔ وہ بارک جس میں کمرہ کوئی نہ تھا۔ بلکہ شروع سے آخر تک صرف ایک ہی بارک تھی۔ اور جو آج سے تقریباً بیس سال پیشتر اٹالین فوجی رسالے کے گھوڑوں کو باندھنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ جہاں آزاد ہواؤں کا جھونکے سے بھی گذر نہ ہوتا تھا۔ اور جو صحرا اعظم لیبیا کی دہشت ناک حد تک ویرانی پر ماتم کرتی دکھائی دیتی۔ اور جس میں ہم تقریباً ایک سو کے قریب سپاہی۔ عہدے دار اور انڈین افسر رہا کرتے۔ لیکن ہمارا کپتان اس کیمپ کی وحشت ناک فضا سے دور آدھ میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی پر رہا کرتا۔ جہاں آزاد ہوائیں گذر سکتی تھیں۔ اور جہاں ہندوستانی سپاہیوں نے خیمے کے اردگرد پھولوں کے باغیچے اگائے تھے۔ رات کے وقت ہندوستانی سپاہی۔ اس باغیچے اور کپتان کی حفاظت کے لئے رات بھر پہرہ دیتے۔ وہ اس لئے کہ یہاں بدو قسم کے قبیلے رہا کرتے تھے۔ اور کپتان ان لوگوں سے بہت خائف تھا۔ ویسے تو کپتان کو ایم سی اور ڈی۔ ایس۔ او جیسے تمغے مل چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مختلف محاذوں پر کئی معرکے سر کر چکا تھا۔ لیکن وہ بدوؤں سے ڈر کر رہنا ہی مناسب سمجھتا تھا۔ اسی لئے ایک کپتان کی خاطر رات بھر تین تین سپاہی پہرہ دیتے رہتے

پہاڑی کے ساتھ ہی ندی سے ذرا ہٹ کر ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ یہ ماہی گیر ندی سے مچھلیاں پکڑتے اور شام کے وقت بازاروں میں بیچتے پھرتے۔ ماہی گیروں کی لڑکیاں سورج چھپنے سے بہت پہلے ہی جھونپڑوں سے باہر نکل آتیں۔ ندی کا رخ کرتیں۔ وہ ندی کے کنارے اپنے میلے کچیلے بوجھل سے کپڑے اتار پھینکتی۔ اور رات گئے تک اسی حالت میں مچھلیوں کی مانند ندی کے پانی میں ناچتی۔ اچھلتی اور

اور تیرتی رہتیں۔ جس وقت یہ ماہی گیر لڑکیاں ندی کی جانب روانہ ہوا کرتیں۔ تو کپتان پیٹرسن بھی اپنے خیمے سے باہر نکل آتا۔ ندی کے آس پاس ٹہلتا ٹہلتا وہ اندھیرا ہونے تک یونہی لطف اندوز ہوتا رہتا۔ کپتان پیٹرسن کو اپنے ماتحت سپاہیوں سے زیادہ ان ماہی گیر لڑکیوں سے دلچسپی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ وہ اُن کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب تھا۔ اور یہ کمانڈنٹ کی زندگی تھی اور کیمپ کے اندر ہماری زندگی تھی ہماری زندگیاں وقت کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی طرح گھسٹتی چلی جا رہی تھیں۔ لیکن اکثر اوقات ایسا محسوس ہوتا گویا ہماری زندگیوں کی گاڑی اچانک کسی روز چلتے چلتے رک جائے گی۔ کائنات پر سرمئی غبار چھا جائے گا۔ پھر اندھیرا بڑھنے لگے گا۔ یہ اندھیرا بڑھتا ہی رہے گا۔ اور پھر کل کائنات پر چھا جائے گا۔ تو چاند سورج کبھی طلوع نہ ہوں گے۔ اور ہماری زندگیاں ان گہرے اندھیروں کی بھینٹ چڑھ جائیں گی۔ بعض اوقات ہم لوگ ایسا ہی محسوس کرتے۔ لیکن کبھی کبھار یہ بھی محسوس کیا کرتے۔ کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ جب ہم لوگ۔ چاند تاروں بہاروں کو اپنی گرفت میں لے لیں گے اور گلنار چاند سورج کو کبھی غروب نہ ہونے دیں گے۔ اور کائنات پر پھیلے ہوئے غمناک اندھیروں کے پردوں کو چیر پھاڑ دیں گے۔ تاکہ زندگیوں میں روشنی ہو زندگی ہو۔ خوشی ہو۔ جیت ہی جیت ہو۔ اور شکست قسم کی کوئی چیز نہ ہو۔ اب یہ احساسات دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔ اور اب ہم لوگ مایوس زندگیوں کے متعلق کم سوچا کرتے۔ گو ماحول آج بھی اتنا ہی ڈل تھا۔ جیسا پہلے ہم لوگ اس کیمپ میں دراصل آرام کرنے کی خاطر لائے گئے تھے۔ ورنہ ہمارا کام اس کیمپ میں کیا تھا ہمارا کام تو محاذِ جنگ پر دشمنوں کے خلاف لڑتے لڑتے اپنے آپ کو یا دشمن کو ختم کر دینا تھا۔ ۱۹۴۰ء سے لے کر اس وقت تک اس بارک میں رہنے والے سپاہی اور عہدے دار دشمنوں کے خلاف لڑتے رہے تھے۔ اور یہ وہ خوش نصیب یا بدنصیب تھے۔ جنہیں آج تک موت بھی زیر نہ کر سکی تھی۔ العلمین کے محاذ پر ان سپاہیوں نے مارشل رومیل کی جرّی اور منظم فوج کے منہ پھیر دیئے تھے۔ اور سرنیکا کے مرغزاروں

میل لمبے چوڑے علاقے میں نازیوں کی فوجوں ٹینکوں مشین گنوں کی دیوارِ چین کو مسمار
کیا تھا۔ ان ہی سپاہیوں نے جرمنی کی مشہور افریقہ کور کے ہزاروں سپاہیوں کو موت
کی نیند سلا دیا تھا۔ اور اُن کے کمانڈر جرمن لفٹننٹ جنرل کو قیدی بنا لیا تھا۔ یہ سپاہی
سال ہا سال تک دشمن کے خلاف لڑتے رہے۔ ان کے بہت سے ساتھی شہید ہو گئے
جن کا خون اس سرزمین نے اس انداز سے جذب کر لیا کہ نشان تک باقی نہ رہا۔ اور ان
کے جسموں پر چیلوں اور گدھوں کے مابین عرصہ تک خوب جنگیں ہوتی رہیں۔ اور یہ خوش قسمت
یا بد قسمت سپاہی ستانے اور آرام کرنے کے بہانے اب اس کیمپ میں محبوس کر
دیئے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ان سپاہیوں کے دماغوں میں "فتور" آ گیا تھا۔ اس
لئے کہ انہوں نے اس جنگِ عظیم کو سر کرنے کی خاطر باقی اتحادی قوموں سے زیادہ حصہ
لیا۔ اور اس کے باوجود بھی لوگ انہیں غلام کہہ کہہ کر چڑاتے رہے۔ بازاروں میں شہروں
میں۔ گاؤں میں محاذِ جنگ پر جہاں کہیں بھی یہ لوگ گئے۔ یہی طعنے یہی پھبتیاں ان کے
ساتھ رہیں۔ آخر ان کے دماغوں میں "فتور" آ گیا۔ اور انہوں نے نازیوں کے خلاف
لڑتے لڑتے ایک دن اچانک ایک دن ہتھیار ڈال دیئے "ہمیں آزاد کرو" "تمہارے
ملکیوں کو جرنیل بناؤ" اور "انگریزوں کی مانند زکام ایسی باتوں پر وکٹوریہ کراس دو"
ان سپاہیوں کے دل و دماغ میں یہ جذبہ جو حکمرانوں کے نزدیک دماغی فتور سے
زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ دن بدن بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ پھر ایک دن آیا کہ نازی فوجیں
ان سپاہیوں کی چوکیوں کے بازو سے نکل کر اتحادیوں کے مقبوضہ علاقوں میں داخل
ہو گئیں۔ پھر جب صورتِ حال بہت ہی نازک ہو گئی۔ تو حکمرانوں نے ان پر
ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ انہیں طرح طرح کے لالچ دیئے گئے۔ چھوٹے موٹے
عہدے دیئے گئے۔ اطالین قیدی عورتیں دی گئیں۔ انہیں بہت کچھ دیا گیا اور
مزید کچھ دینے کے بہانے محاذِ جنگ سے اٹھا لیا گیا

ان سپاہیوں کا سرغنہ ایک پٹھان حوالدار تھا۔ جو کئی معرکوں میں حصہ لینے
کے باوجود بھی کپتان تو کجا جمعدار بھی نہ بن سکا تھا۔ وہ آج سے پانچ سال

تبا سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا۔ اس کا نام شریف گل تھا۔ لیکن اُسے بہادر گل کہا کرتے۔ بہادر گل نے الامین اور اریٹیریا کے معرکوں میں بہت نام پیدا کیا۔ اُس نے اپنی اینٹی ایئر کرافٹ گن (ANTI AIR CRAFT GUN) سے تین نازی بمبار جہازوں کو نشانہ بنایا۔ اسی گن سے اس نے تقریباً دو سو نازیوں کو موت کی نیند سُلادیا۔ اور جوں جوں اس کی بلند ہمتی کے قصّے مشہور ہوتے گئے۔ اس کا نام اسی انداز میں، دشمن ہوتا گیا۔ یہاں تک اس کی بہادری اور جواں مردی کے قصّے نازی کیمپوں میں بھی گائے جانے لگے۔ اس بات کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے۔ کہ ۱۹۴۲ء کی ایک کثیف شام کو بہادر گل اور اس کے چند ساتھیوں نے موقعہ پا کر دو اسکے قریب اطالین سپاہیوں کو قیدی بنالیا۔ ان قیدیوں میں ایک لفٹیننٹ بھی تھا۔ جب اس لیفٹیننٹ کو انگریز کمانڈر کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو اس نے بہادر گل کی بہادری اور بلند ہمتی کی بہت تعریف کی۔ اور کہا ہمارے جنرل نے بہادر گل کا نام آج سے تین ماہ پہلے سنا تھا۔ اور اپنے ماتحت سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا" اس ہندوستانی کی طرح کاش ہم بھی بہادر اور جری سپاہی ہوتے " اس لیفٹیننٹ نے یہ کہا:۔ کہ "اگر بہادر گل ہماری فوج میں ہوتا تو اُسے افسر بنا دیا جاتا"

— اس طرح بہادر گل کی بہادری کے کارنامے بڑھتے گئے تو دیگر سپاہیوں کے نزدیک بہادر گل کی شخصیت مقدس بنتی گئی۔ لیکن اس کے باوجود بھی جب بہادر گل جمعدار نہ بن سکا۔ تو اُس کے دماغ میں "فتور" آگیا۔ اور اس نے اپنے ہمعصر سپاہیوں کے سامنے کہا "ہم قربانی کے بکروں کی طرح انگریزوں کے کام آرہے ہیں۔ اپنا خون دیتے ہیں اپنے سینے میں گولیاں کھاتے ہیں۔ اپنے بچوں اور بیویوں کو یتیم و بیوہ بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی سپاہی کے سپاہی اور غلام کے غلام ہی رہتے ہیں" اور اس کے ہمعصروں نے بہادر گل کی باتوں کو دل سے سنا۔ اور اُس کے ہم نوا بن گئے۔ کہ وہ انگریزوں کے لئے نازیوں کے خلاف نبرد آزما نہیں ہوں گے۔ اور اس کے بدلے حرام موت مرنے کو ترجیح دیں گے۔ وقت گذرتا گیا۔ اور دو

انگریزوں سے بدظن ہوتے گئے ۔ پھر احتجاج کے طور پر انہوں نے انگریزوں کی طرف سے سپلائی کئے ہوئے راشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ کئی دن گذر گئے ۔ اس اثنا میں نازی فوجیں ان کی چوکیوں کے بازو میں نکل نکل کر اتحادیوں کے مقبوضہ علاقوں پر قابض ہوتی گئیں ۔ حالات بہت نازک ہو گئے ۔ حکمرانوں کو بہت تشویش ہوئی اور انہوں نے ان پر ڈورے ڈالنے شروع کئے ۔ انہیں اٹالین نوجوان قیدی عورتیں سپلائی کی گئیں اور محاذِ جنگ سے اٹھا کر امن کے علاقے میں ایک دور دراز مقام پر پھینک دیا گیا۔

یہ اس کیمپ میں آنے سے قبل کی بات ہے ۔ اٹالین قیدی عورتوں میں سے بہادر گل کو جو عورت ملی ۔ وہ اٹھارہ سالہ حسین و نوجوان تندرست و توانا پڑھی لکھی ایک لڑکی تھی ۔ جو اٹالین بری فوج میں سارجنٹ کے طور پر خدمات انجام دیتی رہی اتحادی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی تھی ۔ اس لڑکی کا نام لینورے تھا ۔ لینورے اٹھارہ سال قبل پھولوں کے شہر فلارنس میں پیدا ہوئی تھی ۔ اور اسی شہر میں اچھے سٹینڈرڈ تک تعلیم حاصل کرکے ایک اچھی ناصی فرم میں مینیجر ہو گئی تھی ۔ اور جس وقت اس کے ملک نے اعلان جنگ کیا ۔ تو وہ بھی میدان میں آ گئی ۔ اچھے سٹینڈرڈ تک تعلیم یافتہ وہ نازک اندام لڑکی متواتر تین سالوں تک اپنے ہم قوم سپاہیوں کے دوش بدوش اتحادیوں کے خلاف لڑتی رہی ۔ اس نے بہت سے نئے اور کٹھن مرحلے طے کئے اور اپنا نام روشن کیا ۔ پھر خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے وہ گرفتار کر لی گئی اور ایک عرصہ بعد بہادر گل کو دے دی گئی ۔

بہادر گل عورت کے معاملے میں عجیب و غریب خیالات رکھتا تھا ۔ وہ اس سرزمین پر پیدا ہوا تھا ۔ جہاں رسمی اور روایتی طور پر عورتوں سے کھلم کھلا اظہار عشق و محبت کو نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے ۔ وہ اس سرزمین کا باشندہ تھا جہاں کے رہنے والے اس قدر مہذب تو ہیں ۔ کہ وہ کسی غیر کے تابع رہنا گوارا نہیں کر سکتے ۔ وہ غلامی کے منحوس سائے سے بچنے کی خاطر صدیوں تک غیر ملکیوں کے خلاف لڑتے رہے ۔ اور انہیں کوئی قوم کوئی ہستی زیر نہ کر سکی ۔ لیکن اس کے

برعکس یہ جنگجو انسان عورت کے معاملے میں اس قدر پابند ہیں۔ کہ اپنی عورتوں کو آزادانہ طور پر گھومنے پھرنے سے باز رکھتے ہیں۔ عشق و محبت کا مظاہرہ کرنا تو قیامت کی بات ہے۔ اگر کسی نے عورت کو بُری نظر سے دیکھا۔ تو خون کے دریا بہہ جاتے ہیں۔ اور نسلوں تک انتقام کا جذبہ باقی رہتا ہے اور بہادر گل بھی اسی سرزمین پر پیدا ہوا تھا۔ اس نے چلنا سیکھنے کے ساتھ ساتھ بندوق چلانے کے گر سیکھ لیئے تھے۔ پہاڑوں کی بلند قامت چوٹیوں پر دشمنوں کو شکست دینے کی مشق کی تھی۔ اور جوان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین سپاہی بن گیا تھا۔ لیکن عورت کے معاملے میں وہ بالکل بے بہرہ تھا۔ اور جب لینورے اُس کو پیش کی گئی۔ تو بہادر گل کی آنکھیں زمین کی جانب جھکتی گئیں۔ اور اس طرح وہ بہادر سپاہی جس نے کتنے ہی محاذوں پر دشمنوں کے دانت کھٹے کئے تھے۔ اور جس کے تصور میں ایک خوش آئند انقلاب جنم لے رہا تھا۔ لینورے کی عورتیت کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

لینورے نے کہا

"میں نے تمہاری بہادری اور جواں مردی کے قصے سُنے ہیں بہادر سپاہی"

بہادر گل کچھ نہ بولا

لینورے پھر کہنے لگی

"ہندوستانی بدقسمتی سے غلام ہوتے ہوئے بھی اس قدر دلیر۔ بہادر۔ بلند ہمت اور تہذیب یافتہ ہوتے ہیں۔ کہ اُن کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہی ہم اٹلی والوں کا دل موہ لیتی ہیں"

اور بہادر گل اب کی بار بھی کچھ نہ بولا

لیکن اِس کے دو دن بعد جب دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے۔ تو بہادر گل نے پہلی بار لینورے کو مخاطب کر کے کہا:

"لینورے تم نے ٹھیک کہا۔ ہندوستانی غلام ہیں۔ لیکن میں غلام نہیں ہوں"

کیونکہ میں ہندوستانی نہیں ہوں۔ میں اُس زمین پر پل کر جوان ہوا۔ جہاں کے انسان پیدائشی طور پر آزاد ہیں۔ جن کی روحوں۔ سانسوں اور دماغوں پر غیروں کا قبضہ نہیں اور لینڈورے فاتحانہ انداز میں کہنے لگی " تب تو میں بہت خوش قسمت ہوں۔ کہ ایسے بہادر کے حصے میں آئی جس کا ملک آزاد ہے جس کی قوم آزاد ہے۔ جہاں سرمایہ داروں اور زمینداروں کی پہنچ نہیں اور مجھے یہ جان کر کتنی خوشی محسوس ہو رہی ہے میں حتی الوسع کوشش کروں گی کہ تمہیں خوش رکھ سکوں۔ اور تمہاری خوشنودی حاصل کروں۔ اور اس طرح تمہارے ساتھ اُس سرزمین پر قدم رکھوں۔ جس کے لئے میری روح بے قرار ہو رہی ہے "

چند لمحوں کی خاطر وہ دونوں خاموش رہے۔ سورج جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گیا اور لینڈورے نے سر اٹھا کر بہادر گل کی جانب دیکھا۔ جو نہ معلوم کس سوچ میں کھویا تھا۔ لینڈورے پھر بول اٹھی " بہادر گل! یہ تو ٹھیک ہے کہ تم۔ تمہاری قوم اور تمہارا ملک غلام ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ کہ تم آزاد ہوتے بھی انگریزوں کی خاطر قربانی کے بکرے بننے پر کیوں مجبور ہو۔ تم بہادر اور دلیر سپاہی ہماری طرف سے اتحادیوں کے خلاف کیوں نہیں لڑتے اور میں محسوس کرتی ہوں۔ کہ اطالین اور ہندوستانی انگریزوں کی بہ نسبت ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ اور اس نے کیا ہم اطالین ہندوستانیوں کو اپنے حریفوں کی جگہ دوست اور ساتھی نہیں بنا سکتے؟"

اور بہادر گل کیا جواب دیتا

بہادر گل نے لینڈورے کی بات دل میں رکھی۔ یہ بات کتنے ہی دنوں تک اُس کے دماغ میں محفوظ رہی اور وہ اس کا کوئی مناسب جواب سوچتا رہا۔ لیکن عرصے تک اُس کا دماغ لینڈورے کی بات کا کوئی معقول جواب سوچنے سے قاصر رہا۔ اور وہ ابھی لینڈورے کو اس بات کا کوئی مناسب جواب دینے بھی نہ پایا تھا۔ کہ حکمرانوں کی طرف سے یہ حکم سنا دیا گیا۔ کہ وہ اس جگہ سے تبدیل ہو کر کسی دوسرے

مقام پر پہنچائے جا رہے ہیں۔ اور بہادر گل نے یہ حکم نہایت ہی غم اور غصے کے ساتھ سنا۔ وہ اس موجودہ مقام سے تبدیل ہو کر کہیں دوسری جگہ جانے کے لئے ہرگز رضامند نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ابھی چند مہینے اور اسی مقام پر رہے۔ یا اگر چلا بھی جائے تو فی الحال لینورے اس کے ساتھ ضرور ہو۔ اور جب بہادر گل نے اس خبر کا ذکر لینورے کے سامنے کیا تو وہ بھی بہت متفکر ہوئی۔ اور وہ رات گئے تک بحیرۂ روم کے ساحل پر ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر بیٹھے۔ اس بات کا کوئی مناسب حل تلاش کرتے رہے۔ آخر بہادر گل کے دماغ میں ایک تجویز آ ہی گئی۔ اور اس نے لینورے سے کہا کہ وہ مصنوعی طور پر بیمار بن جائے گا اور پلٹن کے ساتھ کسی دوسرے مقام پر جانے کی بجائے مقامی ہسپتال میں داخل ہو جائے گا۔ لینورے بہادر گل کی یہ تجویز سن کر بہت خوش ہوئی۔ اور اس طرح بہادر گل اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ حکمران تو یہی چاہتے تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کمپنی سے نکل جائے تاکہ ہندوستانی سپاہیوں کے دماغوں میں جو فتور آ گیا ہے وہ فتور یہاں تک رہے

اور بہادر گل ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ اس کی پلٹن وہاں سے کوچ کر گئی۔ اور حکمرانوں کی مرضی کے مطابق اس بارک میں جو ڈیوٹی مقرر کی گئی۔ جہاں کہ زمانے میں مقامی لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کیا کرتے تھے اور جہاں اس کے بعد ہندوستانی جنگی قیدی محبوس رکھے گئے تھے۔

بہادر گل کو ہسپتال میں داخل ہوئے دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اور ان دو ماہ کے بیچ درمیانی عرصے میں وہ اور لینورے باقاعدہ ملتے رہے۔ اور اپنی اکیڈمی کے سکیم کی تکمیل میں مصروف رہے۔ اور پھر ایک دن اس نے اڑتی اڑتی یہ خبر سنی کہ اس کے ساتھیوں نے حکمرانوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر بغاوت کر دی ہے اور حکمرانوں کے خلاف ہتھیار سنبھال لئے ہیں۔ اور اس خبر نے بہادر گل کو پریشان کر دیا اور کا جی چاہا وہ جلد از جلد اپنے باغی ساتھیوں کی صفوں میں شامل ہو جائے۔ اس کے لئے اس نے افسروں سے اجازت مانگی۔ اور جب اسے اجازت نہ مل سکی تو اس

کی پریشانیاں اور بڑھ گئیں - اُس کے دماغ میں چڑچڑاپن پیدا ہوگیا - اور یہ سب
اس صورت میں بڑھتا گیا کہ اُسے لینورتے سے بھی دلچسپی نہ رہی - پھر جب وہ اپنے آپ
کو مزید عرصے تک ان حالات میں رہتے رہنے کے ناقابل سمجھنے لگا تو ایک رات وہ
ہسپتال سے بھاگ نکلا - وہ ایک عرصے تک صحراؤں اور بیابانوں کے راستے چل کر
اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تو اس نے سُنا - اُس کے تیس رفیق جیل کی سنگین
سلاخوں کے پیچھے بند کر دیئے گئے ہیں - اور جو ابھی تک جیل میں بند نہیں کئے گئے اُن
پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے - بارک کے گرد پہرے بٹھا دیئے ہیں اور کیمپ
کے آس پاس انگریزی مسلح گارد متعین ہو چکی ہے -

بہادر گل کو کیمپ کے اندر داخل ہوتے وقت ٹوکا گیا - لیکن چونکہ اُس نے
کپتان کی وردی پہنی ہوئی تھی - اور عجیب غریب ہیبت ناک شکل بنائی ہوئی تھی - اس لئے
سنتری نے اُس کی شخصیت کا احترام قبول کرتے ہوئے اُس کی طرف سے زیادہ پرواہ
نہ کی - اور وہ کیمپ کے اندر داخل ہوگیا اور کیمپ کے اندر اپنے ہمعصروں کو
اس بنا پر جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند دیکھ کر کہ انہوں نے اپنے حقوق کے لئے
مناسب آواز اٹھائی تھی - اُس کی آنکھوں میں خون اتر آیا - اور تصور میں وحشت
جاگ اٹھی - اور نتیجے کے طور پر اُس نے اس شام کو تاریکی پھیلنے سے پیشتر ہی
چاروں اُن حکمرانوں کو بندوق کی گولیوں سے ٹھنڈا کر دیا - جو اُس کے ساتھیوں
پر قیامت ڈھانے میں پیش پیش تھے - لیکن اس سے پہلے کہ وہ گرفتار کر لیا جاتا وہ
وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا -

اور اسی طرح عرصے تک ہندوستانی اور وہ مقامی باشندے جنہیں ہندوستانیوں
سے ہمدردی تھی - بہادر گل کی بہادری اور جوانمردی کے قصے دہراتے اور اس
کو خراج تحسین ادا کرتے رہے -

شروع ہوا - آخر بہادر گل ہندوستان جاتا ہوا کوئٹہ کے مقام پر گرفتار
کر لیا گیا - بہادر گل کے متعلق یہ داستان بھی بہت طویل ہے لوگ کہتے ہیں وہ

چلا انگریزوں کو ختم کرنے کے بعد ایک ٹرک میں سوار ہو کر لینو رے کے پاس پہنچا - اور لینو رے کو صورتِ حال سے واقف کیا - پھر اُس نے لینو رے کو اس کے ساتھ ہندوستان بھاگ چلنے کے لئے رضامند کیا - اور اس طرح وہ دونوں صحراء اعظم لیبیا مصر فلسطین عراق اور ایران کے خشکی کے راستے سے ہندوستان پہنچنے کی فکر میں کوئٹہ تک پہنچ گئے - جہاں انہیں گرفتار کر لیا گیا - گرفتار کر کے انہیں اُس مقام پر واپس لے جایا گیا جہاں سے وہ فرار ہوا تھا - عرصہ تک اُس پر کورٹ مارشل کی کارروائی ہوتی رہی تا آخر اسے سولہ سال سخت قید کا حکم سنا دیا گیا - لوگ کہتے ہیں جس وقت اُسے اس طویل - اور سخت سزا کا حکم سنایا گیا - وہ مسکرانے لگا - اور نہایت ہی خوشی اور فتح مندانہ انداز میں لینو رے کو مخاطب کر کے کہنے لگا "لینو رے یہ سزا میرے لئے موت کا پیغام نہیں ہے - اور اگر ہے بھی تو میرے ساتھی اس موت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں"۔

اور لینو رے — لینو رے کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

— اس حکم کے ایک ماہ بعد بہادر گل کو مصر کے محکمہ جیل کے حکام کے سپرد کر دیا گیا جنھوں نے بہادر گل کو اس شرط پر تبدیل کیا کہ وہ جیسا چاہیں گے بہادر گل کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے - کہتے ہیں - کہ مصری حکام نے جو اس کی بہادری اور اولوالعزمی کی طویل داستانیں سن چکے تھے - بہادر گل کو اپنے چارج میں لینے کے تین دنوں بعد بڑی عزت کے ساتھ بری کر دیا - اُسے ایک کار دے دی گئی - اور لینو رے کو حفاظت سے اُس تک پہنچا دیا گیا - لینو رے کو حاصل کرنے کی تمام مصریوں نے بہادر گل کے لئے بہت کچھ کیا

ان باتوں کو اب کم و بیش پانچ سال ہو رہے ہیں - لیکن بہادر گل کی یاد میرے دل میں بالکل تازہ ہے - جیسے یہ واقعات کل ہی بیتے ہوں - لیکن میں پانچ سال کے اس درمیانی عرصے میں ہمیشہ اُس کا متلاشی رہا - جوں جوں اُس کی تلاش میں دن گزرتے گئے - بالکل اسی طرح وہ واقعات جو تاریخ نے

گل کے ساتھ منسوب کر دیئے تھے۔ تازہ ہوتے گئے۔ میں آج بھی اُس کی جستجو میں
۔ مجھے اُس کا دوست اور ہمعصر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اور میں اپنی اِس
نصیبی پر آج بھی نازاں ہوں۔ اور کاش بہادر گل آج یہاں ہوتا۔ تو میں اُسے
ب کر کے کہتا:۔

بہادر گل تم انقلابی ہو۔ تم نے آج سے پانچ سال قبل ایک زبردست
اب کو جنم دیا۔ اور حکمرانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اب ہندوستانی
ہرگز غلام نہیں رہ سکیں گے۔ تم نے اِس نازیبا سلوک کے خلاف آواز اٹھائی
ــــ لیکن آج جب انسانیت کے نام و نشان کو ختم کر دینے کے لئے اٹلانٹک
ے ایسے نوس ہتھیار پیدا ہو چکے ہیں۔ تو تم خاموش کیوں ہو۔ تم ایسے حالات
رہ کر کیسے زندہ رہے جا رہے ہو۔ میرے انقلابی دوست ایک اور انقلاب
دو اور سرمایہ داروں کو موت کی نیند سلا دو۔ یہ ظالم ہیں۔ لٹیرے ہیں۔ اور
ے آزاد ملک کی ترقی اور بہبودی کی راہ میں پھیلے ہوئے پہاڑ ہیں۔ سمندر ہیں۔

۔ لیکن ... سرمایہ داروں اور زمینداروں کی عیاریوں اور جعل سازیوں
سے بنے ہوئے یہ بلند قامت پہاڑ نہ جانے بہادر گل کو کون سے پردوں
چھپاتے ہیں۔ کہ دل کی آنکھیں بھی اُسے دیکھنے کو ترستی ہیں۔

فضل مالک

واسکٹ

موٹی موٹی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ سیدھی ترچھی۔ تیز تیز۔ ہر لحظہ شور بڑھ رہا تھا۔ جیب خاکستری پہاڑوں میں بادل گرجتے بجلی چمکتی اور ایک زوردار آواز پیدا ہو کر ایک عظیم گونج بن جاتی۔ وہ لرز جاتا۔ . . . خوف سے نہیں اور اُن لکڑیوں کے بوجھ سے بھی نہیں۔ جو وہ پہاڑ کی چوٹی سے اٹھائے آ رہا تھا۔ بلکہ ان برف کی طرح سخ اور تیروں کی طرح گرتی ہوئی بوندوں سے جو اس کے بدن میں گڑی جا رہی تھیں۔ بلکہ جسم کے پار ہو رہی تھیں اُف بلا کی سردی تھی اور وہ ٹھٹھر رہا تھا۔ اس کے بدن پر صرف ایک مٹیالے رنگ کی قمیض تھی۔ جو جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ جیسے کسی نے جان بوجھ کر پھاڑ دی ہو۔ کٹ کٹ اس کے دانت بجتے اور وہ اپنے ہونٹوں کو بھینچتا۔ وہ اپنی اس کمزوری پر کسی طرح قابو نہ پا سکتا تھا۔ عجیب بات تھی۔ پہاڑوں کا رہنے والا چلبلا لڑکا ہو کر اتنی سی سردی سے ٹھٹھک رہا تھا۔ بھلا شہری نازک اندام تھوڑا ہی تھا۔ یہ شہر والے تو یونہی بدنام ہوتے ہیں اس نے چاہا کہ وہ اپنی چادر کو جو اس نے اپنے شانوں پر اٹھائی ہوئی لکڑیوں کے نیچے رکھ لی تھی۔ نکال کر لپیٹ لے۔ لیکن اس کی پیٹھ پر تو قمیض بس برائے نام ہی تھی۔ اس لئے وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ برابر نیچے ڈھلوان کی طرف جا رہا تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا۔ یہ نیچے کی طرف جانا بھی کتنی آسان بات ہے۔ بس بھاگے جاؤ خود بخود۔ مزہ تو تب آتا ہے۔ کہ کوئی چڑھائی پر اتنی تیزی دکھائے۔ آخر چڑھائیوں اور ڈھلوانوں میں فرق بھی تو ہے۔ بس اتنا ہی فرق جتنا جوان ہونے میں اور بوڑھا ہونے میں۔ جونہی وہ پہاڑی کے دامن میں

بیچارہ اس کی ماں نے اُسے آواز دی اور اس میٹھی شفیق آواز نے اس میں کچھ ہمت پیدا کی۔ اور وہ محسوس کرنے لگا کہ جیسے وہ کبھی تھکا ہی نہ تھا۔ اُس کی ماں نے دوپٹہ گول کر کے سر پر رکھا۔ اور دوسرے لمحے لکڑیاں اس کے سر پر تھیں۔ وہ کتنی سبک سبک جا رہی تھی شہباز گھر پہنچ کر ایٹا ہی تھا کہ یار خان آیا۔ یار خان، اس کا ہم عمر تھا۔ اور دونوں میں بڑی محبت تھی یہاں تک کہ جب یار خان پچھلے دنوں پشاور سے واسکٹ اور ٹائر کی مضبوط چپلی خرید کر لایا تھا تو اُس نے کتنی دیر اپنی چپلیاں اور واسکٹ اسے پہننے کو دی تھیں۔ یار خان اسے کتنی دیر تک اوپر نیچے دیکھتا رہا تھا۔ اس کا دوست کتنا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ اور شہباز نے اُس دن سے اپنے باپ سے کہنا شروع کیا تھا وہ بھی اسے یار خان کی طرح تلے کی ڈوری والی کھڑی واسکٹ اور ٹائر کی موٹی موٹی چپلیاں جس پر سفید چمکتی ہوئی میخیں لگی ہوئی ہوں ضرور خرید دے۔ اس ۔۔۔ کے ساتھ روز پہاڑ پر لکڑیاں کاٹنے کے لئے جانا پڑتا اور کبھی باپ کے ساتھ پشاور جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے ایک واسکٹ ضرور خریدنی تھی۔ بھلا پشاور کوئی بلائے۔ اور واسکٹ بھی خرید کر نہ لائے۔ اس کے جتنے ساتھی بھی آج تک پشاور گئے تھے نئے نئے مارکین کے موٹے موٹے کپڑے پہن کر آئے۔ اور اسے تو بس ایک واسکٹ پہنیے۔ اُس کی نظر گھر میں پھرتی ہوئی ان دو مرغیوں پر پڑی جسے وہ پشاور میں فروخت کرنے کے لئے لے جانا چاہتا تھا۔ کم از کم انہیں ہی بیچ کر اس کی واسکٹ آ سکتی تھی یار خان اس کے قریب کھڑا تھا۔ اور وہ ٹکٹکی لگائے اُن خاکستری مرغیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچتا کہ اس کی مرغیاں نہ بیچی جائیں۔ کتنی پیاری پیاری لگ رہی تھیں۔ لیکن جب اُس نے یار خان کی طرف دیکھا۔ تو تلے کی چمکتی ہوئی ڈوری نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ اور وہ خود بخود دل ہی دل میں راضی ہو گیا۔ کہ اُسے ضرور یہ قربانی کرنی پڑے گی۔ اگرچہ اُس وقت وہ بہت تھکا ہوا تھا لیکن یار خان کے ساتھ بکریاں چرانے کے لئے چلا ہی گیا۔ آج اُن کی سب باتیں پشاور کی بابت ہو رہی تھیں۔ اُس دن اُس نے یار خان سے کئی سوالات کئے پھر اس نے واسکٹ کے رنگ پر گفتگو شروع کی۔ اور ایک لمحے میں اُس نے کتنے ہی رنگ منتخب کئے۔ آخر اسی پر آ کر رک گیا۔ کہ وہ بھی گلابی رنگ

کی واسکٹ خریدے گا۔ دونوں دوست جب ایک ہی رنگ کی واسکٹیں پہنے بکریاں چرانے جائیں گے تو کتنے اچھے معلوم ہوں گے۔ سبز سبز پہاڑوں میں گلابی گلابی واسکٹ۔ جیسے سبزے میں اُگے ہوئے گلابی پھول۔ اور پھر چنار کے کالے دوپٹے کا تو بھی تو گلابی تھا۔ چنار جو اُن کے ساتھ کھیلتی تھی۔ جو اُن کے بغیر پہاڑ کو بھی نہ جایا کرتی۔ آج چند ہی دنوں میں ان کے لئے بالکل اجنبی بن گئی تھی۔ اور وہ دونوں دوست سوچتے کہ آخر اس چنار کو ہو کیا گیا۔ جو وہ ان سے پہلے کی طرح نہیں بولتی۔ بس دُور ہی دُور سے کبھی کبھی ہنس کر چلی جاتی ہے اور اتنی سوچ پر بھی انہیں اتنا ہی معلوم ہو سکا۔ کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے سربلند کی ہو گئی تھی۔ اگرچہ سربلند اُس سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ لیکن اس فلسفے کو وہ کیا جانیں۔ یہ تو بڑوں کی باتیں ہیں۔ اور وہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اور یا شاید چنار کا ننھا سا دل جانتا ہو۔ چونکہ شہباز کو پَو پھٹنے سے پہلے ہی روانہ ہونا تھا۔ اس لئے ماں نے اُسے وقت پر سونے کو کہا تاکہ صبح اٹھنے میں تکلیف نہ ہو۔ اس کے باپ نے خچروں کو کرایہ پر لینے کا بندوبست کر لیا تھا۔ صبح جب اس کی ماں اٹھی اور خچروں پر بکریاں لادنے لگی۔ تو وہ چپکے سے اٹھ کر اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اور ماں کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اُس کی ماں نے تو جان بوجھ کر اُسے نہیں جگایا تھا۔ تاکہ کچھ دیر نیند کر لے لیکن ایسی راتوں کو نیند کہاں۔ ہاں آنکھیں بند کئے طرح طرح کے خواب دیکھنا اور پشاور کے بازاروں میں پھرنا اور بات ہے۔ ورنہ نیند تو یار خاں کو بھی نہیں آئی تھی۔ جب وہ ایک صبح پشاور جا رہا تھا۔ جیسے عید کی رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ سب کو وقت سے پہلے ہی جگا دیا جائے۔ بس یہی حالت اس کی تھی۔ پھر سب خچروں کو لاد دیا گیا۔ اور جب شہباز کو ماں نے پیار سے چومتے ہوئے رخصت کیا تو اُسے اس کے ننھے منے بھائی کے لئے چوسنی لانے کے لئے کہا اور وہ سر ہلاتے ہوئے تیزی سے باہر نکلا۔ قافلہ ایک ساتھ روانہ ہوا۔ ان دُور پہاڑوں کی خاموش صحت مند فضا میں رہنے والے آفریدی پشاور جا رہے تھے۔ ٹھنڈی خوش گوار ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ اور شہباز کے ننگے پاؤں چھوٹی چھوٹی کنکروں کو روندتے

ے اٹھ رہے تھے۔ وہ اس گرم جوشی سے جا رہا تھا۔ کہ اس یخ ہوا کا اس کے ننگے جسم پر کچھ اثر
ہیں ہو رہا تھا۔ شاید وہ تصور میں نئی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ گرم گرم چست چست
یوں سردی لگتی کتنی خاموش فضا تھی اور کتنی پراسرار گہرائیاں۔ یہ سادہ لوگ۔ رات
پیدل چلنے والے۔ شہر والوں کی سرد راتوں کو تیز تیز چلنے والی لکڑیوں اور کوئلے سے
م کرنے کس بے نیازی سے جا رہے تھے۔ قافلہ جا رہا تھا۔ روشنی پھیل رہی تھی۔ اور
باز کا دل اچھل رہا تھا۔ اب وہ ہر ایک چیز کو صاف طور پر دیکھ رہا تھا۔ اب
ہ جگہ بھی نزدیک آ رہی تھی جہاں سے وہ پشاور کی پہلی نشانی باڑہ فورٹ دیکھ سکتا
ا۔ اس خیال سے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں کو کچھ محفوظ سمجھتا۔ پھر وہ ہوگا اور
کول کی نرم ٹھنڈی سڑک۔ ان کنکروں سے بدرجہا بہتر۔ یار خان نے اُسے بتلایا
کہ اُس کے پاؤں کنکریوں پر چلتے چلتے کیسے چھلنی ہو گئے تھے۔ لیکن جب سرکاری
ڑک پر پہنچا۔ تو وہ یوں سمجھنے لگا۔ گویا سبزے پر جا رہا تھا۔ اور اب وہی حالت
ہباز کی تھی۔ لیکن اس کا بڑا حوصلہ تھا۔ آخر حوصلہ نہ ہوتا تو واسکٹ کہاں سے
ں۔ اور پھر اپنی پسند کی۔ وہ سوچ رہا تھا اور قافلے کا ایک ساتھی گا رہا تھا۔

" ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے فضا صد درجہ خوشگوار ہے۔ اے کاش میرا محبوب ایسے
ں میرا ہم سفر ہوتا "

" محبت ایک بلا ہے۔ خدا کسی کو اس میں مبتلا نہ کرے۔ اس لئے کہ اس کا نتیجہ فنا
ہوتا ہے "

" اپنے محبوب وطن کو کوئی خوشی سے نہیں چھوڑتا۔ یا تو انسان غربت سے مجبور ہو کر
۔ ۔ ۔ یا اپنے محبوب کے ہاتھوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وطن کو خیرباد کہتا ہے "

ر خچروں کی گھنٹیاں ٹن ٹن کرتی ہوئیں شہباز کے خیالات کا ساتھ دے رہی تھیں۔ اس کے
ؤں برابر اُٹھ رہے تھے۔ اسی تیزی کے ساتھ جیسے اس کے خچر جا رہے تھے۔ ہوا گرم
تی گئی۔ اور وہ پشاور کی سرحد کے قریب آتے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ باڑہ
رٹ کی صاف چمکتی ہوئی سڑک پر جا رہے تھے۔ اب شہباز کے پاؤں کو کچھ آرام

مل گیا۔ اُس کے چہرے پر امید اور مسرت کے رنگ چمکنے لگے۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی۔ جو اپنی منزل کو سامنے دیکھ رہا ہو۔ اگرچہ شہباز کی داسکٹ دور شہر میں کہیں مڑے تڑے بازاروں میں کسی دوکان پر لٹک رہی تھی۔ لیکن اُس کی نگاہیں اسے برابر دیکھ رہی تھیں۔ بلکہ اب تو عین اس کی آنکھ کی پتلیوں میں لٹک رہی تھی۔ جسے ہر ایک قریب سے جاکر دیکھ سکتا تھا۔ وہ اڈے پر پہنچ چکے تھے۔ اور وہ یکایک جیسے نیند سے جاگ اٹھا ہو۔ جب کسی نے مچر پر پڑی ہوئی مرغیوں کی قیمت پوچھی۔ وہ کچھ کہتے کہتے ہی رک گیا۔ وہ کہہ بھی کیا سکتا۔ بس دیکھتے دیکھتے ہی رہ گیا۔ اور اس کی مرغیاں دوسرے کے ہاتھ میں تھیں۔ جس کے بدلے اُس کے باپ کو ایک ایک روپے والے تین نوٹ مل گئے۔ کڑکڑ کرتے ہوئے نئے نوٹ جسے تو اچھی طرح دیکھے بھی نہیں تھے۔ کہ اُس کے باپ نے توڑ موڑ کر پگڑی کے ایک کونے میں باندھ دیئے۔ شہباز مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کی مرغیاں پھڑ پھڑا کر شور کر رہی تھیں۔ جیسے انہیں شہباز سے جدا ہوتے ہوئے افسوس ہو رہا تھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ زرد زرد شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ ہر چیز اُسے بیمار بیمار۔ زرد زرد سی معلوم ہونے لگی۔ کہاں پہاڑوں کی سُرخی اور کہاں یہ زردی وہ یوں سمجھنے لگا جیسے یہاں ہمیشہ زردی ہی زردی چھائی رہتی ہے۔ بازاروں کی گہما گہمی میں وہ کچھ کھو سا گیا۔ موٹروں اور سائیکلوں سے بچتا ہوا حیران حیران دیکھ رہا تھا۔ اس کا باپ خچروں کو کنارے پر کرتا ہوا زور زور سے آوازیں دیتا۔ اور وہ . . . . . وہ تو خود کو بچا لیتا تو بھی کافی تھا۔ بس ٹکر تے ٹکرتے بچ جاتا تھا۔ کتنے بے ہودہ لوگ ہیں یہ شہر والے انہیں تو چلنے کا سلیقہ ہی نہیں۔ چڑھتے ہی آتے ہیں سر دوں پر۔ وہ سوچتا اور سوچ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے باپ کے قریب ہو جاتا۔ اب وہ کباب والے کی دکان سے گذر رہا تھا۔ اسے سخت بھوک محسوس ہوئی۔ وہ دوکان پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دوست نے گرم گرم کباب کی کتنی تعریف کی تھی۔ کباب کی تیز خوشبو نے کچھ دیر کے لئے واسکٹ اس کے دماغ سے ہی نکال دی۔ لیکن اُس کی خچریں

تو برابر آگے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اس کا باپ تو رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اب وہ پھر دو طرفہ دوکانوں کو دیکھنے لگا۔ لیکن جس چیز کو شہباز ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ تو اسے کہیں دکھائی نہ دی۔

سرائے پہنچ کر خچروں سے بوجھ اتارا دیا گیا۔ اپنے ساتھ لائی ہوئی گھاس اُن کے سامنے ڈال کر خود بھی کھانے کو بیٹھ گئے۔ جوار کی روٹی کھاتے ہوئے اسے خواہ مخواہ کباب یاد آگئے سو بھی کتنا نادیدہ تھا۔ جب اپنے ہاں تو وہ روز کباب کھایا کرتا تھا۔ اور اب یہ خشک نوالے اس کے حلق میں انقلاب پیدا کر رہے تھے۔ یکایک اُسے وہ تین روپے یاد آئے۔ یہ خشک نوالے بھی کتنے انقلابی ہوتے ہیں۔ اُسے اتنا خیال بھی نہ آیا کہ ان روپوں سے تو وہ واسکٹ خریدے گا۔ تھوڑی دیر کے لئے جیسے وہ واسکٹ بھول ہی گیا۔ اور اس نے کباب کی فرمائش کر ہی دی۔ لیکن یہ وعدہ فردا کی امید بھی کتنی دل آویز چیز ہے۔ اس نے اسی طرح ہتھیار ڈال دیئے۔ جیسے کوئی غریب نادار جنت میں حور اور شہد کے ملنے کے وعدہ پر سر مار کر خاموش ہو جاتا ہے اسے کہتے ہیں عاقبت اندیشی! اور پھر شہباز کو تو واسکٹ خریدنی تھی اپنے ننھے منے بھائی کے لئے شہد کی چوسنی . . . رات کو جب وہ سونے لگا۔ تو تمام رات خواب ہی خواب دیکھ رہا تھا۔ بازاروں میں سجی ہوئی دکانیں۔ طرح طرح کے خوشنما کپڑے پہنے ہوئے لوگ اور کباب والے کی دوکان پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں۔ اس کے پاؤں کے تلوؤں میں سوزش ہو رہی تھی۔ لیکن صرف ایک رات ہی کی تو بات تھی۔ اور پھر کل ربڑ کی نرم نرم چپلیاں . . . . اُس کے پاؤں کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دینگی۔ صبح جب خریدار سرائے میں آئے تو پہلے ہی شہباز کے باپ نے اپنا سامان فروخت کر لیا اب وہ ایک معقول رقم کا مالک تھا دونوں باپ بیٹا سرائے سے نکلے اور سیدھے بازار چل پڑے قصہ خوانی کے پررونق بازار سے گذر کر وہ ڈاکٹروں کے بازار پہنچ گئے۔ رنگ رنگ کے کوٹ۔ ٹوپیاں اور واسکٹ شہباز کا دل پامال کرنے لگا وہ ہر واسکٹ کو چھوتا ہوا آگے بڑھتا سفید اور زرد رنگ کے نیلے سُرخ واسکٹ۔ نہ جانے کیوں اس کا باپ یوں ہی گذر رہا تھا۔ وہ کسی دوکان پر رک کیوں نہیں جاتا۔ اور وہ مایوس نگاہوں سے دیکھتا

مار رہا تھا۔ اس کو اور بھی تسکین ہو جاتی۔ جب اپنے باپ کی پگڑی کے پلّو میں بندھے ہوئے روپوں کی ابھرتی ہوئی پوٹلی کو دیکھ لیتا۔ انہوں نے سب دوکانوں کا چکر لگایا جمعہ کا دن تھا۔ بازار میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ شہباز کے لئے تو رستہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا۔ اُس نے ہمت کی اور ایک بھڑکتی ہوئی لال سُرخ۔ آنکھوں کو خیرہ کرنے والی واسکٹ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کا باپ مجبوراً اُسی دوکان پر کھڑا ہو گیا۔ واسکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ تو واسکٹ کو ہاتھ سے رکھتا ہی نہیں تھا جب سائز معلوم کرنے کے لئے واسکٹ پہنی تو اُسے ایک مسرت محسوس ہوئی۔ ایک لمحے میں جیبوں کی گہرائی ٹٹول ٹٹول کر دیکھی۔ استر کو بار بار دیکھا۔ ہولے ہولے وہ کپڑے کے نرم نرم سلوٹوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے سہلا رہا ہو۔ اُسے ایسا کرتے ہوئے لذت محسوس ہو رہا تھا۔ اور یوں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ جیسے واسکٹ اس کی اپنی ہو چکی ہو۔ بس قیمت ادا کرنے کی دیر تھی۔ دوکاندار سوا تین روپے پر مصر تھا۔ لیکن بڑی مشکل سے اس نے چھ آنے کی کمی کر ہی دی۔ جب اُس کے باپ نے قیمت ادا کرنے کے لئے پگڑی کے پلّو کو ہاتھ لگایا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی خچریں لکڑیوں سمیت کسی پہاڑی سے نیچے گہرائیوں میں جا گری ہوں۔ اس کے ہاتھ میں خالی پلّو کے سوا کچھ بھی نہ آسکا۔ ہکّا بکّا ہو کر پگڑی کو سر سے اتار کر وہ ایک ایک کونے کو دیکھنے لگا۔ لیکن وہ تو کسی ماں کے لال نے یوں ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔ کہ بس تو یہ ہی بھلی۔ دوکاندار نے جیب کتروں کو گالیاں دیتے ہوئے واسکٹ شہباز کے ہاتھ سے لے لی۔ شہباز دم بخود رہ گیا۔ اس کے منہ سے کچھ بھی نہ نکل سکا۔ البتہ اس کی انگلیاں ایک عجیب انداز میں ہل رہی تھیں . . . .

یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ کسان تحریک کے برخلاف
عام طور پر دو ہی قسم کے حربے استعمال ہوئے (۱) تشدد
(۲) غلط پروپیگنڈا۔ لیکن قدرت کاملہ کا یہ تکوینی اصول
ہے کہ جس طرح وہ آگ سے پانی اور پانی سے ہوا کو جن دیگر
کیفیتوں اور مزاجوں کو یکدم الٹ دیتا ہے۔ اسی طرح تشدد
سے انقلاب اور انقلاب سے پر امن دنیا بسا کر انسان
کے عمرانی جغرافیے کا بھی رنگ بدل دیتا ہے

(مولانا عبدالرحیم پوپلزئی)

مقالات

اورنگ زیب

صوبہ سرحد کے کسان اور سیاسی تحریکات

صوبہ سرحد کے محنت کشوں اور خاص طور پر کسانوں کی تحریکات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس صوبے کے زرعی نظام پر ایک نظر ڈالی جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے صوبہ کی کسی بھی حکومت نے اسباروہیں، عداد وشمار ٹھیک طرح سے کبھی نہیں چھاپے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ بڑے بڑے خانوں۔ درمیانے اور چھوٹے مالک کسانوں کے پاس کتنی زمین ہے۔ اس لئے مجھے اپنے تجربے سے ہی کام لینا پڑے گا۔ جو کسان کام کے دوران میں حاصل ہوا۔ اس لئے ظاہر ہے۔ کہ مضمون میں دیئے ہوئے اعداد وشمار بالکل صحیح تو نہیں ہوں گے۔ البتہ صحیح ہونے کے قریب ضرور ہوں گے

صوبہ سرحد کی اکیس[۲۱] لاکھ ایکڑ زمین کے ساٹھ فی صد حصہ پر براہ راست بڑے بڑے خانوں (لینڈ لارڈز) کا قبضہ ہے۔ جن میں چند بڑے بڑے خانوں کے نام یہ ہیں:- نواب ہوتی۔ نواب طورو۔ نواب ٹیری۔ نواب ٹانک۔ راجگانِ خانپور۔ خان گڑھی حبیب اللہ۔ خوانین پھلڑہ و پڑھنہ، خانانِ تنگی و عمرزئی۔ خانِ اگرہ وغیرہ ان خوانین کے پاس فی کس تین ہزار ایکڑ سے لے کر پندرہ ہزار ایکڑ زمین تک ہے۔ بقیہ چالیس فی صدی زمین درمیانے اور چھوٹے کسانوں کے قبضہ میں ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ بڑے خوانین اور درمیانے مالک کسان خود تو زمین کاشت نہیں کرتے۔ بلکہ مزارعین اور کھیت مزدوروں کے ذریعے سے کاشت کرواتے ہیں۔ میرے اندازہ کے مطابق اس صوبہ کی تیس لاکھ آبادی میں سے آدھی سے کچھ ہی کم آبادی ہمارے دیہات میں مزارعین یا کھیت مزدور

کی ہے۔ یہ مزارعین اور کھیت مزدور ان زمینوں پر نہایت ہی سخت شرائط پر محنت مشقت کرتے ہیں۔ کھیت مزدور کو صرف پندرہ روپیہ مہینہ اور معمولی کھانا ملتا ہے۔ اور کام کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ صبح منہ اندھیرے سے رات تک اسے بیل کی طرح جُتنا پڑتا ہے۔ اس پندرہ روپیہ کی قلیل ترین رقم میں اُسے اپنے کنبہ کا پیٹ بھی پالنا ہوتا ہے۔ میں نے کوئی ایسا کھیت مزدور نہیں دیکھا جسے کوئی بیماری نہ ہو۔ نیم فاقہ کشی نے اُن میں بیماریوں کے مقابلے کی طاقت باقی نہیں چھوڑی۔ اس قسم کے مزدوروں کی زیادہ تعداد ضلع پشاور اور مردان میں ہے۔ اور کسی طرح بھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم نہ ہو گی۔ اِن کے بعد مزارعین ہیں۔ موروثی اور غیر موروثی موروثی مزارعین کو خوانین زمین سے بے دخل نہیں کر سکتے۔ اگر خوانین زمین فروخت کر دیں تو وہ بھی اُسی زمین کے ساتھ فروخت ہو کر نئے خان کے مزارع ہو جاتے ہیں۔ انہیں زمین کی پیداوار کا کہیں نصف اور کہیں ⅓ حصّہ خان کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات میں مختلف قسم کے ٹیکس (جنہیں حبوبات کہا جاتا ہے) بھی خان کو ادا کرنا ہوتے ہیں۔ خاص خاص حبوبات یہ ہیں۔

ناظرانہ۔ انڈوک۔ شادی بیاہ کا ٹیکس یعنی شادیانہ۔ بکریوں کا ٹیکس۔ موٹرانہ وغیرہم کے علاوہ بیگار بھی۔ یہ حبوبات جہاں جہاں کسانوں کی تنظیم ہے۔ وہاں ختم ہو رہے ہیں۔ ان موروثی مزارعین کو خیل کار یا دفعتین۔ پانچ یا آٹھ کے مزارعین بھی کہا جاتا ہے بٹائی اور حبوبات کی ادائیگی کے بعد جو کچھ ان کے پاس بچتا ہے۔ وہ کسی بھی صورت میں پچیس تیس روپے ماہوار سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اِن مزارعین کی زیادہ تعداد ہزارہ۔ کوہاٹ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے اضلاع میں آباد ہے۔ ان کے بعد غیر موروثی دغیر خیل کار مزارعین ہیں جو تعداد میں موروثی مزارعین سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کے کھیت مزدور ہیں۔ اِن میں اور کھیت مزدوروں میں صرف اتنا فرق ہے۔ کہ آخر الذکر تنخواہ پر کام کرتے ہیں۔ اور یہ جنس کی شکل میں خان کو اگر بیل اور کھاد وغیرہ خود استعمال کریں تو نصف بٹائی دیتے ہیں۔ اور اگر بیل اور کھاد وغیرہ خان کی ہو تو پیداوار کا ⅔ حصّہ خان کو دیتے ہیں۔ خان جب اور جس وقت چاہے۔ انہیں زمین سے بے دخل کر سکتا ہے۔ ان کی آمدنی

بھی اوسطاً بیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں - ان کی حالت بھی کھیت مزدوروں کی طرح نہایت خستہ ہے - مالک کسانوں میں بہت زیادہ تعداد ایسے کسانوں کی ہے - جن کے پاس دو تین ایکڑ زمین ہے - ظاہر ہے - کہ اس زمین سے انہیں بہت کم آمدنی ہوتی ہے جس سے ان کے سال بھر کے کم سے کم اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے - اسی قسم کے چھوٹے مالک کسانوں کی بڑی تعداد زمینیں فروخت کرکے یا تو غیر موروثی مزارعین بن رہے ہیں یا شہروں میں جا کر مزدوری وغیرہ کرتے ہیں - اس پس منظر میں اگر آپ ہمارے دیہات کی حیثیت پر نظر ڈالیں گے - تو آپ کو معلوم ہوگا - کہ ہماری آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہے - اوسطاً بیس روپے ماہوار سے تو وہ اپنا پیٹ بھی نہیں پال سکتے ہیں بچوں کی تعلیم اور صحت کی حفاظت تو بہت دور کی باتیں ہیں - ایک طرف تو کسانوں کی مفلسی اور ناداری کی حالت یہ ہے - اور دوسری طرف ہماری زمین بالکل تباہ ہو چکی ہے خوانین زمین کی دیکھ بھال نہیں کرتے اور نہ ہی کر سکتے ہیں - اور مزارعین اول تو کھاد وغیرہ ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتے - اور یہ بھی کہ وہ اسے اپنی ملکیت نہیں سمجھتے - اس لئے زیادہ توجہ نہیں دیتے - نتیجہ ظاہر ہے کہ آج ہمارے یہاں فی ایکڑ پیداوار ساری دنیا سے کم ہے اور دن بدن اور کم ہو رہی ہے - اور وہ وقت دور نہیں - کہ یہ ملک جو گندم کا گھر سمجھا جاتا ہے غلہ باہر سے منگوائے گا - اور مفلسی زیادہ بڑھ جائے گی - ان حالات کی روشنی میں ہمیں اپنے صوبہ کی سیاسی تحریکات اور اُن کے عمل کا جائزہ لینا ہوگا - ہمارے صوبہ کی سب سے پرانی اور بڑی تحریک سرخپوشوں کی تھی - جنہوں نے پہلے پہل زیادہ تر دیہات کی تنظیم میں حصہ لیا - انھوں نے اپنی تقریروں اور اعلان ناموں میں خوانین کی مخالفت کی - لیکن اُن کی لیڈرشپ نے کہیں بھی بھول کر ٹھوس اور واضح صورت میں کسانوں اور مزارعین کو یہ نہیں بتایا - کہ وہ کس قسم کا نظام ہوگا - جس کے لئے جدوجہد کی جائے - زمین قومی ملکیت ہوگی یا نہیں - زرعی تبدیلیوں کی نوعیت کیا ہوگی - صرف خوانین کی مخالفت کا پروگرام ایک منفی بات تھی - سرخپوش لیڈرشپ نے زرعی نظام کے متعلق اس قسم کا طرز عمل کیوں اختیار کیا - اس لئے کہ خود سرخپوش لیڈرشپ خوانین

رکھی ہے۔ انھوں نے کسانوں کی خان دشمنی سے ضرور فائدہ اٹھایا۔ اس لیے اس سوال کو ہمیشہ گول مول رکھا۔ البتہ سیاسی اعتبار سے انھوں نے سامراج دشمنی کو مرکزی نعرہ بنا کر پورے اقتصادی مسئلہ کو اس کے ارد گرد اس مبہم طریق سے رکھا کہ عام کسانوں کو اس سے کافی دھوکا ہوا۔ اور جب کبھی کسانوں کی طرف سے بٹائی اور جوبات کی شکایات ان کے پاس پہنچتی تھی۔ تو انھیں یہ جواب مل جاتا کہ آزادی کے بعد سب تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ اس زمانے میں کسانوں کی اپنی بالغ نظر سیاسی اور اقتصادی تنظیم نہیں تھی جو اس سے پوچھتی کہ انگریز سے آزادی اس وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک دیسی سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ کی لوٹ کھسوٹ کو انگریزی استعمار کے ساتھ ساتھ ختم نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ کہ انگریزی شہنشاہیت اور دیسی جاگیردار سرمایہ دار ایک ہی تصویر کے دو بھیانک رخ ہیں۔ دونوں کا ایک ساتھ ختم ہونا ضروری ہے۔ بہرکیف ہمارے صوبہ کی کثیر آبادی نے اسی غلط پروپگنڈہ کا ساتھ دے کر سرخپوش لیڈرشپ کے ہاتھ میں عنان حکومت دلوادی ۱۹۳۷ء میں کانگرس وزارت قائم ہوئی۔ صوبہ بھر کے کسانوں نے امید بھرے جذبات سے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن انہوں نے اپنی حکمرانی کے دور میں کسانوں کے پورے مسئلے کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ظاہر ہے کہ سرخپوش لیڈرشپ کے اس طرز عمل سے کسانوں میں بے چینی پھیلی۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں ضلع مردان کے علاقہ علہ ڈھیر اور بعض آبادیوں کے کسانوں نے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اور بٹائی دینے سے انکار کیا۔ اور اسی طرح ہزارے میں علاقہ تنان اور کوہاٹ میں علاقہ ٹیری کے کسانوں نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا۔ کانگرس وزارت نے بڑی بے رحمی سے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ کوئی ڈھائی تین سو کسان گرفتار کئے گئے۔ اس تشدد کے باوجود کسان اپنے مطالبات پر ڈٹے رہے۔ لیکن کل ہند سوشلسٹ پارٹی کے لیڈروں نے یہاں آکر کسانوں اور حکومت کے درمیان ثالث بن کر ایک ایسا سمجھوتہ کرایا جس سے کسان تحریک کو بعد میں کافی نقصان ہوا۔ سرخپوش لیڈرشپ کی اس پالیسی سے خود سرخپوش جماعت کے اندر بھی اختلافات پیدا ہوگئے۔

ان اختلافات کی نوعیت دو طرح کی تھی - ایک گروپ جس میں غریب شہریوں اور غریب کسانوں کی اکثریت تھی - وہ سرخپوش لیڈرشپ سے مایوس ہو کر ایمانداری سے کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم چاہتے تھے - اس گروپ کی رہنمائی مولینا عبدالرحیم پوپلزئی خوشحال خان آف کوہاٹ اور ملک امیر عالم اعوان ایڈیٹر ترجمان سرحد پشاور کر رہے تھے انہوں نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی تشکیل کی - اس گروپ میں بھی اور اس سے باہر کچھ ایسے لوگ بھی تھے - جو سرخپوش لیڈرشپ سے بعض ذاتی باتوں کی وجہ سے ناراض تھے - اور وہ ہر اس جماعت میں شریک ہونا عین سعادت سمجھتے تھے - جو سرخپوش لیڈرشپ کی مخالفت کرتی ہو - اس قسم کے افراد کو سامنے رکھ کر سرخپوش لیڈروں نے پراپیگنڈا کا ایک طوفان کھڑا کیا - کہ بائیں بازو کی پارٹیاں تو محض ذاتی عناد کی وجہ سے ظہور میں آئی ہیں - بہرحال مولینا عبدالرحیم کے گروپ نے کسانوں کی اپنی طبقاتی تنظیم کے لئے بڑی محنت کی - غلہ ڈھیر - ہزارہ اور کوہاٹ کے کسانوں نے انہیں کی رہنمائی میں جدوجہد کی - لیکن اس گروپ نے جہاں کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو وہاں سیاسی اعتبار سے انہیں سرخپوشوں یا دوسرے الفاظ میں کانگریس کی سیاست کا ہی دُم چھلا رکھا - کسانوں کو خود ان کے اپنے طبقے کی سیاست سے روشناس نہ کیا - یہی وجہ تھی - کہ کسان تحریک کے اندر خود ان کی اپنی کوئی مضبوط لیڈرشپ پیدا نہ ہو سکی اور اس سارے دور میں کسان ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہے - کیونکہ ایک طرف تو ان کی حیثیت سرخپوش لیڈرشپ سے الگ ایک جنگی کیمپ کی تھی - اور دوسری طرف سیاسی اعتبار سے ایک ایسے حلیف کی تھی جو اپنا کوئی سیاسی پروگرام نہ رکھتا ہو - انہیں عملی طور سے اس صوبہ کی کسان تحریک کو باشعور اور طاقتور جماعت نہیں بننے دیا -

جنگ کے دوران میں سرخپوش لیڈرشپ کی پالیسی کے ماتحت کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے بھی سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا - اور ان کی سیاست نے ایک بار پھر انہیں کانگریس کی جھولی میں ڈال دیا - کسانوں اور مزدوروں کے مسائل ایک بار پھر کانگریس کی سرمایہ دارانہ سیاست کے نیچے دب گئے - اسی زمانہ میں صوبہ سرحد میں

کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل ہوئی کمیونسٹ پارٹی میں کانگرس سوشلسٹ پارٹی۔ فارورڈ بلاک اور کانگرس کے وہ نوجوان شریک ہوئے۔جوان گروپوں کی سیاست سے مایوس ہو چکے تھے۔ اور جو کسانوں اور مزدوروں کی باشعور سیاسی اور اقتصادی تنظیم چاہتے تھے۔گو کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی پالیسی سرخپوشوں کی سیاست کا دُم چھلا تو نہیں تھی۔لیکن لیگ کانگرس اتحاد کے نام پر ان کی پالیسی بھی اِس زمانے میں بہر حال امیروں اور خانوں ہی کی سیاست کا ایک حصّہ رہی۔ اور انہوں نے بھی اپنی ساری تخلیقی قوتیں سرمایہ دار سیاست کے قدموں میں ڈال دیں۔ لیگ اور کانگرس کے خان اگر متحد بھی ہو جاتے۔ تو عام محنت کشوں کو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ بلکہ نقصان ہی ہوتا۔ دونا خیرا اگر متحد ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ زیادہ دلیری سے لوٹیں گے۔چنانچہ اِس غلط پالیسی کی وجہ سے کسانوں کی تنظیم کو آگے نہ بڑھایا جا سکا۔

جنگ کے بعد کے دو سال یعنی ۱۹۴۶-۴۷ء ہمارے ملک میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اِن دو سالوں میں سارا ملک انقلاب کے دروازہ پر آکھڑا ہوا۔ جہازیوں کی بغاوت پولیس اور فوج کی ہڑتالوں کے ساتھ ساتھ مزدوروں اور کسانوں کی تحریکات نے برطانوی شہنشاہیت کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔ برطانوی شہنشاہیت دیسی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے عوام کی اِن انقلابی اور تخلیقی قوتوں کو ابھرتے دیکھ کر خیریت اسی میں سمجھی کہ آپس میں سمجھوتہ ہو جائے۔ تاکہ عوامی قوتیں اور آگے نہ بڑھ سکیں۔ماؤنٹ بیٹن ایوارڈ اسی انقلابی ہرکارڈ کا رد عمل تھا۔چنانچہ انگریزی استعمار نے دیسی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے اتحاد کر کے عارضی طور پر عوامی قوتوں کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔ اور آزادی بھیانک صورت میں ہمارے سروں پر مسلط ہو گئی۔قیام پاکستان کے بعد اِس نئی قسم کی آزادی کو جس انداز سے ہمارے امیر طبقوں نے عوام کے سامنے پیش کیا۔ ابتدائی دنوں میں اِس سے کافی غلط فہمیاں پھیلیں۔ پاکستان کی حکمران جماعت مسلم لیگ نے اسلامی حکومت اور مساوات کے جو راگ الاپے تھے۔ اُن سے یقیناً ہمارے عام کسان اپنے مذہبی عقیدے کی وجہ سے متاثر ہوئے۔گو عام کسانوں

کو مسلم لیگ لیڈر شپ نے کبھی مخاطب نہیں کیا۔ انہوں نے سرخپوش لیڈر شپ کی طرح خوانین کا دشمن پروپیگنڈا بھی نہیں کیا۔ کیونکہ لیگ میں وہ تمام بڑے بڑے خان شامل تھے اور آج بھی ہیں۔ جو انگریزوں کے دوست اور پٹھانوں کی ترقی کے مخالف تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ کسانوں کی اپنی الگ تنظیم کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کا اظہار آج ہم عملاً دیکھ رہے ہیں۔ مسلمانوں کے اتحاد کے نام پر موجودہ لیگی حکمران کسانوں کی تنظیم کو قانون اور پولیس کے ذریعہ دبانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اور دوسری طرف خانوں اور جاگیرداروں کو کھلی چھٹی مل گئی ہے۔ کہ وہ جیسے اور جس طرح چاہیں کسانوں کو لوٹیں۔ پچھلے دو سال میں غیر موروثی مزارعین کو خوانین نے اتنی بڑی تعداد میں بے دخل کیا ہے جس کی نظیر پچھلے پچاس سالوں میں نہیں ملتی۔ اور بٹائی اور جبوبات کی دھونس میں اس قدر دھاندلی مچائی ہے۔ کہ پورے صوبے کے دخیل کار اور غیر دخیل کار مزارعین اس ظلم سے تڑپ اٹھے ہیں۔ آخر کار کسانوں نے پچھلے سال ہزارہ کی تحصیل ہری پور، چارسدہ ہشت نگر اور کوہاٹ میں منظم طریق سے اس ظلم کا مقابلہ کیا اور بٹائی دینے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ حکومت نے پچھلے سال اس سلسلہ میں ایک ہزار سے زائد کسانوں کو گرفتار کر کے تین ماہ سے لے کر تین سال تک سزائیں دیں۔ چارسدہ ہشت نگر میں ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے مسلح فوج کو نہتے اور بے بس کسانوں کے خلاف استعمال کیا اور کئی مقامات پر کسان گولیوں کا نشانہ بنے۔ ایک طرف حکومت کا تشدد تھا۔ تو دوسری طرف مسلم لیگ کے کارکنوں نے کسانوں کے اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انہوں نے مہمند اور غیر مہمند کا سوال پیدا کر کے ہشت نگر میں پھوٹ ڈالنا چاہی۔ تاکہ مہمند اور ملکی کسان آپس میں متحد نہ ہوں۔ اس سوال کو بالکل ہندو مسلم سوال کی طرح پیش کیا گیا۔ انہوں نے ہری پور میں طاہر خیلی، تنولی، آوان اور ڈھونڈ قبیلوں کے کسانوں کو قبائلی نام پر بھڑکانے کی کوشش کی۔ اسلامی اور غیر اسلامی بحثیں شروع کیں۔ فتوے صادر کئے۔ اس کے باوجود کسان منظم ہو رہے ہیں۔ آج بھی صوبہ کی جیلوں میں ہر روز کسان قیدیوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ جو بٹائی اور جبوبات کے

ظلم کا مقابلہ انفرادی یا اجتماعی طور پر کر رہے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں میں آج صرف دو پارٹیاں ہیں۔ جو کسانوں میں کام کر رہی ہیں۔ ایک کیمونسٹ پارٹی اور دوسری مسلم لیگ مسلم لیگ کے کارکنوں کے کام کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ کہ ان کا یہ کام ہے کہ کسانوں اور محنت کشوں کو منظم نہ ہونے دیا جائے۔ دوسری طرف کیمونسٹ پارٹی اپنی طاقت اور لبساط کے مطابق ان کی تنظیم میں مصروفِ عمل ہے۔ اس صوبے میں آج کوئی کیمونسٹ لیڈر ایسا نہیں ہے جس کی گرفتاری کے وارنٹ حکومت نے جاری نہ کئے ہوں۔ شہری آزادی کے فقدان اور جبر و تشدد کے باوجود کیمونسٹ پارٹی کے کارکن صوبہ سرحد کے عوام کو بتا رہے ہیں۔ کہ موجودہ حکمران مالک اور جاگیردار طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کو بدلے بغیر ہمارے کسی مسئلے کا حل ممکن نہیں۔ اس صوبہ میں جب تک کسانوں مزدوروں اور پسے ہوئے درمیانے طبقوں کے نمائندوں پر مشتمل جمہوری حکومت نہیں بنتی۔ ہمارا زرعی اور بے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں صرف کیمونسٹ پارٹی نے ہی کسانوں کو بتایا۔ کہ حکومت کے تجویز کردہ زرعی بل اور مسلم لیگ کی زرعی سفارشات محض لیپ پوت ہے۔ جو اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتے ہیں۔ بلکہ اور پیچیدہ بناتی ہیں۔ دخیل کاروں کے حقوق ملکیت کے بارے میں کیمونسٹ پارٹی نے کسانوں کو بتایا۔ کہ حکومت صرف دو کنال زمین کی ملکیت انہیں دینا چاہتی ہے۔ باقی زمین کا یا انہیں معاوضہ دینا ہوگا۔ نہیں تو زمین خان کی ملکیت ہو جائے گی۔ آج اوسطاً موروثی مزارعین کے پاس بارہ کنال زمین ہے۔ اگر دس کنال زمین کا معاوضہ دخیل کار کو دینا پڑا۔ تو دخیل کاروں میں شاید ایک فی صدی بھی ایسے دخیل کار نہیں ہوں گے جو معاوضہ دینے کے قابل ہوں۔ اس لئے۔ دس کنال زمین لازماً خانوں کی ملکیت میں چلی جائے گی اور دخیل کار آخرکار اس دس کنال میں غیر دخیل کار مزارع بن کر ہی کام کر سکے گا۔ اور جو دو کنال زمین اُس کے پاس باقی بچے گی۔ وہ بھی اُس کے ہاتھوں سے آخرکار اس لئے نکل جائے گی۔ کہ اتنی زمین میں اس کا گزارہ ناممکن ہے۔ اور اس کی فروخت پر مجبور ہوگا دخیل کاروں کے ساتھ تو یہ سلوک ہوگا کہ غیر دخیل کاروں کو تو حکومت نے صاف

صاف کہہ دیا ہے۔ کہ بٹائی اور حبوبات دیتے جاؤ۔ اور اگر خان تمہیں بے دخل کرتا ہے۔ تو بلا چون و چرا بے دخل ہو جاؤ۔ اور کھیت مزدوروں کو تو حکومت شاید انسانوں میں شمار نہیں کرتی۔ پاکستان کی مضبوطی اور خوشحالی کے نعرہ باز حکمرانوں سے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے۔ کہ پاکستان کی اکثریتی صدی کسانوں کو بھوکا مار کر پاکستان کیسے مضبوط ہوگا۔ زمین کو قومی ملکیت بنائے بغیر کسانوں میں خوشحالی کیسے آئے گی۔ کھیت مزدوروں۔ صنعتی مزدوروں اور درمیانے طبقے کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کے بغیر مفلسی کیسے دور ہوگی۔ شہری آزادی اور محنت کشوں کی تنظیم کے بغیر جمہوریت کا قیام کیسے ممکن ہوگا۔ یہ سب ایسے سوالات ہیں جو ہمارے صوبہ کے محنت کشوں کو سوچنا ہونگے اور ان کا حل نکالنا ہوگا۔ اور ان کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی۔

★

اگر ہم سب خدا کے بندے ہیں تو اس کی زمین
کے ہم برابر کے حصہ دار ہیں

●

کسان کی بیداری جاگیرداری کی موت ہے

●

سید انصار ناصری دہلوی

سرحد کی موسیقی

یا قربان

داغی راغی چہ لنہی دالو

لنہی لا بنی دی دیار غم غلطونیہ

دھاڑ دھا دُھم نگڑ ، تن تا توم نگڑ !!

دھاڑ دھا دُھم نگڑ ، تن تا توم نگڑ !!

یا للعجب — ! یہ گانا ہے یا چنگھاڑنا ! اسی سے قلوب میں سوز و گداز پیدا ہوتا ہے ! کیا اسی سے روح میں سرمدی سوتے بیدار ہوتے ہیں ؟ ! نہ رنگ داری ، نہ نے کاری ۔ نہ تان نہ پلٹے نہ سُروادی نہ سم وادی نہ زمزمہ نہ گنگری نہ مینڈ نہ گمک ! ! سنگیت کے جتنے گُر یاد تھے سب ہی پرکھ دیکھے ، کسی پر بھی تو پورا نہیں اترتا ! آخر یہ ہے کیا بلا ! !

حیرت بجا اور تشویش درست ، ایسے کانوں کو جن میں برس ہا برس سے ہندوستانی بھیونؔ سنگیت کے میٹھے بول ، رسیلی تانیں ، کٹیلی ترکیبیں اور سہانے بھاؤ رچے بسے ہوں ، سرحدی نغموں کی یہ انجانی اچرج صدائیں ایسی ہی بے ہنگام ، لایعنی اور کڑھب معلوم ہونی چاہئیں لیکن انصاف شرط ہے ، اس میں دوش بے چاری پشتو موسیقی کا نہیں ، قصور ہے تو کچھ اپنی ہی ناواقفیت اور اس زبان سے اُس مکمل اجنبیت اور اَپرایت کا ہے ۔ جواب تک روا رکھی گئی پھر ایک عذر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پشتو موسیقی کو جاننے سمجھنے کے لئے اس سے کما حقہٗ لطف اندوز ہونے کے لئے محض زبان کا سمجھ لینا ہی کافی نہیں ۔ جب تک اس کے روزمرہ اور

خالصتاً ٹکسالی چیخارے اور اس کے بولنے برتنے والوں کے صحیح مزاج اور کردار سے واقفیت نہ حاصل کی جائے۔ اور جن مخصوص جغرافیائی، سیاسی، ملّی، معاشرتی اور مجلسی حالات میں اس زبان کا مزاج سمجھا جاتا ہے۔ اس کا لب و لہجہ ڈھلتا ہے، اس کے بولنے والوں کی مخصوص ذہنیت اور طبیعت کی ساخت پرداخت ہوتی ہے، جب تک یہ سب باتیں پوری طرح ذہن نشین نہ کر لی جائیں۔ پشتو موسیقی سے حظ اٹھانے، اس سے اثر پذیر ہونے کی تمام اوپری کوششیں بے سود رہیں گی۔ کیونکہ موسیقی کا تعلق براہ راست وجدان سے ہے۔ اور وجدان کچھ ایسا بے ڈھب ساگورکھ دھندا ہے۔ کہ شعوری اکتساب یا اقتباس کی قید و بند میں نہیں جکڑا جا سکتا۔ نہ سیکھنے سے آ سکتا ہے۔ نہ بتلانے سے۔ غرض جب یہ تا ممکن الحصول ٹھہرا، تو نتیجتہً یہ بھی لازم آنا چاہئے، کہ کوئی اجنبی پشتو موسیقی سے پوری طرح محظوظ نہیں ہو سکتا!! ـــ مگر یہ کچھ پشتو موسیقی ہی پر موقوف نہیں، انگریزی، روسی، چینی، برمی، سب ہی کی سنگیت کا یہی حال ہے۔ دراصل یہ امر مسلمات سے ہے کہ کسی ایک زبان کی موسیقی سے دوسری زبان والے اس حد تک سرور و سوز حاصل نہیں کر سکتے۔ جس حد تک کہ خود وہ حاصل کرتے ہیں۔ جن کی کہ موسیقی ہے، ممکن ہے اور بہت سی خارجی چیزوں میں ان سے برابر کی ٹکر لے سکیں۔ بلکہ خاص خاص حالات میں شاید ان سے بازی بھی لے جائیں، لیکن موسیقی ہی غالباً ایسی واحد چیز ہے جو کسی بھی خطہ زمین کے باشندوں کی خالصتاً اپنی ملکیت اور بلا شرکت غیرے ذاتی میراث ہے، اجنبیوں کے لئے اس کے قرار واقعی استلذاذ سے محروم رہنا ازل سے مقسوم ہے، یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ شبہ کی گنجائش ہی نہیں، اور اس کے اسباب و علل اس قدر صاف ہیں کہ یہاں ان کا اعادہ کرنا بھی تحصیل حاصل ہے

لیکن اس بظاہر ہمت شکن صورت حال کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ تلاش و طلب کی راہیں مستقل طور پر مسدود ہو جائیں۔ اور پشتو موسیقی ہمیشہ کے لئے سربستہ راز یا پڑی اچنبھے کی چیز ہی بنی رہے جسے ہم دور ہی دور سے کھڑے دیکھتے رہیں۔ کبھی وجدانی درماندگی کے بہانے کانوں پر ہاتھ رکھنے لگیں، اور کبھی خود ساختہ مشیخت کے زعم میں اس

پر ناک سکیں نہ نکیں، مکمل استلذاذ نہ سہی و اجبی استدراک تو ہو سکتا ہے، بحیثیت آرٹ اس کے اثر و سرور سے قطعی بے بہرہ رہیں۔ تو بحیثیت علم اس کے اصول و ضوابط سے تو کسی حد تک واقفیت ضرور پیدا کر سکتے ہیں۔ باریکیوں اور لطافتوں کو نہ سمجھ بوجھ سکیں، اس کی ترتیب و تشکیل سے متعلق موٹی موٹی باتیں تو جان پہچان سکتے ہیں۔ ذیل کا مضمون اسی سلسلے میں ایک حقیر کوشش ہے :-

شوق نے اکسایا، معلوم تو کریں اس دلاور قوم نے اپنی قلبی کیفیات اور لطیف احساسات کی ترجمانی کے لئے کس قسم کی موسیقی وضع کی ؟ اس کی جد و جہد سے لبریز، پر مشقت زندگی میں یہ موسیقی کس حد تک سکون و راحت بہم پہنچاتی ہے ؟ تمدنی اعتبار سے موسیقی کے بارے میں عام رجحانات کیا ہیں ؟ مجلسی زندگی میں عام طور پر کن کن مواقع پر التزاماً گانا بجانا ضروری سمجھا جاتا ہے ؟ انفرادی طور پر جب ایک پٹھان کے دل کے سوتوں سے جذبات کی دھارا امڈتی ہے۔ تو سوز و گداز کی کونسی لے اسے متشکل کرتی ہے طرب و اندوہ کے کون سے سُر اس آہنگ کے متحمل ہوتے ہیں ؟ سُر، تال، اور بول کی ترتیب و تقسیم کس نظام کے تحت ہے ؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہیں ؟ ہندوستانی سنگیت سے یہ اصول کس حد تک مائل یا مختلف ہیں ؟ پشتو موسیقی کی قدیم شکل کیا تھی۔ تدریجی ارتقا کس طرح ہوا۔ مروجہ ڈھنگ کیسا ہے ؟ آیندہ کے لئے ترقی اور اپج کی کون کون سی راہیں کھلی جا رہی ہیں ؟ غرض اسی قبیل کے سوالات نے دل میں طالب علمانہ شوق اور امنگ پیدا کی، چنانچہ شغف اور انہماک کے ساتھ تلاش شروع ہوئی ۔

سب سے پہلے تو اس حوصلہ شکن محرومی کا سامنا کرنا پڑا کہ پشتو موسیقی کے بارے میں آج تک کسی زبان میں ایک حرف بھی نہیں لکھا گیا ماسوا اس ایک پیراگراف کے جو آرکسٹرا کی تعریف میں پشتو انسائیکلوپیڈیا یا پشتو دائرۃ المعارف (مطبوعہ کابل) میں مندرج ہے جس کی اب تک دو جلدیں آریانہ کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ اور جن میں صرف الف کی ذیل میں آنے والے الفاظ ہیں۔ اس پیراگراف کا اردو ترجمہ سازوں کے بیان میں پیش کیا جائے گا۔

پشتو میں تو کیا کوئی کتاب یا مضمون وغیرہ ہوتا کہ اس زبان میں تصنیف و تالیف کی حالت ویسے ہی ناگفتہ بہ ہے۔ پشتو ادب کی تاریخ بھی سب سے پہلے انگریزی ہی میں لکھی گئی، اسی طرح پشتو ادب کے دوسرے تاریخی پہلوؤں پر بھی جو کچھ کیا مغربی مصنفین ہی نے تحقیق و تدقیق کی (ان میں ڈاکمن، ڈارن، ٹرمپ، تھاربرن، ڈارلی وغیرہ کی تصنیفات مستند مانی جاتی ہیں) لیکن انگریزی میں بھی موسیقی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ اور نہ اردو میں، غرض اس اعتبار سے اس اچھوتے موضوع پر یہ پہلی تحریر ہے جس لائق بھی ہے۔ چونکہ پہلے سے کوئی مواد موجود نہ تھا جس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے یا اپنی تحقیق کا تقابل ہی ہو سکتا۔ اس لئے خالص نظریاتی لحاظ سے اس مضمون کا خامیوں سے مبرا ہونا ممکن نہیں۔ اس کا مجھے پہلے ہی سے احساس ہے۔

غرض اس طرف سے محروم و مایوس ہو چکنے کے بعد دوسری راہ یہی ہو سکتی تھی کہ ذاتی طور پر از سر نو تحقیق و تدقیق کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد سے کاملینؒ سے رجوع کیا۔ بزرگوں کے روبرو بار بار زانوئے ادب تہہ کیا۔ دوستوں اور رفیقوں سے مسلسل و پیہم مشورے کئے ہر ملک سے پوچھا گچھا، لیکن جلد ہی یہ تلخ حقیقت منکشف ہو گئی کہ پشتو موسیقی کے بارے میں امنگ سے جتنی امیدیں وابستہ کر دی تھیں، سب کالعدم اور ہیچ! شوق نے جتنے سوالات کئے تھے۔ ان کے شافی جوابات حاصل کرنے کی ساری آرزوئیں خاک اور ملیامیٹ!! پشتو موسیقی کوئی گھڑا گھڑایا علم نہیں جس کے بارے میں افہام و تفہیم ہو سکے۔ پھر التزاماً اس کا جاننا اور سمجھنا تو کجا یہاں تو معمولی شد بد سے بھی دانستہ احتراز کیا جاتا ہے، پشتو ادب کے اچھے اچھے جید عالموں، پرانی اور نئی طرز کے ادیبوں، شیوہ بیان شاعروں، صاحب بصیرت مفکروں اور دیگر اہل ذوق اور علم دوست حضرات سے استفسار کیا، غرض جس جس سے بھی جائز طور پر توقع ہو سکتی تھی۔ کہ اس فن لطیف کے بارے میں کچھ علم رکھتے ہوں گے۔ بار بار پوچھا گچھا لیکن یہ دیکھ کر حیرت سی حیرت ہوئی، کہ پڑھے لکھے طبقے میں موسیقی کی طرف سے اس قدر شدید عدم توجہی اور غفلت برتی جاتی ہے، کہ اس کی الف بے تے سے بھی کوئی واقف نہیں۔ اور جو واقف ہیں، فن کی حیثیت سے اسے برتتے ہیں۔ اس میں کمال رکھتے ہیں۔ ان کی

علمیت کے خانے ایسے بٹم ہیں کہ کچھ بتا نہیں سکتے۔ خود نہیں جانتے کیا بجا رہے ہیں، کیا گا رہے ہیں، عام طور پر اس فن کے کرنے والے سوسائٹی کے ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو پست اور ذلیل ترین سمجھا جاتا ہے۔ اکا دکا شاید حرف شناس ہو۔ ورنہ عام فن کار جاہل اور ان پڑھ ہیں۔ ان میں سے بہت سے استادانِ فن کے ساتھ بھی سر پٹخ پٹخ کر دیکھ لیا۔ خاک بھی پلے نہیں پڑا۔ غرض اجنبی کے لئے پشتو موسیقی کے حصول میں یہی تخس گورکھ دھندا سامنے آتا ہے۔ کہ "جو جانتے ہیں وہ بتا نہیں سکتے۔ اور جو بتا سکتے ہیں وہ جانتے نہیں۔"

اس بارے میں اپنے فاضل دوست پشتو کے ادیب شہیر خان سمندر خان سمندر بدرشوی (جنہوں نے پشتو شاعری کو اپنی جودت طبع سے فکر و بیان کے نئے نئے اسالیب بخش کر اسے اوج کمال تک پہنچایا) کی نصیحت میرے دل کو لگی ۔"کچھ تو بھی اس تردد کو پشتو موسیقی موجودہ حیثیت میں اس لائق نہیں کہ علمی بحث و تحیص کی متحمل ہو سکے، فن کے طور پر بھی مکمل نہیں۔ بلکہ اپنی نیم بحت حالت میں ارتقاء کے متعدد و مختلف حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے اور اپنی بقا کے لئے قوم کی توجہ کو ترس رہی ہے، جو اسے آج تک میسر نہ آسکی اور واقعہ یہ ہے کہ ایسی بدنصیب و نیم متمدن قوم کو جسے صدیوں کی بیرونی آویزشوں اور اندرونی علائق نے کبھی اتنی مہلت بھی نہ دی کہ تعلیم جیسی اشد ضروری چیز سے بہرہ مند ہو کر تنظیم کے ساتھ اپنی مادی ترقی کی طرف متوجہ ہو سکتی۔ بھلا کہاں اتنی فراغت نصیب ہوتی کہ موسیقی یا دیگر فنونِ لطیفہ جیسی آرائشی اور فی الجملہ ثانوی حیثیت کی چیزوں کی ترتیب و ترویج کی طرف مائل ہوتی۔"

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ یہاں موسیقی سے کسی کو سرے سے مس ہی نہیں، من حیث القوم پٹھان گانے بجانے کے اتنے ہی رسیا ہیں، جتنی کوئی اور قوم بلکہ اس لحاظ سے کہ دلچسپی کے دیگر اسباب یہاں میسر نہیں۔ اوروں کی نسبت اس طرف کچھ زیادہ ہی شغف پایا جاتا ہے۔ شادی، بیاہ، رسم تہوار، کوئی موقع ایسا نہیں جہاں اس کے خوب خوب چرچے نہ ہوتے ہوں۔ کوئی حجرہ بغیر رباب، گھڑا اور ڈھول کے مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ عام پٹھان گانے بجانے کا دل سے والا و شیدا ہے۔ اور یہ صرف ضرب المثل ہی

ہیں بلکہ واقعتاً ایک عام پٹھان کی ساری زندگی مَحد سے لے کر لَحد تک گانے بجانے کے ان گنت مواقع سے پٹی ہوئی ہے لیکن یہ تعلق سطحی ہے۔ عمیق نہیں، رسمی ہے، عملی نہیں اس کے طور پر موسیقی کو شوقیہ طریقے پر برتنا، دل بہلاوے کا ذریعہ سمجھ کر اس سے عملی دلچسپی لینا قدیم رواج کے مطابق اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ اتنا ہی برا سمجھا جاتا ہے جتنا "پیشے" کے طور پر اسے ذریعہ معاش بنانا۔ پٹھان سوسائٹی میں بڑے سے بڑے عیبی کو بھی شاید اتنی ہی حقارت سے دیکھا جاتا ہے یقیناً کسی گانے یا بجانے والے کو جسے عرف عام میں "ڈم" یا "ڈوم" (یعنی نائی) کہا جاتا ہے (موسیقی سے تعلق کی وجہ سے خود بچارے ریڈیو پاکستان کو اکثر نام نہاد ثقہ حضرات اب تک "دَ ڈمانو محکمہ" (ڈوموں کا محکمہ) سے مفتخر فرماتے رہے) عام طور پر گانے بجانے کا ذلیل اور گھناؤنا کام "قدیم دستور" کے مطابق نائی یا اسی قسم کمین لوگوں کے ذمے سمجھا جاتا ہے۔ شادی بیاہ، عقیقہ، ختنے وغیرہ کی تقاریب میں نائی بجا دیگر خدمات بجا لانے کے علاوہ عند الضرورت گا "بھی لیتا ہے کیا گاتا ہے، کس طرح گاتا ہے؟ یہ جاننے کی کسی نے پرواہ نہیں کی، اور نہ کبھی ضرورت ہی ہوئی، بالکل ایسے ہی، جیسے یہ جاننے کی کبھی ضرورت نہ سمجھی جائے کہ وہ حجامت کس طرح بناتا ہے، اس کے سب ہی کام یکساں طور پر ذلیل، ناقابل توجہ اور وہ خود راندۂ درگاہ!

موسیقی سے اس درجہ رواجی تنافر اور تنگ نظری کے اسباب بظاہر مذہب کے ان شدید اور غلو آمیز اثرات کے اور کچھ نظر نہیں آتے، جو سرحد کے تمدن کی ہر صنف و کیف پر عرصہ دراز سے طاری و ساری ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا عبد الخالق صاحب خلیق (جو اپنی فضیلت کے باعث پشتو ادبی حلقوں میں خاص عظمت و شہرت کے مالک ہیں) نے متعدد استفسارات کے جواب میں اپنے مفید مشوروں سے نوازتے ہوئے برسبیل تذکرہ ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ سننے کے لائق ہے :-

" اب سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے پشاور سے ملحقہ ایک قصبہ[کے] میں . . . . خان صاحب[سلہ] جو حضرت[سلہ] . . . کے مرید تھے کے ہاں کوئی خوشی کی تقریب

[illegible]

تھی۔ جشن انبساط انہی طریقوں پر منایا گیا۔ جو دستور کے مطابق ثقہ لوگوں کے نزدیک جائز و روا سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً بے شمار دُنبے ذبح کیے گئے، کئی کئی روز تک ملاؤں اور یتیموں کو کھلائے گئے، احبا اور اعزا کی پُرتکلف دعوتیں ہوئیں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا، غرض دھوم دھڑکے کے سب ہی سامان ہوئے نہ ہوا تو ایک گانا بجانا۔ بعض منچلے نوجوانوں کو مزامیر کے بغیر یہ محفلیں بے رنگ سونی سونی اور ویران معلوم ہوئیں۔ چنانچہ انہوں نے گانے والوں کے ایک طائفے کو جو تھوڑی بھی انعام و اکرام کی لالچ میں مبارکبادیاں اور شادیانے گانے پر بعند تھا، لیکن ..... خان صاحب کے ڈر سے رسائی نہ پاتا تھا، چپکے سے بلا بھیجا، اور اپنی الگ محفل جما کر سماع کا لطف اٹھانے لگے۔ خان صاحب کو بھی پتہ لگ گیا۔ بہت ناراض ہوئے، لیکن جب دیکھا کہ کمبخت آہی گئے اور مبارکبادیاں گانے ہی لگے۔ تو کنبے کے بچوں کی معصوم سی خوشی کی خاطر بزرگانہ شفقت سے خاموش ہو گئے، اور طائفہ کو انعام وغیرہ دے کر جلد ہی رخصت کر دیا، بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن دوسرے دن دیکھتے کیا ہیں کہ حضرتؒ کے مریدوں اور حواریوں کا ایک گروہ جریب و عصا سے مسلح، غضبناک و خشمگیں انداز میں چلاتا۔ نعرے لگاتا ..... خانصاحب کی حویلی کا محاصرہ کر رہا ہے، اور بعند ہے کہ چونکہ اس مکان میں گانے جیسی ناپاک و ناجائز حرکت ہوئی ہے۔ اس لئے طہارت و پاکیزگی کی خاطر حویلی کو جلا کر خاکستر کر دینا ازبس ضروری ہے، ورنہ ___ خانصاحب پر کفر کا فتوی لگا دیا جائے گا، ہزار ہزار طریقے سے سمجھایا گیا، معافیاں مانگی گئیں، لیکن بے سود، آخر خان صاحب کو بھی غصہ آگیا۔ اور بگڑ بیٹھے، مریدین بھی سخت سست کہتے روانہ ہو گئے، بعد میں خان صاحب کے حواریوں اور دوستوں نے جب دیکھا کہ بات کا بتنگڑ بنتا چلا جا رہا ہے اور نوبت اچھی خاصی جنگ تک پہنچتی نظر آتی ہے۔ تو انھوں نے خانصاحب کو سمجھایا بجھایا، اور اس فتنے کے دُور رس نتائج سے آگاہ کر کے انہیں راضی کر لیا

کو مریدین کو خوش کر دینا ہی مناسب ہے، ناچار خانصاحب مان گئے، ادھر بھاگم بھاگ
مریدین کو منا کر واپس بلایا گیا۔ انہوں نے اتنی رعایت برتی کہ حویلی میں نہ سہی
کسی ایسے مکان میں آگ لگا دی جائے جسے خانصاحب خود تجویز کریں، ساتھ
ہی دو مویشی ذبح کئے جائیں، چنانچہ دو مویشی فوراً ذبح کئے گئے، اور ایک کا جھونپڑا
یا حاطہ فی الفور نذر آتش کر دیا گیا۔ بعد ازاں چاول وغیرہ فراہم کر کے دعوت
کا بھی سامان کر دیا گیا جس میں مریدین نے شرکت کرنے سے انکار کیا کہ بدنامی
کا باعث ہوگا۔ لیکن بہر طور انہیں شریک کیا گیا۔ جب مریدین رخصت ہونے
لگے۔ تو انہوں نے خانصاحب کا بے حد شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ اس علاقے
کے سربرآوردہ سردار ہیں۔ آپ نے ہمارا کہا مان کر گویا شریعت کی عزت رکھ
لی، اب باقی سب لوگ بھی آپ کی دیکھا دیکھی گانے بجانے سے پرہیز کریں گے
آج آپ کہا نہ مانتے تو یہ مذموم شئے رواج پکڑتی جاتی "

ایک یہ نہیں ایسے متعدد واقعات سرحد کے مختلف مقامات سے منسوب ہیں، جن سے
مختلف طریق پر گانے بجانے سے اجتناب و پرہیز کی تلقین و تاکید عیاں ہے۔ اس کی وجہ
جواز یا عدم جواز بیان کرنا یا تاریخی نظائر سے اس کی اچھائی برائی ثابت کرنا، جداگانہ بحث
ہے۔ اور اس مضمون کے احاطے سے باہر۔ میری غرض اس نوع واقعہ کے اظہار سے صرف اس
قدر تھی۔ کہ جو اصحاب سرحدی تمدن کے پس منظر سے بخوبی روشناس نہیں۔ ان پر یہ مسلم
حقیقت واضح ہو جائے کہ موسیقی کے فروغ میں منجملہ دیگر اسباب کے یہاں کا برتھا ہوا مذہبی
ماحول اور اس کا غلو آمیز رنگ بڑی حد تک مانع رہا۔ سنجیدہ طبائع نے اس کی طرف سے
مکمل بے رخی اختیار کر لی، البتہ ایسے لوگ جنہیں نام و نمود یا رسوائی جگ ہنسائی کا چنداں
خیال نہیں تھا۔ اس کی طرف بدستور مائل رہے، امتداد زمانہ سے رفتہ رفتہ یہ صرف انہی کی میراث
اور پیسہ کمانے کا ذریعہ بنتا چلا گیا اور اب بھی ہے۔ اب اکثر افراد اس سے یوں پرہیز واجب
سمجھتے ہیں، کہ "میراثیوں" اور "ڈوموں" کی طویل و مسلسل اجارہ داری کے باعث خود فن بھی
غیر دقیع ہو کر رہ گیا ہے۔ کم و بیش ایسی ہی کیفیت اوائل میں ہندوستان کی مسلم

کی ہے۔ یہ مزارعین اور کھیت مزدور اِن زمینوں پر نہایت ہی سخت شرائط پر محنت مشقت کرتے ہیں۔ کھیت مزدور کو صرف پندرہ روپیہ مہینہ اور معمولی کھانا ملتا ہے۔ اور کام کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ صبح منہ اندھیرے سے رات تک اسے بیل کی طرح جُتنا پڑتا ہے۔ اس پندرہ روپیہ کی قلیل ترین رقم میں اُسے اپنے کنبہ کا پیٹ بھی پالنا ہوتا ہے۔ میں نے کوئی ایسا کھیت مزدور نہیں دیکھا جسے کوئی بیماری نہ ہو۔ نیم فاقہ کشی نے اُن میں بیماریوں کے مقابلے کی طاقت باقی نہیں چھوڑی۔ اس قسم کے مزدوروں کی زیادہ تعداد ضلع پشاور اور مردان میں ہے۔ اور کسی طرح بھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ اِن کے بعد مزارعین ہیں۔ موروثی اور غیر موروثی موروثی مزارعین کو خوانین زمین سے بے دخل نہیں کر سکتے۔ اگر خوانین زمین فروخت کر دیں تو وہ بھی اُسی زمین کے ساتھ فروخت ہو کر نئے خان کے مزارع ہو جاتے ہیں۔ انہیں زمین کی پیداوار کا کہیں نصف اور کہیں ⅓ حصّہ خان کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات میں مختلف قسم کے ٹیکس (جنہیں جبوبات کہا جاتا ہے) بھی خان کو ادا کرنا ہوتے ہیں۔ خاص خاص جبوب یہ ہیں:۔

ناظرانہ۔ انڑوک۔ شادی بیاہ کا ٹیکس یعنی شادیانہ۔ بکریوں کا ٹیکس۔ موٹرانہ وغیرہم کے علاوہ بیگار بھی۔ یہ جبوبات جہاں جہاں کسانوں کی تنظیم ہے۔ وہاں ختم ہو رہے ہیں۔ ان موروثی مزارعین کو خیل کار یا دفعہ تین۔ پانچ یا آٹھ کے مزارعین بھی کہا جاتا ہے بٹائی اور جبوبات کی ادائیگی کے بعد جو کچھ ان کے پاس بچتا ہے۔ وہ کسی بھی صورت میں پچیس تیس روپے ماہوار سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اِن مزارعین کی زیادہ تعداد ہزارہ۔ کوہاٹ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے اضلاع میں آباد ہے۔ ان کے بعد غیر موروثی دغیر خیل کار مزارعین ہیں جو تعداد میں موروثی مزارعین سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کے کھیت مزدور ہیں۔ اِن میں اور کھیت مزدوروں میں صرف اتنا فرق ہے۔ کہ آخر الذکر تنخواہ پر کام کرتے ہیں۔ اور یہ جنس کی شکل میں خان کو اگر بیل اور کھاد وغیرہ خود استعمال کریں تو نصف بٹائی دیتے ہیں۔ اور اگر بیل اور کھاد وغیرہ خان کی ہو تو پیداوار کا ⅔ حصّہ خان کو دیتے ہیں۔ خان جب اور جس وقت چاہے۔ انہیں زمین سے بے دخل کر سکتا ہے۔ ان کی آمدنی

بھی اوسطاً بیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ۔ ان کی حالت بھی کھیت مزدوروں کی نہایت خستہ ہے ۔ مالک کسانوں میں بہت زیادہ تعداد ایسے کسانوں کی ہے ۔ جن کے پاس دو تین ایکڑ زمین ہے ۔ ظاہر ہے ۔ کہ اس زمین سے انہیں بہت کم آمدنی ہوتی ہے جس سے ان کے سال بھر کے کم سے کم اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے ۔ اسی قسم کے چھوٹے مالک کسانوں کی بڑی تعداد زمینیں فروخت کرکے یا تو غیر موروثی مزارعین بن جاتے ہیں یا شہروں میں جاکر مزدوری وغیرہ کرتے ہیں ۔ اس پس منظر میں اگر آپ ہمارے دیہات کی حیثیت پر نظر ڈالیں گے ۔ تو آپ کو معلوم ہوگا ۔ کہ ہماری آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہے ۔ اوسطاً بیس روپے ماہوار سے تو وہ اپنا پیٹ بھی نہیں پال سکتے ہیں بچوں کی تعلیم اور صحت کی حفاظت تو بہت دور کی باتیں ہیں ۔ ایک طرف تو کسانوں کی مفلسی اور ناداری کی حالت یہ ہے ۔ اور دوسری طرف ہماری زمین بالکل تقسیم ہو چکی ہے خوانین زمین کی دیکھ بھال نہیں کرتے اور نہ ہی کر سکتے ہیں ۔ اور مزارعین اول تو کھاد وغیرہ ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتے ۔ اور یہ بھی کہ وہ اسے اپنی ملکیت نہیں سمجھتے ۔ اس لئے زیادہ توجہ نہیں دیتے ۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آج ہمارے یہاں فی ایکڑ پیداوار ساری دنیا سے کم ہے اور دن بدن اور کم ہو رہی ہے ۔ اور وہ وقت دور نہیں ۔ کہ یہ ملک جو گندم کا گھر سمجھا جاتا ہے غلہ باہر سے منگوائے گا ۔ اور مفلسی زیادہ بڑھ جائے گی ۔ ان حالات کی روشنی میں ہمیں اپنے صوبہ کی سیاسی تحریکات اور ان کے عمل کا جائزہ لینا ہوگا ۔ ہمارے صوبہ کی سب سے پرانی اور بڑی تحریک سرخپوشوں کی تھی ۔ جنہوں نے پہلے پہل زیادہ تر دیہات کی تنظیم میں حصہ لیا ۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور اعلان ناموں میں خوانین کی مخالفت کی ۔ لیکن ان کی لیڈرشپ نے کہیں بھی بھول کر بھی واضح صورت میں کسانوں اور مزارعین کو یہ نہیں بتایا ۔ کہ وہ کس قسم کا نظام ہوگا ۔ جس کے لئے جدوجہد کی جائے ۔ زمین قومی ملکیت ہوگی یا نہیں ۔ زرعی تبدیلیوں کی نوعیت کیا ہوگی ۔ صرف خوانین کی مخالفت کا پروگرام ایک منفی بات تھی ۔ سرخپوش لیڈرشپ نے زرعی نظام کے متعلق اس قسم کا طرز عمل کیوں اختیار کیا ۔ اس لئے کہ خود سرخپوش لیڈرشپ خوانین

رہی کی ہے۔ انھوں نے کسانوں کی خان دشمنی سے ضرور فائدہ اٹھایا۔ اس لئے اس سوال کو ہمیشہ گول مول رکھا۔ البتہ سیاسی اعتبار سے انھوں نے سامراج دشمنی کو مرکزی نعرہ بنا کر پورے اقتصادی مسئلہ کو اس کے اردگرد اس مبہم طریق سے رکھا۔ کہ عام کسانوں کو اس سے کافی دھوکا ہوا۔ اور جب کبھی کسانوں کی طرف سے بٹائی اور جوبات کی شکایات ان کے پاس پہنچتی تھی۔ تو انہیں یہ جواب مل جاتا۔ کہ آزادی کے بعد سب تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ اس زمانے میں کسانوں کی اپنی بالغ نظر سیاسی اور اقتصادی تنظیم نہیں تھی جو ان سے یہ کہتی۔ کہ انگریز سے آزادی اس وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک دیسی سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ کی لوٹ کھسوٹ کو انگریزی استعمار کے ساتھ ساتھ ختم نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ کہ انگریزی شہنشاہیت اور دیسی جاگیردار سرمایہ دار ایک ہی تصویر کے دو بھیانک رخ ہیں۔ دونوں کا ایک ساتھ ختم ہونا ضروری ہے۔ بہرکیف ہمارے صوبہ کی کثیر آبادی نے اس نئی پروگرام کا ساتھ دے کر سرخپوش لیڈرشپ کے ہاتھ میں عنان حکومت دلوادی۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس وزارت قائم ہوئی۔ صوبہ بھر کے کسانوں نے امید بھرے جذبات سے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن انہوں نے اپنی حکمرانی کے دور میں کسانوں کے پورے مسئلے کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ظاہر ہے کہ سرخپوش لیڈرشپ کے اس طرز عمل سے کسانوں میں بے چینی پھیلی۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں ضلع مردان کے علاقہ غلہ ڈھیر اور مفتی آباد میں کسانوں نے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اور بٹائی دینے سے انکار کیا۔ اور اسی طرح ہزارہ میں علاقہ کاغان اور کوہاٹ میں علاقہ ٹیری کے کسانوں نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا۔ کانگریس وزارت نے بڑی بے رحمی سے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ کوئی ڈھائی تین سو کسان گرفتار کئے گئے۔ اس تشدد کے باوجود کسان اپنے مطالبات پر ڈٹے رہے۔ لیکن کل ہند سوشلسٹ پارٹی کے لیڈروں نے یہاں آکر کسانوں اور حکومت کے درمیان ثالث بن کر ایک ایسا سمجھوتہ کرایا جس سے کسان تحریک کو بعد میں کافی نقصان ہوا۔ سرخپوش لیڈرشپ کی اس پالیسی نے خود سرخپوش جماعت کے اندر بھی اختلافات پیدا کئے۔

ان اختلافات کی نوعیت دو طرح کی تھی - ایک گروپ جس میں غریب شہریوں اور غریب کسانوں کی اکثریت تھی۔ وہ سرخپوش لیڈرشپ سے مایوس ہو کر ایمانداری سے کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم چاہتے تھے۔ اس گروپ کی رہنمائی مولینا عبدالرحیم پوپلزئی خوشحال خان آف کوہاٹ اور ملک امیر عالم اعوان ایڈیٹر ترجمان سرحد پشاور کر رہے تھے انہوں نے کانگرس سوشلسٹ پارٹی کی تشکیل کی - اس گروپ میں بھی اور اس سے باہر کچھ ایسے لوگ بھی تھے - جو سرخپوش لیڈرشپ سے بعض ذاتی باتوں کی وجہ سے ناراض تھے - اور وہ ہر اس جماعت میں شریک ہونا عین سعادت سمجھتے تھے - جو سرخپوش لیڈرشپ کی مخالفت کرتی ہو - اس قسم کے افراد کو سامنے رکھ کر سرخپوش لیڈروں نے پراپیگنڈا کا ایک طوفان کھڑا کیا - کہ بائیں بازو کی پارٹیاں تو محض ذاتی عناد کی وجہ سے ظہور میں آئی ہیں - بہرحال مولینا عبدالرحیم کے گروپ نے کسانوں کی اپنی طبقاتی تنظیم کے لئے بڑی محنت کی - ملہ ڈھیر ہزارہ اور کوہاٹ کے کسانوں نے انہیں کی رہنمائی میں جدوجہد کی - لیکن اس گروپ نے جہاں کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی سیاسی اعتبار سے انہیں سرخپوشوں یا دوسرے الفاظ میں کانگرس کی سیاست کا ہی دُم چھلا رکھا - کسانوں کو خود اُن کے اپنے طبقے کی سیاست سے روشناس نہ کیا - یہی وجہ تھی - کہ کسان تحریک کے اندر خود اُن کی اپنی کوئی مضبوط لیڈرشپ پیدا نہ ہو سکی اور اس سارے دور میں کسان ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہے - کیونکہ ایک طرف تو اُن کی حیثیت سرخپوش لیڈرشپ سے الگ ایک جنگی کیمپ کی تھی - اور دوسری طرف سیاسی اعتبار سے ایک ایسے حلیف کی تھی جو اپنا کوئی سیاسی پروگرام نہ رکھتا ہو - انہیں عناصر نے اس صوبہ کی کسان تحریک کو باشعور اور طاقت ور جماعت نہیں بننے دیا -

جنگ کے دوران میں سرخپوش لیڈرشپ کی پالیسی کے ماتحت کانگرس سوشلسٹ پارٹی نے بھی سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا - اور ان کی سیاست نے ایک بار پھر انہیں کانگرس کی جھولی میں ڈال دیا - کسانوں اور مزدوروں کے مسائل ایک بار پھر کانگرس کی سرمایہ دارانہ سیاست کے نیچے دب گئے - اسی زمانہ میں صوبہ سرحد میں

کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل ہوئی۔ کمیونسٹ پارٹی میں کانگرس سوشلسٹ پارٹی۔ فارورڈ بلاک اور کانگرس کے وہ نوجوان شریک ہوئے۔ جو ان گروپوں کی سیاست سے مایوس ہو چکے تھے۔ اور جو کسانوں اور مزدوروں کی باشعور سیاسی اور اقتصادی تنظیم چاہتے تھے۔ گو کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی پالیسی سرخپوشوں کی سیاست کا دم چھلا تو نہیں تھی۔ لیکن لیگ کانگرس اتحاد کے نام پر ان کی پالیسی بھی اس زمانے میں بہرحال امیروں اور خانوں ہی کی سیاست کا ایک حصہ رہی۔ اور انہوں نے بھی اپنی ساری تخلیقی قوتیں سرمایہ دار سیاست کے قدموں میں ڈال دیں۔ لیگ اور کانگرس کے خان اگر متحد بھی ہو جاتے۔ تو عام محنت کشوں کو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ بلکہ نقصان ہی ہوتا۔ دونوں خواہ اگر متحد ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ زیادہ دلیری سے لوٹیں گے۔ چنانچہ اس غلط پالیسی کی وجہ سے کسانوں کی تنظیم کو آگے نہ بڑھایا جا سکا۔

جنگ کے بعد کے دو سال یعنی ۱۹۴۶-۴۷ء ہمارے ملک میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان دو سالوں میں سارا ملک انقلاب کے دروازہ پر آ کھڑا ہوا۔ جہازیوں کی بغاوت پولیس اور فوج کی ہڑتالوں کے ساتھ ساتھ مزدوروں اور کسانوں کی تحریکات نے برطانوی شہنشاہیت کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔ برطانوی شہنشاہیت دیسی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے عوام کی ان انقلابی اور تخلیقی قوتوں کو ابھرتے دیکھ کر عافیت اسی میں سمجھی کہ آپس میں سمجھوتہ ہو جائے۔ تاکہ عوامی قوتیں اور آگے نہ بڑھ سکیں۔ ماؤنٹ بیٹن ایوارڈ اسی انقلابی لہر کا ردعمل تھا۔ چنانچہ انگریزی استعمار نے دیسی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے اتحاد کر کے عارضی طور پر عوامی قوتوں کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔ اور آزادی بھیانک صورت میں ہمارے سروں پر مسلط ہو گئی۔ قیام پاکستان کے بعد اس نئی قسم کی آزادی کو جس انداز سے ہمارے امیر طبقوں نے عوام کے سامنے پیش کیا۔ ابتدائی دنوں میں اس سے کافی غلط فہمیاں پھیلیں۔ پاکستان کی حکمران جماعت مسلم لیگ نے اسلامی حکومت اور مساوات کے جو راگ الاپے تھے۔ ان سے یقیناً ہمارے عام کسان اپنے مذہبی عقیدے کی وجہ سے متاثر ہوئے۔ گو عام کسانوں

مسلم لیگ لیڈر شپ نے کبھی مخاطب نہیں کیا۔ انہوں نے سرخپوش لیڈر شپ
کی طرح خوانین کا دشمن پراپیگنڈا بھی نہیں کیا کیونکہ لیگ میں وہ تمام بڑے بڑے خان شامل
تھے اور آج بھی ہیں۔ جو انگریزوں کے دوست اور پٹھانوں کی ترقی کے مخالف تھے۔ اس
لیئے ظاہر ہے کہ وہ کسانوں کی اپنی الگ تنظیم کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس
کا اظہار آج ہم عملاً دیکھ رہے ہیں مسلمانوں کے اتحاد کے نام پر موجودہ لیگی حکمران کسانوں
کی تنظیم کو قانون اور پولیس کے ذریعہ دبانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اور دوسری
طرف خانوں اور جاگیرداروں کو کھلی چھٹی دی گئی ہے۔ کہ وہ جیسے اور جس طرح چاہیں کسانوں
کو لوٹیں۔ پچھلے دو سال میں غیر موروثی مزارعین کو خوانین نے اتنی بڑی تعداد میں بیدخل
کیا ہے جس کی نظیر پچھلے پچاس سالوں میں نہیں ملتی۔ اور بٹائی اور جبوعات کی وصولی میں
اس قدر دھاندلی مچائی ہے۔ کہ پورے صوبے کے دخیل کار اور غیر دخیل کار مزارعین اس
ظلم سے تڑپ اٹھے ہیں۔ آخر کار کسانوں نے پچھلے سال ہزارہ کی تحصیل ہری پور۔ چارسدہ
ہشت نگر اور کوہاٹ میں منظم طریق سے اس ظلم کا مقابلہ کیا اور بٹائی دینے سے صاف
صاف انکار کر دیا۔ حکومت نے پچھلے سال اس سلسلہ میں ایک ہزار سے زائد کسانوں
کو گرفتار کر کے تین ماہ سے کر تین سال تک سزائیں دیں۔ چارسدہ ہشت نگر میں ٹینکوں
اور بکتر بند گاڑیوں سے مسلح فوج کو نہتے اور بے بس کسانوں کے خلاف استعمال کیا
اور کئی مقامات پر کسان گولیوں کا نشانہ بنے۔ ایک طرف حکومت کا تشدد تھا۔ تو دوسری
طرف مسلم لیگ کے کارکنوں نے کسانوں کے اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی کسر اٹھا
نہ رکھی۔ انہوں نے مہمند اور غیر مہمند کا سوال پیدا کر کے ہشت نگر میں پھوٹ ڈالنا
چاہی۔ تاکہ مہمند اور ملکی کسان آپس میں متحد نہ ہوں۔ اس سوال کو بالکل ہندو مسلم
سوال کی طرح پیش کیا گیا انہوں نے ہری پور میں طاہر خیلی۔ تنولی۔ آوان اور ڈھونڈ
قبیلوں کے کسانوں کو قبائلی نام پر بھڑکانے کی کوشش کی۔ اسلامی اور غیر اسلامی
بحثیں شروع کیں۔ فتوے صادر کیئے۔ اس کے باوجود کسان منظم ہو رہے ہیں۔ آج کل بھی
صوبہ کی جیلوں میں ہر روز کسان قیدیوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ جو بٹائی اور جبوبات کے

ظلم کا مقابلہ انفرادی یا اجتماعی طور پر کر رہے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں میں آج صرف دو پارٹیاں ہیں۔ جو کسانوں میں کام کر رہی ہیں۔ ایک کمیونسٹ پارٹی اور دوسری مسلم لیگ مسلم لیگ کے کارکنوں کے کام کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ کہ ان کا یہ کام ہے کہ کسانوں اور محنت کشوں کو منظم نہ ہونے دیا جائے۔ دوسری طرف کمیونسٹ پارٹی اپنی طاقت اور بساط کے مطابق ان کی تنظیم میں مصروف عمل ہے۔ اس صوبے میں آج کوئی کمیونسٹ لیڈر ایسا نہیں ہے۔ جس کی گرفتاری کے وارنٹ حکومت نے جاری نہ کئے ہوں۔ شہری آزادی کے فقدان اور جبر و تشدد کے باوجود کمیونسٹ پارٹی کے کارکن صوبہ سرحد کے عوام کو بتا رہے ہیں۔ کہ موجودہ حکمران مالک اور جاگیردار طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کو بدلے بغیر ہمارے کسی مسئلے کا حل ممکن نہیں۔ اس صوبہ میں جب تک کسانوں مزدوروں اور پسے ہوئے درمیانے طبقوں کے نمائندوں پر مشتمل جمہوری حکومت نہیں بنتی۔ ہمارا زرعی اور بے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں صرف کمیونسٹ پارٹی نے ہی کسانوں کو بتایا۔ کہ حکومت کے تجویز کردہ زرعی بل اور مسلم لیگ کی زرعی سفارشات محض لیپ پوت ہے۔ جو اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتے ہیں۔ بلکہ اور پیچیدہ بناتی ہیں۔ دخیل کاروں کے حقوق ملکیت کے بارے میں کمیونسٹ پارٹی نے کسانوں کو بتایا۔ کہ حکومت صرف دو کنال زمین کی ملکیت تمہیں دینا چاہتی ہے۔ باقی زمین کا یا تمہیں معاوضہ دینا ہوگا۔ نہیں تو زمین تم ان کی ملکیت ہو جائے گی۔ آج اوسطاً موروثی مزارعین کے پاس بارہ کنال زمین ہے۔ اگر دس کنال زمین کا معاوضہ دخیل کار کو دینا پڑا۔ تو دخیل کاروں میں شائد ایک فی صدی بھی ایسے دخیل کار نہیں ہوں گے جو معاوضہ دینے کے قابل ہوں۔ اس لئے یہ دس کنال زمین لازماً خانوں کی ملکیت میں چلی جائے گی اور دخیل کار آخرکار اس دس کنال میں غیر دخیل کار مزارع بن کر ہی کام کر سکے گا۔ اور جو دو کنال زمین اُس کے پاس باقی بچے گی۔ وہ بھی اُس کے ہاتھوں سے آخرکار اس لئے نکل جائے گی۔ کہ اتنی زمین میں اس کا گزارہ ناممکن ہے۔ اور اس کی فروخت پر مجبور ہوگا دخیل کاروں کے ساتھ تو یہ سلوک ہوگا کہ غیر دخیل کاروں کو تو حکومت نے صاف

صاف کہہ دیا ہے۔ کہ بٹائی اور جبوبات دیئے جاؤ۔ اور اگر خان تمہیں بے دخل کرتا ہے۔ تو بلا چون و چرا بے دخل ہو جاؤ۔ اور کھیت مزدوروں کو تو حکومت شاید انسانوں میں شمار نہیں کرتی۔ پاکستان کی مضبوطی اور خوشحالی کے نعرہ باز حکمرانوں سے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے۔ کہ پاکستان کی اکثریتی صوبے کسانوں کو بھوکا مار کر پاکستان کیسے مضبوط ہوگا۔ زمین کو قومی ملکیت بنائے بغیر کسانوں میں خوشحالی کیسے آئے گی۔ کھیت مزدوروں۔ صنعتی مزدوروں اور درمیانے طبقے کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کے بغیر مفلسی کیسے دور ہوگی۔ شہری آزادی اور محنت کشوں کی تنظیم کے بغیر جمہوریت کا قیام کیسے ممکن ہوگا۔ یہ سب ایسے سوالات ہیں جو ہمارے صوبہ کے محنت کشوں کو سوچنا ہونگے اور ان کا حل نکالنا ہوگا۔ اور ان کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی۔

★

اگر ہم سب خدا کے بندے ہیں تو اس کی زمین
کے ہم برابر کے حصہ دار ہیں

●

کسان کی بیداری جاگیرداری کی موت ہے

●

سید انصار ناصری دہلوی

سرحدی موسیقی

یا قربان

راځی راځی چه لنډی وایو
لنډی لا بنيږی دی د یار غم غلطونه
دھاڑ دھا دُھم بگڑا ، تن تا توم بگڑا !!
دھاڑ دھا دُھم بگڑا ، تن تا توم بگڑا !!

یا للعجب — ! یہ گانا ہے یا چنگھاڑنا ! اسی سے قلوب میں سوز و گداز پیدا ہوتا ہے ؟ کیا اسی سے روح میں سرمدی سوتے بیدار ہوتے ہیں ؟ ؟ نہ رنگ داری ، نہ لے کاری ، نہ تان نہ پلٹے نہ سُر وادی نہ سم وادی نہ زمزمہ نہ گٹکری نہ مینڈ نہ گمک !! سنگیت کے جتنے گُر یاد تھے سب ہی پرکھ دیکھے ، کسی پر بھی تو پورا نہیں اترتا ! آخر یہ ہے کیا بلا !!

حیرت بجا اور تشویش درست ، ایسے کانوں کو جن میں برس ہا برس سے ہندوستانی میوزک سنگیت کے میٹھے بول ، رسیلی تانیں ، کٹیلی ترکیبیں اور سہانے بھاؤ رچ بسے ہوں ، سرحدی نغموں کی یہ انجانی اچھنج صدائیں ایسی ہی بے ہنگام ، لایعنی اور کڑھب معلوم ہونی چاہئیں لیکن انصاف شرط ہے ، اس میں دوش بے چاری پشتو موسیقی کا نہیں ، قصور ہے تو کچھ اپنی ہی ناواقفیت اور اس زبان سے اُس کمل اجنبیت اور اُپرایت کا ہے ۔ جواب تک روا رکھی گئی پھر ایک عذر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پشتو موسیقی کو جاننے سمجھنے کے لئے اس سے کماحقہٗ لطف اندوز ہونے کے لئے محض زبان کا سمجھ لینا ہی کافی نہیں ، جب تک اس کے روزمرہ اور

خالص ٹکسالی چٹخارے اور اس کے بولنے برتنے والوں کے صحیح مزاج اور کردار سے واقفیت نہ حاصل کی جائے۔ اور جن مخصوص جغرافیائی، سیاسی، ملی، معاشرتی اور مجلسی حالات میں اس زبان کا مزاج سمویا جاتا ہے۔ اس کا لب ولہجہ ڈھلتا ہے، اس کے بولنے والوں کی مخصوص ذہنیت اور طبیعت کی ساخت پرداخت ہوتی ہے، جب تک یہ سب باتیں پوری طرح ذہن نشین نہ کر لی جائیں۔ پشتو موسیقی سے حظ اٹھانے، اس سے اثر پذیر ہونے کی تمام اوپری کوششیں بے سود رہیں گی۔ کیونکہ موسیقی کا تعلق براہ راست وجدان سے ہے۔ اور وجدان کچھ ایسا بے ڈھب ساگورکھ دھندا ہے۔ کہ شعوری اکتساب اکتساب کی قید وبند میں نہیں جکڑا جا سکتا۔ نہ سیکھنے سے آسکتا ہے۔ نہ بتلانے سے۔ غرض جب یہ ناممکن الحصول ٹھہرا۔ تو نتیجتہ یہ بھی لازم آنا چاہیے کہ کوئی اجنبی پشتو موسیقی سے پوری طرح محظوظ نہیں ہو سکتا!! ــــ مگر یہ کچھ پشتو موسیقی ہی پر موقوف نہیں۔ انگریزی، روسی، جینی، برمی، سب ہی کی سنگیت کا یہی حال ہے۔ دراصل یہ امر مسلمات سے ہے کہ کسی ایک زبان کی موسیقی سے دوسری زبان والے اس حد تک سرور وسوز حاصل نہیں کر سکتے۔ جس حد تک کہ خود وہ حاصل کرتے ہیں۔ جن کی کہ موسیقی ہے، ممکن ہے اور بہت سی خارجی چیزوں میں ان سے برابر کی ٹکر لے سکیں۔ بلکہ خاص خاص حالات میں شاید ان سے بازی بھی لے جائیں، لیکن موسیقی ہی غالباً ایسی واحد چیز ہے جو کسی بھی خطۂ زمین کے باشندوں کی خالصتاً اپنی ملکیت اور بلا شرکت غیرے ذاتی میراث ہے، اجنبیوں کے لئے اس کے قرار واقعی استلذاذ سے محروم رہنا ازل سے مقسوم ہے یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ شبہ کی گنجائش ہی نہیں، اور اس کے اسباب وعلل اس قدر صاف ہیں کہ یہاں ان کا اعادہ کرنا بھی تحصیل حاصل ہے

لیکن اس بظاہر ہمت شکن صورت حال کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ تلاش وطلب کی راہیں مستقل طور پر مسدود ہو جائیں۔ اور پشتو موسیقی ہمیشہ کے لئے سربستہ راز یا پری اچنبھے کی چیز ہی بنی رہے۔ جسے ہم دور ہی دور سے کھڑے دیکھتے رہیں۔ کبھی وجدانی واماندگی کے بہانے کانوں پر ہاتھ رکھنے لگیں، اور کبھی خود ساختہ مشیخت کے زعم میں اس

ن سکیٹر نے لگیں، مکمل استلذاذ نہ سہی واجبی استدراک تو ہو سکتا ہے، بحیثیت آرٹ اس کے سرور سے قطعی بے بہرہ رہیں۔ تو بحیثیت علم اس کے اصول و ضوابط سے تو کسی حد تک فیت ضرور پیدا کر سکتے ہیں۔ باریکیوں اور لطافتوں کو نہ سمجھ بوجھ سکیں، اس کی ترتیب کیل سے متعلق موٹی موٹی باتیں تو جان پہچان سکتے ہیں۔ ذیل کا مضمون اسی سلسلے میں ایک کوشش ہے :-

شوق نے اکسایا، معلوم تو کریں اس دلاور قوم نے اپنی قلبی کیفیات اور لطیف احساسات ترجمانی کے لیے کس قسم کی موسیقی وضع کی؟ اس کی جدوجہد سے لبریز، پر مشقت زندگی میں سیقی کس حد تک سکون و راحت بہم پہنچاتی ہے؟ تمدنی اعتبار سے موسیقی کے بارے عام رجحانات کیا ہیں؟ مجلسی زندگی میں عام طور پر کن کن مواقع پر التزاماً گانا بجانا ضروری ہا جاتا ہے؟ انفرادی طور پر جب ایک پٹھان کے دل کے سوتوں سے جذبات کی دھارا رتی ہے۔ تو سوز و گداز کی کونسی لے اسے متشکل کرتی ہے طرب و اندوہ کے کون سے راس آہنگ کے متحمل ہوتے ہیں؟ سُر، تال، اور بول کی ترتیب و تقسیم کس نظام کے تابع ہے؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہیں؟ ہندوستانی سنگیت سے یہ اصول کس حد مماثل یا مختلف ہیں؟ پشتو موسیقی کی قدیم شکل کیا تھی۔ تدریجی ارتقا کس طرح ہوا۔ وجہ ڈھنگ کیسا ہے؟ آیندہ کے لیے ترقی اور اُپج کی کون کون سی راہیں فطرتاً جاری ہیں؟ غرض اسی قبیل کے سوالات نے دل میں طالب علمانہ شوق اور امنگ پیدا چنانچہ شغف اور انہماک کے ساتھ تلاش شروع ہوئی۔

سب سے پہلے تو اس حوصلہ شکن "محرومی" کا سامنا کرنا پڑا کہ پشتو موسیقی کے بارے آج تک کسی زبان میں ایک حرف بھی نہیں لکھا گیا ما سوا اس ایک پیراگراف کے "جو آرکسٹرا" تعریف میں پشتو انسائیکلوپیڈیا یا پشتو دائرۃ المعارف مطبوعہ کابل میں مندرج ہے کی اب تک دو جلدیں "آریانا" کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ اور جن میں صرف "الف" ذیل میں آنے والے الفاظ ہیں۔ اس پیراگراف کا اردو ترجمہ سازوں کے بیان میں پیش جائے گا۔

پشتو میں تو کیا کوئی کتاب یا مضمون وغیرہ ہوتا کہ اس زبان میں تصنیف و تالیف کی حالت
ویسے ہی ناگفتہ بہ ہے۔ پشتو ادب کی تاریخ بھی سب سے پہلے انگریزی ہی میں لکھی گئی، اسی طرح
پشتو ادب کے دوسرے تاریخی پہلوؤں پر بھی جو کچھ کیا، مغربی مصنفین ہی نے تحقیق و تدقیق
کی (ان میں واگھن، ڈارن، ٹرمپ، تھابرن، راورٹی وغیرہ کی تصنیفات مستند مانی جاتی ہیں)
لیکن انگریزی میں بھی موسیقی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ اور نہ اردو میں، غرض اس اعتبار
سے اس اچھوتے موضوع پر یہ پہلی تحریر ہے جس لائق بھی ہے۔ چونکہ پہلے سے کوئی مواد
موجود نہ تھا جس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے یا اپنی تحقیق کا تقابل ہی ہو سکتا۔ اس لئے
خالص نظریاتی لحاظ سے اس مضمون کا خامیوں سے مبرا ہونا ممکن نہیں۔ اس کا مجھے پہلے
ہی سے احساس ہے۔

غرض اس طرف سے محروم و مایوس ہو چکنے کے بعد دوسری راہ یہی ہو سکتی تھی کہ ذاتی طور
پر از سرِ نو تحقیق و تدقیق کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد سے کاملین سے رجوع کیا۔ بزرگوں کے
در پر بار بار زانوئے ادب تہہ کیا۔ دوستوں اور رفیقوں سے مسلسل و پیہم مشورے کئے
ہر ایک سے پوچھا گچھا، لیکن جلد ہی یہ تلخ حقیقت منکشف ہو گئی کہ پشتو موسیقی کے بارے
میں امنگ سے جتنی امیدیں وابستہ کر دی تھیں۔ سب کالعدم اور ہیچ! شوق نے جتنے سوالات
کئے تھے ان کے شافی جوابات حاصل کرنے کی ساری آرزوئیں خاک اور ملیا میٹ "پشتو موسیقی
کوئی گھڑا گھڑایا علم نہیں جس کے بارے میں افہام و تفہیم ہو سکے۔ پھر التزاماً اس کا جاننا
اور سمجھنا تو کجا یہاں تو معمولی شد بد سے بھی دانستہ احتراز کیا جاتا ہے، پشتو ادب کے
اچھے اچھے جیّد عالموں، پرانی اور نئی طرز کے ادیبوں، شیوہ بیان شاعروں، صاحبِ بصیرت
مفکروں اور دیگر اہلِ ذوق اور علم دوست حضرات سے استفسار کیا، غرض جس جس سے بھی جائز
طور پر توقع ہو سکتی تھی۔ کہ اس فنِ لطیف کے بارے میں کچھ علم رکھتے ہوں گے۔ بار بار پوچھا
گچھا لیکن یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی، کہ پڑھے لکھے طبقے میں موسیقی کی طرف سے اس
قدر شدید عدم توجہی اور غفلت برتی جاتی ہے، کہ اس کی الف بے تے سے بھی کوئی واقف
نہیں۔ اور جو واقف ہیں، فن کی حیثیت سے اسے برتتے ہیں۔ اس میں کمال رکھتے ہیں۔ ان کی

طمیت کے خانے ایسے پٹم ہیں کہ کچھ بتا نہیں سکتے۔ خود نہیں جانتے کیا بجا رہے ہیں، کیا گا رہے ہیں، تمام طور پر اس فن کے کرنے والے سوسائٹی کے ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو پست اور ذلیل ترین سمجھا جاتا ہے۔ اِکا دُکا شاید حرف شناس ہو۔ ورنہ عام فن کار جاہل اور ان پڑھ ہیں۔ ان میں سے بہت سے استادانِ فن کے ساتھ بھی سر پٹخ پٹخ کر دیکھ لیا۔ خاک بھی پلے نہیں پڑا۔ غرض اجنبی کے لئے پشتو موسیقی کے حصول میں یہی گورکھ دھندا سامنے آتا ہے۔ کہ جو جانتے ہیں وہ بتا نہیں سکتے۔ اور جو بتا سکتے ہیں وہ جانتے نہیں۔"

اس بارے میں اپنے فاضل دوست پشتو کے ادیب شہیر خان سمندر خان سمندر بدرشوی (جنہوں نے پشتو شاعری کو اپنی جودت طبع سے فکر و بیان کے نئے نئے اسالیب بخش کر اوج کمال تک پہنچایا) کی نصیحت میرے دل کو لگی — "چھوڑو بھی اس تردد کو، پشتو موسیقی موجودہ حیثیت میں اس لائق نہیں کہ علمی بحث و تمحیص کی متحمل ہو سکے، فن کے طور پر بھی مکمل نہیں۔ بلکہ اپنی نیم بخت حالت میں ارتقاء کے متعدد و مختلف حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے اور اپنی بقا کے لئے قوم کی توجہ کو ترس رہی ہے، جو اسے آج تک میسر نہ آسکی اور واقعہ یہ ہے کہ ایسی بدنصیب و نیم متمدن قوم کو جسے صدیوں کی بیرونی آویزشوں اور اندرونی علائق نے کبھی اتنی مہلت بھی نہ دی کہ تعلیم جیسی اشد ضروری چیز سے بہرہ مند ہو کر تنظیم کے ساتھ اپنی مادی ترقی کی طرف متوجہ ہو سکتی۔ بھلا کہاں اتنی فراغت نصیب ہوتی کہ موسیقی یا دیگر فنونِ لطیفہ جیسی آرائشی اور فی الجملہ ثانوی حیثیت کی چیزوں کی ترتیب و ترویج کی طرف مائل ہوتی۔"

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ یہاں موسیقی سے کسی کو مس ہی نہیں، من حیث القوم پٹھان گانے بجانے کے اتنے ہی رسیا ہیں، جتنی کوئی اور قوم، بلکہ اس لحاظ سے کہ دلچسپی کے دیگر اسباب یہاں میسر نہیں۔ اوروں کی نسبت اس طرف کچھ زیادہ ہی شغف پایا جاتا ہے، شادی، بیاہ، رسم تہوار، کوئی موقع ایسا نہیں جہاں اس کے خوب خوب چرچے نہ ہوتے ہوں۔ کوئی حجرہ بغیر رباب، گھڑا اور ڈھول کے مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ عام پٹھان گانے بجانے کا دل سے والا و شیدا ہے۔ اور یہ صرف ضرب المثل ہی

نہیں بلکہ واقعتاً ایک عام پٹھان کی ساری زندگی مہد سے لے کر لحد تک گانے بجانے کے ان گنت مواقع سے پٹی ہوئی ہے۔ لیکن یہ تعلق سطحی ہے۔ عمیق نہیں، رسمی ہے، علمی نہیں فن کے طور پر موسیقی کو شوقیہ طریقے پر برتنا، دل بہلاوے کا ذریعہ سمجھ کر اس سے عملی دلچسپی لینا قدیم رواج کے مطابق اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ اتنا ہی برا سمجھا جاتا ہے جتنا "پیشے" کے طور پر اسے ذریعہ معاش بنانا۔ پٹھان سوسائٹی میں بڑے سے بڑے عیبی کو بھی شاید اتنی بری حقارت سے دیکھا جاتا ہے یقیناً کسی گانے یا بجانے والے کو جسے عرف عام میں "ڈم" یا "دوم" (یعنی نائی) کہا جاتا ہے (موسیقی سے تعلق کی وجہ سے خود بچارے ریڈیو پاکستان کو اکثر نام نہاد ثقہ حضرات اب تک "ڈم مالو محکمہ" (ڈموں کا عملہ) سے متمسخر فرماتے رہے) عام طور پر گانے بجانے کا ذلیل اور گھناؤنا کام "قدیم دستور" کے مطابق نائی یا اسی قسم کمین لوگوں کے ذمے سمجھا جاتا ہے۔ شادی بیاہ، عقیقہ، ختنے وغیرہ کی تقاریب میں نائی بیچارا دیگر خدمات بجا لانے کے علاوہ عند الضرورت "گا" بھی لیتا ہے کیا گاتا ہے، کس طرح گاتا ہے؟ یہ جاننے کی کسی نے پرواہ نہیں کی۔ اور نہ کبھی ضرورت ہی ہوئی، بالکل ایسے ہی جیسے یہ جاننے کی کبھی ضرورت نہ سمجھی جائے کہ وہ حجامت کس طرح بناتا ہے، اس کے سب ہی کام یکساں طور پر ذلیل، ناقابل توجہ اور وہ خود راندۂ درگاہ!

موسیقی سے اس درجہ رواجی تنافر اور تنگ نظری کے اسباب بظاہر مذہب کے ان شدید اور غلو آمیز اثرات کے اور کچھ نظر نہیں آتے، جو سرحد کے تمدن کی ہر صنف و کنف پر عرصہ دراز سے طاری و ساری ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالخالق صاحب خلیق (جو اپنی فضیلت کے باعث پشتو ادبی حلقوں میں خاص عظمت و شہرت کے مالک ہیں) نے متعدد استفسارات کے جواب میں اپنے مفید مشوروں سے نوازتے ہوئے برسبیل تذکرہ ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ سننے کے لائق ہے:۔

"اب سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے پشاور سے ملحقہ ایک قصبہ[1] ہے۔ ۔ ۔ ۔
خان صاحب[1] جو حضرت[1] ۔ ۔ ۔ ۔ کے مرید تھے کے ہاں کوئی خوشی کی تقریب

---

[1] نام و مقام دانستہ حذف کر دیئے گئے ہیں تاکہ کسی کی طرف سے سوءِ ظن نہ ہو

تھی۔ جشن انبساط انہی طریقوں پر منایا گیا۔ جو دستور کے مطابق ثقہ لوگوں کے نزدیک جائز و روا سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً بے شمار دُنبے ذبح کئے گئے۔ کئی کئی روز تک ملاّنوں اور یتیموں کو کھانے کھلائے گئے، احبا اور اعزا کی پر تکلف دعوتیں میں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا، غرض دھوم دھڑکے کے سب ہی سامان ہوئے نہ ہوا تو ایک گانا بجانا۔ بعض منچلے نوجوانوں کو مزامیر کے بغیر یہ محفلیں بے رنگ سونی سونی اور ویران معلوم ہوئیں۔ چنانچہ انہوں نے گانے والوں کے ایک طائفے کو جو خود بھی انعام و اکرام کی لالچ میں مبارکبادیاں اور شادیانے گانے پر بضد تھا، لیکن . . . . خان صاحب کے ڈر سے رسائی نہ پاتا تھا، چپکے سے بلا بھیجا، اور اپنی الگ محفل جما کر سماع کا لطف اٹھانے لگے۔ خان صاحب کو بھی پتہ لگ گیا۔ بہت ناراض ہوئے، لیکن جب دیکھا کم بخت آ ہی گئے اور مبارکبادیاں گانے ہی لگے۔ تو کنبے کے بچوں کی معصوم سی خوشی کی خاطر بزرگانہ شفقت سے خاموش ہو گئے، اور طائفہ کو انعام وغیرہ دے کر جلد ہی رخصت کر دیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن دوسرے دن دیکھتے کیا ہیں کہ حضرتؒ کے مریدوں اور حواریوں کا ایک گروہ جریب و عصا سے مسلح، غضبناک و خشمگیں انداز میں چلاتا۔ نعرے لگاتا . . . . خانصاحب کی حویلی کا محاصرہ کر رہا ہے، اور بضد ہے کہ چونکہ اس مکان میں گانے جیسی ناپاک و ناجائز حرکت ہوئی ہے۔ اس لئے طہارت و پاکیزگی کی خاطر حویلی کو جلا کر خاکستر کر دینا ازبس ضروری ہے، ورنہ ــــ خانصاحب پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے گا۔ ہزار ہزار طریقے سے سمجھایا گیا، معافیاں مانگی گئیں، لیکن بے سود، آخر خان صاحب کو بھی غصہ آ گیا۔ اور بگڑ بیٹھے، مریدین بھی سخت سست کہتے روانہ ہو گئے، بعد میں خان صاحب کے حواریوں اور دوستوں نے جب دیکھا کہ بات کا بتنگڑ بنتا چلا جا رہا ہے اور نوبت اچھی خاصی جنگ تک پہنچتی نظر آتی ہے۔ تو انھوں نے خانصاحب کو سمجھایا بجھایا، اور اس فتنے کے دُور رس نتائج سے آگاہ کر کے انہیں راضی کر لیا

کہ مریدین کو خوش کر دینا ہی مناسب ہے، ناچار خانصاحب مان گئے، ادھر بھاگم بھاگ مریدین کو مناکر واپس بلایا گیا۔ انہوں نے اتنی رعایت برتی کہ حویلی میں نہ سہی کسی ایسے مکان میں آگ لگا دی جائے جسے خانصاحب خود تجویز کریں، ساتھ ہی دو مویشی ذبح کئے جائیں چنانچہ دو مویشی فوراً ذبح کئے گئے، اور ایک مکان کا چھپر یا احاطہ فی الفور نذر آتش کر دیا گیا۔ بعد ازاں چاول وغیرہ فراہم کر کے دعوت کا بھی سامان کر دیا گیا جس میں مریدین نے شرکت کرنے سے انکار کیا کہ بدمزگی کا باعث ہوگا۔ لیکن بہر طور انہیں شریک کیا گیا۔ جب مریدین رخصت ہونے لگے تو انہوں نے خانصاحب کا بے حد شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ اس علاقے کے سربرآوردہ سردار ہیں۔ آپ نے ہمارا کہا مان کر گویا شریعت کی عزت رکھ لی۔ اب باقی سب لوگ بھی آپ کی دیکھا دیکھی گانے بجانے سے پرہیز کریں گے۔ آج آپ کہا نہ مانتے تو یہ مذموم شے رواج پکڑتی جاتی۔"

ایک یہ نہیں ایسے متعدد واقعات سرحد کے مختلف مقامات سے منسوب ہیں، جن سے مختلف طریق پر گانے بجانے سے اجتناب و پرہیز کی تلقین و تاکید عیاں ہے۔ اس کی وجہ جواز یا عدم جواز بیان کرنا یا تاریخی نظا نظر سے اس کی اچھائی برائی ثابت کرنا، جداگانہ بحث ہے۔ اور اس مضمون کے احاطے سے باہر۔ میری غرض اس امر واقعہ کے اظہار سے صرف اس قدر تھی۔ کہ جو اصحاب سرحدی تمدن کے پس منظر سے بخوبی روشناس نہیں۔ ان پر یہ مسلم حقیقت واضح ہو جائے کہ موسیقی کے فروغ میں منجملہ دیگر اسباب کے یہاں کا پُر تعصب مذہبی ماحول، اور اس کا غلو آمیز رنگ بڑی حد تک مانع رہا۔ سنجیدہ طبائع نے اس کی طرف سے مکمل بے رخی اختیار کر لی، البتہ ایسے لوگ جنہیں نام و نمود یا رسوائی جگ ہنسائی کا چنداں خیال نہیں تھا۔ اس کی طرف بدستور مائل رہے، امتداد زمانہ سے رفتہ رفتہ یہ صرف انہی کی میراث اور پیسہ کمانے کا ذریعہ بنتا چلا گیا۔ اور اب بھی ہے۔ اب شرفا اس سے یوں پرہیز واجب سمجھتے ہیں، کہ "میراثیوں" اور ڈوموں کی طویل و مسلسل اجارہ داری کے باعث خود فن بھی غیر فصیح ہو کر رہ گیا ہے۔ کم و بیش ایسی ہی کیفیت اوائل میں ہندوستان کی مسلم

ہوتا ہے، چاربیتہ اور اس میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ایک تو یہ اس قدر طویل نہیں ہوتی دوسرے اس کے دو مصرعوں میں پہلا بڑا اور دوسرا چھوٹا ہوتا ہے۔ مصرعہ ثانی کے آدھا ہونے کی رعایت سے ہی اسے نیم کئی کہا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ معانی کے لحاظ سے ان ٹکڑوں میں کوئی خاص ربط ہو، ترکیب بند عام طور پر اس طرح ہوتی ہے کہ پہلا شعر یعنی مطلع ہوتا ہے، اسے ادا کرنے کے بعد پھر مطلع کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ پہلے مطلع اور پھر اس کا آدھا حصہ دوہراتے ہیں، اسی کو نیمکئی کہتے ہیں باقی مصرعے جو اس کے بعد کہے جائیں، ٹکئی کہلاتے ہیں۔ ٹکئی کا پہلا مصرعہ یا تو مروجہ ٹپوں کا پہلا مصرعہ ہوتا ہے یا اس کا ہم قافیہ کوئی اور مصرعہ، ٹکئی کے بعد پھر نیمکئی کا مطلع دوہرایا جاتا ہے، اسی طرح ٹکئی کا دوسرا بند اور پھر نیمکئی علیٰ ہذا۔

یہ بھی مل جل کر گانے یعنی کورس کی چیز ہے۔ لیکن اکیلے بھی گائی جاتی ہے

نیمکئی کا نمونہ :۔

زړه م نه صبریږي یمه ناست په انتظار
په وخت د ماز یګر

ترجمہ:۔ میرے دل کو قرار نہیں، تیرے انتظار میں بیٹھی ہوں
سہ پہر کا وقت ہے

غوږ م ږیرنیولے دی خو زیری به داسے را نه شی
او وائی شوک داسے چه پیړ زوم غم پتا نه شی
اکرم افسوس چه سہائی پوره ارمان نه شی
سوزمه مخلوقه د بیلتون په سوانګار

ترجمہ:۔ ہمہ تن گوش ہوں، لیکن ایسی خوشخبری کوئی نہ لائے گا
کوئی آکے مجھ سے کہہ دے کہ ترا غم اب دیکھا نہیں جاتا
لیکن افسوس میری امیدیں پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتیں
لوگو! جدائی کے سرخ انگاروں پر لوٹ رہی ہوں

پہ وخت د ماز یگر

سہ پہر کا وقت ہے

څہ به زه ګلے کوم دا د نصیب چارے دی
بندے ما ته شکه د جانان د دیدن لارے دی
اوس به تیر وم که هر څو ډیرے دشوارے دی
خدائے دِ امیدونو د چا نکړی تار پتار د
پہ وخت د ماز یگر

ترجمہ کیا کسی کا گلہ کروں، یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں
اسی لئے اپنے محبوب کے دیدار کے راستے مسدود ہو چکے ہیں
اب چاہے کتنے ہی کٹھن کیوں نہ ہوں، یہ دن گذارنے پڑیں گے
خدا کسی کی امیدوں کا شیرازہ نہ بکھیرے
سہ پہر کا وقت ہے

گانے میں وہی التزام ہے، جو چار بیتہ میں ہے، راگ بھی بالعموم بھیرویں ہی مستعمل ہوتا ہے۔ اور ٹھیکہ بھی بالعموم وہی تینگرہ

ایک بند کی سرگم اس طرح ہے۔

نی نی سا رے رے رے رے ما' پا گا گا رے رے سا
نی گا رے سا گا رے رے سا سا

لوبھہ

لوبھ اور نیمکئی میں ترکیب کے لحاظ سے اس قدر خفیف فرق ہے کہ انجان اس میں تمیز نہیں کر سکتے، دونوں کی بندش مستزاد کی سی ہوتی ہے، مضمون کے لحاظ سے البتہ

یہ فرق ضرور ہوتا ہے۔ کہ بوبجہ عاشق و معشوق کے سوال و جواب یا واردات حسن و عشق کے لئے وقف ہے بہشا ید یہی اس کی وجہ تسمیہ بھی ہو کیونکہ لوبھ کے لغوی معنی کھیل کے ہیں۔ اس کے پہلے دو مصرعے ایک ہی قافیے کے ہوتے ہیں لیکن بحر میں مختلف' پہلا مصرعہ طویل اور دوسرا مختصر۔ اس کے بعد کے مصرعے تعداد میں دو یا تین یا چار چار بھی ہوتے ہیں۔ آخری مصرعہ کو مطلع کے ساتھ گرہ کرتے ہیں۔ ہر بند کو "کڑی" کہتے ہیں

نمونہ:- خود بہ جہنم دار ما نہ — استھائی

چہ پہ لمسون دِ دغماز تتے بمہ بے گناہ — ٹیپ

کیوں نہ ارمان مجھے رلائیں

کہ میں بنا غمازی کا نشانہ بے گناہ

مرض م دم پہ دم زیاتیگی — انترہ

پہ حال م هیڅوک نہ خبریگی — //

زړګے بہ صبر کړم لتانہ — استھائی

تو ے بلا د عاشقی خو رلے بمہ بے گناہ — ٹیپ

مرا درد بڑھ رہا ہے

تجھے میری خبر کیا ہے

دل پہ رکھ لوں گا اپنے پتھر

کہ عشق کی بلا کا ہوں نشانہ بے گناہ

پہ تمامی جہان رسوا شم — انترہ

دِ چو دو خپلو د خدا شم — //

پہ عشق کے پاک شم دحیانہ — استھائی

نہ دیوئ د بے ننگی خطے بمہ بے گناہ — ٹیپ

بکھرے ہر سو مرے فسانے

ہنسے اپنے اور بیگانے

شرمِ عشق نے اڑالی
میں بن گیا رسوائی کا فسانہ بے گناہ
عام طور پر اکیلے ہی گایا جاتا ہے، گانے کا ڈھنگ ویسا ہی ہے جیسے ٹپے کا
اور ٹھیکہ بھی وہی تینگڑہ لگایا جاتا ہے

۱۔ راگ سندھی بھیرویں
استائی:۔ ساگا گاما گاماپاماما گارےسارے ماگارےسا نی سا،ساسا
انترہ:۔ ساسا نی سا ساگاماپا، پاما دھادھاپا
گاگاماگا ماپاما گارےسارے ماگارےسا نی ساساسا

راگ بھیم پلاسی:۔
استائی:۔
نی نی سارے رےرےرےما پا ماگارےسا۔ نی ساسارے ماگارےساسا
انترہ:۔
ماماماپا دھاپاما گارےسا۔ نی ساسارے ماگارےساسا

بدلہ

قدیم اصطلاح میں بدلہ "سندرہ" کو کہتے تھے، جس کے معنی ہیں "شعر خوانی" یعنی شعر گانا اس لحاظ سے پشتو نظم کی ہر ایک صنف بدلہ کہی جا سکتی ہے۔ لیکن بعد ازاں پشاور اور خیبر ایجنسی کے گرد و نواح میں اس کے خصوصی معنی ہو گئے اب بدلہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مشہور داستانِ محبت کا ذکر ہو۔ غالباً اسی لئے اسے بعض لوگ "بیان" بھی کہتے ہیں، بدلہ عام طور پر مثنوی یا قصیدے کی طرز پر مسلسل نظم کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ اور زیادہ تر بیلو یا ضلع میں گایا جاتا ہے۔

نمونہ از قصہ موسے خان گل مکئ (تصنیف مولوی نعمت اللہ مرحوم)

خلق وائی موسیٰ خان دے مردانہ
ما تہ ښکاری پہ مثال دَ زنانہ
خلق وائی موسیٰ خان دے باقبال
ما تہ کم ئی د روباہ اود شغال
خلق وائی موسیٰ خان خوان دغیرت شے
زہ دا ایم چہ لائق د دیر تہمت دے
خوک بہ وائی گل مکئ وہ بد لمنہ
موسیٰ خان ئی ځکہ دہ نہ کڑہ وختنہ
خوک بہ وائی چہ بہ داوہ بہ روز گارہ
موسیٰ خان ځکہ لہ دے شو تویہ کارہ

ترجمہ۔ لوگ کہتے ہیں کہ موسے خاں ہے جواں مرد
مجھ کو نظر آتا ہے لیکن وہ کہاں مرد
لوگ کہتے ہیں کہ موسے خاں ہے با اقبال
مجھ کو نظر آتا ہے لیکن وہ اک شغال
لوگ کہتے ہیں کہ موسے خاں ہے غیرت مند
مجھ کو نظر آتا ہے لیکن وہ ہوس مند
لوگ کہتے ہوں گے گل مکئ میں ہوگا عیب
موسے خاں اسی لئے انکاری ہے لاریب
لوگ کہتے ہوں گے گل مکئ تھی بدچلن
موسے خاں اسی لئے اب اس سے ہے بدظن

راگ ضلع :-

استھائی۔ نی سا سا رے رے رے رے رے رے گا گا رے رے گا
گا ما ما ما گا رے رے ما گا رے رے سا

انترہ :۔ ساگاماپا یاقربان
پاپاماپا پاپاپاماگا ماساریےگا ریےماما
ماماگا ماگارے رے سا
ٹھیک ۔ تینگڑہ
دھاڑدھادی نگ تن دھادھی نگ

غزل

پشتو غزل عین بعین فارسی غزل کی نقل ہے، مضمون کے لحاظ سے بھی اور بناوٹ کے لحاظ سے بھی، یعنی وہی گل وبلبل، حسن وعشق اور ہجر ووصال کے افسانوں کے ساتھ ساتھ دنیا کی بے ثباتی کے دکھڑے، عشق مجازی وعشق حقیقی کی آویزش پند ونصائح کی بھرمار وغیرہ وغیرہ اور اسی طرح مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور باقی اشعار کے دوسرے مصرعے مطلع سے ہم قافیہ اور ہم وزن —— بنیادی اصول یہی ہیں، بعض بعض استادوں نے اس کی بناوٹ میں کچھ اختراعیں بھی کیں، اسی طرح جیسے معانی کے لحاظ سے خوشحال خاں خٹک، رحمان بابا، عبدالقادر خاں، علی خان اور عبدالحمید وغیرہم نے تنگنائے غزل میں اخلاقی معاشرتی اور سیاسی مضامین کو اجاگر کر کے پشتو ادب میں انقلاب برپا کیا، لیکن تکنیک وہی کی وہی رکھی

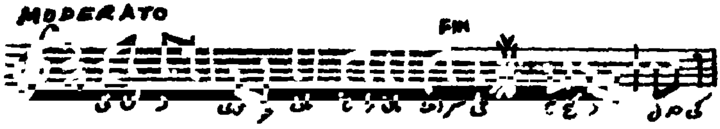
گانے میں بھی پشتو غزل کا التزام ویسا ہی ہے جیسے فارسی اور اردو غزل کی گائیکی سے، گو تانوں اور استھائی انترہ کی وہ دلربایانہ بندشیں نہیں۔ سیدھی سیدھی روش سے گائی جاتی ہے، راگ راگنی بھی کوئی مقرر نہیں ملے جلے سُر لگتے ہیں، ٹھیکے وہی ہندوستانی، یعنی قوالی، دادرا، کہروا وغیرہ

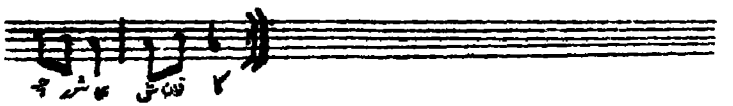
نمونہ غزل خوشحال خان خٹک

تورہ چہ تیرہ یئ ہی خو گذار لرہ کښته
زلفی چہ دل دل شی خو څپل یار لرہ کښته
سترگے رانه واڅے چہ پہ ښکلو نظر مکړہ
سترگے چہ پیدا شوے خو دیدار لرہ کښته
شیخ د شوخ روزہ کہ رند د ډکے پیالے اخلی
ھر سړے پیدا دے څپل څپل کار لرہ کښته
څہ زړا فریاد کړے شمع لہ تور و زلفو
تہ ورتلے نچپلہ دے تور مار لرہ کښته
می شتہ چنگ دے شتہ او څپل یار سرہ خوشحالہ
څپل بیامن پہ لاس کښی څہ گلزار لرہ کښته

ترجمہ۔ تلوار تیز کرتے ہیں اک وار کے لئے
زلفوں کا پیچ و خم ہے فقط یار کے لئے
کیوں کہتے ہو حسینوں پہ ڈالوں نہ میں نظر
آنکھیں ملی ہیں یار کے دیدار کے لئے
زاہد کو زہد، رند کو ساغر کی فکر ہے
ہر اک ہے اپنے اپنے ہی آزار کے لئے
محو فغاں ہو گیسوئے مشکیں سے کس لئے
خود ہی گئے تھے ناگ کے تم پیار کے لئے
مے بھی ہے چنگ نے بھی ہے خوشحال یار بھی
لے کر بیامن باغ کو چل پیار کے لئے

کابلی طرز کی غزل کی اسٹاف نوٹیشن :-





قلندری خویان، خر امان افنسی گی — دنیا ده فانی ارمانی، لاس پسو گی

په کنج د لحد کی چه شور د عاشقانو کا — فریاد بی لو خوبی نه په درځ د معشوق گی

رباعی

پشتو رباعی کا وہ مفہوم نہیں جو فارسی اردو رباعی سے مخصوص ہے یعنی چار مصرعوں کا مخصوص وزن کا قطعہ جس کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوں، اس قسم کی صنف پشتو شاعری میں سرے سے ناپید ہے۔ گو بعض شاعروں نے کچھ رباعیاں فارسی طرز پر لکھی ہیں۔ جو کتابی رباعیاں کہلاتی ہیں۔ جن اشعار کو عوام الناس رباعی کہتے ہیں، وہ دراصل چھوٹی بحر کی غزلیں ہیں۔ اصل میں پشتو رباعی اور پشتو غزل دونوں ایک ہی چیز ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ پشتو غزل میں زیادہ تر عاشقانہ مضامین ہوتے ہیں۔ اور پشتو رباعی میں صرف پند و نصائح، علم و حکمت کی باتیں ہوتی ہیں، بحریں بھی قدرے مختلف ہوتی ہیں، دوسرا فرق ادا کرنے کا ہے، یعنی پشتو غزل اردو غزل کی طرح ہر راگ اور ہر لے میں گائی جا سکتی ہے، لیکن رباعی کی ایک دھن مخصوص ہے جو کسی حد تک ہندی دوہے سے مماثل ہے، اور قریب قریب اسی طرح الاپی جاتی ہے۔ ٹھیکہ اس کے ساتھ کوئی نہیں بجتا۔ کیونکہ لے کی بندش سے الاپ مبرا ہوتا ہے۔ عام رواج کے مطابق پشتو رباعی کو غزل، بدلہ، ٹپکی وغیرہ گانے سے پہلے الاپتے ہیں، اور اس کی

مقبولیت کا یہ عالم ہے۔ کہ جب تک ایک آدھ رباعی نہ الاپی جائے مجلس کا رنگ نہیں جمتا محفل سماع میں رباعی گانا از بس ضروری ہے، خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کی رباعیات زبان زدِ عام ہیں۔

رباعی عبدالرحمان بابا

تل به نه وی شگفته گلزار د عمر
نه به جوړ وی همیشه بازار د عمر

پھلتا رہتا نہیں مدام یہ گلزارِ زندگی
رہتا نہیں ہمیشہ یہ بازارِ زندگی

لکه برق چه خان شرګند کاندې بیا نه دی
هسې تیز دې بې شک رفتار د عمر

جس طرح لمحہ بھر کے لئے کوندے کی لپک
اس طرح تیز تر ہے یہ رفتارِ زندگی

چند سمندی نه جلو لری نه واګے
خو به پرېوزی عاقبت شهسوار د عمر

کیونکر نہ شہسوار بھی گر جائے راہ میں
بے باگ ڈور جبکہ ہے رہوارِ زندگی

عاقبت به په اجل په مقراض غوڅ شی
پیوسته به مدام نه وی تار د عمر

کٹ جائے ایک بار جو مقراضِ مرگ سے
جڑتا نہیں ہے پھر کبھی وہ تارِ زندگی

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ کہ غزل اور رباعی کو چھوڑ کر جن کی گائیکی عین مین ہندوستانی غزل اور دوہے کی گائیکی جیسی ہے۔ اور کسی طرح پشتو موسیقی سے خاص نہیں، باقی جتنی قسمیں ہیں یعنی نیمکئی، بدلہ، لوبہ، چار بیتہ، سب کی سب ٹپے کی گائیکی کے مختلف ابھنگ ہیں، گویا جس طرح پشتو شاعری میں ٹپہ اول ترین صنف ہے اور باقی اصناف اس سے مشتق، اسی طرح پشتو موسیقی کی بھی جملہ طرزیں ٹپے کی طرز ہی کی الٹ پھیر سے گھڑی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں استاد سبز علی خاں صاحب (پشتو کے نامور موسیقار) کی رائے انہیں کے الفاظ میں نقل ہے۔

"چاربیتہ، بدلہ، نمکئی، لوبھ جو ہے یہ سب ٹپے کا جزو ہے یعنی یہ سب چیز ٹپے سے نکلا ہوا ہے۔ ٹپہ ان چیزوں کا باپ ہے۔ اور یہ چیزیں مثلاً چاربیتہ، لوبھ، نمکئی بدلہ وغیرہ یہ سب ٹپے کے بچے ہیں بس "

گانے کی ان اقسام کے علاوہ ناچ کے ساتھ سازوں پر مختلف طرزیں بجائی جاتی ہیں، پٹھانوں کا رقص اس مقبولیت اور شہرت کے پیش نظر جو اسے سرحد کے علاوہ پاکستان کے دیگر خطوں اور بیرونجات میں حاصل ہے۔ خاص اہمیت رکھتا ہے، اور جداگانہ تفصیل بیان کا مستحق۔ اس کی ان گنت اقسام ہیں، اور ہر ایک کے ساتھ جدا جدا ناچ دھنیں بجائی جاتی ہیں خٹک ناچ کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً شاہ ڈولا، بنگڑا، بلبلہ وغیرہ یہاں چند مقبول ترین طرزیں درج کی جاتی ہیں

شان

شان بمنزلہ نوبت اور شادیانے کے ہے جو خوشی کی تقاریب پر روشن چوکی، نفیری نقارے کے اہتمام کے ساتھ ہندوستان میں بجتی ہے، یہاں شان برات کے ساتھ گاؤں میں داخل ہوتے ہوئے غازیوں کے لشکر کے سامنے، اولاد نرینہ کی پیدائش اور ایسے ہی موقعوں پر ڈھول سرنا یا نصیری رباب وغیرہ پر بجایا جاتا ہے۔ اسے خوشخبری کا نغمہ سمجھتے۔

راگ چھایا نٹ

استھائی:۔

پاپاپاپا دھا دھا نی نی ساساسادھا
نی دھا پاگا ماگا رے سا رے گاماپا
گاماگا رے ساساگاما

انترہ:۔ ساساساسا دھانی سا رے نی نی دھاپا
رے گاماپا گاما رے سا پا

ٹھیکہ۔مغلئ

تن تا ترکڑ دھن دھن دھاگے ترکڑ چال چنچل

ساخنئ

شان کے بعد دوسرا خوشی کا نغمہ ساخنی کے نام سے مشہور ہے، یہ بھی پشتو موسیقی کی قدیم ترین دھن ہے اور ہر مجلس میں رواجاً ضرور بجائی جاتی ہے، عام خیال کے مطابق اگر ساخنی نہ بجائی جائے تو گویا مجلس نامکمل رہتی ہے، گانے کی مجلس کی ابتدا ہی اس سے ہوتی ہے، جیسے دلی اور یو۔پی کے اطراف میں قوالی سے پہلے سازوں پر نغمہ بجایا جاتا ہے (آستانہ محبوب الٰہیؒ پر عرس شریف کے موقعے پر بخشا قوال اور داعظا قوال کے نغمے خاص مقبولیت رکھتے تھے) یہاں ساخنی ڈھول طبلہ یا نقارے کے ساتھ سرنا، بانسری، بین، رباب اور سارندہ وغیرہ پر بجائی جاتی ہے، اس کی بندش خوش آئند دشوخ اور لے تند و تیز ہوتی ہے ٹھیکے کا نام بھی ساخنی ہے۔ ساخنی کی بھی دو قسمیں ہیں، قزلباشی، ساخنی جو تیراہ وغیرہ کے علاقے میں رائج ہے اور پشاوری ساخنی سے قزلباشی ساخنی نسبتاً زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے

پشاوری ساخنی

راگ پیلو ضلع

استائی:-

ما دھانی سا نی سانی رے گارے سانی رے رے رے رے

ما دھانی سا نی سانی رے گارے سانی سا سا سا سا

انترہ:-

گاما پاپا پا دھاپا ماما پاما گاگا گاگا

ماگا رے رے رے گاما سا سا سا سا رے گاما ما ما

پاما گاگا گاگا ماگا رے رے رے رے گاما سا سا سا سا ۔ مادھانی

ابھوگ:-

ساسانی دھانی دھا نی دھانی دھانی سادھا دھادھادھانی پاما

ماماپاگاگا گاگارےسانی نی رےگاما گاماگاپا

دھاپاماگاماما رےرےرےگا گاگارےرے سانی گاگا

گاماما گاگارےسا رےرے سانی مادھانی سا

نی سانی رے گارےسانی سا سا سا

ٹھیکہ:-ساخی

دن تگ دن دن تگ دھا تن تگ تن تن تگ دھا

تگ پریم-چال کچھ کچھ تلواڑہ سے ملتی ہے، چنچل ہو تو مغلئی یا چاچر سے مشابہ ہوتی ہے

بنگڑہ، شادولہ، بلبلہ

یہ تینوں خشک ناچ کی مقبول گتیں ہیں۔ ان سب کے ساتھ عام طور پر وصن ایک ہی بجتی ہے۔ سُر کے لئے بین، بانسری، مرنا وغیرہ اور تال کے لئے ڈھول یا نقارہ بجائے جاتے ہیں، لے نہایت شوخ و شنگ برتی جاتی ہے۔ سرگم کچھ اس طرح بنتی ہے

راگ ضلع پیلو ملا جلا

لا - لا - لا - لا - لا - لا - لا - لا

دھا - پا - دھا - پا - دھا - سا - سا

لا - لا - لا - لا - لا - لا - لا - لا

سا رے گا ماگا رے سا رے رے

لا - لا - لا - لا - لا - لا - لا - لا - لا - لا

سا - رے - گا - ما - گا - رے - سا - سا - دھا - پا

لا - لا - لا - لا - لا - لا - لا

دھا - پا - دھا - پا - دھا - سا - سا

ٹھیکہ تینگرہ

دھاڑ دھا دی نگ تن دھادی نگ ۔ دھاڑ

خٹک ناچ کے علاوہ جو سپاہیوں، چوں مردوں، کسانوں، دہقانوں کے علاوہ مختنی و نوعمر امرد لڑکے، کے گروہوں میں یکساں طور پر مقبول اور رائج ہے۔ بعض ناچ ایسے بھی ہیں جو صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہیں، ہندوستانی ناچ کی طرح ان کی مختلف گتیں ہیں۔ جب سے مجرا شروع ہوا، پٹھان طوائفیں محفلوں اور مجلسوں میں یہی گتیں بھرتی ہیں۔ اب ان کا رواج پھر کم ہوتا جا رہا ہے اور شاید ہی کوئی ایسی رقاصہ ہو جو ساری کی ساری گتیں بھرنا جانتی ہو، اس کے لئے بے حد مشاقی درکار ہے۔ اس لئے اب کوئی محنت نہیں کرتا۔ اس قسم کی دو گتیں درج کی جاتی ہیں۔

ناچ دھن

راگ کھماج

ساساساسا ساساسارے نی نی نی

پہلی گت دھا دھا دھا دھا نی دھا پا گا ما ما سا نی

دھا پا ما گا گا ما پا نی

دوسری گت دھانی دھا پا دھانی ساسا دھانی دھا پا

ساگارے سا پا دھا ما گا پانی ساسا ـــــ سا

ٹھیکہ:-

بولوں میں خفیف ردوبدل کے ساتھ مغلئی برتا جاتا ہے، پوری گت کے ساتھ خالی بھرے کے دو یا چار چکر بجتے ہیں۔

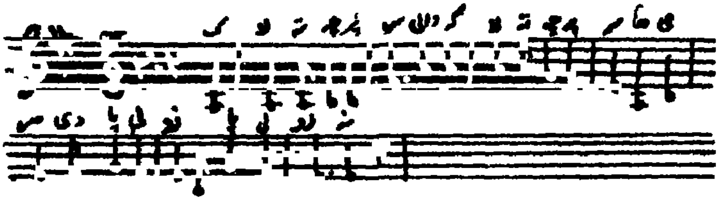
دھاکت دن تٹ کٹ دن دن دھادن دھادھادن تٹ کٹ دن دن دھادن

تاتا تاتن تٹ کٹ تن تن تاتن دھاکت دن تٹ کٹ دن دن دھادن ــ دھا

اتن

ان ناچ دُھنوں کے علاوہ جو نسبتاً جدید قسم کی ہیں۔ بعض دور دراز کے اضلاع میں ایک اور قسم کا ناچ قدیم سے رائج ہے۔ اسے "اتن" "نسبا" یا "گوڈا" بھی کہتے ہیں۔ اکثر اصحاب "اتن" کو رقص یا موسیقی سے بے تعلق مان کر صرف ورزش کا ایک قدیمی طریقہ سمجھتے ہیں۔ لیکن بعض حضرات اسے باقاعدہ رقص ہی کہتے ہیں۔ اس بارے میں راؤں میں اس قدر تضاد ہے کہ اجنبی کے لئے کوئی حتمی فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے اس سلسلے میں تفصیلات آب میاں سید انوار الحق صاحب رشید و سے (جو پشتو کے صفِ اوّل کے ادیب اور ژرف نگاہ محقق ہونے کے علاوہ اردو میں بھی صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ گفتگو ایسی پاکیزہ شگفتہ اور شیریں کہ ان کے سامنے اپنے آپ کو اہلِ زبان کہتے شرم آتی ہے) تبادلہ خیال کی سعادت حاصل ہوئی۔ اُن کی رائے نہایت معقول ہے کہ اتن شروع شروع میں جنگی قسم کی ورزش ہی تھی۔ جیسے ہندوستان میں بانک پٹہ، منٹ وغیرہ جس کے مخصوص پینترے ہوتے تھے۔ جوان لڑکوں میں مبارزت کا شوق پیدا کرنے کے لئے اسے باجے گاجے کے ساتھ زیادہ دلکش بنا دیا گیا۔ ہوتے ہوتے اب گویا مکمل رقص بن گیا۔ جس کی مخصوص ادا اور طرز یعنی دُھن بھی بن گئی۔ کابل میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس رقص میں اپنے علیحدہ گروہ بنا کر یا لڑکوں کے ساتھ مل کر شرکت کرتی ہیں۔ وہاں عورتوں کے علیحدہ اتن کو "پشلہ" اور مشترک و مخلوط اتن کو "گن اتن" کہتے ہیں اس طرف مخلوط قسم کا رقص رائج نہیں۔ البتہ مردوں میں اب بھی کہیں کہیں اتن کا رواج ہے۔

کابل کی طرح یہاں بھی اتن کے ساتھ بالعموم مصرع یعنی ٹپہ ہی گایا جاتا ہے اس کی اسٹاف نوٹیشن "چند آہنگ پشتو" (جو سید انوار الحق صاحب ہی کے کرم سے دستیاب ہوئی) اس طرح درج ہے :-



کلا تہ چہ پرسودی پالبو و منہ - د لوزو پالبز لا بنی سود چھتی پالبودین کوی کوئ

ساز

آیئے اب ذرا سازوں کو دیکھیں - اس سلسلے میں واحد تحریری شہادت جو ملتی ہے وہ پشتو انسائیکلو پیڈیا (دائرۃ المعارف) مطبوعہ کابل (جس کا ذکر اوّل آ چکا ہے) کا ایک مختصر نوٹ ہے - اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے :-

" افغان آرکسٹرا

ان تصاویر اور نقوش سے جو یہاں (افغانستان میں ایک تاریخی درہ) میں پائے گئے ہیں، اور ان موسیقی کے آلات سے جو اس علاقے میں مروّج ہیں معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی اور اس کی بندشیں افغانستان میں کئی ہزار سال سے رائج ہیں - ساز وغیرہ بعض اوقات اجتماعی طور پر اور بعض اوقات انفرادی طور پر بجائے جاتے تھے - پرانے موسیقار افغانستان کی موسیقی میں آرمونی کی تاریخ دو ہزار سال پہلے تک بتاتے ہیں - جب موسیقی کے بعض آلات کو دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے - کہ یہ آلات اسی سرزمین سے مخصوص تھے - اور دوسری ملکوں میں ان کا نام و نشان بھی نہ تھا - مثلاً رباب، سارندہ اور طنبور کی شکل اور بناوٹ دوسری جگہ نہ تھی - اسی طرح ہارپ، مخصوص چنگ جس کا بامیوں کے طریقے کے بموجب نچلا حصہ جو اس وقت

کے خاص آلات کے سُر اور وزن کی وجہ سے یورپی اصطلاح میں ارزیدو نانس) کہلاتا ہے۔ کدو کی شکل کا تھا، لیکن بہت کم دیکھا گیا ہے۔ رباب عرب میں بربط کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مگر وہ آلا جو عربی میں رباب کہلاتا ہے، ہمارے ہاں کے رباب سے شکل اور بجانے کے طریقے اور آواز کے طور پر بالکل مختلف ہے، اسی طرح سارندہ ہندوستان کی سارنگی سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔ مثلاً سارنگی اس طرح بجائی جاتی ہے، کہ بجانے کے وقت تاروں پر انگلیاں نہیں بلکہ ناخن کی پشت سے کام لیا جاتا ہے۔ اور سارندہ بجانے کے وقت انگلیوں کے پوٹوں سے کام لیا جاتا ہے
پٹھانوں کا آرکسٹرا۔ رباب، سارندہ، سرنا (شہنائی) اور ڈھول پر مشتمل ہیں۔ نیز طنبور کی شکل اور خصوصیت کا ساز دوسری جگہ موجود نہیں، یہ تاروں پر مضراب کی ایک مخصوص تال کی ضرب سے بجتا ہے۔ زیر بغلی اور زنگ کے ملاپ سے اس علاقہ کے شمالی حصوں میں آرکسٹرا ترتیب دیا جاتا ہے، غیچک بھی مختلف شکلوں میں دیکھا گیا ہے "

اس نوٹ میں جس آرمونی ساز کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ شاید ہزاروں برس پہلے ہی رائج ہو تو ہو۔ نہ ماضی قریب میں اس کا کہیں سُراغ ملتا ہے۔ نہ اب کہیں دیکھنے سننے میں آتا ہے
وہ ساز جو قدیم سے پشتو موسیقی سے خاص ہیں، اور ضروری ردوبدل کے ساتھ آج تک رائج ہیں۔ یہ ہیں۔

سُر کے ساز:۔ رباب، سارندہ، سرنا، شپیلئ (بانسری)

تال کے ساز:۔ ڈھول، نقارہ، طبل (دف، گھڑا اور تھالی

ان کے علاوہ بعض معمولی قسم کے ساز مثلاً ایکتارہ۔ دو تارہ اور چمچے کی شکل کے تار کے ساز بعض اطراف و نواح بالخصوص سوات و چترال میں رائج ہیں
ان میں قدامت کے لحاظ سے سب میں اول سرنا اور نقارہ یا لکڑی سے بجائے جانے والے ڈبے سے ڈھول ہیں۔ سرنا دراصل شہنائی یا نفیری کی ایک قسم ہے۔ اسی طرح ربڈ یعنی

نرسل سے بجتی ہے سات سوراخوں کے لئے بغیر چابی کے سوراخ ہوتے ہیں شکل بھی ویسی ہے سوائے اس کے کہ عام ہندوستانی شہنائی سے ذرا بڑی اور لمبی ہوتی ہے۔ اس کے بجانے کے لئے مشق کے علاوہ خاصی قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے

شروع شروع میں حملہ و یلغار، جدال و قتال کے موقعوں پر ڈھول اور سرنا بجانے والے پیدل یا گھوڑوں پر سوار روشن چوکی کے نشان کی طرح جلوس کی قیادت کرتے تھے، اسی قسم کے موقعے موسیقی کے صحیح مصرف کے لئے مناسب و جائز سمجھے جاتے تھے، اور تھا بھی ٹھیک ایسے سنجیدہ قوموں کے لئے ایسی ہی ولولہ انگیز اور جوشیلی موسیقی ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن جیسے جیسے کارزار اور ہنگاموں سے فرصت ملتی گئی، خانہ بدوشی نے مدنیت کو جگہ دی، اور کاروانی ہنگاموں نے منزلوں پر قیام کرکے ڈیرے ڈالے، زندگی میں ٹھہراؤ بڑھا۔ اور بے سروسامانی کی جگہ جم جاؤ ہونے لگا۔ تو بتدریج موسیقی نے بھی کھل کھیلنے کے بیش از بیش مواقع تلاش کر لئے، اور میلے، تماشے، شادی بیاہ، ریت رسم (شادی شادی) فصلوں کی بوائی اور "اشر" یعنی کٹائی" "عونبل" یعنی اجتماعی طور پر خرمن اندوزی، کے موقعوں پر موسیقی عند الضرورت مقصد براری کرتی رہی یہاں تک کہ پٹھان معاشرت میں ان موقعوں پر التزاماً گانا بجانا ضروری بن گیا؟ جن میں سب بلا تفریق مرد و زن شامل ہوتے، میزبان کے گھر مہمانوں کا گانے اور ناچ میں شامل ہونا۔ دوست کی شادی پر باقی دوستوں کا گانا بجانا، ایک کنبے کا دوسرے کنبے کی خوشی میں شریک ہوکر گانا بجانا اور ناچنا۔ بھائی کی شادی پر بہن کا تھالی سے کر عورتوں کی محفل میں گانا اور ناچنا فرض سمجھا جانے لگا۔ غرض اس طرح وہ موسیقی جو صرف "لشکر کرنے" یا اسی قسم کے معرکوں میں استعمال ہوتی تھی۔ زندگی کے دکھ سکھ کی شریک بن کر مزاجوں میں رچ کر، دلوں میں سما کر، دن رات کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ اور میلوں اور تماشوں کھیتوں اور کھلیانوں کنوؤں اور رہٹوں سے ہوتی ہوئی حجروں اور مکانوں کی قلعہ بند چار دیواری کے اندر تک پہنچ گئی۔ جہاں مردوں کی طرح خانہ نشین عورتیں بھی دن بھر کے کاموں سے تھک ہار کر ذرا اسی ذرا اس سے جی بہلانے لگیں۔ قیاس کہتا ہے، کہ اس ثانوی دور میں

سازوں کی طرف بھی توجہ ہوئی اور ڈھول نقارہ سرنا کے علاوہ ایسے سازوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جو دور میں بلند بانگ اور تیز خروش ہونے کی بجائے خوش آئندہ، نرم رو، رسیلے اور میٹھے ہوں، چنانچہ شہر کے سازوں میں رباب۔ سارندہ اور بانسری اور تال کے سازوں میں ہاتھ سے بجایا جانے والا ڈھولی، طبل (دف) اور گھڑے نے رواج پایا۔ ساز میں بانسری ڈھول، طبل (دف یا خنجری) اور گھڑا ملک کے دوسرے خطوں میں بھی اسی طرح رائج اور مقبول ہیں۔ شکلیں بھی خفیف سے ردوبدل کے ساتھ سب جگہ ایک سی ہیں، البتہ رباب اور سارندہ پشتو موسیقی کے خصوصی ساز ہیں، جو کہیں اور مستعمل نہیں۔

رباب

رباب نسبتاً زیادہ پرانی قسم کا ایک ساز قدیم عربی موسیقی میں بھی تھا۔ اور ایرانی میں بھی، اغلباً وہیں کے اثرات سے یہاں تک پہنچا۔ اس کی شکل سرود سے ملتی جلتی ہے۔ گو قدرے چھوٹا ہوتا ہے، بجانے کا طریقہ بھی ویسا ہی ہے یعنی لکڑی یا ہڈی کی مضراب سے تاروں پر زخمہ دیا جاتا ہے اور انگلیوں کے پوٹوں سے سُر نکالے جاتے ہیں، سرود میں طربوں کے علاوہ باج کے تاروں میں بھی تانت کے ساتھ لوہے اور پیتل کے تار ہوتے ہیں اور رباب میں صرف تانت کے تار ہوتے ہیں، طربیں ندارد (اگرچہ بعد میں ایزاد ہوئیں، پرانے رباب میں یہ نہیں تھیں) سرود کا گونج کا پیٹا بڑا ہوتا ہے، اور رباب کا اس سے آدھا بھی نہیں ہوتا۔ دوسرا سب میں بڑا فرق یہ ہے کہ رباب میں باج کے صرف تین تار ہوتے ہیں۔ اور سرود میں چار۔ گو نئے اصول کے مطابق رباب میں بھی چوتھا تار لگایا جاتا ہے، جو صرف چھیڑا جاتا ہے، اسے شہ تار کہتے ہیں۔ رباب کے تار ان سروں کے مطابق ہوتے ہیں

پہلا تار:۔ سُر یعنی کھرج — مدھ ستان — سُر — زیر

دوسرا تار:۔ سر کا پنچم — مندر ستان — پنچم — بم

تیسرا تار:۔ سر کی چڑھی کھب — تار ستان — چنگ — کھٹ

شہ تار:۔ سر سے ملا ہوا — تار ستان — ٹھپ — سلوم

ہندوستانی موسیقی کے اثر سے اب رباب میں طربیں بھی ایزاد کر دی گئی ہیں

تاکہ گونج پیدا ہو۔ یہ تعداد میں بارہ یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہیں۔ طربیں عام طور پر اس ترتیب سے چنگ ہوتی ہے

۱	۲	۳	۴
باج کے سُر سے۔ اتری مدھم	پنچم	چڑھی رکھیوت	اتری نکھار
۵	۶	۷	۸
اتری مدھم	چڑھی گندھار	چڑھی رکھب	سر
۹	۱۰	۱۱	۱۲
پنچم	چڑھی رکھیوت	اتری نکھار	سر

و قس علیٰ ہذا

اس قسم کا چنگ کیا ہوا رباب اکثر پیشہ ور یا مشاق رباب نواز ہی بجاتے ہیں ورنہ عام طور پر سیدھے سادے رباب رائج ہیں، پٹھانوں کا عزیز ترین ساز یہی ہے، جہاں دیکھئے دو چار ملے بیٹھے ہیں۔ اور رباب بج رہا ہے۔ ہر حجرے میں چلم کی طرح رباب اور اس کی سنگت کے لئے گھڑے کا ہونا از بس لازمی ہے۔ جنگ کے میدان اور پہاڑی مورچوں پر بھی پٹھان سورما اسے اپنے ساتھ رکھتے ہیں، اور فراغت کے لمحوں میں اس سے دل بہلاتے ہیں۔ اس سے شغل رکھنا کچھ ایسا بہت معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اکثر نامور شجیع پٹھان شوقیہ طور پر اس سے شغف رکھتے ہیں۔ خیبر ایجینسی کی انجمن تنظیم قبائل کے صدر ملک بادر خاں صاحب غازی رباب بجانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اور بھی بے شمار ذی قدر خوانین شوقیہ رباب بجاتے ہیں۔

رباب نوازی کے جگت استاد جنہوں نے سرحد میں اس فن کا خاص وقار قائم کیا اور جن کا شاگرد ہونا ہی سعادت سمجھی جاتی تھی (اب بھی ان کے شاگردوں کے آگے ماہرین فن کان پکڑتے ہیں) ایک بزرگ گزرے ہیں۔ استاد محبت خان مرحوم موضع مرغز تحصیل صوابی ضلع مردان کی پیدائش ــــ دینیات اور امور مذہبی کے فاضل ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے، اور استاد احمد دین جو رحمان بابا کے ہم مرتبہ سمجھے جاتے تھے ــ سے شرف تلمذ حاصل تھا، علم موسیقی میں ماہر، ہزاروں چار بیتے حفظ تھے، اس زمانے میں جس شخص کو

زیادہ چار بیتے یادریوں دیں استاد مانا جاتا ہے) ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے شوق میں
رنگون سے کراچی تک کی خاک چھانی ، اور اس علم میں مہارت حاصل کی ، رباب بجانے میں
ید طولیٰ رکھتے تھے ، گھنٹوں اور پہروں بڑی سے بڑی محفل مجلس کو مدہوش بنائے رکھتے تھے
ان جیسی تیکھی مضراب آج تک کسی کو نصیب نہ ہوئی ۔ بعد میں اس فن کی بے قدری کے سبب
ناچار ہارمونیم سیکھا ، چندے اس سے شغف رکھا ۔ پھر سارنگی میں کمال حاصل کیا ۔
۱۹۲۶ء میں پشاور آئے اور یہیں بودو باش اختیار کر لی ۔ ان کے بیسیوں ریکارڈ ہیں ۔
اور سب کے سب مقبول ۔ پہلا ریکارڈ " زلفے غنچے کرپے دی " کہا جاتا ہے تین
لاکھ کے قریب فروخت ہوا ۔ ۱۹۴۲ء میں رحلت کی ، مزار آبائی وطن ہرغر میں ہی ہے

ریڈیو پاکستان پشاور کے رحمن دولت خان کو بھی استاد محبت خان کی شاگردی
کا فخر حاصل ہے ۔ استاد محبت خان کے صاحبزادے فرخ سیر ریڈیو پاکستان پشاور کے
گانے کے پروگرام میں اکثر حصہ لیتے ہیں ۔ ان کے علاوہ زر داد اور زیور خان بھی رباب نوازی
میں کمال رکھتے ہیں ۔

سارندہ

پشتو موسیقی کا نہایت رسیلا ساز ہے ، اور وضع قطع میں سب سے الگ اور نرالا ۔
تار اور طربیں رباب کی طرح ہیں ، لیکن سارنگی کی طرح بغل میں رکھ کر گز چلنے سے بجتا ہے
اور باج پر انگلیوں سے مقام پیدا کئے جاتے ہیں ۔ باج کے تار رباب سے ایک زیادہ
یعنی چار ہیں ۔ اور اس ترتیب سے ملائے جاتے ہیں :۔

پہلا تار :۔	سر یعنی کھرج	مدھ ستان	سُر	تیور
دوسرا تار :۔	سر کا پنچم	مندر ستان	پنچم	ٹُنبہ
تیسرا تار :۔	سر کی چڑھی رکھب	تار ستان	چنگ	کھٹ
چوتھا تار :۔	سر کی چڑھی دھیوت	تار ستان	ٹیپ	سلورم

سارندہ میں طربیں خاص اہمیت رکھتی ہیں ، اور تعداد میں بارہ سے سولہ تک ہوتی

ہیں۔ تانت اور لوہے پیتل کے کل تار باج اور طربیں ملا کر سولہ سے بیس تک ہوتے ہیں
طربوں کی ترتیب اس طرح ہے

باج کے سر یعنی عام طور پر پانچویں کالے سے	۱	۲	۳	۴
	سر	اتری رکھب	چڑھی رکھب	چڑھی رکھب
	۵	۶	۷	۸
	اتری گندھار	چڑھی گندھار	اتری مدھم	اتری مدھم
	۹	۱۰	۱۱	۱۲
	چڑھی مدھم	پنچم	پنچم	اتری دھیوت
	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶
	چڑھی دھیوت	اتری نکھار	چڑھی نکھار	سر

سارندہ رباب کے مقابلے میں بعد کی چیز ہے اور قدرے پیچیدہ بھی۔ شاید اسی وجہ سے شوقیہ طور پر سیکھنے اور بجانے میں اتنی مقبولیت بھی نہ پا سکا۔ اس کو بجانا ہے بھی مشکل — لیکن جانکار اور مشاق ہاتھوں میں ہو تو گویا منہ سے بولتا ہے، آہنگ سارنگی سے زیادہ تر دٹ اور رسیلی — اور بہت کچھ ہندوستانی اسراج یا دلربا سے مشابہ ہے، گونج زیادہ نہیں ہوتی، نہ کھرج پر زور ہوتا ہے۔ بلکہ مدھم زیادہ اجاگر نظر آتی ہے۔ سنگیت کے لئے ایک اچھا ساز ہے۔ تان دھنیں بڑی تیکھی نکلتی ہیں۔ اور سننے والوں کو جھا جھا دیتی ہیں۔ ریڈیو پاکستان پشاور کے مایہ ناز رتن استاد پذیر خاں جن کے گھرانے سے یہ ساز ایجاد ہوا، اس میں لائق رشک مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے کمال کا شہرہ کل ہند و بیرون ہند تک ہے ذاتی علم اور مشاقی کے علاوہ قدرت نے انہیں سُریلے پن اور مٹھاس کا ایسا جوہر ودیعت کیا ہے۔ کہ بارہا بڑی بڑی آل انڈیا میوزک کانفرنسوں میں نامی گرامی فن کاروں کو اپنی شیریں رس بھری باج سے مست و بے خود بنا چکے ہیں، طبعاً اس قدر سادہ لوح، حلیم اور منکسر المزاج کہ اپنے کمال سے خود نا آشنا۔ ان کے خاندان اور ان کے ساز کے بارے میں ان کی اپنی زبانی چند باتیں نقل ہیں:-

- میرے والد کا نام عبدالقدیر خان دادا کا نام پیر بخش خان، نانا کا نام فضل قادر خان اور ماموں کا نام غلام حیدر خان تھا۔ یہ سب بزرگ رباب اور سارندہ میں ماہر تھے۔ اور قابل استاد تھے، آٹھ نو برس کی عمر میں میرے والد صاحب نے سارندہ بجانے میں شاگرد کیا۔ یعنی اپنے ہاتھ سے مجھے سارندہ سکھایا جب بارہ برس کا ہوا۔ تو والد صاحب نے میرے ماموں کے پاس شاگرد کر دیا، یہ استاد میرے ماموں بھی تھے اور سسر بھی، اپنے زمانے کے نہایت قابل اور بزرگ استاد تھے۔ بارہ چودہ برس تک میں نے استاد جی سے نہایت محنت سے علم موسیقی حاصل کیا، اور ان کی خدمت کی، جب کسی لائق ہو گیا تو استاد جی نے اجازت دی کہ اب جاؤ، کھاؤ، کماؤ، جس وقت استاد جی نے ہمیں جائز دے دی۔ تو پھر ہم اپنا کام کرنے لگے۔ اکیلا بھی بجانے لگا۔ اور قوالوں کے ساتھ بھی کام کرتا رہا۔ اور تھیٹر اور خاموش سنیما میں بھی آرکسٹرا کا کام کرتا رہا غرض ۱۹۳۳ء تک اسی طرح مشہور ہوتا رہا، اس کے بعد پشاور ریڈیو اور پھر دہلی ریڈیو اور دہلی ریڈیو کا بڑا اسٹیشن اور پھر پشاور پاکستان ریڈیو میں آج تک وفاداری اور محنت سے کام کرتا ہوں۔ میرے بہت سے ریکارڈ بھی بھرے گئے۔

اب میں اپنے سارندے کا بیان پیش کرتا ہوں، جناب، سارندہ ہمارے گھرانے سے ایجاد ہے، پہلے اس کی شکل ایسی نہ تھی، کابل سے ایک نامور رباب بنانے والا کاریگر آیا، اس کے پاس جا کر ہمارے بزرگوں نے اس کی شکل نئی بدلائی۔ اور ایسا خوبصورت ساز ایجاد کر دیا جو ہمارے بزرگوں دادا جی نانا جی اور ہمارے استاد جی کی مہربانی اور محنتوں سے آج تک یادگار چلا آتا ہے۔ ہمارے بزرگ کہتے تھے۔ جب ہمیں نئے طرز کی ضرورت پڑتی تھی تو کنوؤں اور رہٹوں پر جاتے اور اس کی صدا پر کان لگا کر اپنے دماغ سے نئے نئے طرز نکالا کرتے۔ جب وہ سادہ زمانہ تھا، آنی پڑھائی لکھائی نہیں

جانتے تھے۔ اگر ان صاحبوں میں پڑھائی کا مادہ ہوتا۔ تو پشتو کی سنگت بنا لیتے تو ہمارے پشتو بھائیوں کے لئے یادگار زمانہ ہو جاتا، مگر نہ سرگم تھے اور نہ ماترے، اتنا سادہ زمانہ تھا کہ راگ کی شناخت نہ تھی، جب پہاڑی شروع کر کے ختم کرتے تھے تو پھر کہتے تھے اب پیلو کا ٹھاٹ ملاؤ، پہلے زمانے میں کل سارندہ میں تیرہ تاریں تھیں، جس میں تین تار رودے کی اور دس تاریں پیتل کی طاؤس کی تھیں۔ پہلا تار ہندوستانی میں سر اور پشتو میں ازیہ کہلاتا ہے۔ دوسرا پنچم اور پشتو میں بم کہتے ہیں۔ اور تیسری تار کو ہندوستانی میں رکھب اور پشتو میں کھٹ کہتے ہیں۔ ہم نے اپنے سارندے کو زمانے کی ضرورت کے موافق بڑھایا، اور آٹھ تاریں اور بڑھا کر چنگ کیا۔ چوتھا تار رودے کا بڑھایا، جس کو ہندوستانی میں دھیوت اور پشتو میں سلیم کہتے ہیں، جب ہم نے اپنے سارندہ کو چنگ سر کر دیا۔ تو ہر قسم کی چھوٹی موٹی آواز والے گویئے سے ہمارا میل ہو گیا۔ اور اس میں سب ترکیبیں ادا ہونے لگیں۔ تیراہی نغمے جدا ہیں۔ اور بنوں کوہاٹ کے جدا اور خٹک کے جدا، مگر ہمارے سارندہ میں سب ہندوستانی اور پشتو نغمے بجائے جا سکتے ہیں، اور جناب، غلام بھی اسی سادے زمانے سے ہے، اگر اس زمانے میں راگ ریت کی ضرورت ہو تو بندہ ہر طرح حاضر ہے۔ ٹپہ اور لوبھ کے ہم نے اپنے بھائی گل میر سے سرگم کرا دیا ہے۔ میرے بھائی گل میر اور خوش میر استاد عبدالعزیز خان اور عبدالقدیر خاں کے شاگرد رہے ہیں۔ فرانٹیر میں ایک اور استاد بڑے نامی گزرے ہیں، استاد بہرام خاں، طبلہ اور ناچ یہاں اسی نے پھیلایا۔ اور جو بھی پشتو طبلہ بجاتے ہیں تو یہ سب اسی کی ایجاد ہے اور ایک اور استاد گزرے ہیں جن کا نام بابا موصلی تھا، پشتو ناچ ان پر ختم تھا، جناب یہ سب بزرگ بڑے قابل اور ماہر تھے اور پشتو موسیقی کا رواج انھوں نے پھیلایا۔ اب بھی جو کچھ ہے سب انہی کی یادگار ہے، فقط

۔ نذیر خاں"

سازندہ نوازی میں اگر کوئی استاد بذیر خان کا ثانی ہوسکتا ہے، تو اُن کے بھائی گل میر خان ہی ہیں۔ جن کی جلیت اور تیاری کا شہرہ ہے۔ دوسرے نمبر پر پیران کے دوسرے بھائی خوش میر خان ہی ہوسکتے ہیں۔ اور کوئی نہیں

طبلہ پشتو موسیقی کا ساز نہیں ہے، ہندوستانی کے اثر سے رائج ہوا، لیکن بول ڈیٹ تک اکثر قدیمی نقارے اور بڑے ڈھول کے رائج رہے اور اب تک ہیں۔ "دھاڑ" "نگڑ" "تاکڑ" "دھوم" وغیرہ اصل میں نقارے ہی کے بول ہیں۔ البتہ اب قوالی، غزل اور سندرے کی سنگت میں ہندوستانی ٹھیکے بجنے لگے ہیں۔ ان کی کاٹ اور باج بھی ہندوستانی طرز کی ہے۔ سرحد میں طبلہ کو رواج دینے والوں میں دو استادوں کا نام مشہور رہا ہے، چاچا بہرام، اور چاچا رحمت، ان کے علاوہ میاں قادر بخش اور محمد شریف استاد کے بھی اکثر لوگ شاگرد رہے۔ آج کل کے طبلہ نوازوں میں روشن چودھری اور گل صنم خان خاصے مشہور ہیں۔ یہ سب دہلی یا لاہور کی باج بجاتے ہیں۔

گانے والوں میں جن اصحاب نے اپنے کمال سے شہرت حاصل کی، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

استاد اکرم خان موضع سوڑی زئی پشاور، پشتو کا سب میں پہلا گراموفون ریکارڈ انہی کا بنایا گیا۔ اور بے حد مقبول ہوا (اس ریکارڈ کے بول تھے، زہ بلبل ستا د وصال یمہ) استاد احمد و سارنگی موضع تاروجبہ پشاور، ڈیبر راج (مرحوم) پشاور سید عالم مردان، وحید اللہ، نعمت اللہ مردان، جمعہ خان صوابی۔ بابا و رحمت صوابی عورتوں میں جنہوں نے اپنے فنی کمال سے ناموری حاصل کی، ان میں یہ زیادہ مشہور ہیں:۔

شمعی مریا، انماپٹی، گلزار، صبر النساء، حبیب جان اور نظیر جان، حبیب جان جیسی صاحب علم اور خوش آواز مغنیہ کہتے ہیں کہ اب تک دوسری کوئی نہ ہوسکی۔ اس کے لاتعداد ریکارڈ بنائے گئے۔ جو اب تک مقبول و ہر دلعزیز ہیں۔ نظیر جان بھی بڑی اعلیٰ مغنیہ تھی اس نے اپنا "گ" سے پٹنے کی ایک خاص دھن وضع کی جو اسی کے نام سے اب تک

گائی جاتی ہے، اس کے علاوہ شاعرہ بھی تھی، اس کے ہزاروں ٹپے رائج و مقبول ہیں ایک یہ ہے۔

کہ نظیر جان دِ یاد یگی ——— ملک دِ کانو کی، ترلاندی تارا ځینه
اگر تمھیں نظیر جان بہت یاد آتی ہے تو اپنا سارا اثاثہ بیچکر موضع ترلاندی پہنچ جاؤ

موجودہ دور میں جن استادان فن کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

مظفر خان، میرا حمد خان (ان کو نئی نئی دلپذیر طرزیں بنانے میں ید طولی ہے) ملا نور محمد، سبز علی، فرخ سیر، خانزادہ عبداللہ جان۔ نظر گل چاربیتہ اور اسی قسم کے کورس گانے والوں میں متوکل، مبین اور ہمنوا، لار رحمان، انور اور ہمنوا، ولی محمد ملا نور محمد اور ہمنوا وغیرہ ہیں۔

عورتوں میں حشتی چمن جان، مغل جان، فیروزہ جان، دلبر جان، گوہر بیگم، حسن پری صابر جان۔ مہر النساء بیگم، بادشاہ زرین جان، دلبر جان بلاللہ اور سلطان ہیں۔

الغرض یہ ہے پشتو سنگیت، اس کے خصوصی سازوں اور چند نامور فن کاروں کا مجمل سا بیان، یہاں ایک نکتہ اور وضاحت طلب ہے۔ وہ بھی محض اس لئے کہ بعض حضرات اس ضمن میں غیر معمولی ضد سے کام لیتے ہیں۔ یعنی پٹھانوں کے تمدن کی روایتی "قدامت پسندی" کو تقدیس کا جامہ پہنا کر اس کی جائز و ناجائز توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا ڈالتے ہیں۔ اور ارتقا کے فطری اثرات کو بھی یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس سے حقائق کا جیسا خون ہوتا ہے۔ سو ہوتا ہی ہے۔ طرفہ ستم یہ اور ہوتا ہے کہ سادہ لوح پٹھان ان "خدائی فوجداروں" کے پیہم و مسلسل پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر مفروضہ قدامت پسندی کو کوئی نہایت ہی قابل فخر چیز سمجھ کر اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اور ہر نئی بات سے چاہے وہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہوں، خواہ مخواہ بھڑکنے لگتے ہیں۔ قدامت پسندی کا یہ ڈھونگ رہی سہی آج کی جوت کو اور بھی ماند کر دیتا ہے۔ حرکت و عمل کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں، اور ہمت و کوشش ہمیشہ

کے لئے مانگیں توڑ کر ڈھیر ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ تغیر و تبدل کی رویں، سوچ سمجھی ابھروں پر بڑھنے کی بجائے غلط اثرات کے تحت جس طرف کو راہ پاتی ہیں۔ من مانی شکلیں بنا کر بے اختیار بہ نکلتی ہیں۔ دیہاتوں کے تمدن کے اکثر شعبوں میں یہ بے راہ روی یکساں طور پر کار فرما نظر آتی ہے) لیکن یہ ماننا کہ ان کی طرز بود و ماند، عادات و اطوار، خیال و زبان، ساز و سنگیت، پچھلے دو سو سال سے ایک سے چلے آتے ہیں۔ اور کسی بات میں بھی سر مو فرق نہیں ہوا؟ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خوش فہمی نظر آتی ہے، نہ اسے کوئی سلیم العقل انسان تسلیم ہی کر سکتا ہے۔ وقت کی دھارا کے آگے کونسی باڑھ بند روکی جا سکتی ہے؟ تغیر و تبدل مین منشائے فطرت ہے چنانچہ ہو کر رہتا ہے۔ چاہے اس کی رفتار دوسرے حسابوں سست اور الجھی ہوئی سی ہو، شاید اس لئے کہ خارجی اثرات اور اندرونی تقاضے نسبتاً زیادہ شدید نہ ہوں، لیکن یقین طور پر ترقی ہوئی اور ضرور ہوئی۔ گائیکی کے ان نمونوں اور سازوں کے حالات سے ہی جو ابھی پیش کئے گئے۔ قارئین نے اندازہ لگایا ہوگا۔ کہ یہ کسی طرح بھی ابتدائی شکلیں نہیں۔ مانی جا سکیں بلکہ ارتقا کی ایسی کڑیاں ہیں جنہیں بار بار کی مشق سے آزمایا گیا، اور نت نئے تجربے کر کر کے وسیع و موثر بنایا گیا ہے یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور ہمیشہ تک جاری رہے گا۔ کوئی بھی آرٹ اگر اپنے مقصد و مصرف کو صحیح طور بر قرار رکھنا چاہتا ہے۔ تو کبھی بھی جامد و ساکن نہیں رہ سکتا۔ چاہے وہ مصوری ہو یا نقاشی یا شاعری، پھر سنگیت جیسا خاص الخاص فن جو انسان کا دم قدم کا ساتھی۔ دکھ سکھ کا شریک، اسے تو اتنی ہی تیزی سے بدلنا پڑتا ہے جتنی تیزی سے خود انسان کی سوجھ بوجھ بڑھتی یا ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ چنانچہ پشتو موسیقی بھی اپنے متوالوں کے بڑھتے اور تربیت پاتے ذوق کے عین مطابق قدم بقدم بدل رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انجانے پن کے باعث یہ تبدیلی غیر شعوری اور مبہم طریق پر ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے جانکاری شعور اور علم بڑھتا جائے گا۔ تبدیلی کے دھارے بھی سوچی سمجھی راہوں پر موڑے جا سکیں گے۔ تب ہی فن فروغ پا سکے گا۔

پچھلے صفحات میں پشتو گائیکی کے جن نمونوں کا ذکر کیا گیا ہے (مثلاً ٹپہ، چار بیتہ لوبہ، نیمکئی، رباعی وغیرہ) انہیں ان کی موجودہ شکل میں کلاسیکی مان کر، آیئے ان چند

اثرات کا اجمالی جائزہ لیں۔ جو جدید یا رومانی قسم کی تبدیلیوں کے موجب بنے۔

زیادہ نہیں کہیں تیس برس اُدھر کی بات ہے، پہلی عالمگیر جنگ کے بعد کے اثرات نے ملک میں عجیب بدحالی پھیلا رکھی تھی۔ چاروں طرف بیکاری اور لاچاری کا دور دورہ تھا۔ عام زندگی کی بڑی اور چھوٹی سب ہی قدریں اور قیمتیں تہس نہس ہو رہی تھیں۔ اُن کی جگہ مشینوں کی رواج بخشی سے نئے نئے اقتصادی معیار قائم ہو رہے تھے۔ "پیداوار" "تقسیم" اور "خرچ" کے کارگہ پر "طلب و رسد" کے ایسے تانے بانے کھنچے جا رہے تھے جن کے ابریشمی پھندے سے زندگی کی ضروریات "آسائشات" اور "تعیشات" پر یکساں گرہ بندی سے حاوی ہو رہے تھے چنانچہ "روٹی پانی" سے لے کر "شعر و ادب" اور "ساز و سنگیت" تک سب ہی چیزیں نری "جنسِ کاروباری" بن کر رہ گئیں۔ جن کی قیمتیں "اسی طلب و رسد" کے بندھے ٹکے پیمانے پر مقرر ہونے لگیں۔ ایسے عالم میں جبکہ روٹیوں کے بھی لالے پڑ رہے ہوں، موسیقی جیسی سر تا سر آرائشی جنس کی جیسی کچھ بھی درگت ہونی چاہئے۔ قیاس کی جا سکتی ہے "طلب" سرے سے تھی ہی نہیں، "رسد" کہاں سے ہوتی۔ رسمی طور پر گانا بجانا، شادی بیاہ، میلے تماشوں تک ہی رہ گیا تھا۔ بہت ہوا تو کبھی کبھار دو چار بگڑے دل مل بیٹھے۔ اور کچھ "رول ران" کر کے ذرا کی ذرا مجلس گرم کر لی۔ بعد ازاں اسی مجلس نے پیشہ وارانہ شکل اختیار کر لی۔ ضرورت پڑنے پر میراثی یا طوائفیں بلائی جانے لگیں۔ مجرے ہونے لگے۔ لیکن ایسے باقاعدہ مواقع خال خال ہی میسر آتے تھے۔ عام طور پر "فن" کے چرچے سرد پڑ چکے تھے۔ اور فن کار بیچارے یا تو جس تس کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو رہے تھے۔ یا مجبوری اور طریقے سے محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگے۔ کوئی نائی بنا۔ کوئی بھٹیارہ، کوئی مستری اور کوئی محض سیلانی گداگر۔

غرض اس دور میں موسیقی کچھ ایسی کس مپرسی کے عالم میں تھی کہ اچانک سنگلاخ پہاڑوں کو پھلانگتی، سرحدیں عبور کرتی ایک چھوٹی سی مشین دھرمی آن کودی۔ جس نے آتے ہی ایک چکاچوند سی پیدا کر دی۔ اور دیکھتے دیکھتے ایسی مقبول ہوئی۔ کہ شہروں، قصبوں سے ہوتی ہوئی دور دور کے دیہاتوں، ترلوں کے حجروں اور زنان خانوں تک جا پہنچی ——

یہ شین تھی ـــ گراموفون!

گراموفون کی ایجاد سے ملکوں ملکوں کی سنگیت جس طرح متعدد و مختلف پہلوؤں سے متاثر ہوئی، کم و بیش اسی طرح پشتو موسیقی کو بھی ہونا چاہئے تھا۔ لیکن یہاں پہلے سے اس کی علمی حیثیت تو کجا سرے سے شوق کے ہی لالے تھے۔ اسی لئے گراموفون بھی پشتو موسیقی کے فنی ارتقا میں کر بتا کچھ زیادہ ممد ثابت نہ ہو سکا۔ البتہ دو بڑے فائدے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ طلب کے بڑھ جانے سے جو سرد بازاری اور جمود سا طاری تھا۔ وہ کسی حد تک کم ہوا۔ اور عام طور پر موسیقی کے چرچے بڑھنے لگے۔ نئی نئی چیز تھی فوراً لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ پٹھان ویسے بھی زندہ دل، کھیل تماشے کے رسیا ٹھہرے۔ دن رات اسی کے گرویدہ ہو گئے۔ دوسرا بڑا فائدہ اتفاقی طور پر یہ ہوا کہ دوسرے خطوں کی موسیقی جس سے یہاں کے لوگ قطعی ناآشنا تھے۔ ریکارڈوں کے ذریعے رائج ہوتی رہی اور دھیرے دھیرے غیر شعوری طور پر پٹھانوں کے مزاجوں میں رچتی رہی۔ شروع شروع میں پشتو کے ریکارڈ کہاں تھے۔ لہٰذا وہی جانکی بائی الٰہ آباد۔ زہرہ بائی پانی پت۔ گوہر بائی کلکتے والی، دلاری بائی محمد حسین نگینے والے، بھائی چھیلا۔ ماسٹر فقیر الدین۔ ماسٹر لبھو، پیارے صاحب اور پیارو قوال وغیرہ وغیرہ مقبول و ہر دلعزیز ہوتے رہے۔ بعد میں جب تاجروں نے شوق دلا دلا کر خوب بازار پیدا کر لیا تب کچھ پشتو ریکارڈ بننے شروع ہوئے۔ چنانچہ زیادہ نہیں پچھلے پندرہ بیس برس کی بات ہے کہ ہز ماسٹرز وائس کا سٹوڈیو لاہور میں قائم ہوا اور وہیں استاد اکرم خاں کا پہلا ریکارڈ بنا (زبلبل ستا د وصال یم) عام روایت کے بموجب یہ ریکارڈ اس قدر مقبول ہوا کہ کئی لاکھ تک فروخت ہوا۔ پھر اور ریکارڈ بنے یہاں کے بعد ہی استاد صحبت خان مظفر خان دلبر خان، میاں ستہاب، عبداللہ جان، زر خان، کچکول خان، عبدالجبار، انظر گل، خانزادہ اور سبز علی اور عورتوں میں وزیر جان ـــ بے نظیر جان، مہر النساء، چشتی چمن جان، اور حبیب جان اور سازندوں میں استاد نذیر خاں سارندہ نواز وغیرہ وغیرہ کے ریکارڈ بننے لگے۔ ہز ماسٹرز وائس کے بعد پشاور کی ایک کمپنی بجاج اینڈ کمپنی نے گلشن ریکارڈ اور ایک اور تاجر نے "بانگا فون" کے ادارے قائم کئے۔ انہوں نے بھی قریب قریب

انہی فن کاروں کے ریکارڈ بنائے۔ یہ تمام ریکارڈ مروّج دھنوں میں پشتو کے مخصوص نغموں ٹپہ۔ چار بیتہ، نیمکئی، لوبہ، بدلہ، رباعی اور غزل تک ہی تھے۔ ہاں دوسرے اثر کے تحت ہندوستانی اور پنجابی مقبول دھنوں میں بھی (جو اپنے چنچل پن اور تراوٹ کے باعث پٹھانوں کے وجدان میں سما چکی تھیں) بے شمار ریکارڈ بنے اور خالص پشتو دھنوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی مقبول ہوئے مثلاً:

مظفر خان: زما ستر گے نہ دی دا خو تیر دی ۔ بطرز: تیری آنکھیں نہیں یہ تو تیر ہیں
سبز علی۔ راحلوېګی دا زړه غم بے دِ قاپار دا ۔ ؎ دل تو میرے ہی چکا جان ہے جاناں باقی
؎ تاندہ زړه قربان شمه قربان زړه قربان یا نبی ۔ ؎ با نکے نیناں والیا نیناں ملاندا جاورا
؎ شادا بہ تر قیامت دِ گلزار د محمد ۔ ؎ پیغام صبا لائی ہے دربار نبی سے

حبیب جان: یارانو مالہ جو دے مجھے کا ۔ ؎ ماہی وے مینوں ڈنگہ جڑھائے

عام ریکارڈوں کی چنگاریاں کچھ کجلا رہی تھیں۔ کہ ایکا ایکی فلموں کی پھلجھڑیاں چھٹنی شروع ہو گئیں۔ کے سی ڈے۔ سہگل۔ کانن بالا۔ اوما ششی۔ امیر بائی کرناٹکی۔ زہرہ جان انبالہ والی شمشاد اور نہ جانے کس کس کے نغموں نے ایسی یورش کی کہ رہے سہے حواس بھی جاتے رہے اور لوگ بھونچکا سا ہو کر رہ گئے۔ بھلا ان فلمی طرزوں کی نت نئی بندشیں اور ان کے طرحدار آرکسٹرا کی البیلی کٹیلی ترکیبیں اپنے سادے سے چار بیتے ٹپے لوبے میں کہاں تھی اور کہاں ہے کو کہیں کسی نے ایسے پھڑکا دینے والے گیت سنتے تھے۔ پھر خالص پشتو طرز کے گیتوں کے فلمائے جانے کی گنجائش بھی کہاں تھی۔ لے دے کے ایک ہی تو پشتو فلم بنا وہ بھی بدیسی کہانی کا (یعنی لیلیٰ مجنوں بزبان پشتو جسے رفیق غزنوی نے بنایا اور جس کے مکالمے اور گانے امیر حمزہ خاں شنواری نے لکھے) اور وہ بھی بچارا پٹ پٹا کر رہ گیا۔ لہٰذا دیکھ بھال ہندی کے فلمی گیتوں کی دھنیں پٹھانوں کے دلوں میں کھبتی چلی گئیں۔ جن کی کھٹک اب تک رہ رہ کر ٹیس دیتی رہتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ بعض مقبول فلمی طرزوں پر پشتو زبان میں گیت لکھے جانے لگے۔ فدا مطہر غزنوی نے اس قسم کے سب سے زیادہ گیت لکھے۔ ان میں سے اکثر کے ریکارڈ بھی

بنے۔ اس ضمن میں سبز علی خاں موسیقار سب میں پیش پیش رہے۔ ان کے بے شمار مقبول ریکارڈوں میں سے چند یہ ہیں:-

داسشد راشہ لیلیٰ یو زلف راشہ	(بطرز) دھیرے دھیرے آ رے بادل دھیرے دھیرے آ	(فلم قسمت)
دلبر بے وفا وایہ تصور سوز ماشے	" پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے	(فلم سورداس)
هس پہ نقش پہ زان	" چل چل رے نوجوان	(فلم بندھن)
دگیند مے نظارے دی۔ خواجہ خواجہ	" ساون کے نظارے ہیں۔ آہا۔ آہا۔	(فلم خاندان)
افسوس دِ عاشقی کے حاسے حال زمانے	" بگڑی ہوئی دنیا نوں میری فیروسامنے	(فلم منگتی)

ہرچند کہ یہ نقل مطابق اصل تھی لیکن نقل پھر نقل ہی ہے۔ اس میں نہ وہ جذب و کشش تھی نہ وہ سرور و سوز۔ اور نہ اس کے آرکسٹرا میں وہ رنگ ترنگ۔ چنانچہ اصل فلمی گیتوں کے مقابلے میں یہ گیت ذرا نہ ٹھہر سکیں۔ پھر اصلی گیتوں کی بھی انتہا نہ رہی۔ ہر آٹھویں دسویں پان سات نئے نئے زبانوں پر چڑھتے گئے۔ کس کس کی نقل کی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نقل بازی کی ہمتیں آخر جواب دے گئیں۔ اور فلمی گیتوں کو بلا مقابلہ خوب خوب کھل کھیلنے کا موقع ملتا رہا۔ اب حال یہ ہے کہ بازاروں میں گلی کوچوں میں جہاں دیکھیے بچے بچے کی زبان پر یہی ترانے ہیں "یہاں بدلہ وفا کا بیوفائی کے سوا کیا ہے" یا "آجا میری برباد محبت کے سہارے" یا "جب سے پیچھے گئے ہیں وہ زندگی زندگی نہیں" یا اسی قسم کوئی اور مغویات قصبوں دیہاتوں میں بھی ایسے ایسے اُجڈ دہقان جنہیں اردو کا ایک لفظ بھی نہیں آتا بڑے طمطراق سے بہکتے چلے جاتے ہیں "دل کی لگی زباں پر آئے تو کیا کروں" یا "میں ترا چاند تو مری چاندنی او۔ ہو" وقس علیٰ ہذا

عام مذاق کے ابتذال کی کوئی حد ہے بگڑتا ہے تو بگڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ پھر ظاہر ہے ریکارڈوں کی موسیقی خالصتاً کاروباری شے تھی اسے مذاق کے سنوارنے اور دیگر اصول و ضوابط سے کیا سروکار۔ موسیقی و شاعری کے معیاری نمونے پیش کرنے میں ناحق کی تضیع اوقات اور محنت کی دردسری تھی کیونکہ سرے سے ان کی مانگ ہی نہ تھی لہٰذا وہی اٹکل پچو، تک بے تک چلت کی چیزیں مقبول ہوتی رہیں۔ اور ایسی مقبول ہوئیں کہ لوگ ٹپے، چار بیتے کو بھول سے گئے۔ حد یہ کہ پشتو غزل اور اس سے مماثل لوبھ،

بدلے بھی عام مجروں اور محفلوں میں اردو غزل کی ہزار ہا مختلف دھنوں میں گائے جانے لگے۔
پھر جہاں اس قسم کی گائیکی نے پشتو موسیقی کو متعدد نئی نئی طرزوں سے روشناس کیا وہاں ساز سنگت
میں بھی طرح طرح کی اختراعیں ہوئیں۔ سب سے پہلے تو ہارمونیم رائج ہوا، پھر کلارنٹ اور اسی قسم کے
دیگر ساز۔ علاوہ ازیں فوجی آماجگاہ ہونے کی وجہ سے ایک اور ساز بھی آن شامل ہوا یعنی انگریزی
بین جو اب پٹھانی ناچ کی سنگت کا جزوِ لاینفک بن گئی ہے۔ پشتو موسیقی کی خالص گائیکی میں
سنگت کا کوئی قاعدہ قرینہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ بس شروع سے آخر تک سب ہی ساز
اتنے زور زور سے بجائے جاتے تھے کہ گانے والے کی آواز بھی نقار خانے میں طوطی کی آواز
بن کر رہ جاتی تھی۔ وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ پشتو موسیقاروں کی آوازیں عام طور پر بلند اور
پاٹ دار ہوتی ہیں، نہ گائیکی میں ایسی کھینچ تان، پھینک تان، مینڈیں اور رمزیں ہیں جن کا
سازوں میں مدغم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا۔ لہذا یہی رواج پڑ گیا، کہ جتنے زور سے گانا
اتنے ہی زور کی باجے، اور مسلسل و پیہم شروع سے آخر تک یکساں۔ نہ کہیں دم نہ قیام، نہ
کہیں ٹھہراؤ نہ روانی۔ ریکارڈوں کے ذریعے ہی سنگیت کا کچھ الٹا سیدھا شعور پیدا ہوا۔ اور
سازوں کے مقام سے سرسری شناسائی پیدا ہوئی۔ غرض اس دور کی یہی دو برکات ہیں
اسی زمانے میں ایک اور طرفہ شگوفہ کھلا یعنی "سانگ پبلسٹی" کا جنگی ادارہ قائم ہوا
جس کی سیادت میاں سید رسول رسا صاحب نے فرمائی۔ فنی اعتبار سے اس قسم کے اداروں
نے جس طرح ہندوستان کے دیگر علاقوں میں آخور کی بھرمار کی یہاں بھی اسی نسبت سے
چند مبتذل شہکار سرکئے اور بس۔ فنی ارتقاء میں بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ ہنگامی ادارہ شمہ برابر بھی
اضافہ نہ کر سکا۔ سوائے اس کے کہ عام مذاق میں جو ابتذال سی پھیل رہی تھی۔ اسی کو اپنی افراط
تفریط سے کچھ اور اجاگر کرے گا۔ یہاں اقتصادی اعتبار سے اتنا فائدہ ضرور ہوا۔ کہ
چند مفلوک الحال فن کاروں کو معقول سہارا مل گیا۔ ان میں پیر سبز علی خان پیش پیش
رہے (یہ بزرگ پشتو موسیقی کی تاریخ میں "موٹا مام" کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور اتنے ترقی
پذیر ہیں کہ ہر نئے رجحان کے امام بن جاتے ہیں) چند ہی دنوں بعد معمولی سی چمک دمک
دکھا کر یہ شرارہ بھی خاموش ہو گیا۔ ادر مگ بھگ اسی زمانے میں ریکارڈوں کی کمپنیاں

بھی، نہ گلشن ریکارڈ رہے نہ بانگا فون اور نہ ہز ماسٹرز وائس کا زور شور

غرض ان ہنگامی اثرات کے بعد خاصے عرصے تک پھر جمود سا طاری ہو گیا۔ فنی چرچے بالکل ہی ختم ہو گئے۔ امنگوں پر ایسی اوس پڑ چکی تھی۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ شاید موسیقی ہمیشہ کے لئے فنا ہو چکی ہے۔ اسباب ظاہر تھے، نئی طرزوں کی تڑک بھڑک اور ان کے گیتوں کے ہیجان انگیز بول پرانی پشتو دھنوں اور ان کے سادہ درویشانہ مضامین کا سارا مزا کرکرا کر چکی تھیں۔ جب نئی طرزوں کا بازار ہی سرد ہو گیا تو پرانی لگی بندھی دھنوں کو کون پوچھتا۔ اور کسے غرض پڑی تھی کہ پرانی موسیقی کی نئے انداز سے تجدید کا کھڑاگ مول لیتا۔ چنانچہ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ اور بڑھتی ہوئی سہل انگاری نے فن کو دھکیلتے دھکیلتے تحت الثریٰ تک پہنچا دیا۔

غرض کچھ ایسا ہی عالم تھا کہ سات سمندر سے ایک اور مشین جو اپنی قوت اور دور رس اثرات کے لحاظ سے زمانۂ حال کی عظیم ترین ایجادوں میں سے ہے۔ یہاں بھی آن براجمان ہوئی یہ مشین تھی ریڈیو۔ اور ریڈیو نے دم توڑتی ہوئی پشتو موسیقی کو ایک بار پھر زندہ کر دیا۔

سرحد میں نشر گاہ کا قیام، اس کا تدریجی فروغ، نشری پروگراموں کی ترتیب، تشکیل و پیش کش کے ادلتے بدلتے معیار و نظریات، سننے والوں پر مختلف حالات میں ان کے گھٹتے بڑھتے اثرات، پھر پروگرام بنانے والوں اور فنکاروں پر ان اثرات کا ردِ عمل ان تمام باتوں کا احاطہ کرنا، سرحد کے ادبی، تمدنی اور فنی ارتقا کی ایسی مستقل تاریخ قلمبند کرنے کے مترادف ہے۔ جو یہاں کی سیاسی تاریخ سے بھی کہیں زیادہ پیچیدہ و ژولیدہ ہے جس کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے اور نہ گنجائش — آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ

عزیز پٹھان نوجوانو! تمہاری موسیقی تمہاری توجہ کو ترس رہی ہے

واقی واقی چہ لنڈی وا لیہ | او آو کہیے الاہیں
لنڈی لو بنی دی دیار تم غلطو ینہ | تجھے ہی اچھے ہیں کہ دوست کا غم جلاتے ہیں

یا قربان

دوست محمد خان کامل

خوشحال خان خٹک اور اسکی شاعری

برحرف و صوت میسر نہ گردد آزادی
ببیں اسیر قفس طوطیان گویا را

بے د تورے خلاصی نشتہ پہ بل کار یعنی "بغیر تلوار کے آزادی محال ہے" خوشحال، افغانوں کا یہ شمشیرزن شاعر مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر (۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) کے عہد میں ماہ ربیع الثانی ۱۰۲۲ھ مطابق مئی و جون ۱۶۱۳ء میں قبیلۂ خٹک کے سردار اور حکومت مغلیہ کے منصبدار شہباز خاں کے گھر بمقام سرائے اکوڑہ جسے اس وقت ملک پور بھی کہتے تھے پیدا ہوا۔ یہ قصبہ پشاور سے قریباً ۳۵ میل کے فاصلہ پر قدرے شمالاً جانب شرق دریائے کابل کے جنوبی کنارے پر شاہی سڑک کے قریب واقع ہے۔ شہباز خاں ولد یحییٰ خاں پشت ہا پشت سے خان و سردار تھا قصبہ سرائے اکوڑہ اس کے دادا ملک اکوڑے ولد ملک درویش محمد عرف چنچو نے ہی جسے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر (۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء) کے عہد میں عروج حاصل ہوا آباد کیا تھا۔ جہاں آج عہد مغلیہ کے کئی بڑے بڑے منصبداروں [illegible] سربرآوردہ امرا کے ناموں تک سے سوائے مورخین و طلبائے تاریخ کے اور کوئی واقف نہیں وہاں ان افغان قبیلوی سرداروں کے نام جن کی حیثیت ان عمائدِ دولت کے مقابلہ میں معمولی زمینداروں کی تھی آج تک نہ جانے کیوں باقی ہے۔ انہیں کوئی جانتا یا نہ جانتا مگر خوش حال بلند اقبال کا یوم ولادت نہ صرف اس کے خاندان بلکہ افغان قوم کی تاریخ میں وہ لازوال دن تھا جس نے نہ صرف اپنے خاندان کو زندۂ جاوید کر دیا۔ بلکہ اس کے علمی، ادبی اور

سپاہیانہ کارنامے سارے قبیلہ خٹک۔ بلکہ ساری افغان قوم کی شہرت وناموری کا باعث بنے جس نے اپنے عزم آہنیں اور دم آتشیں کے ساتھ افغانوں کو ہنگامۂ حیات سے آشنا کیا اور جس کی تلوار کی جھنکار اور نغماتِ آتشبار کی گونج آج بھی سرزمین روہ کے میدانوں اور کوہستانوں میں سنائی دے رہی ہے۔ وہ افغان تھا۔ مگر اس کی قسمت میں نہ صرف افغانوں کی تاریخ کے ایک خاص اور محدود دور میں ان کا شاعر، مفکر اور فوجی اور سیاسی قائد ہونا تھا بلکہ وہ اس کے فن اور علمی وادبی آثار کی جامعیت وعمومیت کی وجہ سے جوں جوں سمجھا اور پہچانا جائے گا ہر جگہ ہمیشہ قدر ومنزلت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اس نے اپنا پیغام آزادی اور لافانی درس زندگانی افغانوں کو سنایا اور انہوں نے ہی سب سے پہلے اسے سنا مگر اس کی نوید امید اور درس یقین محکم وعمل پیہم کو جغرافیائی حدود کے اندر قید نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ہر وہ قوم جو زندہ رہنا چاہتی ہے۔ اور جسے آزاد اور باعزت وآبرو زندگی سے محبت ہے اسے اپنا سمجھے گی۔ اور اس کے پیغام حریت کو اپنائے گی۔ خیر علیانی ۱۰۲۲ھ اس کا مادۂ تاریخ ولادت ہے۔

خوشحال خاں کی زندگی کے ابتدائی حالات کی تفصیل تو معلوم نہیں البتہ جو کچھ معلوم ہے اس سے اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حادثات وخطرات مہد سے لحد تک برابر اس کے ساتھ لگے رہے۔ اس کی زندگی ہنگاموں اور شورشوں کے ساتھ شروع ہوئی اور یوں ہی ختم ہوئی۔ چنانچہ اپنی پرآشوب زندگی کا ذکر اپنے ایک شعر میں یوں کرتا ہے

"لا یو شور را ځنې لا نه دی بل اشی   مګر زه پیدا په ورځ د شور و شر یم

"ابھی ایک ہنگامہ مجھ سے رخصت نہیں ہونے پاتا کہ دوسرا آموجود ہوتا ہے
گویا میں شور وشر ہی کے دن پیدا ہوا تھا"

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک مرد صاحب کمال وخود آگاہ کی شخصیت کے عروج وارتقاء کا راز فتنہ وابتلاہی میں مضمر ہے۔ آزمائش اس کے قوائے پنہاں اور غیر پوشیدہ کے ظہور کے لئے تازیانہ کا کام دیتی ہے۔ اور وہ اپنے فطری اور ذاتی خیر کی وجہ سے خارجی شر ومعصیت کو بھی خیر وبرکت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ خوشحال کے نزدیک "غم" "معصیت"

اور شر ہی انسان کی قدر و قیمت کی کسوٹی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

"غم ئی ند ے پیدا کړے بے حکمته - د نامرد او مرد د پېژند کښ غم محک دے"

"اللہ نے غم کو بغیر حکمت کے پیدا نہیں کیا - غم نامرد اور مرد کی پہچان کے لئے کسوٹی ہے"

اگرچہ شاعر نے غم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن جو کچھ اس نے غم کے متعلق کہا ہے اس کو توسیع دے کر ہم شر پر بحیثیت مجموعی حاوی کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح سے ہمیں عالم میں شر کے وجود کا سبب نظر آتا۔ اور اس کی فلسفیانہ تشریح و توضیح مل جاتی ہے۔ عالم میں وجود شر کے متعلق خوشحال خان کا خیال جرمن فلسفی گاٹفریڈ ولہیم لائبنز (۱۶۴۶ء تا ۱۷۱۶ء) کے نظریہ سے بہت حد تک ملتا ہے۔ خوشحال خان نے اپنی نظم میں مرد و نامرد کے امتیاز کو لا کر اس میں انتہائی شدت و زور پیدا کر دیا ہے اور اس طرح سے یہ نہ صرف منظوم وعظ ہو جانے سے بچ کر شعر بن گئی ہے۔ بلکہ اس میں اس قدر اثر پیدا ہو گیا ہے۔ کہ سامع غم اور شر سے مغلوب ہونے کے خیال کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا اور اسے مغلوب کرنے کی نیت سے اس کے ساتھ برسرپیکار ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

اگرچہ خوشحال خان کی قسمت میں ایک بلند پایہ شاعر متبحر عالم و مصنف ہونا لکھا تھا۔ مگر جیسا کہ وہ خود ہمیں بتاتا ہے۔ وہ مکتب میں وہ کچھ حاصل نہ کر سکا جو اسے حاصل کرنا چاہیئے تھا۔ اس کا وقت زیادہ تر سیر و شکار کی نذر ہوتا۔ اس نے بہت کچھ بعد میں غالباً پرائیویٹ مطالعہ اور ذاتی تجربات و مشاہدات سے حاصل کیا۔ اگرچہ مکتب کی قیود و پابندی سے وہ خوگر نہ ہو سکا۔ مگر شکار کی طرح کتاب کی محبت بھی اس کی فطرت و طبیعت میں مرکوز تھی۔ جو بعد میں ظاہر ہوئی۔ اور آخری وقت تک اس کے ساتھ رہی۔ چنانچہ کہتا ہے

"دا یم راغلم په عمر چه رم د ینے - زلمی توب را څخه لوړ زیرے سپینے -
یو د ښکار بل د کتاب بل د دلبر د - په جهان کښ نور مے نشو ے دا د ینے مینے"

یعنی جیسا کہ دیکھتے ہو اس عمر کو آن پہنچا ہوں - سفید ڈاڑھی نے جوانی مجھ سے چھین لی ہے

محرّمین عشق بلاکم وکاست ویسے کے ویسے ہیں ۔ شکار، کتاب اور حسن

شہباز خان کو کچھ تو پرانی قبائلی عداوت اور کچھ قبائلی مندڑ و یوسف زئی کی حکومت مغلیہ کے خلاف سرکشی کی وجہ سے ان کے ساتھ اکثر برسرپیکار رہنا پڑتا تھا۔ چنانچہ خوشحال خان کو بہت چھوٹی عمر ہی میں میدان جنگ دیکھنے کا موقع ملا۔ سال ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء میں سرائے اکوڑہ سے چند میل کے فاصلے پر بمقام جہانگیرہ یوسف زئیوں کے ساتھ شہباز خان کا مقابلہ ہوا۔ خوشحال خان بھی جس کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ باپ کے ساتھ تھا خٹکوں کو شکست ہوئی اور شہباز خان اپنے بیٹے اور ساتھیوں سمیت بمشکل تمام گذر پیر سباک پہنچا۔ جہاں ایک زبوں حال کشتی میں بیٹھ کر وہ دریائے کابل کو عبور کر کے اپنے گاؤں پہنچے۔ یہ کشتی دریا میں ڈوبتے ڈوبتے بچی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد شہباز خان نے یوسف زئیوں سے اپنی شکست کا انتقام لے لیا۔ اٹھارہ سال کی عمر ۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۱ء میں خوشحال خان کی پہلی شادی ہوئی۔ اور اسی سال ایام عروسی میں خوشحال تپ محرقہ یا کسی اور میعادی بخار سے سخت بیمار پڑا۔ اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ خویش و اقارب اس کی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مگر خیریت گذری اور چند دنوں بعد خوشحال خان شفایاب ہو گیا۔ خوشحال خان کے اپنے بیان کے مطابق بیس سال کی عمر میں (۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۳ء) میں اس نے شعر کہنے شروع کئے۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک مسلسل غزل جو اس نے اس وقت کہی تھی۔ جب اس کی عمر بیس سال سے قدرے متجاوز تھی موجود ہے۔ اور ہم اس سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ وہ بیس سال کی عمر کے قریب بہت اچھے اشعار بہ تسلسل مضمون غزل کی صورت میں کہہ لیتا تھا۔

• عقل مصلحت کے سو بند تعمیر کرتی ہے۔ مگر عشق کا ایک ہی سیلاب آکر ان سب کو منہدم کر دیتا ہے۔ اے عاقل مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ عشق کیا ہے۔ اگر عاشق ہو گئے تو تم بھی عقل سے سیر ہو جاؤ گے۔ عشق اپنی ہٹ سے ذرا بھی نہ ہٹے گا۔ عقل یونہی پڑی غصے سے اپنی انگلیاں مروڑتی

رہے - میں ہر چند عشق سے رشتہ توڑنے کی کوشش کرتا ہوں - مگر خدا میرا رشتہ اور بھی زیادہ عشق سے جوڑ دیتا ہے - میری عمر بروئے حساب پچپن سے زیادہ ہے - مگر غم عشق چند سالوں ہی میں مجھے بوڑھا کر دے گا - اگر کہیں اسے وصال یار میسر ہو تو بے چارہ خوشحال بھی اپنی خاطر بے قرار کو آسودہ کر دے گا۔"

اس غزل میں پہلے تین شعر عقل و عشق کے مقابلہ اور موخر الذکر کے غلبہ سے متعلق ہیں - اور باقی شعر بھی عشق کی قوت و شدت سے تعلق رکھتے ہیں - اس لئے ہم اسے بہ ہمہ وجوہ ایک مسلسل غزل کہہ سکتے ہیں - چونکہ شاعر کے سامنے اصل مقصد عقل و عشق کی کشاکش اور عشق کی قوت و طاقت کے سامنے عقل، اس کی مصلحتوں اور حیلوں کی بے بسی اور ناکامی کو ظاہر کرنا ہے - یہی تھیم غزل میں نمایاں اور غالب ہے - اس لئے ہم اسے بہ آسانی "کشاکش عقل و عشق" یا ہم قسم عنوان دے سکتے ہیں -

خوشحال خان کے کلام میں متعدد جگہ عقل و عشق کا مقابلہ، غلبہ عشق اور گریز عقل کا ذکر ہے -

سنہ ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں خوشحال خان کا سب سے بڑا بیٹا اشرف خان پیدا ہوا جس کا شمار بھی پشتو کے چوٹی کے شعرا میں ہونا مقدر تھا -

سنہ ۱۰۵۰ھ میں رمضان کی آخری تاریخ کو بروز جمعہ (جنوری ۱۶۴۱ء) بگڑ نالہ تحصیل و ضلع مردان کے قریب شہباز خان کا یوسف زئیوں کے ساتھ مقابلہ ہوا اس کے بیٹے خوشحال خان و جمیل بیگ بھی اُس کے ساتھ تھے - شہباز خان کو ایک تیر کنپٹی پر لگا اور خوشحال خان بھی مجروح ہوا - لڑائی میں یوسف زئیوں کا پلہ بھاری رہا - اور خٹک کافی جانی نقصان اٹھا کر واپس لوٹے - شہباز خان پانچ دن بعد جمعرات کے دن چھ شوال (جنوری) کو پچاس سال کی عمر میں انتقال کر گیا

شہباز خان کے خوشحال خان و جمیل بیگ کے علاوہ دو اور بیٹے شمشیر خان

ومیر باد خاں بھی تھے۔ چونکہ خوشحال خاں سب سے بڑا تھا اسے باتفاق رائے قبیلہ کا سردار نامزد کیا گیا۔ جب خوشحال خان کے زخم مندمل ہوئے تو اس نے لشکر فراہم کرکے اچانک علاقہ یوسف زئی پر حملہ کیا۔ اور کافی کشت و خون اور آتشزنی کے بعد واپس لوٹا۔ یوسف زیوں نے بھی لشکر فراہم کرکے تعاقب کیا۔ فریقین میں جو لڑائی ہوئی اس میں خٹکوں نے فتح پائی۔ اس اثنا میں خوشحال خاں کو شہنشاہ شہاب الدین (۱۰۳۷ھ ۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۸ھ ۱۶۵۸ء) کا فرمان ملا جس کی رُو سے خانی اور باپ کا منصب خوشحال خاں کو عطا کیا گیا تھا

خوشحال خان نے عہدِ شاہجہانی کے بعض اہم واقعات میں حصہ لیا اور خدمات نمایاں سرانجام دیں جن کی شہنشاہ نے بطریقِ احسن قدر کی۔ شاہجہان خوشحال خان کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ اور خوشحال خاں بھی اپنے بادشاہ کا ادب و احترام کرتا۔ اور حکومت کی وفاداری کا دم بھرتا رہا۔

ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ مطابق ۱۶۵۸ء میں شاہجہان کے بیٹے اورنگ زیب نے سریر آرائے ہندوستان ہو کر اگلے سال رمضان ۱۰۶۹ھ (جون ۱۶۵۹ء) ابوالظفر محی الدین عالمگیر کے القاب اختیار کئے۔ ۱۰۶۸ھ سے ۱۰۷۴ھ تک خوشحال خاں عہدِ عالمگیری کے واقعات میں (تا دمِ تحریر میسّر تواریخی شہادت کی رُو سے) ہمیں کوئی خاص کردار ادا کرتا نظر نہیں آتا۔ البتہ اس دوران میں سرکش یوسف زیوں کے ساتھ چھوٹی موٹی لڑائیاں برابر جاری رہیں

ششم جلوس عالمگیری (رمضان ۱۰۷۳ھ تا رمضان ۱۰۷۴ھ) - ۱۰۷۴ھ میں سید امیر خان خوافی صوبہ دار کابل نے شہنشاہ سے حسب الطلب مل کر عرض کیا کہ کہ جب تک بعض . . زمینداروں کو گرفتار کرکے محبوس نہ کیا جائے ممانعتِ باج راہداری کے احکام کا نفاذ اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ اس تیر کا نشانہ دراصل خوشحال خان تھا۔ شہنشاہ نے دوم سال جلوس (رمضان ۱۰۶۹ھ تا رمضان ۱۰۷۰ھ) میں غلہ و دیگر اجناس کا محصول راہداری ہمیشہ کے لئے معاف کر دیا تھا۔ اس عام بخشش سے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ اور زرِ مبلغ پچیس لاکھ نقد خالصہ شریفہ کی آمدنی میں

کم ہوگئے تھے یہ حکم زمینداروں اور جاگیرداروں کی آمدنی پر بھی اثر انداز ہوتا تھا شہنشاہ کا یہ حکم
کئی عمدہ زمینداران کو ناگوار گزرا ہوگا مگر اس امر کی قطعاً کوئی شہادت
نہیں کہ خوشحال خان نے اس حکم کے نفاذ کے بعد اظہار سرکشی یا سرتابی کیا ہو یا اس کے نفاذ
میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی ہو۔ وہ حسب سابق حکومت مغلیہ کے لئے اور رہ کچھ
اپنی ذاتی عداوت کے لئے یوسف زئیوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہا۔ سید امیر خان خوافی نے
. . یہ مفسدانہ چال محض خوشحال خان اور اپنے نائب متعین پشاور مرزا عبدالرحیم کے
درمیان ناراضگی اور خوشحال خان کے خلاف اس کے مچوں کے ساتھ سازش کو کامیاب
بنانے کے لئے چلی۔ سید امیر خان خوافی نے شہنشاہ سے یوں مبہم عرض[۲] کر کے "زبردستی
کے عمل[۱] کی اجازت حاصل کر لی اور بارگاہ بادشاہی سے رخصت کے بعد اپنے صوبہ
میں واپس آکر وسط جمادی الثانی ۱۰۷۴ھ (وسط جنوری ۱۶۶۴ء) میں خوشحال خان
کو پشاور میں بلا کر گرفتار کر لیا۔ دو مہینے تک خوشحال خان پشاور ہی میں محبوس رہا۔
اور اس کے بعد ہندوستان روانہ کر دیا گیا۔ جہاں وہ وسط رمضان (وسط اپریل)
میں دہلی پہنچا۔ سرکردہ عمائدین محمد امین خان۔ میر محمد امین۔ میر بخشی ولد میر محمد سعید میر جملہ
المخاطب بہ معظم خان خاناں اردستانی اور میر خان میر میران ولد خلیل اللہ خان
یزدی نے خوشحال خان کی رہائی کے لئے ہر چند کوشش کی۔ مگر بانی فساد سید
امیر خان خوافی برابر اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہا۔ چنانچہ اس نے شہنشاہ کو
لکھا کہ خوشحال خان کو رہا کرنا نقضِ امن کا باعث ہوگا۔ چنانچہ خوشحال خان کو
اڑھائی سال کے قریب دہلی اور رنتھمبور میں قید رہنا پڑا۔ اور پھر جب آگرے میں رہا
ہوا تو اس کے بعد بھی کافی عرصے کے لئے احتیاطاً اسے ہندوستان میں ٹھہرایا گیا
خوشحال خان نے بربنائے مصلحت منصب قبول کر کے حکومت کی ملازمت اختیار کر لی

ایام اسیری میں اس نے کئی ایک نظمیں لکھیں جن میں بعض بہت طویل ہیں۔ ان میں
وطن کی یاد اپنے گرفتار اور قید ہونے کے واقعات اور اپنی مظلومیت بے گناہی کا
ذکر ہے۔ ان میں سے ایک مسلسل غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

" اے بادِ نسیم اگر خیر آباد (سرائے اکوڑہ اور اٹک کے درمیان سرحد میں ایک گاؤں جس کے قریب ہی دریائے کابل اور دریائے سندھ کا سنگم ہے) پر تیرا گذر ہو یا سرائے اکوڑہ کے دریا کے کنارے تو چلے تو بار بار آداب و نیاز کے ساتھ میرا سلام ان سے عرض کیجو۔ (متلاطم و تیز رفتار) اباسیند (دریائے سندھ) کو چلا کر پکارنا اور (سبک خرام و ہموار) لنڈے (دریائے کابل) سے آہستہ، نرمی سے کہنا کہ شائد پھر تمہارے جام مجھے نصیب ہوں۔ . . . . جب ہند میں پہاڑ کا ٹھنڈا پانی نہیں تو میری اس سے توبہ۔ اگرچہ نعمتوں سے بھرپور ہی کیوں نہ ہو

اے خوشحال تو ہمیشہ ہند میں نہ رہے گا۔ انجام کار گنہگار کو جہنم سے نکالا جائے گا۔"

ایک اور غزل کا شعر ہے:۔

"پښتنې جونه دِ زلفې بادَ ته نیسي چه شمال مې بوئي راوړي په دغه کښې"

"افغان دوشیزائیں اپنی زلفوں کو ہوا میں لہرائیں تاکہ باد شمال ان کی خوشبو مجھ تک پہنچاتی رہے۔"

جب خوشحال خان وطن واپس آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد شہنشاہ کے حکم کے مطابق مہابت خان مرزا لہراسپ صوبہ دار کابل نے جس کا تقرر بجائے سید امیر خان خوانی ابتدائے سال یازدہم جلوس عالمگیری رمضان سنہ ۱۰۷۸-۹ھ میں ہوا تھا۔ لنگر کوٹ (موجودہ گڑھی کپورہ واقع تحصیل و ضلع مردان) میں یوسف زئیوں کو دبانے اور قابو میں رکھنے کے لئے قلعہ تعمیر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور خوشحال خان کو تعاون کے لئے کہا۔ اس سے پہلے سال دہم جلوس عالمگیری رمضان سنہ ۱۰۷۷-۸ھ میں قریباً آٹھ نو مہینے افواج حکومت ولایت یوسف زئی کو بشمول نواحی شہباز گڑھ و لنگر کوٹ تاخت و تاراج، تباہ و برباد اور نذرِ آتش کرتی رہیں۔ مہابت خان اپنے تقرر کے بعد سنہ ۱۰۷۹ھ میں اپنے محال پر پہنچا تھا۔ اور قلعۂ زیر بحث کی تعمیر کا ارادہ غالباً سنہ ۱۰۸۰ھ / ۱۶۶۹ء میں کیا

ایک تو خوشحال خان بے گناہ قید کئے جانے کی وجہ سے حکومت سے سخت ناراض اور اسکے خلاف معاہدانہ قسم کے خیالات موجزن تھے۔ اور دوئم اس کے ایام حبس میں یوسف زئیوں نے باوجود اپنی دیرینہ دشمنی سیاسی اختلافات اور سالہا سال کے کشت وخون کے خوشحال خان کے اہل وعیال کو اپنے علاقہ میں پناہ دے کر حمیت افغانی کا ثبوت دیا تھا۔ اس لئے خوشحال خان ان کا صد درجہ ممنونِ احسان تھا۔ ان وجوہ کی بناپر اس نے مہابت خان کے پیش کردہ منصب ہزاری اور ولایت یوسف زئی کی سرداری حکومت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تعاون سے انکار کردیا۔ اس نے حکومت کی اس تجویز کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مہابت خان کو اسے عملی جامہ پہنانے سے روکنے کی کوشش کی۔ اپنے ایک طویل قطعہ میں قلعہ کی تعمیر اور اپنی طرف سے یوسف زئیوں کی حمایت کی طرف ان دو شعروں میں اشارہ کرتا ہے :۔

- لنگر کوٹ مغلو ساز کړو   زه پښتنګ بیا د افغان شوم
- که یوسف زی که مند لږ دی   زه د دواړو نګهبان شوم

" مغلوں نے لنگر کوٹ بنایا تو میں افغانوں کی عزت کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور یوسف زئیوں اور مندڑوں دونوں کا نگہبان ہوا "

جب مہابت خان نے دیکھا۔ کہ خوشحال خان اس کے دام سیاست میں بہ تحریص و ترغیب یا اور کسی طرح نہیں پھنسے گا اور حکومت سے تعاون کرنے کا نہیں۔ تو اس نے خوشحال خان کو پریشان اور تنگ کرنا شروع کیا۔ وطن لوٹنے کے بعد باوجودیکہ خوشحال خان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مگر وہ چند وجوہ کی بنا پر جن میں سے اس کے اپنے بیان کے مطابق ایک سابقہ حق نمک کا پاس تھا۔ حکومت کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانا نہ چاہتا تھا۔ مگر ایک قلعہ لنگر کوٹ کی تعمیر نے اسے افغانوں کی عزت و آبرو بچانے کو اٹھ کھڑا ہونے کے لئے آمادہ کیا۔ اور پھر مہابت خان کے پریشان کرنے نے تو زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا اس اثنا میں روہ (ولایت افاغنہ) میں شورش کے آثار نمودار ہوئے۔

خوشحال خان نے جس کا جام صبر و تحمل بریز ہو چکا تھا۔ موقع کو غنیمت جانا وہ حکومت کے خلاف سرگرم عمل ہوا۔

۱۱ اخر ۱۰۸۳ھ (مارچ۔ اپریل ۱۶۷۲ء) میں شورش نے بڑی خطرناک صورت یار کر لی تھی جبکہ خوشحال خان کے قابل اور آزمودہ کار رفیقوں ایمل خان مہمند اور یا خان آفریدی کی زیر کمان وطن دوستوں کی ایک زبردست جمعیت آفریدیوں مدوں اور شنواریوں پر مشتمل تیار ہو گئی۔ شروع سال ۱۰۸۳ھ (اپریل ۱۶۷۲ء) وسط ذیقعدہ ۱۰۸۵ھ (فروری ۱۶۷۴ء) تک کوہ تہترہ (علاقہ ملاگوری) کے پاس، دوآبہ، نوشہرہ (ضلع پشاور) اور کرڑپہ (علاقہ مہمند) میں افغانوں مغلوں کے درمیان بڑی بھاری لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں افغانوں کو متواتر مات حاصل ہوتی رہیں۔ اور مغلوں کا بہت زیادہ مالی و جانی نقصان ہوا۔ پیہم کامیابیوں کی وجہ سے خوشحال خان کی پارٹی کا وقار و اقتدار بہت بڑھ ۔ اور چند اور قبائل بھی اس میں شامل ہو گئے۔

موخرالذکر مقام میں افغانوں کے ہاتھوں شاہی فوج کی تباہی کا حال معلوم کے شہنشاہ نے خود افغانوں کے خلاف فوج کی کمان ہاتھ میں لینے کا مصمم دہ کیا۔ چنانچہ گیارہ محرم ۱۰۸۵ھ (اپریل ۱۶۷۴ء) کو شہنشاہ نے حسن ابدال طرف کوچ کیا۔ شہنشاہ غالباً ربیع الاول کے مہینہ میں لاہور پہنچا۔ اگر پہلے پہنچا ہو تو اس مہینے کا کچھ حصہ لاہور ہی میں گذارا۔ خوشحال خان بھی دیہات بلہ خٹک کا دورہ کر چکنے کے بعد آفریدیوں کے علاقہ میران میں ماہ ربیع ول میں وارد ہوا۔ اور وہاں سے اورنگ زیب کی لاہور پہنچنے کی اطلاع پاکر جذبات کا اظہار کیا:۔

قل وته به هم کار بنکار کېږم — چه راضي واخېنه دوږه د فريدخان شي
ک زيب بادشاه زړه وک په لاهور داغي — کوره کاندي به شوک وان ټوک به ودان شي
لان د ننګيالي دي حاردده کا ـــه — يا به وخوري ګګرے پا به کامران شي

آزادی تو بادشاہی لا قیدے کا   چہ د بل تر حکم لاندے شی زندان شی"

یعنی :- وہ کام کر کے مغل کو دکھاؤں گا کہ فرید خان (شیر شاہ سوری) کی رُوح مجھ سے خوش ہو جائے گی۔ . . . . . . اورنگ زیب بادشاہ غم و غصّہ سے بھرا ہُوا دل لئے لاہور آ پہنچا ہے۔ دیکھو کل کون برباد اور کون آباد ہوتا ہے . . . . . . ایک غیرت مند انسان کے دُنیا میں دو ہی کام ہوتے ہیں یا تو وہ کامران ہوتا ہے اور یا اپنا سر قربان کرتا ہے . . . . . . آزادی بادشاہی سے بھی بڑھ کر ہے۔ دوسرے کا تابع فرمان ہونا ہی تو زندان ہے ۔"

شہنشاہ دو ربیع الثانی (اواخر جون) کو مع ایک کثیر التعداد فوج اور بے پناہ سامان حرب کے حسن ابدال پہنچ کر خیمہ زن ہُوا۔ حسن ابدال پنجاب میں راولپنڈی اور پشاور کے درمیان موخر الذکر مقام سے تقریباً اسی میل کے فاصلہ پر واقع ہے شہنشاہ آتے ہی افغانوں کے خلاف قوائے فوجی و سیاسی کے استعمال میں بڑے زور شور سے معروف ہُوا۔ شہنشاہ کے حسن ابدال میں ورود کی تاریخ سے مراجعت کی تاریخ (پندرہ شوال ۱۰۸۶ھ مطابق دسمبر ۱۶۷۵ء) تک افغانوں اور مغلوں کے درمیان بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں بعض بڑی بھاری اور خونریز تھیں ان میں کبھی حکومت اور کبھی افغانوں کا پلّہ بھاری رہا۔ اگرچہ شہنشاہ کی حسن ابدال سے واپسی کے وقت بحیثیت مجموعی صورت حالات بہت حد تک حکومت کے حق میں بدل چکی تھی۔ مگر شہنشاہ پوری کامیابی حاصل کر کے نہ لوٹا تھا۔ حسن ابدال سے کوچ کے بعد چند دن کالا باغ میں قیام کرنے کے بعد پندرہ ذی قعدہ (جنوری ۱۶۷۶ء) کو لاہور اور ۱۹ ذی الحجہ (فروری) لاہور سے روانہ ہو کر ۲۲ محرم ۱۰۸۷ھ (اواخر مارچ) کو دار السلطنت پہنچا۔

اس دوران میں خوشحال خان اپنی تلوار اور قلم و زبان کے ساتھ یکساں مغلوں کے خلاف سرگرم عمل رہا۔ اور افغان قبائل کے علاقوں کے دورے کر کے انہیں

جابر حکومت کے خلاف برسرپیکار ہونے کے لئے آمادہ کرتا رہا یکم جمادی الاوّل ۱۰۸۲ھ کو اس نے بریول علاقہ یوسف زئی میں جہاں وہ حکومت کے خلاف لشکر فراہم کرنے گیا تھا۔ ایک طویل نظم لکھی جس میں شورش کے ابتدا سے جنگ خاپش ربیع الاوّل ۱۰۸۳ھ) جس میں افغانوں کو بہت بڑی فتح حاصل ہوئی تھی تک کے حالات کے علاوہ افغانوں کو مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے لئے تلقین کی گئی اور اُن کی بے حسی کے سبب اُن پر ملامت کی گئی ہے۔ خوشحال خان کی یہ نظم زور بیان رفعتِ خیالات و شدتِ جذبات کے لحاظ اور تاریخی اعتبار سے اس کی بہترین نظموں میں سے ہے۔

" اب تو یہی نظر آرہا ہے کہ اس سرزمین سے مغلوں کا نام و نشان مٹا یا جائے یا افغان ذلیل و خوار ہوں ...... ایسے وقت میں جب کہ ننگ و ناموس بچانے اور نیک نامی حاصل کرنے کا وقت ہے یہ بے حمیت افغان کیا چال چل رہے ہیں اگر افغان کچھ اور سوچیں گے تو مٹ جائیں گے۔ بغیر تلوار کے نجات کا اور کوئی ذریعہ نہیں شمشیر زنی میں تو افغان مغلوں سے بہتر ہیں۔ کاش اس کے ساتھ کچھ سمجھدار بھی ہوتے جب قومیں آپس میں متحد ہوتی ہیں۔ تو بادشاہوں کو ان کی اطاعت قبول کرنا پڑتی ہے۔ نفاق و اتفاق اور جہل و علم ہر ایک (ہر شخص۔ ہر انسان) کا ہر ایک کام اللہ کے ہاتھ ہے۔ آہ دیکھو تو آفریدی، مہمند شنواری کیا کر رہے ہیں منل لشکر ننگر ہار میں ڈیرا ڈالے ہوئے۔ مجھ اکیلے ہی کو ان میں (یعنی یوسف زئیوں میں کیونکہ ان کے درمیان یہ نظم کہی گئی تھی) نیکنامی نام و ننگ اور عزت۔ یوسف زئی اپنی کھیتی باڑی میں خوش ہیں۔ اس وقت جو ایسی بے حمیتی اور بے غیرتی دکھا رہے ہیں تو اس کا انجام دیکھ لیں گے۔ میرے نزدیک موت اس زندگی سے بہتر ہے جو عزت و آبرو کے ساتھ نہ ہو

خوشحال خٹک ہمیشہ دنیا میں زندہ نہ رہے گا۔ لیکن اس کی یادگار دنیا میں باقی رہے گی۔ یکم جمادی الاوّل ۱۰۸۰ھ کو میں بریول میں یہ اشعار کہہ رہا تھا۔

اسی مہینہ اور سال میں جبکہ خوشحال خان بریول میں مغلوں کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ اس کے لڑکے نظام خان نے ۲۰ سال کی عمر میں اس دنیا سے رحلت کی۔ نظام خان کے مرثیہ میں خوش حال خاں نے اظہارِ غم و اندوہ کے ساتھ جس انداز کے ساتھ افغانیت کا اظہار کیا ہے وہ اس کے جوش و جذبۂ ملّی اور مغلوں کے خلاف آخری دم تک جاری رکھنے کی نیّت و ارادہ کا آئینہ دار ہے

کشکی ځوان کړی پښتانہ پہ ننگ کښی مړ وے — نہ چہ کور رنځور روان شہ تو لتک
چہ کړ قام پہ ننگ کښی وھو ځغلہ زویہ — پہ عالم کښی وبابا غاړہ کا لک"

"کاش عالم شباب میں افغانوں کی عزت کے لیے لڑتا ہوا مارا جاتا۔ بجائے اس کے کہ بستر سے قبر کو چل دیا۔ وہ بیٹا جو قوم کی عزت کے لیے مرتا ہے۔ وہ دنیا بھر میں اپنے باپ کی گردن کو اونچا کر دیتا ہے"

اور اس طوفان خیز جذبۂ ملی کا یہ ہیجان انگیز اظہار رنج و الم کے اس عالم میں ہوتا ہے:۔

"خوژ وندے پہ دنیا پایم خدائے دِنکا — ستا څہرہ ځما د زړہ لہ تختی حک
دَ نظام دَ غشی یو برابر ندے — کہ خوشحال پہ زړہ خوړلی ډیر ناوک"

"جب تک میں جیتا رہوں خدا نہ کرے کہ تیرا چہرا میرے لوحِ دل سے محو ہو۔ خوشحال نے دل پہ کئی تیر کھائے ہیں۔ مگر نظام (کی موت) کے تیر جیسا ایک بھی نہ تھا۔

شہنشاہ کے سفر واپسی میں لاہور سے روانگی سے پہلے حکومت کے وفادار قبیلہ بنگش اور خوشحال خان خٹک کے درمیان ۹ ذی الحجہ ۱۰۸۰ھ (فروری

۱۶۷۶ء کو بمقام گنبت جنگ ہوئی اور خوشحال خان خود زخمی ہوا

۱۷ شعبان ۱۰۸۷ھ (اکتوبر ۱۶۷۶ء) کو شاہزادہ محمد معظم کو شاہ عالم بہادر کا خطاب دیکر شہنشاہ نے مہم افاغنہ پر متعین کیا اور شاہزادہ مذکور کی سفارش سے اعظم خاں محرم ۱۰۸۸ھ (مارچ ۱۶۷۷ء) میں کابل کا صوبہ دار مقرر ہوا

شاہزادہ کے ساتھ شہنشاہ نے امیر خاں کو بھی ہندوستان سے ولایت افاغنہ کی جانب رخصت کیا تھا۔ انہوں نے وہ پہنچ کر افغانوں کے ساتھ مصالحت کی کوششیں شروع کیں۔ یہ مساعی بارآور ہوئیں۔ خوشحال خاں نے شاہزادہ کے پاس جا کر اس کی ملازمت اختیار کی شاہزادہ اور امیر خان دونوں نے خوش حال خاں کی بڑی خاطر و مدارات کیں۔ جب شہنشاہ کو اس بات کا علم ہوا کہ خوشحال خان نے شاہ عالم بہادر کے پاس جا کر ملازمت اختیار کر لی ہے تو اس نے شاہزادہ اور امیر خان کو لکھا۔ کہ خوشحال خاں کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور جس طرح اور جس منصب سے وہ خوش ہوتا ہے اسے راضی کیا جائے۔

چنانچہ جب بادشاہ کی متذکرۃ الصدر ہدایت شاہزادہ و امیر خان کو ملی۔ تو شاہزادہ نے سیف خان کے ذریعہ خوشحال خان کو کہلا بھیجا۔ کہ "بادشاہ نے تمہیں ہزاری دو ہزاری منصب مرحمت کیا ہے۔ تم اسے قبول کرو" خوشحال خاں نے جواب دیا کہ "بادشاہ کی طرف سے مجھ پر ستم ہوا ہے۔ میں بادشاہ کی نوکری کی خواہش نہیں رکھتا۔ اگر خدا نے تجھے بادشاہ کیا تو پیری میں بھی تمہاری نوکری کروں گا۔"

مختصر یہ کہ خوشحال خان مورد عنایات ہو کر واپس ہوا۔ اور مغلوں اور افغانوں کی آپس میں صلح ہو گئی۔ اس صلح کی چند وجوہات جو ہم قیاس کر سکتے ہیں۔ وہ پانچ سالہ جنگ سے فریقین کا نقصان۔ حکومت کے سامنے سلطنت کے دیگر حصوں میں معاملات و مشکلات اور بادشاہ کے حسن ابدال آنے کے بعد جنگ کے رخ کا حکومت کے حق میں بدلنا اور اس کی مراجعت کے وقت بحیثیت مجموعی حکومت کا غلبہ ہونا۔ اور شاہزادہ اور امیر خان کے ولایت افاغنہ میں ورود کے وقت

فریقین کا خشک سالی اور قحط کے اثرات سے پریشان ہونا ہیں۔ علاوہ بریں امیرخان کے والد خلیل اللہ خان اور چچا (صالت خان (میر عبدالہادی) کے ساتھ دیرینہ تعلقات اور خوشحال کے گرفتار ہونے کے بعد اور قید کے دوران میں اس کے ساتھ امیرخان کے احسانات بھی اس صلح کے محرک ہوئے۔ مگر جیسا کہ جلد ہی عرض کر دیا جائیگا صلح کا سبب زیادہ تر افغانوں کی بے حسی اور غفلت اور خوشحال خاں سے خصوصاً اپنے قبیلہ کی روگردانی اور بیٹوں کی مغلیت تھی۔ جن میں بہرام خان علی الاعلان نہایت بے حیائی سے اس کے خلاف شمشیر بکف اور لشکر کش تھا۔

شاہ عالم بہادر کابل ۲۵ جمادی الآخر ۱۰۸۸ھ (اگست ۱۶۷۷ء) کو پہنچا اور کابل میں چند مہینے قیام کرنے کے بعد چھ ذی الحجہ ۱۰۸۸ھ (جنوری ۱۶۷۸ء) کو واپس دہلی پہنچا۔ امیرخان اپنے محال پر مندرجہ بالا واقعات کے بعد ۲۷ ربیع الآخر ۱۰۸۹ھ (جون ۱۶۷۸ء) کو پہنچا۔

مغلوں اور افغانوں کے درمیان صلح کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ بلکہ اس صلح کا جو حشر ہونا تھا۔ وہ خوشحال خاں کی ایک غیر فانی نظم سے ہی ظاہر ہے۔ جو اس نے چوترہ (علاقہ خٹک ضلع کوہاٹ میں ایک وادی) سے شاہزادہ کے پاس روانگی کے بعد کہی تھی :-

"بے غیرت افغانوں کے غم سے میں نے اونچائی کو چھوڑ کر نیچائی اختیار کر لی۔ خیر اگر اس طرح ہی مجرم (ظالم) سے انتقام لینے کی سبیل نکل آئے تو اچھا ہی ہے۔ جب میرا گوہر حمیت ٹوٹ گیا۔ تو روتے روتے میں نے دم بھر کے لئے آنکھوں کو بے نم نہ ہونے دیا۔ وہ موتی (گوہر مقصود) میرے ہاتھ نہیں آ رہا۔ سو میں نے کشتی سمندر سے لا ساحل پر کھڑی کر دی۔ آہ میری وہ کمر جو قوت۔ عزم و استقلال کے لحاظ سے ایک کوہ عظیم تھی چار و ناچار میں نے مغل کے آگے خم کر دی۔ بخت نے بھی اور لوگوں نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا اس لئے غم والم سے میں نے منہ مغل کی طرف

کر لیا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو طوعاً مغل کی طرف دو قدم بھی نہ چلتا۔ اب اُن کے منہ سے ٹیڑھی باتیں سن رہا ہوں۔ جن سے میں نے کبھی سیدھی بات بھی نہ کی تھی۔ اگرچہ ہر چند میں اپنے تئیں مذمت سے بچاتا تھا۔ مگر جان گیا کہ اپنے پرائے میری مذمت کر رہے ہیں۔ ان بڑے بولوں کے سبب شرمسار ہوں۔ جو ہر ایک کے سامنے مُنہ سے نکالا کرتا تھا۔ مجھ پر سینکڑوں طرح کی لعن طعن ہونے لگی۔ حالانکہ ہمیشہ میں اپنے آپ کو ملامت سے بچاتا تھا۔ اگرچہ میں نے ہزاروں آلام دیکھے ہیں۔ لیکن میرا یہ الم سب سے بڑھ کر ہے۔ شاید بخت پھر میری یاوری کرے اور مجھے اس غم سے نجات دے دے گا"

اس نظم سے قارئین کرام صلح کے سبب اصلی کے متعلق بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں یہ نظم خوشحال خان کے ان جذبات و رنج قلبی اور ذہنی کوفت و تکلیف کی بھی آئینہ دار ہے جو صلح کے لئے شاہ عالم بہادر کے پاس جاتے وقت ہی صلح کی ناپائیداری کو ظاہر کر رہی تھی۔

امیر خان نے میدانِ کارزار میں بھی اور بساطِ سیاست پر بھی خوشحال خان اور اس کے رفقاء کو پیہم شکستیں دیں

رجب ۱۰۹۱ھ ۱۶۸۰ء میں خوشحال خان نے بمقام دودہ ضلع کوہاٹ بنگشوں کو شکست دے کر جنگ گنبت میں اپنی شکست کا انتقام لیا۔ اس کی حکومت کے خلاف آخری کامیابی تھی۔ مگر اس سے اس صورتِ حالات میں جو حکومت کے حق میں عرصے سے رونما ہو چکی تھی۔ کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوئی

۹۳-۱۰۹۲ھ میں امیر خان نے خوشحال خان کے بڑے لڑکے اشرف خان ہجری کو گرفتار کرا کے ہندوستان روانہ کر دیا۔ جہاں وہ دکن (بیجاپور) میں قید کر دیا گیا۔ اس کی گرفتاری میں بھی بہرام خان نے اپنا غدارانہ پارٹ ادا کیا۔

امیر خان کی فوجی کامیابیاں خوشحال خان اور اس کی پارٹی کے لئے آتی مصرت تھا.

نہ ہوئیں جیتنی اس کی سیاسی چالیں ۔ اس نے افغانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کر کے ان کا اعتماد حاصل کیا ۔ اور انہیں آپس میں لڑانا شروع کر دیا اور ایمل خاں اور دیگر افغان قبائلی سرداروں میں پھوٹ ڈال کر افغانوں کی جمعیت کو منتشر کر دیا ۔ ایمل خان اور دریا خان کی موت کے متعلق یہ تو معلوم ہے کہ کب اور کیسے واقع ہوئی البتہ وہ دونوں خوشحال خان سے پہلے ہی اس دنیا سے چل بسے تھے ۔ اور خوشحال خاں نے باوجود پیرانہ سالی قوم اور قبیلے کے نفاق اور ناخلف بہرام خان کی سرکشی و تمرد کے حکومت کے خلاف اپنی جد و جہد جاری رکھی ۔ مغل رشوتوں اور مناصب کے ذریعہ افغانوں کو خرید رہے تھے ۔ اور ان میں آتش رشک و حسد لگا اور بھڑکا رہے تھے ۔ مگر یہ بوڑھا سپاہی اکیلا، یکہ و تنہا ایک طرف ایمل خان و دریا خاں کی جدائی میں رہین ماتم اور دوسری طرف مغلوں کے خلاف شمشیر بکف اور سرگرم عمل تھا ۔ چنانچہ کہتا ہے :۔

" جب مغلوں کو دیکھتا ہوں تو وہ پرانے مغل اب نہیں رہے ۔ ان کا تلواروں کا دور گذر چکا ہے اور اب صرف قلم ہی ان کے پاس رہ گیا ہے افغانوں کو روپیہ اور مکر و فریب کے پھانس رہے ہیں ۔ البتہ مجھ پر ان کا اثر نہیں کہ مجھ پر اللہ کا فضل ہے ۔ میں نہ مکھی اور نہ کوا ہوں کہ گندگی پر منڈلاؤں کا ۔ میں باز یا شاہین ہوں اور اپنے شکار سے میرا دل خوش ہے ۔ اگر میری طرح کوئی اور بھی ہوتا ۔ تو اس بات سے میں بہت خوش ہوتا ۔ مگر میں زیر بار الم تو اسی لئے ہوں کہ میری طرح اور کوئی نہیں ایمل خان اور دریا خان دونوں اچھی طرح عزت و آبرو سے گذر گئے ، ان دونوں کے فراق میں میں ہمیشہ آہ و ماتم کر رہا ہوں "

ایک اور جگہ کہتا ہے :۔

" چیتانہ نکہ مکس ورباندی گرزی   ورتہ ولیبی دمغل دحلوا تال دے

نولے وایہ تیکئے تار پہ تار خور ے شو   اوس چہ منم کښی لو کرم د ذوالجلال دے
ایمل خان دریا خان وایہ خوړ دبین ولاړل   اوس خو پاتے مغل تہ یو خوشحال دے"

" افغانوں کے آگے مغلوں نے ملوبے کا تھال رکھا ہوا ہے اور وہ مکھیوں کی طرح اس پر بھنبنا رہے ہیں۔ باقی سب آسرے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اب تو صرف ذوالجلال کے کرم پر بھروسہ ہے۔ ایمل خان اور دریا خان دونوں بحکم رسم مردان دانا چلے گئے، اب تو خوشحال اکیلا مغلوں کے مقابلے کے لئے رہ گیا ہے"

الغرض کچھ تو افغانوں کے نفاق اور مغلوں کے انعامات واکرامات اور القاب ومناصب کے لئے ان کی باہمی رقابت اور کچھ خوشحال خان کے بیٹے بہرام خان کی ناخلفی اور غداری کی وجہ سے خوشحال خان کو کامیابی نہ ہوئی۔ بلکہ بہرام خان نے کئی بار اس کے گرفتار کرنے کی کوشش بھی کی مگر وہ اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ان حالات میں خوشحال خان کے لئے مقابلہ جاری رکھنا ممکن نہ رہا تھا چنانچہ اسے انجام کار آفریدیوں کے علاقہ میں پناہ لینی پڑی۔ عاق بہرام خان کی ہجو و مذمت میں خوشحال خان نے کئی ایک شعر اور نظمیں کہی ہیں۔ مختلف نظموں سے چند شعر درج ذیل ہیں:-

"څوک بهرام غوندے منحوس بدبخت بخیل شی   چہ شامت ئی خیل خانہ شی تار په تار"

" کوئی بہرام جیسا منحوس، بدبخت اور بخیل پیدا ہو جاتا ہے جس کی شامت سے سارا خاندان پریشان ہو جاتا اور بکھر جاتا ہے"

"د بهرام لښکرے پرتے په تیری کښی   امید شته چه خدای ئی زر کا شرمسار"

" یعنی بہرام کی فوجیں تیری اکوڑہ خٹکوں کا صدر مقام ہے میں پڑی ہوئی ہیں امید ہے کہ خدا اسے جلد شرمندہ کر دے گا"

"دا هم ځای د تعجب کړه ئی وینے   چه لښکرے په خوشحال کا بهرام خان"

" اگر دیکھو تو یہ بھی تعجب کا مقام ہے کہ بہرام خان (بیٹا) خوشحال (باپ) کے

خلاف لشکر پہ لشکر جمع رہا ہے "

"مشوم بہرام ہم دخان غم شو زہ ھم غم ذدہ دخان مشوم"

" منحوس بہرام میرے لئے اور میں اس کے لئے وبال جان ہوگیا "

" نہ دایو عیب لما نہ سل ھنرہ چہ بہرام لما پسر زہ ئی پدار یم"

"یعنی میرا یہ ایک عیب میری سو خوبیوں کے مٹانے کو کافی ہے ۔ کہ بہرام میرا بیٹا اور میں اس کا باپ ہوں "

"نور دلوم دمادزوی پہ شمار شہ دخوشحال خٹک وینا پدا تمام"

" خوشحال خٹک کا اٹل فیصلہ یہی ہے کہ آئندہ تیرا نام اس کے بیٹوں میں شمار نہ ہو "

آخر یہ افغانی مجاہد سنسنی خیز و حیرت انگیز کامیابیوں کے بعد جن سے اس نے " خاطر او زنگ کو دا غدار کر رکھا تھا " آفریدیوں کے علاقہ میں ۲۸ ربیع الثانی شمسی مہینہ حوت (اسفند ارمذ) کی پہلی تاریخ کو بروز جمعہ ۱۱۰۰ھ (فروری ۱۶۸۹ء) کو بعد یاس و حرمان و حسرت و ارمان اٹھتر سال کی عمر میں خود دل پہ داغ ناکامی لئے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوا ۔ وہ یہ سب کچھ بہت پہلے سے ہی دیکھ رہا تھا ۔ چنانچہ مرنے سے بہت پہلے اپنے انجام کو دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اس نے یہ شعر کہا تھا ۔

"پښتانہ چہ بے ننگی کاخوک ئی غمہ کا گورستان لوہ بہ درومولہ ارمان"

" افغان جب بے غیرتی پر تلے ہوئے ہیں تو کیا کیا جائے آخر حسرت و ارمان کے ساتھ ہمیں گورستان جانا ہوگا "

اس کے فرزند گوہر خان نے اس کی وفات کی مندرجہ ذیل تاریخ فارسی میں لکھی ہے :-

" خان خانان و قدوہ افغاں آں یکے سر خرد مندان

چوں بہ ہفتاد و ہشت سال شدہ
چو الف بود ہمچو دال شدہ!

روز آدینہ بود چو ز جہاں
رفت و ماندیم ما بہ آہ و فغاں

غرۂ ماہ بود آں حوت
کہ بہ لب می نہاد مہر سکوت

بست و ہشتم ربیع آخر بود
کہ خطا زین جان پاک او بر بود

چوں زتار یخ فوت خان خبرم
شندہ ز مار رفتہ زیں جہاں پدرم

۱۱۰۰ھ

خوشحال خان کے بڑے فرزند اشرف خان ہجری جو کئی سال سے بیجاپور میں قید بھگت رہا تھا۔ باپ کی وفات کے متعلق مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہا ہے :۔

" رفت آں میر روہ شاہ خٹک
کہ بہ خوبی امیر افغان بود

بلکہ افغاں ہمہ چو تن بودہ
اندر وادی بر تبہ جاں بود

ماہ و تاریخ فوت او جستم
خردم زیں قبیل سخن راں بود

روز آدینہ از ربیع دوم
بیست و ہشتم ۔۔۔ بود

سالِ ہجراں او اگر خواہی
"مولِد خیر مجد دا احسان بود

۱۱۰۰ھ

" خیر عالمیان" مادۂ تاریخ ولادت تھا اور "مولدِ خیر مجد و احسان بود" مادۂ
۱۰۲۲ھ ۱۱۰۰ھ

تاریخ وفات ہوا۔

آپ نے انتقال سے پہلے حسب ذیل وصیت فرمائی :۔

" میری قبر ایسی جگہ بنانا جہاں میری خاک پر مغلوں کا سایہ تک نہ پڑ سکے اور مغل شہسواروں کی گرد سمند میری قبر تک نہ پہنچنے پائے اور چونکہ مغلوں کی بہترین فوجوں کو میں نے خس و خاشاک کی طرح اڑایا ہے۔ اس لیے میری قبر کو پوشیدہ رکھا جائے تاکہ وہ اس کی بے حرمتی نہ کرنے پائیں"

یہی وہ وصیت ہے جس کو علامہ اقبال ؒ نے آئینہ دار عزت و عظمت نفس

اور خودداری جان کر بہ نظر استحسان دیکھا اور یوں اردو نظم کا جامہ پہنایا

"قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم | کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے | ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں | کہستان کا یہ بچہ ارجمند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ | مغل شہسواروں کی گرد سمند"

خوشحال خاں کی لاش کو سرائے اکوڑہ سے کچھ فاصلہ پر بمقام اسوڑی سپرد خاک کیا گیا۔ اور کافی عرصہ تک اس کی قبر کو پوشیدہ رکھا گیا

میں نے خوشحال خان کے انجام کو ناکام اور حسرتناک کہا ہے بہ الفاظ دیگر اسے بدقسمت و بدنصیب کہا۔ یہ اس لئے کہ وہ مقصد جس کے لئے خان نے سر توڑ کوشش اور آخری دم تک جد و جہد کی حاصل نہ ہوا اور وہ گوہر مقصود جس کے لئے اس نے دریائے خون میں شناوری کی ہاتھ نہ آیا۔ اس لئے کہ خان کے اپنے خیال میں وہ خوش قسمت نہ تھا اور ارمانوں سے بھرا ہوا دل لئے قبر میں جا رہا تھا۔ مگر ظلم و زیادتی کے خلاف تلوار اٹھانا، اس سے برسر پیکار ہونا نسلی برتری کے احساس اور اس کے نتائج کے مٹانے کے لئے سرگرم عمل ہونا اپنی اور اپنی قوم کی عزت و شان کے تحفظ اور حصول آزادی کے لئے لڑنا ایک ایسا اولوالعزمانہ کارنامہ ہے جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ خوشحال بدنصیب و ناکام نہ تھا۔ بلکہ خوش بخت و بلند اقبال تھا۔ وہ اپنے سپاہیانہ و شجاعانہ اور علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ زندۂ جاوید رہے گا۔ جب تک ایک حریت پسند ذی نفس بھی روئے زمین پر باقی ہے خوشحال کا نام باقی رہیگا

خوشحال خاں کی اولاد

خوشحال خان نے کئی شادیاں کی تھیں۔ آپ کے قریباً ساٹھ[۶۰] بیٹے اور ساٹھ[۶۰] لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے کئی ایک آپ کے عین حیات میں داغ مفارقت

دے گئے تھے۔ اولاد میں بھی کئی شعرا اور ادبا ہوئے جن میں سے اشرف خان ہجری، عبدالقادر خان، صدر خان، سکندر خان، گوہر خان اور بی بی حلیمہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

تصنیفات

۱ - دیوان یا کلیات خوشحال خان - ایک قصیدہ میں جو محرم ۱۰۹۵ھ میں لکھا گیا۔ اس وقت تک دیوان کے اشعار کی تعداد تقریباً چالیس ہزار تھی۔ انتقال کے وقت دیوان کے اشعار کی تعداد ۴۰ - ۵۰ ہزار کے درمیان قیاس کر سکتے ہیں۔ مگر مطبوعہ مجموعہ کلام اشعار اس تعداد سے بہت کم ہیں۔ دیوان زیادہ تر پشتو بعض فارسی اور چند ذو لسانین (فارسی و پشتو اور پشتو ہندی اشعار) نظموں پر مشتمل ہے۔ اصناف سخن جن میں خان نے طبع آزمائی کی حسب ذیل ہیں :-

غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی، مربع، مخمس، مسدس، معشر ترکیب بند (جن میں ایک ذو القافیتین بھی ہے) اور ترجیع بند

۲ - باز نامہ (نظم) بازوں کے امراض اور اُن کے علاج وغیرہ کے متعلق ہے۔ (دیوان میں بھی اس مضمون پر نظمیں ہیں)

۳ - صحت البدن - حفظانِ صحت اور طب کے متعلق ہے

۴ - ہدایہ - فقہ اسلامی کی مشہور کتاب ہدایہ کا عربی سے پشتو میں ترجمہ ہے۔

۵ - آئینہ - فقہ کی کتاب ہے عربی سے پشتو میں ترجمہ ہوئی

۶ - فضل نامہ منظوم مذہبی و فقہی مسائل ہیں

۷ - دستار نامہ - متفرق نثری مضامین جو سیاست تہذیب و اخلاق و شکار و لعب وغیرہ کے متعلق ہیں کا مجموعہ ہے۔

۸ - سوات نامہ - تقریباً چار سو اشعار پر مشتمل ایک مثنوی ہے جس میں سوات و سفر سوات، چند تاریخی اور قومی جد و جہد کے حالات بیان ہوتے ہیں۔ کچھ تھوڑی سی ادبی تنقید بھی ہے

۹۔ فرخنامہ۔ مناظرۂ شمشیر و قلم

۱۰۔ خاندانی اور ذاتی حالات جن سے اکثر صاحب تاریخ مرصع اقتباس کرتا ہے

خوشحال خاں نے ایک قسم کا شارٹ ہینڈ بھی ایجاد کیا تھا جس کا نام زنجیری تھا۔ مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ آپ کی اور تصنیفات کے متعلق بھی کہا جاتا ہے مگر افسوس سوائے کلیات یا دیوان خوشحال خاں کے اس کے اکثر علمی و ادبی آثار یا تو ناپید ہیں۔ یا بہت ہی کمیاب۔

عقائد اور اخلاق و عادات

آپ ایک راسخ الاعتقاد حنفی مسلمان تھے۔ مرد صالح اور عالم باعمل۔ غیر متزلزل ارادہ کے مالک بہت شجاع اور بہادر، خوددار اور سخی و فیاض تھے۔ باوجود خانی و سرداری وضع قطع فقیرانہ تھی، باوجودیکہ بادشاہوں اور ان کے درباروں سے تعلق رہا۔ لیکن قصیدہ گوئی اور مدح سرائی نہیں کی۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

"دھغہ شاعر مخ تورشہ چہ پہ طمع وھر و دوھر دربار و تہ ولاڑ ہ شي"

"یعنی اس شاعر کا منہ کالا ہو جو لالچ کیلئے ہر دور دربار کے سامنے کھڑا ہو"

کلام اور واقعات زندگی کے مطالعہ سے گفتار و کردار میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے، صاف گو اور گفتگو میں آزاد اور بے باک تھے، کتب بینی اور شکار اور باز اور گھوڑے رکھنے کا بہت شوق تھا، یہ شوق پیرانہ سالی میں بھی دامن گیر رہا ہے

"غابس وتلی بیرہ سپینہ لا تر او سہ باز پہ لاس کہ زم پہ غر و نو پہ جبال"

"دانت گر پڑے اور ڈاڑھی سفید ہو گئی۔ مگر ابھی تک باز بدست پہاڑوں اور کہساروں میں پھر رہا ہوں"

شاعری

اگرچہ خوشحال خان کی شاعری کا مابہ الامتیاز پہلو اس کا قومی، وطنی اور حماسی حصہ ہے

اور زیادہ تر وہ افغانوں کے قومی شاعر کی حیثیت ہی سے جانا اور پہچانا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ خوشحال خان کی شاعری جامع ہے اور حیات و فکر انسانی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو۔ جس کی اس میں عکاسی نہ کی گئی ہو۔ مولانا عبدالمجید صاحب سعدی افغانی مرحوم دیوان خوشحال خان مطبوعہ ہوتی ضلع پشاور (حال مردان) ۱۹۲۹ء کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں "ایک سردار اور شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک زبردست فلسفی اور حکیم تھا جسے اپنی قوم کے تمام سررشتے خوبیاں اور ساری اخلاقی کمزوریاں اچھی طرح معلوم تھیں اور جیسا مرض تھا ویسا ہی علاج تجویز کیا۔ اس کی ساری عمر سرگرمی میں گزری اور شب و روز لڑائیوں میں معروف رہتا۔ مگر اس کے باوجود کوئی ایسا خیال نہیں جو اس کے دیوان میں نہ ہو"

حمد

حمد و مناجات میں بھی خوشحال خان کے حریت پسندانہ خیالات کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

"تہ دائم خی ایہ موجود ے	وجود د ھر چا دے دِ تا لہ جود ے

معبود بل نہ لرم معبود م تہ ئے	معبود م بل مکہ ء تہ معبود دہ ئے۔"

"اے میرے ازلی، ابدی موجود خدا، ہر ایک کا وجود تیرے جود سے ہے،
میں دوسرا معبود نہیں رکھتا۔ تو ہی میرا معبود ہے، اے میرے معبود کسی
اور کو میرا معبود نہ ہونے دیجیو"

رباعی۔ اختصار کلام، جامعیت، کثرت معانی، خوبی زبان اور حسن بیان کے لحاظ سے بے نظیر ہے جس میں ذات باری، اس کے ازلی و ابدی ہونے۔ اس کی صفت خالقیت اور اس صفت کے ہمہ گیر ہونے اور ساتھ ہی عنایات (الہی الفاظ جود کے استعمال سے) اور توحید کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی نہایت عمدگی سے دنیاوی خداؤں کے اقتدار سے نجات چاہی ہے۔

نعت

متعدد نعتیہ قصائد و غزلیات میں سے صرف دو قصائد کے چند اشعار پیش کرتا ہوں :-

دخدائے عرفان م وشو پہ عرفان د محمد ... پاک دے محمد پاک دے سبحان د محمد
درست خلق کہ یو کرے انس و جن د واڑہ جہان ... لا ترواڑہ بہ دے کو تنہا جہان د محمد

"عرفانِ الٰہی مجھے عرفانِ محمدی ہی کے ذریعہ حاصل ہوا، محمدؐ کا سبحان بھی پاک اور محمدؐ بھی پاک ہے۔ اگر خدا کی ساری مخلوق انس و جن اور دونوں جہانوں کو اکٹھا کرو تو ان سب سے ذاتِ محمدی تنہا بدرجہا افضل ہے۔"
جس طرح طلوعِ آفتاب کے بعد ستارے معدوم ہو جاتے ہیں اسی طرح نبی کریمؐ کے بعد انبیاءِ کرام کی آمد کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ آپ نے سارے جہان کا مقابلہ اکیلے تن تنہا کیا، ہر طرف دشمنوں کا ہجوم تھا۔ مگر آپ نے اس کی فکر نہ کی۔ شاہانِ عالم خواہ چین، ہند یا روم کے ہیں سب اپنے تئیں آپؐ کا غلام سمجھتے ہیں۔"

ملی اور وطنی شاعری

اگرچہ خوشحال خاں کے سوانح حیات بیان کرتے ہوئے ہم تاریخی پس منظر کے ساتھ ہی اس کے وطنی اور جنگ آزادی سے متعلق کلام کے چند اقتباسات ہدیۂ قارئین کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے قومی، وطنی اور حماسی اشعار کے چند اور نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ ذیل کے چند اشعار میں جو ایک غزل سے ماخوذ ہیں وہ اپنی قوم پر تنقید کرتے ہوئے اسے اپنی تاریخ اور گذشتہ عظمت و شوکت کی طرف توجہ دلاتا ہے:-

"اچھے آدمی لعل و یاقوت کی طرح نایاب ہیں۔ ہونگے لوگوں کی پتھروں کی طرح کمی نہیں، اگر اور قوموں میں اچھے آدمی ہوں تو ہوں گے مگر افغانوں

میں اچھے آدمی بہت ہی کم ہوں گے۔ ہر چند انہیں نصیحت کی باتیں کہو لا حاصل، نصیحت تو باپ کی بھی انہیں اچھی نہیں لگتی۔ یوں تو مخلوق سے اور ہر کام افغانوں کا اچھا ہے، مگر افسوس یہ ان میں اتفاق پیدا نہ ہو سکا بہلول (لودھی) اور شیر شاہ (سوری) کے قصے سنتا ہوں جو ہند میں افغان بادشاہ تھے۔ چھ سات پشت ان کی ایسی حکومت تھی کہ سارے لوگ انہیں دیکھ کر محو حیرت تھے۔ یا وہ افغان اور تھے اور یہ آج اور ہو گئے یا اب خدا کا حکم ہی یہ ہے کہ افغان کا برا حال ہو۔ اگر افغان اتفاق کی توفیق پائیں تو بوڑھا خوشحال پھر جوان ہو جائے گا۔"

ایک اور قطعے میں اپنے حسرتناک جذبات کا یوں اظہار کیا ہے:۔

"چه مغل وته م د توره لو کړ   پښتانه م د عالم وته ښکاره کړه
اتفاق په پښتانه کښې پیدا نشو   گنې ما به د مغل گریوان پاره کړه"

"جب میں نے مغلوں کے خلاف تلوار اٹھائی تو سارے افغانوں کی شان کو آشکارا کر دیا۔ افغانوں میں اتفاق پیدا نہ ہوا ورنہ میں مغل کے گریبان کو پارہ پارہ کر دیتا۔"

اپنے بیٹوں کی بے اتفاقی اور مغلوں کے مناصب پر اترانے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"ما دولت درته گټلی و په توره   دا ځما د تورے نقش ئې آدره کړ"

"میں نے ان کے لئے بزور شمشیر بادشاہی حاصل کی تھی۔ مگر انہوں نے میری تلوار کے نقش کو مٹا دیا۔"

اسی قسم کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں:۔

"لا په خوب کښې په لوزه پرلوزی لگیته   چه د چا تو غوږ ځما د تورے شوبنگ شے
که پلا دوړم گور سے هغه زړه یم   چه م داغ په خاطر هبنی د اورنگ شے
د دست جهان م د مغل وته خیبر کړ   خلئے په ځائے پښتانه وته ملنگ شے

غنی زه لوے دعوے لرم په زړه کښې   ولے خدائے کرم چه پښتون وارہ بے ننګ شوئے

"وہ جس کے کانوں تک میری تلوار کی جھنکار پہنچ چکی ہے وہ اب بھی لرزتا ہوا چارپائی سے گر پڑتا ہے، آؤ دیکھو اس زمانہ میں میں ہی تو ہوں جس کے خاطر اورنگ کو دا غدار کر رکھا ہے، ایک خیبر کیا، سارے ملک کو میں نے مغل کے لئے خیبر بنا رکھا ہے۔ اور جگہ جگہ افغانوں کو خراج ادا کر رہے ہیں۔ دل میں تو بڑے بڑے دعوے ہیں۔ لیکن آہ کیا کروں افغان سب بے حمیت ہیں۔"

قصیدہ یرمول کے ابتدائی حصے کے بعض اشعار جو لفظی و معنوی اعتبار سے شوکت و ہیبت سے پُر اور رزمیت و حماسیت سے لبریز ہیں مع ترجمہ ہدیۂ قارئین ہیں:۔

پښتنو ځلیمو بیا لاسونه سره کړه   لکه باز منګلی سرے کا په ښکار

سپینې تورې ګلګونې کړے په وینو   په اهار کښې شګفته شو لالهٔ زار

ایمل خان دریا خان دواړه مرګ ئی نه مے   هیڅ تقصیر دواړه په ننګ وکړه په وار

دَ خیبر دره ئې سره کړله په وینو   په کرپه ئې هم بدن ګړ وهلو کار

تر کرپے تر باجوړه ممه غش وه   په لرزه په زلزله شول بار په بار

"افغان نوجوانوں نے پھر اپنے ہاتھوں کو سرخ کر لیا۔ جیسے باز اپنے شکار سے چنگل سرخ کیا کرتا ہے۔ سفید تلواریں انہوں نے لہو سے گلگوں کر لیں اور اساڑھ (کے مہینے) میں لالہ زار کھل گیا ہے۔ ایمل خان دریا خاں اُن دونوں کو خدا موت سے بچائے۔ انہوں نے اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی، خیبر کے درہ کو بھی لہو سے سرخ کر دیا۔ اور کرپہ میں بھی توپیں گرجنے لگیں۔ کرپہ سے باجوڑ تک میدانوں اور پہاڑوں کو لرزہ اور بھونچال نے آ لیا۔"

دوسرے شعر میں سفید تلواروں کو لہو سے گلگوں کرنے اور اساڑھ میں لالہ زار

کھلنے میں جنگ عمایش میں غالباً افغانوں کی فتح عظیم کی طرف اشارہ ہے جو تاریخ نظم دیکھ جمادی الاول ۱۰۸۳ھ سے تھوڑا عرصہ پہلے جون کے مہینہ (ماہ ربیع الاوّل) میں ہوئی تھی۔

ہندوستان میں قید خانہ سے باد نسیم کے ذریعہ اباسیند (دریائے سندھ) اور لنڈے (دریائے کابل) کو جو پیام وسلام بھیجا تھا ۔ اور جس مقصد کے لئے افغان دوشیزاؤں سے ہوا میں زلفیں لہرانے کی خواہش کی تھی وہ آپ پڑھ چکے ہیں ۔ اب ایک رباعی کا ایک شعر اور ایک دوسری رباعی پوری نقل کی جاتی ہے ۔ جن سے حب الوطنی کے بلند ترین جذبات ہویدا ہیں :-

"خبے دی تر مشکو د وطن خاوره قدے اوبه دی د وطن وادیر"

"یعنی خاک وطن مشک سے اچھی اور وطن کا گرم پانی برف کی طرح خوشگوار ہے"

اور

"د وطن ونے چندن ترا کر دی خاورے ئی وار ه مشک وعنبر دی
سوانے کہ نوروو تہ سنگر د ے کا تری ئی وار ه ماتہ سرہ زر دی"

"یعنی وطن کے درخت سارے صندل وعود ہیں اور اس کی مٹی مشک وعنبر ہے ۔ اگر سرائے اکوڑہ اوروں کی نظر میں ایک پتھریلی سنگلاخ زمین ہے (تو ہو) میری نظر میں تو اس کے پتھر سونا ہیں"

خوشحال خان کی قومی و وطنی شاعری کے بعض اہم حصوں کو پیش کرنے سے بوجہ طوالت مضمون قاصر ہیں ۔ ان اقتباسات کو ہم مغلوں کے خلاف جدوجہد کے ابتدائی دور کے ایک قصیدہ کے آخری دو اشعار پر ختم کرتے ہیں!

"که م عمر په شمار ه تر شپیته تیر د ے لا په کار کښې د شواری که ازبک یم
د افغان په ننګ م د تړلے توره ننګیالے د زمانے خوشحال خټک یم"

"یعنی اگرچہ میری عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی ہے ۔ مگر اب تک سواری میں ازبک ہوں ۔ افغانوں کی لاج رکھنے کو میں نے تلوار اٹھائی ہے"

میں زمانے بھر کا غیرت مند خوشحال خٹک ہوں ئے

خوشحال خان کی قومی شاعری قومی محبت "حب الوطنی" او العزی" اور جذبات حریت و حمیت و شجاعت سے لبریز ہے۔ قوم کی محبت اس پر شاعر کو نکتہ چینی کرنے سے نہیں روکتی بلکہ یہی محبت اپنی قوم پر سخت سے سخت تنقید کا سبب ہوتی ہے۔ خوشحال خان کی ملی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود اس کے تین بڑے ہیروز میں سے ایک ہے۔ وہ افغانوں کا صرف فردوسی ہی نہیں۔ بلکہ وہ افغانوں کی تاریخ میں رستم و فردوسی کا دوہرا کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں ہمیں جذبات کا ایک زور و ہیجان اور خلوص نظر آتا ہے اور جب خان افغانوں کو بے نقط سنانے پہ اترآتا ہے۔ تو ان صلواتوں کو پڑھنے اور سننے میں بھی ایک خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔

اخلاقی شاعری

اخلاقیات کا کوئی ایسا پہلو نہیں۔ جس پر خوشحال خان نے اظہار خیال نہ کیا ہو کوئی ایسی اخلاقی خوبی اور برائی نہیں۔ جس پر اس نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ مگر یہاں بھی خان کی حیات اور اخلاق کا امتیازی پہلو یعنی عمل، جہد و جہد پیہم۔ مصائب و آلام سے مقابل ہونا اور نبرد آزمائی کرنا ہم کو نمایاں طور سے نظر آسکتے ہیں۔ اسی طرح ننگ و ناموس استقلال اور وفاداری اور حماست و شجاعت کو خان کی شاعری میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ خان کی ملی شاعری سے اخلاقیات کو جدا نہیں کیا جا سکتا اس میں کئی اعلیٰ اخلاقی سبق اور درس ہمیں ملتے ہیں۔ مگر ہم اس شاعری کو اس لئے افغانی یا اُن کی قومی شاعری کہتے ہیں۔ کہ وہ سبق اور درس اُن نظموں میں موجود ہیں۔ جو افغانوں کی قومی جد و جہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن کا خطاب یا اپیل زیادہ تر افغانوں ہی سے ہے۔ لیکن یہاں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ تمام تر اختبابات

ان نظموں سے کئے جائیں جن میں افغانوں کا ذکر نہ ہو۔ جنہیں کسی صورت میں بھی جغرافیائی حدود میں متقید نہ کیا جاسکے!

پہلے ہم خان کی اخلاقی شاعری کے اس پہلو کو لیتے ہیں۔ جو بہت نمایاں ہے اور خان کی قومی شاعری کی طرح اس کا طرّہ امتیاز ہے یعنی درس عمل اور مصیبت و موت کا مردانہ وار مقابلہ ۔ عمل کے ساتھ امید کا ہونا ضروری ہے ۔ یہ فطرتاً عمل کی محرک ہوتی ہے۔ اس لئے امید ایک ضروری اخلاق ہے اور امید اور یاس و نا امیدی رجائیت اور قنوطیت اخلاقیات کی ضروری بحثیں ہیں ۔ اگرچہ مجھے اس سے انکار نہیں کہ خان کا کلام المناک و اندوہگیں خیالات بھی اپنے اندر رکھتا ہے ۔ کہیں کہیں زار او رگریہ بھی ہے۔ وہ کہتا ہے "مجھے خوشی بھی اس دنیا میں ڈھونڈے نہ ملی۔ انسان جو کسی وقت غم سے خالی نہیں شاید غم ہی کے لئے پیدا ہوا ہے" اور اپنی ایک رباعی میں کہتا ہے کہ "غم انسان کے خمیر میں ہے ۔ اور اگر دم بھر کے لئے ہنسے تو پہروں رونا پڑتا ہے" مگر باوجود اس کے وہ نا امید ہونے کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے وہ غم کو "مرد و نامرد کے درمیان" امتیاز کے لئے ضروری سمجھتا ہے ۔ اگر غم نہ ہوتا تو سب اس سے آزاد ہوتے اور جہاں اس نے مغلوب کوئی نہ ہوتا۔ تو اسے مغلوب کرنے والا بھی کوئی نہ ہوتا ۔ اور ہر گاہ غم سے آزادی چونکہ لازمی (بوجہ عدم وجود غم) ہوتی ۔ اس لئے اس آزادی کے لئے کوئی قابل داد نہ ہوتا ۔ ہم کسی کے متعلق یہ نہ کہہ سکتے ۔ کہ اس نے اپنی جدوجہد اور ہمت سے غم پر غلبہ حاصل کیا۔ اسی طرح شر کی دوسری انواع و اقسام کو بھی ہم اخلاق کے نشوونما اور ارتقا بلکہ اس کے وجود کے لئے ضروری قرار دیں گے۔ اگر بدی کا وجود ہی نہ ہوتا اور نیکی ہی نیکی ہوتی تو انسان بدی نہ کرنے پر اور نیکی ہی کرنے پر مجبور ہوتا۔ یا اگر انسان کو نیک و بد میں انتخاب کا اختیار ہی نہ دیا جاتا اور اسے صرف نیکی ہی کی استعداد دی جاتی تو اس کا کوئی فعل خواہ وہ کتنا ہی اچھا اور نیک کیوں نہ ہوتا اپنا نہ ہوتا ۔ اور اگر وہ فعل و عمل اپنا نہ ہوتا تو نیک و بد کا امتیاز نہ رہتا ۔ لیکن ایک مقام آتا ہے جہاں

عقل انسانی کا رہوار تھک کر رہ جاتا ہے ؎

"مکڑہ نادانہ دَ نکرو کار دے ۔۔۔ داچہ پرے خیژی غابنی دشوار دے
خرد کمزورے زبون لیدہ شی ۔۔۔ چہ دِ پرِ بنی دا ھو نبرہ بار دے"

"اے نادان نہ کر، یہ نہ کرنے کا کام ہے یہ بلندی جس پر تو چڑھ رہا ہے بہت ہی دشوار گذار ہے۔ عقل کمزور اور عاجز ہے۔ اور تو نے اس پر اتنا بوجھ لاد رکھا ہے"

اور اس شعر میں علوئے ہمت اور ہنرمندی کا ایک مثال درس ملتا ہے۔

"وائی لار د ختو نشتہ د آسمان تہ ۔۔۔ نہ بہ لار ددتہ پیں اکرم پہ ھنر"

"کہتے ہیں آسمان پر چڑھنے کا راستہ نہیں۔ میں ہُنر سے یہ راستہ تیرے لئے پیدا کر لوں گا"

اسی مضمون کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو!

"ویمے شد دنکہ بہ دالوزم آسمان تہ ۔۔۔ دی ئی داشی د ھمت پہ پر و بال"

یعنی "میں نے استاد سے پوچھا کہ آسمان کی طرف کس طرح اڑوں گا۔ اس نے کہا ہمت کے پر و بال سے"

دو شعر مختلف نظموں کے ملاحظہ ہوں :۔

"د مراد تو پہ معراج بہ ورتلے نشی ۔۔۔ چہ د سعی کوتاھی لری پہ زړہ کبنی"

"وہ جس کے دل میں سعی کی کوتاہی ہو مرادِ کمال کے معراج کو حاصل نہ کر سکے گا"

اور

"کہ کوئیں کبنے اخلاص دوی ضامن یم ۔۔۔ کہ کامران پہ خپل مراد نشی سوے"

"جو کوئی خلوص دل سے حصولِ مراد کے لئے کوشش کرے میں اس کی کامیابی کا ضامن ہوں"

رموزِ مملکت

خوشحال خاں نے اپنی کئی نظموں میں رموزِ مملکت اور امور حکومت سیاست پر روشنی ڈالی ہے۔ اس موضوع پر بعض اشعار درج ذیل ہیں:-

اپنی ایک نظم میں۔ ۔ ۔ احمقوں کی کئی قسمیں بتاتے ہوئے لکھا ہے:-

"بل هغه۔ پرے احمق بللے بویه   چه به بے تورے دعویٰ کا د ملکو لا"

"اس آدمی کو بھی احمق سمجھنا چاہیئے جو بغیر تلوار ملکوں کا دعویدار بنتا پھرے"

ایک غزل کا شعر ہے:-

"کل کتہنلہ دَ تورے   کہ کابل دے کہ کشمیر"

یعنی "کابل کشمیر سب تلوار کی کمائی ہیں"

اپنے ایک قصیدہ میں کہا ہے کہ سردار کے لئے اللہ پر بھروسہ اور داد و دہش اور تلوار بہت ضروری ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو باتیں بننے اور جلسے جلوس۔ وفود اور منت سماجت سے کام نہ بنے گا۔ اور یہ کہ ملک کو ہمیشہ مفسدہ پردازوں سے پاک رکھنا چاہیئے۔

ایک اور موقع پر کہتے ہیں:-

"داد و دہش اور تلواریں مارنا یا چلانا یہ دو کام ہیں جن سے سرداری کا کام انتظام اور انجام پاتا ہے۔ یا خدائے واحد کا تکیہ اور یا تلوار کا تکیہ ہے کانفرنسوں اور ڈیپوٹیشنوں سے کام نہیں بنتا۔ اگر لوگوں کے سردار میں ہزار ہنر ہوں (قوتیں) نظام عالم بغیر صمصام (تلوار) کے ناممکن ہے۔ ملک میں فتنہ پردازوں کی مثال گھر میں سانپوں کی ہے، جس گھر میں سانپ ہوں وہاں آرام کہاں"

مندرجہ ذیل رباعی میں حکومت و سیاست کے اہم رموز خوبی اور اختصار سے بیان کئے گئے ہیں۔ تلوار کو ملک کے نظم و نسق اور بچاؤ اور امورِ مملکت

کے انتظام والصرام کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ تعلیم دیتا ہے کہ لڑائی سے صلح اچھی ہے۔ اگر صلح ہو سکے تو لڑائی کی ضرورت نہیں۔ سردار کے لئے شمشیرزن اور جنگجو ہونا ضروری اور اس سے زیادہ ضروری صلح پسند ہونا ہے:۔

"سړی دارد عفو وکرم څښتن بندے
دجنګ تو کار په آشتی مینن بندے
ویره ضرونه د سړی داری دی
چه واره تیرشی تیغ میلاهن بندے"

یعنی سردار وہ اچھا جو صاحب عفو وکرم ہو اور بہ نسبت جنگ کے صلح سے زیادہ محبت رکھتا ہو سرداری کے کئی ہنر ہیں، جب سارے ہنر، دلائل و براہین ہو چکیں تو پھر برہان تیغ ہے"

اس کے ساتھ ہی ۔

"باشاهانو لره توس د زړه بائد
مروت، غوررسی، عدل دا حسان"

یعنی" بادشاہوں کے لئے رحمدلی، مروت، مظلوموں کے حال پر غور اور دادرسی اور عدل و احسان ضروری ہیں"

عشقیہ کلام

خوشحال خاں کا عشقیہ کلام بھی گوناگوں مضامین صنائع و بدائع اور معنوی اور لفظی خوبیوں سے لبریز ہے۔ خان اپنے عشقیہ کلام میں بھی اپنی شخصیت کی عظمت و بزرگی اور افغانی شان برقرار رکھتا اور اس کا اظہار کرتا ہے۔ یہ اس کے عاشقانہ کلام کی خصوصیت ہے۔ اگرچہ فارسی شاعری کے زیر اثر خان کے کلام میں بھی اس قسم کے اشعار ملتے ہیں جن میں معشوق کے سامنے اپنے تئیں بہت گرایا گیا ہے۔ مگر ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں۔ جن میں افغانی روح اور خان کی ذاتی شان نمایاں نظر آتی ہے۔ پہلے ایک شعر جناب عبدالحی حبیبی صاحب کے انتخاب سے پیش کرتا ہوں:۔

"هغه لوری داره ده هلی لنکر مے داغے
ته لاذ خوشحال یاره مرګ غواړي دوغ مه کتر نے ننګ کړه"

" خوشحال کی اتنی ہیبت اور اس کا اتنا دبدبہ ہے کہ اس کے قتل کرنے کو دلی سے فوج پہ فوج بھیجی جا رہی ہے۔ اور ایک تم ہو کہ تمہیں اس کے قتل کرنے سے ابھی تک عار ہے "

اسی قسم کے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں :۔

"د غمزے پہ تیغ ئی خو د بندی خوشحاله   مرنے پہ روغ صورت نہ ځی له جنګ"

" اے خوشحال تو اس کے غمزے کی تلوار سے گھائل اچھا ہے۔ بہادر بغیر زخم کھائے لڑائی سے نہیں جاتا "

"تورے تورے زلفے کبود خال پکښی کوتره   داشله کڼی ګوٹے پر بندی یو څه شهباز دے"

"کالی کالی زلفیں اور ان کے بیچ میں کبود خال کبوتری ہے۔ آ دیکھ اُن زلفوں میں اس خال کی وجہ سے ایک کیسا شہباز گرفتار ہو گیا ہے "

'کیسا شہباز' اور پھر خاص طور سے 'ایک کیسا شہباز' (یو څه شهباز) میں عاشق شاعر اپنی شخصیت کی اہمیت و انفرادیت پر جو زور دے رہا ہے وہ ظاہر ہے۔

"رخ خال ئی تور تارو دے په کلزار کښی   د زړه باز مې د نظر پسے د اکړے"

" اس کے چہرے کا سیاہ خال (تِل) 'تارو' (کالا تیتر) ہے اور میرے دل کے باز نے اس کی طرف آنکھیں لگا رکھی ہیں "

خان کی ایک فارسی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ جس میں کہتا ہے کہ "یہ تیری آنکھوں کے ہرن بھی کیا ہرن ہیں کہ شیر نران کا شکار ہوتا ہے" :۔

آہوئے چشم تو چہ آہو ئیست   کہ ورا شیر نر شکار بود"

اور مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو عاشق و معشوق دونوں کتنے عالی مرتبہ ہیں

"ستا د رخ په دور زه جهانګیر شاه یم   دا ته کښینه کرشمے د نور جهان کړه"

"تیرے چہرے کے عہد حسن و جمال میں میں جہانگیر بادشاہ ہوں، آ میرے سامنے بیٹھ کر نور محل (نور جہان) کے کرشمے دکھا۔"

اب خان کے عشقیہ کلام سے چند متفرق اشعار کا انتخاب ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔ اور اُن میں جو صنائع و بدائع طرز بیان کی خوبیاں اور محاسن ہیں بالاختصار بیان کئے جائیں گے۔ مندرجہ ذیل شعر میں صنعت ہائے تعلیل، طباق الاضداد اور تجنیس ملاحظہ ہو:-

شاید زلفو کښې ځ خوار خاطر ښاد نشو — د مومن په کفرستان کښې څه حرمت

"میرے دل بے چارے کو تیری زلفوں میں خوشی نصیب نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے، مومن کی کفرستان میں کیا قدر اور آبرو ہوتی ہے۔"

'خوار، خاطر' اور 'ښاد' (خاد۔شاد) میں 'خ' کی تکرار نے شعر میں ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔

'مومن' (دل) اور 'کفرستان' کے علاوہ 'خوار' (غریب، بے چارہ) اور 'ښاد' بھی متضاد ہیں اور یوں بھی شعر میں طباق الاضداد ہے

(۲) مندرجہ ذیل شعر میں بھی صنعت تعلیل و طباق ہے:-

"کفرستان د شاه کړو د زلفو گوره — چه په څه رنګه تاوېږی ایمان د

• معشوقہ کی زلفوں کے کفرستان کو دیکھو کہ ایمان کو دیکھ کر کس طرح بل کھا رہا ہے"

(۳) مندرجہ ذیل شعر بھی صنعت طباق الاضداد کی بہترین مثال اور جناب حبیبی کی حسین و جمیل نگاہ انتخاب پر دال ہے۔ بقول جناب حبیبی صاحب اور حقیقت میں ایک اعجاز اور کلام خان کی فوق العادۃ بلاغت کا ثبوت ہے:-

"په مانو بۍ مړه شو یو کره عیدی — په خندا ئی جوړه ی کړه ژړا مي

"جب وہ روٹھ کر گلہ کرتی ہے۔ تو مردے نہلانے والوں کے ہاں عید

ہو جاتی ہے' اور جب ہنستی ہے تو جوہری کے گھر صف ماتم بچھ جاتی ہے۔
(۴) مندرجہ ذیل شعر میں صنعت ہائے تجنیس' طباق' لف النشر مرتب اور تلازمات ورعایات ملاحظہ ہوں:۔

"د مخ ثنا ے وایم د زلفو ی صفت کرم پہ خولہ کہ پہ خامہ ی صبح وشام پہ مخ وشپہ"

میں اس کے چہرہ کی ثنا کہنا (وایم) اور زلفوں کی صفت کرتا (کرم) خولہ (منہ) سے اور خامہ (قلم) سے صبح وشام اور درمخ (روز) شپہ (شب)

شعر میں ترصیع بھی ہے۔ ترصیع کئی لفظوں میں ہے' مندرجہ ذیل پانچ شعر کی غزل تمام اسی صنعت میں ہے:۔

"دجہان پہ مخ پہ نہ وی ھسے تا غندے دلبرہ
پریرویہ' عنبر بویہ' سنبل مویہ' سمنبرہ
گلعذارہ' زلفے مارہ' شہسوارہ خوش رفتارہ
بادہ نوشہ' مبغچہ تا' تعصب پوشہ' مو کمرہ
دلنوازہ' سرفرازہ' عشوہ سازہ' لعبت بازہ
خود پسندہ' سربلندہ' شکرخندہ' لب شکرہ
طرہ بنا کہ' گریوان چاکہ' تل بے باکہ' لمش تپاکہ
خود آرایہ' خودنمایہ' خودستایہ' خوش ھنرہ
غزلخوانہ' خوش الحانہ' دردمندانہ' لب خندانہ
عنبر خالہ' پوخیالہ' تل خوشحالہ' د زرہ غورہ

"مطلع کے مصرعہ اولیٰ کا ترجمۂ روئے زمین پر تیری طرح دلبر نہ ہو گا"
مقطع کے مصرعۂ ثانیہ کا ترجمۂ عنبریں خالوں والی' پوخیال' ہمیشہ خوش رہنے والی جسے دل ہمیشہ اوروں پر فوقیت دیتا ہے۔ یا عنبریں خالوں والی محو خیال جس کو اے خوش حالی دل ہمیشہ اوروں پر فوقیت دیتا ہے
باقی اشعار کے ترجمہ کی ضرورت نہیں۔ سب فارسی ہے۔

. . . . .معشوقہ کی صفات

کے آخر میں 'ہ' اور کارے پر فتح تانیث کے لئے ہے۔ مقطع میں ایہام بھی ہے "خوشحالہ" کے آخر میں "ہ" تانیث کے لئے بھی ہو سکتی ہے جس صورت میں مراد معشوقہ ہوگی اور ندائیہ بھی جس صورت میں مراد شاعر ہوگا۔ اس کے مطابق میں نے دونوں طرح تشریح کر دی ہے۔

اس شعر میں لف ونشر غیر مرتب اور تضاد وطباق بھی ہے :-

" بارخ و زلف او سرو کارے   در شب و روز روزگار بود "

" تیرے (دن جیسے) چہرے اور (رات جیسی) زلفوں سے میرا سروکار ہونا اور شب اور روز ہی میرا روزگار ہوتا ہے "

اسی غزل کے مندرجہ ذیل شعر میں تشبیہ تام ہے

" قدِ تو درمیان دیدۂ ما   ہمچناں سرو جوئبار بود "

" تیرے قد کا تصور میری آنکھوں میں، سرو جوئبار کی طرح ہے "

یہی خیال ایک پشتو شعر میں بھی ادا کیا گیا ہے

"خما ستر گے لکہ جُوَنہ سرو وَنہ   سرووَنہ جدا نہ دہ لہ جویہ"

"میری آنکھیں ندی کی طرح ہیں اور تو سرو ہے، سرو کا درخت بغیر ندی کے اچھا نہیں لگتا "

نیچرل شاعری

خوشحال خاں نے جہاں اخلاقیات وسیاسیات اور انسان کی حیات اجتماعی و انفرادی کے متعلق حکمت و دانش کے موتی لٹائے اور قومیت و وطنیت کے پرجوش اور ولولہ انگیز نعرے لگائے اور حسن و عشق کے میٹھے گیت گائے اور پیارے راگ الاپے ہیں، وہاں فطرت کے چہرہ سے بھی نقاب اٹھا کر اس کے خط و خال کی تصویر کھینچی ہے۔ فطرت کے متعلق خاں نے ایک ایک دو دو اشعار متفرق نظموں میں بھی لکھے ہیں اور اس کے علاوہ متعدد نظموں میں بھی نیچرل شاعری کے اعلےٰ نمونے ملتے ہیں۔

خوشحال خاں نے عالمِ پیری کے متعلق متعدد اشعار و رباعیات کے علاوہ ایک پوری نظم (بصورت غزل مسلسل) بھی لکھی ہے جس میں بحیثیت ایک خان و سردار، متلاشی مقاصد عاشق اور شکاری بڑھاپے کی دستبرد اور چیرہ دستی کا ذکر ہے۔

• مجھے یا خبر نہ تھی۔ کہ بڑھاپا کس خیال سے آرہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سائی بلندیوں اور پستیوں پر چھا گیا۔ میرے مشک (سیاہ بال) اور موتیوں (دانتوں) کو تو اکیا دن (برس کی عمر) میں لوٹ لیا۔ اور میری آنکھوں کی روشنی میں نشتر میں آمود دار ہوا۔ میں اسے اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ کسی صورت میں بھی موت سے کم نہیں جس نے زور اور قوت اور ملک و مال سب کو آن دبوچا۔ جب دل میں عہدِ شباب کی جستجو اور جدوجہد کا خیال کرتا ہوں۔ تو اب وہ کہاں! ان سب تلاشوں کو اس نے سراسر پایمال کر ڈالا۔ چہرے کا حسن بدن کی صحت، ہاتھ پیر کی چستی اور پھرتی: بڑھاپا، ان سب خوبیوں کا زوال بن کر آیا ہے۔ بدن کی مثال ایک درخت کی ہے۔ جس کا پھول اقبال ہے۔ جب بدن پر آیا تو اقبال یہ بھی بڑھاپا آیا۔ اسے آئینے اب جا اور زمین کے ایک کونے میں پڑا رہ کہ حسینوں کے خد و خال کو بڑھاپے نے مسخ کر ڈالا لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے خجالت ہوتی ہے، بڑھاپا عشق و محبت میں انفعال بن کر آیا ہے۔ نہ شکار ہے اور نہ (تیر و تفنگ کے) ذائلہ اب تو روہ کے پہاڑ کے بکرے بڑے اطمینان اور مزے سے بے خوف و خطر پھریں کہ خوشحال کو بڑھاپے نے آلیا

مندرجہ بالا غزل میں خان کے اعتراف ناتوانی کے باوجود بڑھاپے نے باز اور شیر کو بالکل دبا نہ دیا تھا۔ قوت اور جوشِ عمل کا یہ عالم تھا۔ کہ میدانِ حیات میں ہمیشہ اختتامِ حیات تک حصولِ مقاصد کے لئے تگ و دو اور جدوجہد جاری رکھی اور تادمِ مرگ ہاتھ قبضۂ شمشیر پر رہا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر قریبًا تہتر

سال کی عمر میں کہے گئے:۔

"باز د چیلد بنکاره دوزی چه روپیشی تو زاړه شوی خار چرته خوان شنال"
خدایه هومره مهلت ور کړې کا پدې جهان کښ چه کاږه کار دوند سم کاندی خوشحال"

"باز بوڑھا ہوکر بھی اپنے شکار سے باز نہیں آتا، جوان گیدڑ بوڑھے شیر کے قربان"

..... اے خدا خوشحال کو اتنی مہلت دے کہ وہ بگڑے کاموں کو سیدھا کرلے"

تہتر سال کی عمر میں خدا سے اس لئے آرزوئے حیات کرنا کہ بگڑے کاموں کو سیدھا کرے بہت بڑے عزم و استقلال اور غیر متزلزل قوت ارادی کی دلیل ہے

★

انسان کا طرزِ زندگی اور طرزِ فکر دو بے ربط چیزیں نہیں ہیں۔ سماجی نشو و نما کی تاریخ محنت کش عوام کی تاریخ ہے یہی سماج کی سب سے بڑی قوت ہیں اور یہی اقدار پیدا کرتے ہیں

(سٹالن)

●

منوبر حسین مہمند

درۂ خیبر

خیبر پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک مشہور درّہ ہے۔ اور پشاور اور کابل کے درمیان بہت بڑی شاہراہ ہے۔ جہاں جگہ جگہ ایسے ایسے مقامات واقع ہیں جو فوجی اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔

خیبر کی وادی جمرود سے طورخم تک ۳۳ میل کی وسعت میں پھیلی ہوئی ہے۔ خیبر ریلوے جو ۱۹۲۵ء میں مکمل کی گئی اسے فن انجنیئرنگ کا ایک بہت بڑا کارنامہ خیال کیا جاتا ہے۔ جمرود سے لنڈی خانہ جانے والی سڑک دوہری اور بعض جگہ اس سے بھی زیادہ چوڑی ہے۔ یہ سڑک بہت عمدہ حالت میں ہے۔ اور اس کی حفاظت کے لئے جگہ جگہ فوجی چوکیاں اور قلعے ارد گرد کی پہاڑیوں پر قائم ہیں۔ یہ سڑک چکر کھاتی ہوئی اوفیاس کی پہاڑیوں کے نیچے سے گزر کر شاہ گئی کی پہاڑیوں تک جاتی ہے۔ اور پھر علی مسجد جا پہنچتی ہے۔ جو سطح سمندر سے تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ علی مسجد سے بڑھ کر یہ چکر کاٹتی ہوئی ایک کھلی وادی میں جا نکلتی ہے۔ جہاں زخاخیل قبیلوں کے قلعہ بند دیہات ہیں۔ اور پھر یہی سڑک پہاڑی علاقے سے ہوتی ہوئی درگئی کی سطح مرتفع کو پھاند کر لنڈی کوتل جا پہنچتی ہے۔ اور پھر لنڈی خانہ کی طرف نیچے اترنے لگتی ہے۔ جو پاکستان کی راجدھانی میں شمال مغربی صوبے کی آخری سرحد ہے۔

خیبر کی تاریخی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس میں کسی قسم کے مبالغہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ یہ اہمیت اس لئے نہیں کہ اس کے ساتھ بعض بادشاہوں اور فاتحین کا

گہرا تعلق ہے۔ یا یہ کہ یہ ایرانیوں بدھوں۔ یونانیوں، افغانوں مغلوں، سکھوں اور انگریزی فاتحین کی آماجگاہ رہ چکا ہے۔ بلکہ اس نے پسماندہ اقوام کی طوفانی آمد بھی دیکھی ہے۔ اور بہت سی طاقتوں کے عروج و زوال بھی ——

اس وادی میں جو بڑے بڑے افغانی قبیلے آباد ہیں ان میں سے آفریدی شنواری ملاگوری اور سلیمانی قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نہایت طاقتور ہے مشہور باغ مسجدان کی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ جو اس مقام پر واقع ہے جسے میراں کہتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک متبرک مقام ہے۔ جہاں پہنچتے ہی وہ اپنے تو ی جھگڑے اور تنازعے بھول کر نیک کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کھجوری کا میدان ان کا مقبوضہ علاقہ ہے۔ جو سور کی قمر کوئی سے شجائی میلہ تک پھیلا ہوا ہے۔

شنواریوں کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ وہ ایران سے آئے ہیں۔ اور آفریدی علاقہ میں سب سے آخر میں وارد ہوئے ہیں۔ ان کے قبضہ میں کوہ سفید کا شمالی حصہ ہے۔ ان کا علاقہ آفریدیوں کے علاقے کے بالمقابل واقع ہے۔ اور سفید کوہ ان کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا ہے۔

ملاگوری قبیلے کے قبضے میں وہ علاقہ ہے۔ جو سپیر سنگ پوسٹ کے مغرب سے شروع ہو کر ڈبرائی پہاڑی کی چوٹیوں اور شمال میں دریائے کابل سے لکا سا تک پھیلا ہوا ہے۔ نسبتاً اس قبیلے کی تعداد بہت کم ہے۔

شلمان مہمند قوم کی شاخ ہیں ان کا علاقہ مشرق میں ڈبرائی کوتل تک مغرب میں شلمان غاغا تک وسیع ہے۔

درہ خیبر کے قرب و جوار میں قدیم زمانے کی بہت سی یادگاریں پائی جاتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملک پرانے زمانے میں بہت زیادہ آباد تھا۔ جہاں سے کئی ایسی اشیاء برآمد ہوئی ہیں۔ جو بدھ کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اگر سائنٹفک طریق پر کھدائی کی جائے۔ تو نہایت اہم انکشافات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

جب سے انسان نے تاریخی دور میں قدم رکھا ہے۔ اس زمانے سے آج تک سب

کی سب تاریخیں ایک طرفہ اور ایک خاص مقصد کے لئے لکھی گئی ہیں جس طرح انسانی ادوار ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ اسی طرح ہر دور میں انسانی تقاضے بھی مختلف رہے ہیں ۔ مگر تاریخ لکھنے والوں نے انسانی تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ہمیشہ ایک خاص طبقے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی

مَیں یہ نہیں کہتا کہ اُن میں ایک آدھ سیاح بھی ایسا نہ تھا جس نے صحیح طور پر یا فطری طور پر انسانی تقاضوں کا ساتھ نہ دیا ہو ۔

مگر یہ تو مَیں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ متقدمین کے بعد جن تاریخ نویسوں نے دُنیا کی تاریخ مدون کی ۔ انہوں نے ایسی تاویلیں اور ایسی پیچیدگیاں پیدا کی ہیں ۔ کہ صحیح اور غلط کا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا ۔

یورپ نے ابتدائے خواب ملک گیری سے لے کر اب تک جتنے حربے استعمال کئے ہیں ان میں سے دو اہم ہیں ۔ ایک مذہبی اور دوسرا تاریخی مذہبی حربہ یورپ نے سب سے پہلے ترکی کے خلیفۃ المسلمین کے خلاف استعمال کیا ۔ جس نے تاریخ میں صلیبی جنگ کا رسوائے عالم نام پایا ۔ اور تاریخی حربہ ایک ایسے طریقے سے استعمال کیا ۔ کہ ہمارے اسلاف سے لے کر اخلاف تک اس حربے کے زخم اب تک چاٹ رہے ہیں ۔ اور غیر شعوری طور پر اسی زخم کو نسخہ شفا سمجھے ہوئے ہیں ۔

یورپ کے جوع الارض کے مریضوں میں سے پرتگیزی ۔ فرانسیسی اور انگریزی اقوام سمندر کی طغیانیوں کا مقابلہ کر کے فرطِ حرص و آز سے ہندوستان تک پہنچ گئیں ۔ مگر آخر کار اس سرزمین پر پورا تسلط انگریزی کے حصے میں آیا ۔ یہی زمانہ انگریزی اور فرانسیسی مستشرقین کی تاریخی ضرب کاری کا ہے ۔

یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ ہندوستان پر ہمیشہ مغرب کی طرف ہی قبیلوی اور بادشاہی حملے ہوتے رہے ہیں ۔ اور ہر حملہ آور کو شمال کے آزاد قبائل کے دشوار گزار پہاڑ عبور کرنے پڑے ۔

یہ حملے مذہبی رنگ میں بھی ہوتے ہیں ۔ اور نسلی رنگ میں بھی ۔ ہر حملے کے لئے

کچھ نہ کچھ وجوہات ضرور تھے۔ مگر ان مختلف ناموں کی تہ میں صرف ایک ہی ملک گیری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اگرچہ بعض حملے انتقامی بتلائے گئے ہیں۔

خیبر کے باشندے اپنی ناگفتہ بہ غربت و بدحالی کے باوجود ہمیشہ اپنی حریت و آزادی کے نگہبان رہے۔ اور آج تک دُنیا کی بڑی سے بڑی قوتوں کی عظمت و جبروت کے سامنے بھی اُن کے سر کبھی نہ جھک سکے یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ حریت پرور انسان ہر آنے والے حملہ آور کی کن مصالح کی بنا پر رہنمائی کرتے رہے۔ ہم ذرا غور و فکر سے کام لیں تو واقعات اور شواہد کی روشنی میں اس سوال کا جواب ہمیں نہایت آسانی سے مل جاتا ہے قبائلی سورما اولوالعزم اور شجاع ہونے کے ساتھ ساتھ جہالت کی وجہ سے سیاسی شعور سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ اور مذہبی عقیدت ان میں دیوانگی کی حد تک پائی جاتی ہے۔ ایرانی حملہ آور جو سب کے سب مسلمان تھے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہیں ہمیشہ آلہ کار بناتے رہے۔ اور اپنے حملوں کو ہندوستان کے غیر مسلموں پر غزا اور اسلام کی ترویج کے لئے ایک مذہبی فریضہ بتاتے رہے۔ اور ایسے رنگ میں ان سے امداد چاہی کہ وہ ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے قبائلیوں کی اس تاریخی لغزش سے انگریزوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اور رجعتی علما کے ذریعے اپنے آپ کو اولوالامر ثابت کر کے وقتاً فوقتاً انہیں استعمال کیا چنانچہ امان اللہ خاں کو کابل کے تخت سے ہٹانے کے لئے ملا شور بازار کا رسوائے عالم کارنامہ ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے یہی مذہبی حربہ تھا جس کے نام پر قبائلیوں کو مشتعل کیا گیا۔ اور امان اللہ خاں کو کافر و مرتد ظاہر کر کے چشم زدن میں اس کی تباہی کے اسباب پیدا کر دئے گئے۔ اس کے بعد مختلف سیاسی تحریکیں بھی انہیں مذہب کے نام پر اکسا کر ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتی رہیں۔ اور آج بھی ہر موقع پرست طاقت اسی پرانے حربے کے ذریعے انہیں استعمال کر سکتی ہے اس کے علاوہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ان حملہ آوروں کا ساتھ دینے میں قبائلیوں کا لوٹ کھسوٹ کا جذبہ بھی شامل تھا۔ اور اس کی وجہ ان کا ازلی افلاس ہے

جب انگریز ہندوستان پر مکمل طور پر قابض ہو گئے تو انہوں نے جو کام سب سے پہلے کیا وہ ہندوستان کی تاریخ کی تدوین تھا۔

انہوں نے سرحد ہند پہ بسنے والے قبائل کو تاریخ کے اوراق پہ ڈاکو۔ قاتل۔ رہزن غیر مہذب۔ آدم خور، جنگلی اور وحشی بتایا۔ انہوں نے ہمیشہ ہندوستان کے باشندوں کو انہی قبائل اور ان کی یورشوں سے ڈرایا۔ اور انگریزی حکومت کو رحمت الہٰی ثابت کرنے کی کوشش کی۔

انگریزوں نے ہندوستان مغلوں سے چھینا۔ مغلوں کی حکومت راس کماری سے لے کر مشرق میں آسام تک اور مغرب میں باختر و بخارا تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن مغلوں کو بھی ہندوستان کے راجے مہاراجوں کی نسبت مغرب ہی کی طرف سے زیادہ دشواریاں پیش آتی رہیں۔ اور ہند کے مغربی جانب بسنے والی یہی پشتون قوم تھی۔ چونکہ مغلوں کی حکومت سال ہا سال قائم رہی۔ اس لئے اٹک کے اس پار کے پختون مغلوں کے ہمہ گیر اثر سے بچ نہ سکے۔ لیکن مغلوں کے زیر اثر صرف صوبہ سرحد کا میدانی علاقہ تھا۔ اور موجودہ قبائلی رقبہ کبھی بھی ان کے زیر اثر نہ ہو سکا۔

خیبر میں جو قبائل آباد ہیں ان میں سے افریدیوں کو اپنی جنگجویانہ اور بہادرانہ صفات کی وجہ سے بڑی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ افریدی پشتون قوم کا ایک قبیلہ ہے جو درہ خیبر کے ساتھ والے جنوبی پہاڑوں یعنی تیراہ میں آباد ہے۔

یہ افریدی اس علاقہ میں کب کیوں اور کیسے آئے۔ یہ سوال بنیادی طور پر پختون ہی کے مسئلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور میں یہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس کے متعلق ہمارے پاس کوئی سائنٹیفک تاریخ نہیں۔ جو تھوڑے بہت معلومات ہیں۔ وہ اسی قماش کی تاریخوں میں ہیں۔ جن پر کوئی اعتماد نہیں۔

میری نگاہ میں صرف ہیروڈوٹس یونانی سیاح ہے جو اپنی سیاحت میں پانچویں صدی قبل از مسیح میں ایک قوم پکتائی کا ذکر کرتا ہے۔ اور پکتائی یہی پختون قوم ہے۔ یونانی سیاح نے اصل میں اپنے لب و لہجہ میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ ورنہ اصل میں یہ لفظ پکھتا ہے۔ جس کا ذکر ویدوں میں موجود ہے۔ اور ویدوالوں نے پخت یا پکھتا ہی کو اپنے لب و لہجہ کی

وجہ سے یکھتا لکھا ہے۔

اب بھی جنوبی ہند کے ہندوستانی خ کو ادا نہیں کر سکتے جس طرح ص کو ح سے ادا کرتے ہیں۔ اگر انگریزوں کی فوج میں بھرتی شدہ جنوبی ہند کے باشندوں کو کسی نے بات کرتے سنا ہو۔ تو ان پر ثابت ہو جائے گا۔ کہ وہ لنڈی خانہ کو لنڈی کھانہ کہا کرتے تھے۔ کیونکہ قدرتی طور پر وہ خ نہیں بول سکتے جس طرح ہمارے مشرقی وسطیٰ کے فارسی خوان ٹ ڈ ڑ ادا نہیں کر سکتے۔ پس میرے نزدیک ہیرودوٹس کا قول درست معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ پختون قوم پانچویں صدی قبل از مسیح یا کم و بیش اس موجودہ مقبوضہ علاقے کے آس پاس موجود تھی خواہ وہ ابتدا میں کوہ سلیمان میں آباد تھی یا وسط ایشیا کے پہاڑوں میں اور پھر قبائلی عادات اور فطری ضروریات کے تقاضوں سے ادھر اُدھر پھیل گئی۔

بہرصورت سکندر کے حملے کے وقت تیراہ پر آفریدی آباد تھے۔ اور جب سکندر خیبر پار کر کے اٹک پہنچا۔ تو پیچھے سے اس کا آفریدیوں نے لوٹ لیا۔ جن کی سرکوبی کے لئے سکندر کو دریائے سندھ سے واپس آنا پڑا۔ مگر آفریدی بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ گئے اور سکندر پریشان و حیران واپس آیا۔

ہیرودوٹس یونانی پکتائی یعنی پختون قوم کے قبیلوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک قبیلے کا نام اپیرِیٹی بیان کرتا ہے۔ اپیریٹی ہی آفریدی ہیں جو آج درۂ خیبر کے مالک ہیں۔ سکندر کے حملے کے بعد آفریدیوں نے لودھیوں اور سوریوں کے زمانہ انحطاط اور مغلیہ حکومتوں کے زمانے میں صفحات تاریخ پر نمایاں حیثیت اختیار کی ہے۔ اور ۹۳۲ھ سے لے کر آج تک اس قبیلے کی تاریخی حیثیت نے خیبر کو ایک بین الاقوامی درجہ عطا کیا ہے۔

آفریدیوں نے انگریزی دور میں بھی متعدد لڑائیاں لڑیں اور ۱۹۳۰ء میں پشاور پر اُن کا آخری حملہ ہمیشہ یاد گار رہے گا۔ وہ آج بھی تیراہ میں آباد ہیں۔ اور خیبر کی عظمت کے پاسبان ہیں۔

فکر تونسوی

وحشی اور اُجڈ

"چھوڑیئے جی! سرحد کے پٹھان تو وحشی اور اُجڈ ہوتے ہیں ۔"

یہ فقرہ وہ لوگ عام طور پر دُہراتے ہیں جو اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی دُہراتے ہیں۔ جو نہ مہذب ہیں نہ اجڈ۔ سرحد کے پٹھان کی یہ ذہنی تصویر مہذب لوگوں کے فکر اور عمل کے راستے متعین کرتی ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہ تہذیب کا حقیقی رُوپ کیا ہے؟ تہذیب کی عادت تہذیب کے پھیلاؤ کا ساتھ دیتی ہے۔ یا نہیں۔ کیا تہذیب کوئی ایسی جنس ہے جسے بلیک مارکیٹ میں فروخت کرنے کی آزادی ہے؟

میں اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور اہم سوال بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہ کیا پٹھان انسانی بطن سے پیدا ہُوا ہے، یا وہ جانوروں اور مویشیوں کی نسل کی یادگار ہے۔ اگر وہ انسان ہے، جس میں سوچنے کی قوت، سمجھنے کی صلاحیت اور بڑھنے کی عادت موجود ہے۔ تو وہ وحشی اور اجڈ کیوں کر ہے؟

اگر ایک طرف انسانی زندگی ایٹم کے نقطے تک پہنچ چکی ہے۔ اگر ایک طرف حیات کا نغمہ سورج، چاند اور کائنات کے اتھاہ رازوں کو منظرِ عام پر لا چکا ہے اگر ایک طرف انسان، مسرت کے لازوال خزانے کو مٹی کے انباروں میں سے نکال نکال کر زندگی کو تابناک بنائے جا رہا ہے۔ تو پھر دوسری طرف بھی انسان وہی انسانی نسل کی ایک غیور نشانی، ایک بہادر یادگار کیوں ہمارے ذہنوں پر ایسے

نقش چھوڑ رہی ہے۔ جس سے ہم پٹھانوں کو وحشی اور اجڈ کہہ کر اپنی وحشیانہ قسم کی تسکین کرتے رہتے ہیں ؟

لیکن وہ میرے سوالوں کا جواب دینا نہیں چاہیں گے۔ کیوں کہ میں ان مہذب لوگوں کے احساس کمتری کو ننگے روپ میں دیکھ چکا ہوں۔ وہ ڈرتے ہیں اس طاقت سے، جو انسان کے غیر مہذب سینے میں سے تہذیب کے منہ زور اور انقلابی لاوے کا طوفان باہر لا رہی ہے۔ وہ پٹھان کی جہالت اور اُجڈپن پر صرف کلمۂ تاسف پڑھتے ہیں۔ وہ پٹھان کے اُس جادُو کی طرف سے آنکھیں موند لیتے ہیں۔ جو ہر انسان کی طرح اُس کی روح میں حیاتیاتی ارتقا کے جلوے دکھا سکتا ہے۔ وہ جادو ہے اس کی طاقت اس کی غیرت اور اس کی شجاعت۔ ان کی تہذیب کے علمبرداروں کا طریقہ یہی رہا ہے۔ کہ اس جادو بھری طاقت، غیرت اور شجاعت کے طوفان کا سچا راستہ گم کر دے اور اس کے سامنے کبھی لُوٹ مار کا راستہ، کبھی مذہب کا راستہ، کبھی نام نہاد قومیت کا راستہ اور کبھی دشمن کافروں کا راستہ دکھا کر اپنی اجارہ دار "تہذیب" کو برقرار رکھے۔ اُس تہذیب کو برقرار رکھے، جس کی بدولت وہ پٹھان کو زندگی کے نت نئے بڑھتے اور ابھرتے راستے کی پرچھائیں تک دکھانا گوارا نہیں کرتی

کیا پٹھان اُجڈ اور وحشی ہے یا تہذیب کے وہ علمبردار وحشی اور اجڈ ہیں۔ جو انسان کو وحشی اور اجڈ رکھ کر نعرہ تحسین و آفرین لگاتے ہیں۔ اور جھوم جھوم جاتے ہیں۔

پٹھانوں پر وحشت اور بربریت کا اتہام لگانے والے کیوں یہ فراموش کر جاتے ہیں۔ کہ ہیروشیما اور ناگاساکی ابھی تک خون تھوک رہے ہیں، لاکھوں بدمیوں پر پھیلے ہوئے پلیگ کے جراثیم ابھی تک تہذیب کی دہائی دے رہے ہیں۔ لاکھوں جمہوریت پرست چینی، وحشی اور جاہل چینی، امریکی بموں اور برطانوی سرمائے کے خنجروں سے زخمی ہو رہے ہیں۔ امریکہ کے سیاہ فام انسانوں کی کثیر تعداد، زندگی کے جگمگاتے ہوئے طوفان سے محروم رکھی جا رہی ہے۔ افریقہ کے چمکیلے سونے کی روشنی میں کالے حبشیوں کی رُوحیں مسخ کی جا رہی ہیں۔ اور کشمیر اور فلسطین پر شیطان کے

یہ مہذب نمائندے اپنی تہذیب کا راگ الاپ الاپ کر انسانی جانوں کے لہو سے ہولی کھیل رہے ہیں

کیا پٹھان اُن سے زیادہ وحشی ہے؟ کیا اُس کی بہادری اور غیرت کا دھارا زندگی کی بنیادی قدروں سے موڑ کر، اس پر بم باریاں کر کے، اُس کو سنگین پہاڑوں میں مقید رکھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کرنا، دہشت اور درندگی کا گھناؤنا ثبوت نہیں ہے؟

کون تھا وہ جس نے بہادر پٹھانوں سے کہا تھا کہ تمہارا وجود، نسلِ انسانی کے لئے خطرہ ہے۔ نسلِ انسانی کے تحفظ کے اجارہ داروں کو یہ حکم لگانے کا کیا اختیار تھا؟ کیا اس لئے کہ وہ غلام ہندوستان اور پاکستان کی دولت سمیٹ کر لے جانا چاہتے تھے ـــ کون تھا جس نے غلام ہندوستان کے لوگوں پر یہ بھوت مسلط کر دیا تھا۔ کہ پٹھان صرف لوٹ مار کرتا جانتا ہے؟ کیا اس لئے تا کہ غلام ہندوستان ان آزاد منش پٹھانوں کی آواز سے آواز ملا کر کہیں برطانوی راج کے سورج کو مغربی اُفق کا راستہ نہ دکھا دے۔؟ ـ کون تھا وہ جس نے بہادر پٹھانوں کے سروں پر فوجیوں کی چوکیاں مسلط کر رکھی تھیں۔ تا کہ نفرت اور خوف کا افسانہ عروج حاصل کرتا چلا جائے۔

ہر پٹھان کے ذہن میں اس کون کے شیطانی نقش و نگار موجود ہیں۔ وہ اُجڈ اور وحشی ہیں۔ وہ جاہل اور ظالم سہی۔ مگر انسانیت کی سچائی اور زندگی کا حسن اور حقیقت کی محبت اُس میں کبھی مر نہیں سکی۔ وہ زندہ رہنے والوں کی قدر کو اپنے سینے کے نہاں خانے سے مٹا نہیں سکا۔ سامراجی انگریز اس نہاں خانے کا محافظ بن کر چاہے سینکڑوں برسوں تک بیٹھا رہتا۔ مگر وہ ایک مصنوعی خطرے کے بم سے کائنات کی سچی اور لافانی وسعت کو تو ختم نہیں کر سکتا تھا

میں نے سینکڑوں پٹھانوں کو دیکھا ہے۔ میں قبائلیوں کی محفلوں میں بیٹھا ہوں میں نے سود خور پٹھانوں کی باتیں بھی سنی ہیں۔ میں نے سرحدی بلوچوں کے رہن سہن

کو دیکھا ہے، میں خود ایک سرحدی ہوں، مَیں نے اُن کے نغمے سنے ہیں۔ ان کی صحبتیں دیکھی ہیں۔ اُن کے پیار اور حسن کے ترانے سُنے ہیں، انسان سے اُن کی عقیدت کے دلربا اور قابلِ رشک مناظر دیکھے ہیں۔ میں نے اُن کی غیرتوں اور بہادریوں کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ میں اُن میں گھوما ہوں۔ اُن کے دسترخوان کے محبوب لمس سے محظوظ ہُوا ہوں۔ اُن کی عورتیں، ان کے بچّے، ان کے بوڑھے اور ان کے گرانڈیل جوان میرے سامنے اپنی زندگی کے خوبصورت مظاہرے کرتے رہے ہیں

مَیں انھیں وحشی اور اُجڈ کہہ کر کیوں اُس سچائی کو جھٹلاؤں جسے جھٹلانے کے لئے امریکہ اور برطانیہ کے کارخانہ دار اور سامراجی کیٹرے ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے ہیں۔ لگا رہے ہیں اور لگانا چاہتے ہیں۔

جن لوگوں کو آج پٹھان سے شکایت ہے، اُس سے نفرت کا احساس ہے، اس سے رقابت کا خطرہ ہے۔ کیا کبھی اُنھوں نے اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھا کہ یہ شکایت یہ نفرت یہ رقابت اُن کی اپنی تخلیق کی ہوئی ہے۔ اور کہ انھیں اپنی گھناؤنی تخلیق پر ناز بھی ہے۔ کیا یہ ناز، تہذیبی ارتقا کا ناز ہے؟ کیا یہ غرور علم اور سائنس کا غرور ہے۔ کیا یہ فخر محبّت اور خوبصورتی کا فخر ہے۔؟ ــــ

میں کسی پٹھان سے کیوں پوچھوں؟ میں تو دُنیا کے ہر اُس انسان سے پوچھوں گا جو سامراجی طبقے کے استحصال کی بدولت اُجڈ ہے، وحشی ہے، جاہل ہے اور اُسے تہذیب کی ہوا تک نہیں لگی۔ حیرت اور غصّے کا مقام ہے کہ مجرم اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے اپنے ہی جرم کو عدالت کے سامنے پیش کرکے چھٹکارا چاہتا ہے۔ دُنیا کا ہر انسان آج پٹھان ہے، دنیا کا ہر پٹھان آج انسان ہے۔ اور یہ دونوں عناصر نئی مہذب انسانیت کو جنم دے رہے ہیں۔ سامراجیوں کا پرانی گھناؤنی تخلیقیں؟ جو دنیا کے سامنے نفرت، رقابت اور شکایت کی شکل میں ظاہر ہوئی تھیں۔ اب ایک نئی عالمگیر محبت کے دائرے میں داخل ہو رہی ہیں۔ ایٹم کی دھمکی۔ مذہب کا خطرہ اور پلیگ کے جراثیم کا "انسانیت نواز" پھیلاؤ اس مضبوط ہوتے ہوئے دائرے

کو کبھی نہیں توڑ سکے گا۔

سرحد کے پٹھان پر جو کچھ آج تک گذری۔ سرحد کا پٹھان جس روپ میں ہمارے سامنے لایا جاتا رہا۔ سرحد کے پٹھان کی وحشت کی داستانیں جس عنوان کے تحت لکھی جاتی رہیں، سرحد کے پٹھان کی غیرت اور شجاعت کو جس مکروہ . . مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا رہا —— وہ سب کچھ ایک نیا انقلابی طوفان ختم کرنے کے لئے ابھر چکا ہے۔ اُسے روکنے کے لئے نئی عالمگیر جنگ کی سازشیں کرنے والے سرمایہ دار اور جاگیردار اور ان کے

ایجنٹ اپنی موت کے دھماکے سن سن کر لرز رہے ہیں۔ وہ گھبرا گئے ہیں اُس طاقت سے اس جادو سے، جو سرحد کے ہر پٹھان میں جاگ گئی ہے۔ جو دنیا کے ہر مزدور اور کسان اور ہر محنت کش میں انگڑائیاں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور جو انسان نما بھیڑیوں پر ٹوٹ پڑنے کے لئے کمربستہ ہو چکی ہے۔

اور میں ان غیور اور جسور پٹھانوں سے بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہ کیا وہ اُس راز کو جانتے ہیں جس نے راز داروں نے ان پر بڑے بڑے جاگیردار پٹھانوں کو مدتوں مسلط رکھا؟

کیا وہ اُس ظالم اور وحشی طبقے کا نام جانتے ہیں جس نے ہمیشہ ان کو مسخ شدہ روایات کے فرسودہ اور تاریک غاروں میں تیار رکھا۔ کیا وہ اس چالاک نگاہ سے واقف ہیں۔ جس نے علم اور سائنس کی روشنی سے انہیں محروم رکھا۔ اور کیا وہ اُس گھناؤنے ہتھیار کو بھی سمجھ سکے ہیں۔ جس نے ان کی سچائی کی رُوح کو، الفت کے جذبے کو، محبت کے نغمے کو، حسن کے ربط کو چیرا، پھاڑا، زخمی کیا اور پھر دنیا کے سامنے ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر کہا۔ کہ چھوڑیئے جی، پٹھان تو ہے ہی اصل کا وحشی اور اجڈ۔

اپنے دشمن کو پہچاننا ہر انسان کا فرض ہے۔ پٹھان کا فرض دشمن کی نگاہوں کو چیرتا ہوا اس منزل کی طرف بڑھے گا۔ جو آج حیاتِ انسانی کی صحیح اور مسرت بخش منزل ہے۔ یہ منزل انسانیت کے راستے سے نفرت اور بغض اور وحشت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر سکتی ہے۔ بہادر پٹھان کے دست و بازو، بہادر پٹھان کی بھوک، بہادر پٹھان کی لاعلمی، بہادر پٹھان کا غیرت مند شعور اس جدوجہد میں اپنے دشمن کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ دوست

اور دشمن میں تمیز کر سکتا ہے

کیا تم نہیں جانتے۔ کہ انھوں نے اٹلانٹک کا فوجی معاہدہ کر ڈالا تاکہ معصوم اور نہتے انسانوں پر، بڑھتے چڑھتے جمہوریت پسندوں پر، محنت کش مزدور انسانوں پر۔ بڑھتے ہوئے طالب علموں پر، سائنس دانوں اور ادیبوں پر، فلاسفروں اور مفکروں کی لاشوں پر ایٹم کے مرگ آفرین ذرات کا خونین رقص دیکھا جائے۔ اور پٹھانوں کو بھی اگر وہ جمہوریت اور سچائی کا ساتھ دیں۔ بھون کر راکھ کر دیا جائے۔

کیا آج انھوں نے عہد نہیں کر لیا۔ کہ چین، برما، ملایا، انڈونیشیا، ہندچینی، ہندوستان اور پاکستان اور سرحد کے فاقہ کش انسانوں کو جن میں پٹھان بھی شامل ہیں۔ امریکی کارخانوں کی بنائی ہوئی توپوں اور بموں اور گولوں کا نشانہ بنا دیا جائے تاکہ ان ملکوں کے مٹھی بھر سرمایہ دار حاکم، جاگیردار لیڈر اور سامراجی ایجنٹ، مولوی اور جہالت اور وحشت کی دلدل کو وسیع تر کرنے میں امریکی جنگ بازوں کا ہاتھ بٹا سکیں

پٹھان آج تک علم اور سائنس کی روشنی سے محروم رہے ہیں۔ اور آج جب کہ علم اور سائنس اور امن کا امنڈا ہوا سیلاب سرحد کے پٹھانوں اور قبیلوں کی طرف اپنی آغوش محبت دلکشی ہوئے بڑھ رہا ہے۔ یہ فاشسٹ لوگ پھر بوکھلا گئے ہیں۔ پھر سرا سیما ہو اٹھے ہیں پھر ایک ایسے انتقام کا راستہ کھول رہے ہیں۔ جو وہ آج تک انسانوں سے لیتے رہے ہیں۔ ہر پٹھان سے لیتے رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ انسانی زندگی میں شعور اور علم پیدا ہو۔ وہ نہیں چاہتے کہ ایٹمی انرجی کو حیات انسانی کے ارتقا اور تعمیر کے لئے وقف کیا جائے۔ وہ نہیں چاہتے کہ انسان بیسویں صدی کے اس سائنسی دور میں بھی بچوں کا قاعدہ پڑھنا شروع کر دے

تہذیب انسانی کے یہ معمار اپنی عمارت کو ڈھتے دیکھ کر جنگ جنگ کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ وہ پٹھان کی غیرت اور بہادرانہ جذبات کو چھیڑ کر زور سے آواز لگاتے ہیں "بہادرو! تمہارا کام لڑنا ہے، تمہارا فرض ہے جنگ کرنا، انسانوں پر گولیاں چلانا، اور ہمارا کام ہے تمہارے کاندھوں پر بندوق رکھ دینا۔

مگر تمہاری بندوقوں کی غیرت مرگئی ہو، اگر اس بندوق کی گولیوں میں انسانیت کی سنساہٹ کا فور ہو چکی ہو۔ تو اسے بھاؤ پٹھانو! مزدور اور کسان اور اپنے جیسے محنت کش بھائیوں کے خلاف اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ

لیکن تمہاری غیرت تو محبت اور حسن کے رچاؤ سے ہی آج تک زندہ ہے۔ میں کیونکر تعین کروں۔ کہ وہ ایک بھوک کے مارے ہوئے ثقاہت کے ستائے ہوئے محنت کش انسان کے خلاف استعمال ہو سکتی ہے۔ اور اس لئے استعمال ہو سکتی ہے۔ تاکہ تمہیں اُجڈ اور وحشی کہنے والے، اجڈ اور وحشی رکھنے والے تمہیں پھر ایک بار وحشی اور اُجڈ رکھ کر اپنے مہذب ہونے کا ڈھونڈرا پیٹ سکیں۔ اپنے منافع خواروں اپنے سرمایہ داروں اور اپنے جاگیرداروں کا تحفظ کر سکیں۔ اور دُنیا بھر میں بڑھتی ہوئی انسانیت کی تحریک کو لامذہب اور دہریت کا نام دے کر ہمارے خنجروں سے اُس کی آستین کو خون آلود کرا دیں۔

کیا تمہارے پاس اپنے ماضی کے تجربات اور حال کی زندگی کی تصویریں نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو ذرا نہیں اٹھا کر دیکھو۔ یہ کتنی چمکیلی ہیں۔ کیا ان کی روشنی میں تمہیں وہ راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ جو مستقبل کی منزل کو جاتا ہے۔ اور جس کے ایک طرف لیڈروں اور وحشیوں کے نمائندے انگریزوں اور امریکیوں کے جنگ باز ایجنٹ ہیں اور دوسری طرف محبت اور خوبصورتی اور علم اور سائنس کے محنت کش نمائندے انسانیت کی اس آخری جدوجہد میں غیرت مند پٹھانوں کی صف، محبت اور امن کے نمائندوں کا ساتھ دے گی۔ میرا یقین کتنا مستحکم ہے۔ مضبوط اور گرانڈیل پٹھانوں کی طرح مستحکم ‌+

●

ایم عبدالقادر

حجرہ

ہر قوم کی زندگی میں بعض ایسی امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں جو اُس قوم کی سماجی زندگی کی بنیادیں کہلائی جا سکتی ہیں۔ اور جن پر اس قوم کی اجتماعی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ اور بغیر جس کے وہ قوم اصلی معنوں میں سماجی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ ترکوں کی زندگی میں قہوہ خانے کا جو رتبہ ہے یا یورپ کی زندگی میں کلبوں کا جو مرتبہ ہے وہی رتبہ یا حیثیت افغانوں کی زندگی میں حجرے کو حاصل ہے پٹھان کی سماجی زندگی ابتدا سے لے کر انتہا تک حجرے سے وابستہ ہے۔ حجرے کے بغیر کوئی افغان گاؤں یا کوئی پٹھان خاندان یا گروہ تصور ہی نہیں۔ لہٰذا جو اہمیت حجرے کو حاصل ہے۔ ضروری ہے کہ ہم اس کا تجزیہ کریں۔ بعض ایسی عناصر جو ہر قوم کی سماجی زندگی میں ہوا کرتی ہیں جس سے باقی اقوام سبق لے سکتی ہیں۔ البتہ ان کا جائز یا ناجائز استعمال اس قوم کے افراد کی تعلیمی ارتقاء پر منحصر ہوتا ہے۔

ہر گاؤں میں جہاں دو چار پٹھان بستے ہوں۔ کوئی نہ کوئی جگہ ایسی ضرور ہو گی جس میں وہ لوگ صبح و شام ضرور ملتے ہوں۔ جہاں تک میرا قیاس کام کرتا ہے میں اس نہایت عجیب و غریب رسم کی تاریخی نشو و نما یوں سمجھتا ہوں۔ کہ ابتدا ہی سے پٹھان ایک جنگجو قوم تھی۔ لہٰذا اکثر اوقات اپنے مخالفین سے لڑنے وغیرہ کے متعلق جرگہ (صلاح مشورہ) کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے کوئی ایسی مشترک جگہ ضرور ہونی چاہیئے تھی۔ جہاں تمام ممبران قوم جمع ہو کر کسی اہم مسئلے کے متعلق رائے زنی کریں ہوتے ہوتے یہ مجالس بہت عام ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ آپس کے تنازعات بھی اسی جگہ فیصل ہونے لگے۔ اسی طرح سماجی زندگی میں ہر اقدام کی ابتدا اسی جگہ سے ہوئی اور اسی جگہ اس کی انتہا ہوئی۔ چونکہ افغان فطرتاً جمہوریت اور حریت پسند ہے۔ اس لئے حجرے میں غریب۔

امیر سب کو مساوی رائے دینے کا حق حاصل ہوتا ہے - اس کلب میں جمع ہو کر ہر کام میں پیشقدمی کرنے سے پہلے رائے لی جاتی تھی - اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حجرہ افغانی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا - شروع شروع میں تو حجرے کی یہی صورت تھی - لیکن رفتہ رفتہ اس کی حالت بدلتی گئی - جا بجا چھوٹے چھوٹے خان یا رئیس جس کے زیر اثر کچھ لوگ ہوں آپس میں مبتلائے جنگ و جدل ہوئے - تو ہر ایک خان یا رئیس نے اپنا حجرہ یا کلب الگ بنایا جس میں اس کے ہم خیال یا جیسے پشتو میں پرہ جنبہ کہتے ہیں، لوگ جمع ہو جاتے تھے - وہ رئیس یا خان پھر اپنے پرہ جنبہ والوں سے مختلف قسم کی تجاویز کے متعلق گفت و شنید کرتا تھا - اگر کوئی مہمان یا مسافر اس گاؤں میں آ کر رہتا تو یہی حجرہ اس کے لئے قیام گاہ ہوتا - اس میں مہمان سو بھی جاتا تھا - وہیں اس کو کھانا بھی مل جایا کرتا تھا - اس حجرہ کی موجودگی کو بھی پٹھان کی مہمان نوازی میں بڑا دخل ہے

ہر ایک پٹھان بستی کئی قبائل یا خیلوں میں منقسم ہوتی ہے - ہر خیل کے لوگ گاؤں کے مختلف حصوں میں یکجا رہتے ہیں - اور ہر خیل کا اپنا حجرہ یا کلب الگ ہوتا ہے - ہر حجرے کا کوئی نہ کوئی نام بھی ہوتا ہے - جو عموماً اسی خیل سے تعلق رکھتا ہے مثلاً حجرۂ دوست خیل - یا خادی خیل یا پیر خیل وغیرہ وغیرہ - بعض حجرے کسی دن، شخص یا واقعہ یا درخت وغیرہ سے یاد کئے جاتے ہیں - مثلاً حجرۂ غزنی یا ناصا پٹے حجرہ یا پوسے حجرہ - غرضیکہ ان حجروں میں صبح و شام کسان لوگ جمع ہوتے ہیں - اکثر غیر شادی شدہ نوجوان تو رات کو بھی حجرے ہی میں سوتے ہیں - رات کے وقت عموماً جب معتبر لوگ نماز سے واپس آتے ہیں - تو تھوڑی دیر حقہ پینے کے واسطے یا بات چیت کی غرض سے حجرے میں آ جاتے ہیں - نوجوان اس وقت اکثر خاموش رہتے ہیں - جب یہ بزرگ لوگ لیٹ جاتے ہیں - تو پھر نوجوان گھڑے اور رباب سے دل بہلاتے ہیں - اس محفل سرود کو مجلس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

علی الصبح اکثر کسان جمع ہو کر یہاں سے اپنے اپنے کھیتوں کو چلے جاتے ہیں - اور پھر شام کو جب دن بھر کے کام کاج کے تھکے ماندے واپس آتے ہیں - تو حجرے میں آرام کرتے ہیں اور گاؤں کے اندر اگر کچھ واقعات یا حادثات ان کی عدم موجودگی میں وقوع پذیر ہوئے ہوتے ہیں - ان سے اطلاع پا کر اس کے متعلق اپنی برادری سے تبادلۂ خیالات

کرتے ہیں۔

پٹھانوں کی سماجی زندگی چونکہ مکمل طور پر جمہوری اصولوں پر مبنی ہے۔ اس لئے شادی اور غمی کی رسوم بھی حجرے ہی میں ادا ہوتی ہیں۔ شادی کے موقع پر تمام برات کے لوگ حجرے میں جمع ہوتے ہیں۔ تمام عزیز و اقارب دور دور کے گاؤں سے جب آتے ہیں۔ تو سیدھے حجرے ہی میں پہنچتے ہیں۔ گانا بجانا وغیرہ سب حجرے ہی میں ہوتا ہے۔ برات روانہ بھی ہوتی ہے۔ تو حجرے ہی سے۔ اسی طرح جب دُلہن کے ہاں برات پہنچ جاتی ہے۔ وہاں بھی حجرے ہی میں برات کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ تمام کھانا پینا وغیرہ بھی یہیں ہوتا ہے۔ غم کے موقع پر بھی اسی طرح تمام خویش اقربا اور احباب حجرے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ فاتحہ خوانی کی رسم بھی یہیں ادا ہوتی ہے۔ جنازہ کے ساتھ سب لوگ یہیں سے مل کر جاتے ہیں۔ اور تجہیز و تکفین کے بعد باقی رسمیں بھی یہیں ادا ہوتی ہیں

یہ تو حجرے کے اس پہلو کا ذکر ہے جسے ہر لحاظ سے مستحسن تصور کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس عام اختلاط کے باعث جس میں آج کل ہر سماج کے لوگ مبتلا ہیں۔ اس عمدہ اور مستحسن چیز کو بھی اب وہ درجہ حاصل نہیں رہا۔ اور اب جو کچھ فساد قتل و غارت اور قمار بازی وغیرہ کا سلسلہ چلا ہے۔ وہ بھی حجرہ سے شروع ہوتا ہے۔ عموماً بیکار نوجوان جو زمینداری کی مشقت برداشت نہیں کر سکتے اور جہالت اور ناخواندگی کی وجہ سے ملازمت یا کاروباری زندگی میں حصہ نہیں لے سکتے ہیں۔ ان کلبوں میں جمع رہتے ہیں۔ آپس کی دشمنیاں چونکہ عام ہو گئی ہیں۔ اس لئے اکثر یہ نوجوان بے کاری کی وجہ سے سازشوں میں لگے رہتے ہیں۔ کم سن بچے بھی اکثر حجروں میں کھیلتے رہتے ہیں۔ یہ ان نوجوانوں کی مصاحبت میں پرورش پاتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو مصائب اور کمزوریاں سوسائٹی میں موجود ہوتی ہیں۔ وہ بچوں میں بہت جلد راسخ ہو جاتی ہیں۔ اکثر تاش کھیلنے کی بیماری حجرے ہی سے بچے قبول کر لیتے ہیں۔ جو آگے چل کر جوا بازی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ چھرا چاقو وغیرہ کا استعمال بھی اسی جگہ سکھایا جاتا ہے۔

اسی طرح حجرے کی وہ اہمیت جو ابتدا ہی میں اس کو حاصل تھی بالکل معدوم

ہو گئی ہے۔

ایک اور بہت بڑا فرق جو آج کل حجرہ کی حیثیت ترکیبی میں واقع ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بجائے خیل یا قبیلہ کے مشترک کلب ہونے کے حجرے آج کل کچھ ذاتی ملکیت بن رہے ہیں۔ اکثر خان یا رئیس جو پہلے قبیلے کے حجرے کو لازماً استعمال میں لاتے تھے۔ آج کل ضد اور پرہ جنبہ اور تربوریت کی وجہ سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا لیتے ہیں۔ گویا پٹھان کی سماجی زندگی میں جو مرکزیت حجرے کو حاصل تھی وہ اس افتراق و اشتقاق کی وجہ سے زائل ہو چکی ہے۔ اور ہر خان چنانچہ جو معمولی سی حیثیت بھی رکھتا ہو۔ ایک کوٹھا سا بنا کر جدا راگ الاپ رہا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اس طرز عمل سے سماجی زندگی کی یکسانیت فنا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آج کل سوائے چند دور افتادہ دیہات کے جہاں عام کسان رہتے ہیں۔ اور کوئی خان یا خانچہ نہیں۔ وہاں حجرہ کی وہ پرانی کیفیت باقی نہیں رہی۔ حجروں کی کثرت کا لازمی نتیجہ کثرت اختلاف ہے اور اختلاف کی کثرت گویا جرائم کی کثرت ہے

بعض قبائل میں حجرہ ایک درخت کے نیچے اکٹھا ہو جانے کو کہتے ہیں۔ کرم اور ننگرہار کے لوگ عموماً کسی بڑے درخت کے نیچے بیٹھ کر سماجی زندگی بسر کرتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ زیادہ تر پہاڑی علاقوں کے رہنے والے ہیں۔ اس لئے ان کی سماجی زندگی زیادہ منظم نہیں ہو سکتی۔ ان کے گاؤں بھی عام دیہات کی طرح نہیں ہوتے۔ عموماً الگ الگ کچھ فاصلہ پر ایک آدھ کمرہ یا کوٹھا ہوا کرتا ہے جس میں یہ لوگ اپنے بال بچوں اور مال مویشی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور ان کو کسی درخت کے آس پاس بیٹھ کر بات چیت کر لیتے ہیں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ عام دیہات سے یہ کیفیت اب مفقود ہو رہی ہے لوگ زیادہ تر نفسا نفسی میں مبتلا ہیں۔ آپس کے جھگڑے بڑھ رہے ہیں۔ اور ایک ہی جگہ بیٹھ کر زندگی کے معمولی مراحل بھی طے نہیں کر سکتے۔ اگر حجروں کو واقعی اسی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ جس کے لئے یہ وضع کئے گئے تھے۔ تو یقینی طور پر پٹھانوں کی زندگی بہت زیادہ بہتر بن سکتی ہے ؛

امیر حمزہ خان شنواری

پٹھان اور توہمات

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں توہمات نہ پائے جاتے ہوں۔ اگرچہ یورپ اور امریکہ نے تہذیب و تمدن کی دوڑ میں اقوام عالم کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی ان میں توہمات اب تک پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً یورپ کے بڑے بڑے روشن دماغ اور تعلیم یافتہ افراد تک ان میں مبتلا ہیں۔ عرب لوگوں کا خیال ہے کہ تعرف الاشیاءُ با ضدادہا۔ توہمات عقل کی ضد ہیں۔ اور یہ ناممکن ہے۔ کہ انسان تو روئے زمین پر موجود ہو اور توہمات فنا ہو جائیں۔ توہمات ہی کی موجودگی ہمیں ہر زمانہ میں ذہنی ارتقا کا اندازہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا۔ کہ انسان جن بھوت کو بالکل ایک یقینی وجود مانتا تھا۔ اور ہزاروں سال اسی تصور پر جما رہا۔ مگر ذہنی ارتقا نے اسے وہمی وجود ثابت کر دکھایا۔ اور اب اگر اس توہم کا وجود باقی ہے۔ تو اس کی وجہ صاف ہے، کہ ارتقا اپنے ساتھ ماضی کے تصورات سے آئی ہے۔ جو انسان کے تحت الشعور میں تاحال موجود ہیں۔ اب ارتقا کی اگلی منزلیں اس تصور کو بھی مٹا دیں گی۔

ہر ایک قوم کی روایات اور مذاہب کے اصول توہمات کے وجود میں معاون ثابت ہوتے آئے ہیں۔ مگر توہمات پر محل وقوع کا بھی گہرا اثر پڑتا ہے ۔ اکثر ہمسایہ اقوام کے توہمات بھی دوسری قوم میں رواج پا جاتے ہیں۔ اور پھر وہ قوم اسے مسلسل عمل سے اپنا لیتی ہے۔ مثال کے طور پر آزاد قبائل میں آج سے پچاس برس قبل یہ دستور نہ تھا۔ جب دلہن سسرال میں لائی جاتی ہے۔ تو اُسے ایک دودھ کا گلاس پیش

کیا جاتا ہے۔ دُلہن اس سے دو چار گھونٹ پی لیتی ہے۔ اور پھر عورتیں دُلہن کا وہ جُھوٹا اُس کے خاوند کو پلا دیا کرتی ہیں۔ اُنہیں یقین ہے۔ کہ ایسا کرنے سے دُولہا عمر بھر دلہن کا تابعِ فرماں رہے گا۔ یہ توہم صوبہ سرحد کے افغانوں میں نمودار ہوا۔ اور آزاد قبائل کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے یہاں بھی چلا آیا۔ آزاد قبائل میں یہ توہم پایا جاتا ہے۔ کہ جب دُلہن لائی جاتی ہے۔ تو اُسے گھوڑے سے صرف ایک ایسی عورت اُتارا کرتی ہے جس کی اولاد بہت ہو۔ اور اُن میں سے کوئی مرا بھی نہ ہو۔ پھر اُسے خاندان کے سب سے خوشحال اور صاحبِ حشمت گھر میں آتارا جاتا ہے اور اس پر گیہوں یا جو کے دانے بکھیر دیئے جاتے ہیں۔ اگر دلہن کی سوکن موجود ہو۔ تو سوکن دلہن کے آنے سے قبل اُس کوٹھے پر چڑھ جاتی ہے جس میں دُلہن کو آتارا گیا ہو۔ وہ دلہن کے کوٹھے کی چھت پر پر دو چار دفعہ اِدھر اُدھر چل پھر کر نیچے اتر آتی ہے اور فوراً ہی دلہن کو اپنی آواز سناتی ہے۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ ایسا کرنے سے دُلہن عمر بھر اس کے ماتحت رہے گی

یوں تو نظرِ بد لگ جانے کا توہم تقریباً تمام مشرقی اقوام میں پایا جاتا ہے۔ مگر اسے دفع کرنے کے طریقے جدا اور مختلف ہیں۔ آزاد قبائل میں بھی اس کے مختلف طریقے پائے جاتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے متعلق یہ معلوم ہو جائے۔ کہ اُس کی نظر کسی کو لگ گئی ہے۔ تو اُس کے کپڑوں یا ازار بند میں سے ایک حصہ لا کر جلا دیا جاتا ہے۔ اور اُس کی دُھونی مریض کو دی جاتی ہے۔ نظرِ بد سے بچنے کے لئے اکثر بچوں کی پیشانی پر کالک لگائی جاتی ہے۔ یہ توہم صوبہ سرحد سے قبائل میں چلا آیا ہے۔ اگر کسی شخص کے متعلق یہ یقین ہو جائے۔ کہ اُس کی نظرِ بد لگ جاتی ہے۔ تو لوگ اُس کے نقشِ قدم پہ مینخ ٹھونک دیا کرتے ہیں۔ اور اکثر لوگ اس پر پیشاب بھی کر دیا کرتے ہیں۔ نظرِ بد سے محفوظ ہونے کے لئے قبائل کے لوگ بھی گنڈے تعویذ کے قائل ہیں۔ مگر عورتیں نظرِ بد کے مریض کا علاج یوں کیا کرتی ہیں۔ کہ ایک لڑکے کے ہاتھ گاؤں کی مسجد سے گھاس منگوائی جاتی ہے (آزاد قبائل کے پہاڑوں میں ایک قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے۔ جنہیں وہ لوگ "مخیزنے" کہتے ہیں۔ "ژخیخہ" پشتو میں شیشہ کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ

یہ گھاس شیشے کی طرح چمکدار ہوتی ہے۔ اس لئے اُسے "خیخئے" کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک بڑے طشت میں پانی ڈال دیا جاتا ہے۔ اور گھاس لے کر اُسے آگ دکھائی جاتی ہے جب گھاس سے شعلہ بلند ہونے لگتا ہے۔ تو جلتی ہوئی گھاس ایک ہانڈی میں رکھدی جاتی ہے۔ اور ہانڈی طشت کے پانی میں اوندھی کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد متعدد عورتیں لکڑیاں۔ چاقو۔ آرے اور دیگر اشیاء لئے ہوئے آہستہ آہستہ ہانڈی پر ضربیں لگاتی ہیں۔ اور ساتھ ساتھ کہتی ہیں "نظربات۔ نظربات۔ ڈسپین سترگی۔ ڈتورسترگی۔ ڈشین سترگی۔ نظربات۔ نظربات" یعنی نظر بد ٹوٹ جائے۔ چاہے وہ سفید۔ سیاہ اور سبز آنکھوں والے کی ہو۔ نظر ٹوٹ جائے۔ نظر ٹوٹ جائے"۔ واضح ہو کہ یہ عمل کرتے وقت پانی کا طشت عین مریض کے سینہ کے اوپر موجود رہا کرتا ہے اور چند عورتیں اُسے ہوا میں تھامے ہوئے ہوتی ہیں۔ چار پانچ دفعہ جلی ہوئی گھاس اور ہانڈی کا عمل کیا جاتا ہے۔ اور پھر راتوں رات وہ پانی گھاس سمیت ایک چوراہے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ تاکہ نظر بد کرنے والا شخص اگر اُس راہ سے گذرے اور اُس کی نگاہ جلی ہوئی گھاس اور پانی پر پڑے۔ تو اُس کی نظرِ بد کا اثر زائل ہو جائے اگر اس کے بعد بھی مریض کو افاقہ نہ ہو۔ تو قوم کے مشہور عاملوں کو بلایا جاتا ہے۔ ان عاملوں میں عورتیں بھی ہُوا کرتی ہیں۔ جن کا یہ دعویٰ ہوتا ہے۔ کہ چند جن ان کے تابع فرمان ہیں۔ وہ آکر مریض کو دیکھتے ہیں۔ تو تھوڑی دیر کے لئے مراقبہ کرتے ہیں۔ یا آنکھیں بند کر کے آسمان کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور گویا وہ اپنے جنوں سے مریض کے متعلق کچھ دریافت کرتے ہیں۔ اُن کے ہونٹ ہلتے ہیں اور بعد میں آنکھیں کھول کر کہتے ہیں "بچارے پر دشمن نے جادو کر دیا ہے" مریض کے وارث پوچھتے ہیں اس کا علاج کیا ہے۔ عامل صاحب پھر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کہتے ہیں "فلاں قبر کے پاس مریض کا بُت بنا کر دفن کیا گیا ہے لوگ جا کر اُسے لے آتے ہیں۔ وہ اکثر کپڑے یا موم کا ایک پتلا سا ہوتا ہے۔ جس میں بہت سی سوئیاں چبھوئی ہوتی ہیں۔ سوئیاں اس سے نکال دی جاتی ہیں۔ اور

عامل اپنا نذرانہ لے کر چلا جاتا ہے۔ اکثر مریض اِس سے اچھے بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ عامل پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں۔ انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب وہ اچھے ہو جائیں گے اور یہی یقین اُن کی ارادی قوت کو ایک مرکز پر لا کر بحران کو مضبوط کر دیتا ہے۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ بحران کے صحیح ہو جانے کے بعد مرض نیست و نابود ہو جاتا ہے

مگر کسی بچے کے بیمار ہونے کی حالت میں عامل سے کام نہیں لیا جاتا۔ کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے۔ کہ کوئی شخص بچے پر جادو نہیں کیا کرتا۔ اگر نظرِ بد کا یقین بھی جاتا رہے اور شیرخوار بچہ بدستور بیمار ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ بچے کا رنگ زرد پڑ گیا ہو۔ تو آزاد قبائل کی عورتوں کے خیال میں اُسے چاند نے پکڑ لیا ہے۔ ایسے حال میں آزاد قبائل کی عورتیں آدھی رات کے قریب بیمار بچے کو بازوؤں میں تھام کر کوٹھے سے باہر لاتی ہیں۔ اور اُسے چمکتے ہوئے چاند کے سامنے پیش کر کے تین دفعہ یہ الفاظ دھراتی ہیں: "چاند چاند یہ بچہ تمہارا ہے ہمارا نہیں"

اگر کسی کا بچہ مر جائے۔ اور وہ بار بار والدین میں سے کسی کو خواب میں دکھائی دے تو کہا جاتا ہے۔ کہ بچہ پیار مانگتا ہے۔ ایسی حالت میں بچے کا باپ یا ماں جا کر اُس کی قبر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ اور انہیں یقین ہے کہ پھر وہ خواب میں نہیں آیا کرتا مگر ایک توہم ایسا بھی موجود ہے جس کے خیال ہی سے دہشت ہونے لگتی ہے۔ آزاد قبائل کے مرد اس توہم کے شدید مخالف ہیں۔ مگر عورتوں میں اس کی پابندی اب تک پائی جاتی ہے۔ اگر کسی عورت کی اولاد تو پیدا ہوتی ہو۔ مگر پیدا ہوتے ہی مر جاتی ہو۔ تو وہ اس کے لئے متعدد درگاہوں میں جاتی ہے۔ گنڈے تعویذ کراتی ہے۔ مگر ان تمام امور میں ناکامی کے بعد ایک دہشت ناک کام کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ جب اُس کا بچہ مر جائے۔ تو تین چار دن کے بعد بچے کی ماں قبرستان جا کر قبر سے اپنے مرے ہوئے بچے کی لاش نکال کر اُسے یوں گود میں لٹا لیتی ہے جس طرح کہ عورتیں بچوں کو دودھ پلاتی ہیں۔ ایک آدھ گھنٹہ تک بچے کو سینے

سے پیشلئے وہیں بیٹھی رہتی ہے۔ اور اُس کے بعد بچے کو دوبارہ پیرو خاک کر کے گھر لوٹ آتی ہے۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ ایسا کرنے کے بعد اکثر عورتوں کے بچے مرنے سے بچ جایا کرتے ہیں

آزاد قبائل میں ہر عید سے تین دن پیشتر مُردوں کی عید منائی جاتی ہے۔ اور یہ عید اُن میں ایک مذہبی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے۔ کہ برابر تین دن تک آزاد قبائل میں قسم قسم کے کھانے پکائے جاتے ہیں۔ دُنبے ذبح ہوتے ہیں۔ پلاؤ پکتا ہے۔ اور شام ہوتے ہی اُسے حجروں میں چُنا جاتا ہے۔ غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے رہنے والے بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ عید سے تین دن پیشتر اُن کے مردوں کی روحیں اپنے گھروں میں آتی ہیں۔ اور اگر اس موقع پر انہیں ثواب پہنچانے کے لئے صدقہ وغیرہ نہ کیا جائے۔ تو وہ ناراض ہو کر چلی جاتی ہیں۔ اور بددعائیں دیتی ہیں۔

جن بھوت اور پریت کا توہم دنیا بھر کی قوموں میں موجود ہے۔ آزاد قبائل بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ آزاد قبائل کے بہادروں میں ایسے ایسے شجیع افراد بھی ہو گذرے ہیں۔ جن میں سے ایک ایک نے سو سو آدمیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ مگر اُن کی ہمت کبھی نہیں ڈگمگائی۔ لیکن انہی بہادروں کو اگر رات کے اندھیرے میں کسی لق و دق بیابان یا سنگلاخ پہاڑ سے گذرنے کا موقع پیش آیا۔ تو جن بھوت کے وہمی تصور نے اُن کا زہرہ آب کر دیا ہے۔

متفرق توہمات اگر گھر کے صحن میں کُتا زمین پر لوٹ رہا ہو۔ تو قبائلی عورتوں کا خیال ہے کہ یہ مہمان کے آنے کی نشانی ہے۔ اگر آٹا گوندتے وقت طشت سے آٹا گر پڑے تو یہ بھی مہمانوں کی آمد کا شگون سمجھا جاتا ہے۔ اگر بیٹھے بیٹھے کسی عورت کی چادر سر سے سرکتی ہوئی چہرہ پر آ جائے۔ تو اُنہیں وہم ہو جاتا ہے۔ کہ گھر کا فلاں شخص سفر سے آ رہا ہے۔ اگر کسی عورت کی سوکن مر جائے۔ تو عرصہ تک ہر جمعہ کی شب کو اس کے نام کا فاتحہ دیا کرتی ہے۔ تاکہ اُس کی رُوح اُسے تکلیف نہ دے۔ اور اس کے مرنے کے

بعد وہ آرام سے گھر کی ملکہ بنی رہے۔

ام الصبیان کے مرض میں جبکہ بچے دن بدن سوکھتا جاتا ہے۔ تو اُس سے قبائلی عورتوں اور مردوں میں ایک نیا توہم پیدا ہو گیا ہے۔ اس مرض کے متعلق ابتدا ہی سے ان کا خیال ہے۔ کہ اس پر جن بھوت کا سایہ ہو گیا ہے۔ مگر اس کے لئے وہ گنڈے تعویذوں سے کام لیا کرتے تھے۔ انگریزوں کے اقتدار کے بعد انہوں نے اِس مرض کا ایک اور علاج دریافت کر لیا۔ اور ان کا خیال ہے۔ کہ یہ تیر بہدف علاج ہے۔ وہ اپنے مریض بچے کو کسی بھنگی کی قبر پر لے جا کر اتوار کے دن نہلاتے ہیں۔ اور متواتر تین چار دفعہ یہ عمل کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔ کہ بھنگی کی رُوح کے پرتو سے مرض جاتا رہتا ہے۔

ایک متوحش اور خوفناک توہم بیس پچیس سال قبل نہایت کثرت سے پایا جاتا تھا۔ مگر آج کل اس کی شدت کم ہو گئی ہے۔ تاہم خال خال یہ بھی موجود ہے۔ اس کی صورت یوں ہے۔ کہ ایک اُدھیڑ عمر کی عورت رات کے اندھیرے میں قبرستان چلی جاتی ہے۔ اور کسی تازہ مردے کی قبر کھود کر اُس میں اتر جاتی ہے۔ اور مُردے کا کفن ہٹا کر اُس کے سینہ پر آٹا گوندتی ہے۔ اور پھر بدستور قبر کو بند کر کے گھر آ جاتی ہے۔ یہ خمیر دو قسم کا ہوتا ہے۔ سیاہ اور سفید۔ سیاہ قسم کا خمیر، ادھیڑ عورت اُن جوان عورتوں پر فروخت کیا کرتی ہے۔ جن کی سوکنیں ہوں۔ یہ سیاہ قسم کا خمیر لیکر ایک سوکن دوسری سوکن کے کپڑوں پر مل دیتی ہے۔ اور اُسے یہ یقین ہو جاتا ہے۔ کہ اب وہ خاوند کی نظروں سے بالکل گر جائے گی۔ سفید قسم کا خمیر خود استعمال کرتی ہے۔ اور اس کا خیال ہوتا ہے کہ اب خاوند اُس سے بے پناہ محبت کرنے لگے گا۔

اگر کسی عورت کو پسو کاٹ کھائے اور وہ فوراً پسو کو پکڑ لے۔ تو کہا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے خاوند کو بہت ہی پیاری ہو گی

اگر آزاد قبائل کی عورتیں کہیں بیٹھی ہوں۔ اور کوا کائیں کائیں کرتا ہوا گذر جائے یا قریب کی دیوار پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرنے لگے تو وہ فوراً کہدیتی ہیں "د خوز یوے د کوہ" یعنی "خوشخبری ہے" ان کا خیال ہے۔ کہ کوے کی آواز میں کسی آنے والے واقعہ کا وجود پوشیدہ ہے۔

سید انوار الحق

پیشوں عورت

عورتیں مرد کا لباس اور مرد عورتوں کا۔ عورتیں مردوں کی کھیتیاں
ہیں۔ (قرآن)

دنیا اور دنیا کی تمام نعمتیں اچھی اور خوبصورت ہیں۔ لیکن ان سے
بھی زیادہ خوبصورت اور پرہیزگار عورت ہے۔

عورت گھر کا اجالا ہے جس گھر میں عورت نہیں۔ اس میں خوشی
اور اجالا نہیں (حدیث)

عورت کی حکمت گھر کو آباد رکھتی ہے (حضرت سلیمان)

جس گھر میں عورت نہیں ہوتی وہاں سعادت کے فرشتے قدم
نہیں رکھتے (سکندر اعظم)

عورت زندگی کی ساتھی اور دکھ درد میں مرد کی معاون ہے (گوئٹے)

عورت کی گود انسان کا پہلا مکتب اور گہوارہ ہے (والسٹر)

عورت سب سے اچھا اور سب سے آخری آسمانی تحفہ ہے (ملٹن)

عورت کو خدا نے صرف محبت کے لئے پیدا کیا (رد ویو)

عورت ہی وہ واحد ہستی ہے جو عشق و محبت کی حقیقت کو
پہچانتی ہے (شیلر)

اے عورت تو وہ ہے جس کے لئے میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ

میرے پاس ہے وہ اور جو کچھ میرے پاس نہیں ہے وہ بھی
تیرے قدموں پر نچھاور کر دوں (شیکسپیئر)

قدیم زمانے سے لے کر اس وقت تک عورت قربانیوں کے پیش
کرنے اور مذہبی قوانین کی توسیع میں کامل توجیہہ کے ساتھ
پیش پیش ہے۔ اور عورت ہی مقدس قوانین کی پرورش کرتی ہے
ہے۔ (رگ وید)

یہ افکار و اقوال عام عورت کے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ اگرچہ پشتون عورت کو عام عورتوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا تاہم بعض وجوہ کی بنا پر اس کی بعض خصوصیات کو ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پشتون عورت دوسری اقوام کی عورتوں سے منفرد ہے۔

فطرت نے بعض خصوصی امتیازات کی بنا پر مرد کو عورت پر ایک حد تک تفوق ضرور عطا کیا ہے لیکن ساتھ ہی عورت ذات کو بقیہ تمام انسانی حقوق میں مرد کے ساتھ قریب قریب برابر کا شریک و حصے دار بھی بنایا ہے۔ لیکن مرد نے اس اتنی سی رعایت سے ایسا ناجائز فائدہ اٹھایا کہ کچھ نہ پوچھیئے۔ پہلے تو عورت بے چاری کو ناقص العقل ثابت کر کے بدنام کیا۔ پھر اُسے نحیف و ناتواں بتلا کر زیردست کیا۔ خود مطلق العنان رہا۔ اور عورت کو ہمیشہ پابند و محبوس رکھا۔ غرض جہاں تک ہو سکا اُس سے اُس کے تمام جائز حقوق چھین کر اُس پر زبردستی کی۔ یورپ نے اس آخری دور میں گو بظاہر عورت کو پوری آزادی دے رکھی ہے۔ لیکن درحقیقت اِس عطیہ آزادی میں بھی زیادہ تر مردوں کی خواہش نفسانی کی تکمیل اور طلب ہیمی کی تسکین کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے! اسلام نے عورت کو بہت کچھ دیا۔ بہ لحاظ انسانیت اُس کی بڑی عزت کی اس کے احترام کو ملحوظ رکھا معاشرتی زندگی میں اُسے بہت بڑا رتبہ دیا لیکن افسوس ہے کہ مسلمان نے اپنے کردار اور عمل میں عورت کے لئے اس کے جائز حقوق کو آہستہ آہستہ نظرانداز کر کے جگہ جگہ اپنی مرضی کے مطابق رسمی اور رواجی قاعدے اور ضابطے بنا لئے۔ علی الخصوص پشتون مسلمان نے تو عورت ذات کو بالکل ہی اپنے حقوق سے محروم کر دیا

عورت کی زندگی کے تین حصے ہوتے ہیں۔ ایک میں وہ بیٹی ہوتی ہے۔ دوسرے میں بیوی بنتی ہے اور تیسرے میں وہ ماں کہلاتی ہے۔ پشتون عورت جب پیدا ہوتی ہے۔ تو اُس کی ولادت کو ہی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ پھر اُس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا جب وہ کام کاج کے قابل ہو جاتی ہے تو ہوش سنبھالتے ہی سارا گھر اُس کے حوالہ ہو جاتا ہے۔ جب جوان ہو جاتی ہے تو اُس کے والی وارث اپنی مرضی کے مطابق اُسے بیاہ دیتے ہیں۔ مال۔ جائداد و وراثت میں سے اُسے کوئی حصہ نہیں دیتے۔ بلکہ الٹا شادی کا خرچہ بھی لڑکے والوں سے طلب کیا جاتا ہے۔ بیوی بنتے ہی شوہر کا سارا گھر اُسے سنبھالنا پڑ جاتا ہے۔ اور ماں بن جانے کے بعد بھی وہ اس قابل کبھی نہیں تسلیم کی جاتی۔ کہ اُس کی کسی بات کو کوئی اہمیت دی جائے یا اس کی منفرد ہستی تسلیم کی جائے۔ اس بدنصیب کے نصیب میں سوائے اس کے کہ وہ ساری عمر دوسروں کی مرضی کی متابعت کرتی ہوئی اِس آباد و معمور دنیا سے ارمانوں بھرا دل لے کر چل بسے اُسے اور کوئی بھی خوشی و آسودگی حاصل نہیں ہوتی۔

ایک طرف تو پشتون مرد کی اپنی اس شریک حیات عورت ذات کی طرف سے بے اعتنائی، چشم پوشی اور غصب حقوق دیکھئے اور دوسری طرف اس پیکرِ ایثار و وفا۔ پشتون عورت کا صبر و استقامت اور قوت برداشت ملاحظہ کیجئے کہ مرد کے یہ ظلم و ستم اور جبر و تعدی سب کچھ کس خندہ پیشانی حوصلہ اور ضبط و تحمل کے ساتھ قبول کئے ہوئے ہے اور آج تک خود مرد کے خلاف اُف تک زبان پہ کبھی نہیں لائی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ازل سے اسی سلوک کی مستحق سمجھتی ہو۔ اسی لئے مخالفت کا تصور تک اس کے ذہن میں نہیں آتا۔

صوبہ سرحد کی اکثریت یعنی تقریباً پچاسی فی صدی آبادی دیہاتی ہے۔ اور گاؤں دیہات ویسے تو ہر جگہ اور سرحد کے علی الخصوص [illegible] میں تعلیم [illegible] ترقی [illegible] سے بہت حد تک ناآشنا و بے بہرہ واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے من حیث القوم پشتون عورت کی زندگی کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ تو وہ بھی دیہات ہیں [illegible] ایسے علاقے جہاں کے لوگ ابھی باہر کی ترقی یافتہ دنیا سے زیادہ گھلے ملے بھی نہیں ہیں اور [illegible] کی زندگی ابھی تک اپنی قدیمی خصائل کی ڈگر پہ چل رہی ہو۔ ساتھ ہی جہاں عورتوں کی [illegible] پیدائش سے تربیت و

نگہداشت کی طرف سے مرد کی لاپرواہی اور غفلت کی بھی حد نہ ہو۔ وہاں قدرتاً یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس قوم کے مرد جب ایسے ہیں تو عورتوں کا کیا حال ہوگا۔ لیکن دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ پشتون عورت ایک بے مثال کردار کی مالک اور بے نظیر محاسن کی حامل ہے۔ گھر کے کام کاج میں لکڑیاں لانا۔ پانی بھرنا۔ کپڑے دھونا۔ سینا پرونا۔ کوٹنا۔ چھانٹنا۔ پینا۔ پکانا ریندھنا۔ جھاڑو بہارد۔ اُپلے تھونپنا۔ لیپنا پوتنا اور ایسی ہی اور بہت سی جسمانی مشقتیں تو تمام مشرقی اقوام نے اپنی عورتوں کے سپرد کر رکھی ہیں۔ لیکن پشتون عورت ان تمام امورِ خانہ داری کو بہ تمام د کمال سنبھال لینے کے علاوہ جو کمال رکھتی ہے اس کی مثال دوسری اقوام دملل میں پیش کرنا محال ہے۔ وہ اس کا اپنی قومی یا خاندانی لڑائیوں میں مردوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو کھڑے ہو کر برابر کا حصہ لینا ہے۔

پشتون عورت شروع سے نہایت نفس کش واقع ہوئی ہے سو ذاتی آرائش و نمائش حسن وجمال سے محترز چلی آرہی ہے۔ بہت کم زیور پہنتی ہے۔ اور لباس میں کوئی ایسے بھڑکیلے رنگ نہیں استعمال کرتی۔ جو دماغ میں کوئی خاص تحریک پیدا کریں۔ اُس کا لباس عموماً سادہ دیگر سیاہ ہوتا ہے۔ اُسے مرد سے حد درجہ الفت و موانست ہے۔ بلکہ اس کے ناموس اور اس کی عزت پر ہر دم فدا ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ ایک دوشیزہ جس کی ابھی نامزدگی ہی ہوئی ہے منسوب مرد کے اچانک مرجانے کے بعد اس نے دوسری جگہ شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اور ساری عمر نہایت عزت دعفت اور صبر سکون سے اپنے ماں باپ کے ہاں گذار دی۔ یا ماں باپ کو خلاف مرضی شادی کرتے دیکھ کر شادی سے ہی انکار کر دیا۔ یا شادی ہوتے ہی بیوہ ہوگئی پھر بھی بقیہ زندگی خاموشی اور ہمت سے گذار دی اور عقد ثانی نہیں کیا۔ اور اگر کسی عورت نے ایسا کیا تو اُسے معیوب و مغموم سمجھا۔ بلکہ خود عورت اپنے دوسرے نکاح کو اس اصطلاح میں ظاہر کرے گی۔ کہ "سر پر خاک ڈالی ہے" یعنی دوسری شادی کی ہے۔ شوہر کے ساتھ انتہائی عسرت و تہی دستی میں بھی بخوشی گذارا کرتی ہے۔ اور حرفِ شکایت زبان پہ نہیں لاتی۔ اپنی عفت و عصمت کی خود محافظ و نگران رہتی ہے۔ اپنے خاندان کی عزت و دقار اور اپنے مرد کے ننگ و ناموس پر حد درجہ شیفتہ اور آبائی وضعداری کا پاس رکھنے والی ہے۔ خاندانی یا قبائلی لڑائیوں میں اکثر مردوں

کے دوش بدوش لڑتی ہے۔ اور اگر کبھی اسلحہ استعمال نہیں کر سکتی تو بے دریغ و بے دھڑک میدان جنگ و محاربہ میں پہنچ کر اپنے مردوں کی ہر ممکن مدد و معاونت کرتی ہے مہمان نوازی اور حسنِ خلق میں مرد سے سبقت لے گئی ہے۔ لیجئے ہم آپ کو اُس کی زندگی کا ایک اور روشن پہلو بتلاتے ہیں جس سے آپ اُس کے دماغ کے مدارج اعلیٰ۔ اس کے ذہن اور فکر و خیال کی بلند پروازی کا اندازہ لگا سکیں گے۔ اور آپ معلوم کر سکیں گے۔ کہ اس بظاہر پسماندہ و پس افتادہ قوم کی عورت علم و ادب کی شاہراہ پر کس قدر بڑھ چکی ہے یہاں ہم اس مسئلہ کی ماہیتی اور نفسیاتی جہت کو قصداً نظر انداز کرتے ہیں کہ عورت کا ادبیات سے براہ راست کیونکر اور کیا تعلق ہے۔ مگر اتنا ضرور کہیں گے کہ چونکہ عورت ذات از روئے خلق و آفرینش نہایت حساس اور نازک طبع واقع ہوئی ہے۔ وہ فطرتاً اور خلقتاً لطیف ترین جذبات اور نازک ترین احساسات لئے ہوتی ہے

قانون قدرت کے مطابق اس کائنات میں کسی شے اور کسی آدمی کو کوئی چیز بے وقت و بلا ضرورت نہیں دی جاتی۔ قدرت نے انسانی دماغ میں بڑی زبردست اور عجیب و غریب۔ اَن گنت قوتیں بلا استثنے ودیعت کر رکھی ہیں۔ لیکن انسان اپنی زندگی میں جن جن قوتوں سے کام لیا کرتا ہے وہی نشو و نما پاتی اور بڑھتی رہتی ہیں اور جو قوتیں کام میں نہیں لائے جاتے بیکار و معطل پڑے رہتے ہیں اور اُن میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ آیا اس شخص کے دماغ میں یہ قوت و استعداد موجود بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ جن قوموں نے اپنی عورتوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی ہے اُن کی عورتیں زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے ساتھ ساتھ کام کر رہی ہیں۔ ایسے ہی پشتون حکمران یا متمول گھرانے کی عورتوں کو جہاں تھوڑی کسی بھی صحیح تربیت دی گئی ہے۔ وہاں اُن کے ذاتی کمالات اور دماغی جوہر اجاگر ہو گئے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا کابل کے ایک فاضل ادیب بینوا نے ایک کتاب "پشتنے میرمنے" لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان میں بھی ایسی بہت عورتیں گزری ہیں۔ جو شعر و سخن میں ذوقِ سلیم اور مہارت تامہ رکھتی تھیں۔ جن کے نظم و نثر کے کلام

کے نمونے محفوظ کیے گئے ہیں۔ گو اس مجموعے کا اکثر حصہ فارسی میں ہے۔ مگر دقت نظر، ندرتِ تخیل اور بلندیٔ فکر کے لحاظ سے، اس میں کلام ہے یں کہ کلام اعلےٰ پائے کا ہے۔ مثال کے طور پر کابل کے محمد زئی قبیلے کے سردار نور محمد خان کی بیٹی بی بی آمنہ 'فدوی' کا منظوم کلام ملاحظہ ہو:-

تا نظر بر چمن و غنچۂ خنداں وا کردم — ستمے بود کہ بر دیدۂ بینا کردم
نہ چمن رنگِ وفا داشت نہ گل بوئے وفا — سیر آں بود کہ ہر سو کہ تماشا کردم

نثر کا نمونہ اس خط کا یہ ہے:-

"حمد بے پایاں و ثنائے بے شمار نثار بارگاہ حضرت آں پادشاہ، خالقے کہ شمع محبت انساں را بنور اخلاص برافروختہ، و در دل پاکان از خود بجز ماسوائے آں بود سوختہ ... الخ

ہرات کی بی بی آغا بیگم کا ایک مطلع ہے:-

آہ ازاں دامے کہ دارد رشتۂ تاب از رسن — و اے ندارد لعلِ لب پر دم میخورم خوناب ازو

سبزوار کی بی بی آغا ناز دوستہ کا کلام

ہر کجا آں مہ بہ آئینِ زلفِ پریشاں بگذرد — ہر کہ کفرِ زلفِ او بیند ز ایماں بگذرد
اے محباں پند ما بپذیرید و در وے مروید — ہر کہ دامن گیر داین درویش ز درماں بگذرد

بی بی بیک خراسان کی ایک خدا رسیدہ عارفہ بزرگ عورت تھیں۔ شیخ ابو سعید ابو الخیر لکھتے ہیں کہ ایک روز یہ بی بی میرے پاس آئیں۔ اور کہنے لگیں کہ لوگ تو یہ دعائیں مانگتے ہیں کہ خدا انہیں گھڑی بھر کی فرصت دے۔ کہ تجھے پہچان جائیں۔ لیکن میں یہ دعا مانگتی رہی ہوں۔ کہ بار الٰہ مجھے دم بھر کی مہلت دے کہ میں اپنے آپ کو پہچان سکوں کہ میں خود کون ہوں اور کس لئے ہوں۔

ہرات کے شیخ عبداللہ کی بیوی بی بی لہ کا شعر ہے:-

روم بہ باغ و ز نرگس دو دیدہ وام کنم — کہ تا نظارۂ آں سرو خوش خرام کنم

بلخ کے حاکم امیر درویش علی کی بیوی بی بی بیگی کا ایک شعر ہے:-

من اگر توبہ ز مے کردہ ام اے سرو سہی — تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے ندہی

قندہار کی ایک خاتون بی بی نور محکئی کہتی ہے :-

پہ سپین میدان د، بہ درسرہ یم — زہ پښتنہ لہ تورے نہ تر لم مینہ !

میں کھلے میدانِ جنگ میں (جہاں حفاظت و مدافعت کا کوئی ساز و سامان نہیں ہوگا) تیرے ساتھ ہوں کیونکہ پشتون نژاد ہوں۔ تلوار سے ڈرتی نہیں ہوں۔ اور جب اس کا عاشق ایدی خان ایک قومی وطنی لڑائی میں شہید ہو جاتا ہے۔ تو یہ فرطِ الم سے تڑپ کر کہتی ہے۔

جانان مِے سر پہ وطن کبنیښودہ — تارِ د زلفو بہ کفن ور تہ گنڈمہ

(جاناں نے وطن کی خاطر سر دیا۔ اس کا کفن اپنی زلف کے تاروں سے سیئوں گی) مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانہ میں قندہار کے حاکم عبدالرحیم خان خاناں کی بیٹی بی بی جاناں بیگم جو عالم فاضل تھی جس نے قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ کہتی ہے :-

عاشق ز خلق عشقِ تو پنہاں چساں کند — پیداست از دو چشم ترش خوں گریستن

سلطان محمود غزنوی کی پوتی سلطان مسعود کی بیٹی بی بی جہان ملکہ کی ایک مشہور نظم کا ایک شعر ہے :-

تا کلکِ صنع ایزد نقش وجود بستہ — چوں تو ملک نہادے ہرگز نیا فریدہ

افغانستان کے سمت شمالی میں ایک جگہ کے مہتر قرائے کی بیٹی آغا بیگم کا ایک شعر ہے :-

ز ہشیارانِ عالم ہر کرا دیدم غمے دارد — دِلا دیوانہ شو۔ دیوانگی ہم عالمے دارد

ہرات کے نور علی شاہ کی بیوی بی بی حیاتے کا ایک شعر :-

بہ یادِ لعلِ شیریں۔ می کنم چوں کوہ کن جانے — چو فرہاد از برائے خویش کارے کردہ ام پیدا

بلخ کے امیر عمی کی بیٹی دل شاد خاتون :-

حل شد از غم ہمہ مشکل کہ مرا در دل بود — جز غم عشق کہ حل کردنِ آں مشکل بود

بلخ کی بی بی رابعہ جس کے حسن و عشق کی داستانیں اور کلام کے نمونے کئی قدیمی کتابوں اور تذکروں میں قلم بند کئے گئے ہیں۔ ایک شعر ہے :-

مگر چشمِ مجنوں بہ ابر اندر است — کہ گل رنگِ رخسارِ لیلے گرفت

قندہار کی بی بی رابعہ کی ایک رباعی :-

آدم ئے زمکے وتہ راستون کا ۔۔۔ پہ ادر دغم ئے موسے لوہون کا
دوزخ ئے ودغ کاپر مخ دزمکے ۔۔۔ نوم ئے دھغہ دلتہ بیلتون کا

(آدم کو زمین پر اُتار بھیجا، شعلۂ غم سے اس کا سینہ جلایا۔ پھر ایک دوزخ بنادیا روئے زمین پر اور نام اُس کا رکھ دیا جدائی)

احمد شاہ بادشاہ کی ماں زرغونہ آنا: ۱۱۶۷ھ میں جب احمد شاہ ابدالی نے قندھار شہر کو ازسرِ نو بنانا چاہا۔ تو اُس نے ملک وملت کے بڑے بوڑھوں سے بھی استصواب رائے کیا۔ کہ نئے شہر کا نقشہ کیسا ہونا چاہیئے۔ کئی مختلف تجاویز پر غور وخوض کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ شہر کے گرداگرد کئی خندقیں اور بھاری فصیلیں بنائی جائیں تاکہ دشمن کے حملوں سے شہر محفوظ و مامون رہ سکے۔ سب نے یہ تجویز پسند کی لیکن جب احمد شاہ بادشاہ کی ماں "زرغونہ آنا" کو معلوم ہوا تو اس نے بیٹے کو بلوا بھیجا۔ اور اُس سے کہا کہ "بیٹا! سن۔ پشتون کبھی مٹی کی دیواروں کی پناہ نہیں لیتا۔ اور نہ ہی دشمن سے خندقوں میں چھپ کر بیٹھتا ہے پشتون تو اللہ پاک کی مدد کے آسرے اپنے زوربازو سے اپنی اور اپنے وطن کی حفاظت کیا کرتا ہے"

قندہار کی قوم اچکزئی میں ایک زرغونہ آد بے گذری ہیں۔ ایک قومی لڑائی کے موقع پر اپنے بیٹے ریدی خان کی حوصلہ افزائی کے لئے جو ٹپے کہے ہیں۔ اُس کا نمونہ

تورے بہ نکړئی نو بہ څہ کړئی ۔۔۔ چہ موشیدے دپښتنے رودلی دینہ!

یعنی بہادری اور شجاعت نہیں بتلاؤگے تو آخر اور کیا کروگے۔ کیونکہ تم نے دودھ جو ایک پشتون عورت کا پیا ہے۔

ایک بی بی زرغونہ کاکڑ قوم میں بھی ہوگذری ہیں۔ یہ بھی بڑے پائے کی عالم و فاضل تھیں۔ انہوں نے شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کی بوستان کا پشتو میں نہایت اعلےٰ منظوم ترجمہ کیا ہے۔ حاجی میر ویس خان کی بیٹی بی بی زینب بھی بڑی ادیب اور شاعرہ تھی۔ خود بھی دیندار تھی اور عالموں اور شاعروں کی قدردان بھی تھی۔ اپنے بھائی شاہ محمود خاں کی وفات پہ ایک طویل مرثیہ لکھا ہے۔ جس کا ایک بند ہے

محمودہ! فریاد زمے خور زاری ۔۔۔ پر ما لٹ دِ لتولہ کلی کور ژاړی

خپلوان لاځه پاچا دِ وزورژاړي — لشکر سپاه دے۔ بلی سپورژاړي
پښتون دغول په واویلا شونا — تند هاروایه په ژړا سونا

بی بی سلیمہ بیرام خان خان خاناں کی بیوی کا ایک شعر ہے:۔

کاکلت را گر زمستی رشتۂ جاں گفتہ ام — مست بودم زیں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

بی بی عائشہ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

شفق را لالہ گوں دیدم نماز شام در گردوں — مگر خورشید را کشتہ کہ دارد دامنِ پرخوں

بی بی فاطمہ خراسانی کی ایک رباعی:۔

آیے! از تو وفا و مہربانی نایاب — بے وصلِ تو لذت از زندگانی نایاب
وصلِ تو حیاتِ جاودانی لیکن — مانندِ آب زندگانی نایاب

حاجی میرویس کی ماں بی بی نازو بھی کس قدر بلند خیال شاعرہ ہو گذری ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:۔

سحرگہ وہ۔ دنرگس لیمہ لاندہ — څاڅکی څاڅکی نے لہ سترگو څڅیدہ
ماویل څہ دی۔ گُلشلی گلہ ولے ژاړے — دہ ویل۔ ژوندم دے لوہ خولہ خندیدہ

(افسوس کہ ترجمے میں وہ بات نہیں آسکتی۔ جو خود رباعی میں ہے۔ مگر خیر! کہتی ہے ایک روز صبح کے وقت میں نے دیکھا۔ تو نرگس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اور آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ میں نے کہا۔ کیا بات ہے۔ پیارے پھول۔ رو کیوں رہا ہے۔ اس نے کہا۔ اس لئے کہ میری کل زندگی صرف ایک دفعہ ہنس دینا ہے)

ایسے ہی صوبہ سرحد کے مشہور عالم عالم اور شاعر خوشحال خاں خٹک کی ایک بیٹی بی بی حلیمہ بھی بہت بڑی عالم فاضل۔ شاعرہ ادیب ہو گذری ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ یونہی سراپردۂ عصمت میں رہ کر عمر گذاری۔ عبادت گذار تھیں۔ لڑکیوں کو درس دیا کرتیں۔ "پٹہ خزانہ" مطبوعہ کابل میں اُن کے صرف اس قدر حالات لکھے ہیں۔ کہ وہ عبدالقادر خاں کی سگی بہن تھیں۔ قرآن پاک حفظ کرنے کے علاوہ اپنے باپ کی زندگی میں انہوں نے مروجہ علوم حاصل کر لئے تھے۔ اور شیخ سعدی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ کی مرید ہو گئی تھیں

تصوف اور طریقت کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ یہاں تک کہ مثنوی مولانا روم اور مکتوبات امام ربانی کی اشکال، بہ آسانی حل کرسکتی تھیں۔ پشتو میں شعر بھی کہے ہیں۔ نمونہ یہ ہے

هر چاوته چه گورم دا ره دے
دجال په ننداره دے شادمان گرم

(ترجمہ۔ جسے بھی دیکھتی ہوں بس وہی نظر آتا ہے اُس کے حسن و جمال کے تماشوں سے شادماں ہوں)

غیر فکرم له زره نه وابهر شو
پرخلیل آو پر عدو بانے یکساں شوم

(غیر کا خیال میرے دل سے نکل گیا ہے اور دوست دشمن دونوں کے لئے یکساں ہو گئی ہوں)

بی بی حلیمہ کے حالات اب تک مقامی طور پر بھی پوشیدہ تھے۔ اتنا بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کہ اُن کی قبر کہاں ہے۔ چنانچہ تعمیر مزار خوشحال خاں کے دوران میں جناب محمد نواز خاں خٹک کی تلاش و تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ خوش حال خاں کے باغیچی جو پرانی اور شکستہ حال قبر ہے۔ دراصل وہی بزرگ۔ حافظ قرآن عفیفہ کی قبر ہے۔ چنانچہ شیر دل خاں رئیس شیر دنے جو خود بھی عبدالقادر خاں کی اولاد سے ہی ہیں اور اس وقت مزار خوش حال خاں کی تعمیر کا سارا اہتمام و بندوبست کر رہے ہیں۔ یہ معلوم کر لیا کہ یہ قبر حلیمہ بی بی کی ہے۔ تو اس کی از سر نو تعمیر اپنے ذمے کر کام شروع کر دیا ہے۔ بی بی حلیمہ نے اپنے قدیم مسکن اکوڑہ خٹک میں لب دریا ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی ہے۔ اور اسی کے قریب اپنے ایک خاندانی مقبرے کی پختہ اور وسیع چار دیواری بھی بنوائی ہے۔ یہ دونوں یادگاریں اب محفوظ چلی آرہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی عمر کی ہو کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئی ہیں۔ کیونکہ وہ دسوائی بُنئی کے نام سے اب تک مشہور رہیں۔ اور لفظ نئی پشتو میں نانی۔ دادی یا بہت ضعیف العمر عورت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

درخانئی۔ رحد کے مشہور رومان کی ہیروئن جس وقت اپنے عاشق زار آدم خاں کی شہادت کا سنتی ہے تو غم واندوہ سے بے تاب ہو کر پڑ جاتی ہے۔ اور درد و کرب سے مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتی ہے اُس وقت اس کے اپنے پرائے سب اُس کے پاس

آتے ہیں۔ اور اُس کی بے قراری کو آسیب کا خلل جان کر جھاڑ پھونک شروع کر دیتے ہیں۔ درخانئی ان کی نا سمجھی پر جھلا کر کہتی ہے

ورانہ خلقہ دیو پری ویلی نہ یمہ | یہ دِ جا خبرہ نہ اوسہ کنزہ یمہ

آدم خان م کوچ وکڑ وله مالا رشو | پہ آدم پسے پہ تورلیمہ رندہ یمہ

اے بے راہرو نادان لوگو مجھ پہ کوئی بھوت پریت کا سایہ تو نہیں ہوا ہے۔ جو تم لوگوں کی بات نہیں سنتی یا بہری ہوں۔ ارے! آدم خان کوچ کر گیا مجھے چھوڑ کے چلا گیا۔ میں تو اس کے فراق میں اچھی بھلی آنکھوں کے ہوتے ہوئے اندھی ہو رہی ہوں

رسالہ پشتون مورخہ ۱۷۔ اگست ۱۹۴۶ء تحصیل چارسدہ تپہ ٔ زڑے ایک بہن اپنے ایک پشتو منشور مقالہ میں لکھتی ہیں:۔۔۔۔۔۔۔ میرے خیال میں یہ ہمارے پشتون بھائی بڑی سخت غلطی بلکہ ایک گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جو ہمیں ہمارے فطری حق کے حصول سے منع کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو کسی کی حق تلفی کرتا ہے۔ وہ خدا تعالےٰ کا مجرم اور گنہگار رہے۔ کیونکہ ہم چلا چلا کر مانگ رہی ہیں۔ کہ ہمیں تعلیم دلائی جائے۔ لیکن ہمارے مرد ہمیں تعلیم نہیں دلاتے۔۔۔۔۔۔ بے تعلیم انسان نہ خود چل سکتا ہے۔ نہ اپنی زندگی سدھار سکتا ہے۔ نہ ملک و قوم کی خدمت اچھے طریقے سے کر سکتا ہے۔ لیکن ہماری بدقسمت لڑکیاں چوپایوں کی طرح بندھی کھڑی ہیں۔ حرکت نہیں ہلا سکتیں۔۔۔۔۔۔ الخ

منافت گاؤں کی ایک خاتون بنت محمد عمر خان کی مناجات ۲۴۔ اگست ۱۹۴۶ء کے پشتون میں شائع ہوئی ہے۔ جس کا ایک شعر ہے:۔

دغلامئ طوقونہ ئے وشلوئے دغاړے نہ تہ!

بنہ ئے مخ روښانہ پہ ھر ځائے پہ ھر میدان کہ ربہ

(اے خدا!۔ تو غلامی کے طوق (ان کے یعنی پشتونوں کے) گلوں سے نکال پھینک۔ اور انہیں ہر جگہ اور ہر میدان میں سرخرو کر۔

روشن عبدالغنی خان لکھتی ہیں:۔۔۔۔۔۔۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تہذیب

کے بنانے میں عورتوں کا بھی ہاتھ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عورت اور مرد کے فرائض جدا جدا ہیں۔ بہر حال عورتیں مردوں کی مدد ضرور کر سکتی ہیں۔ عورت کا فرض اولین گھر کا رکھ رکھاؤ ہے۔ اور سب سے اہم فرض بچوں کی پرورش اور تربیت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

زرتاڑ۔ چارسدہ کی ایک ورہن لکھتی ہیں :- ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہماری غریب پشتون بہنیں زندگی میں مُردوں کی مثال ہیں۔ گھر کی چار دیواری کے باہر اگر دنیا الٹ پلٹ ہو جائے۔ تب بھی ہمیں خبر نہیں ہوتی۔ اور یہ پشتون مردوں کا اپنی بہن بیٹی پہ بڑا ظلم ہے۔ کہ پہلے تو انہیں تعلیم نہیں دلاتے اور اگر کہیں کوئی عورت نوشت وخواند میں کچھ شُد بُد پیدا کر لیتی ہے۔ تو وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

بیگم یونس خاں لکھتی ہیں :- ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ہوشمند اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ عورتوں کی ترقی ہی اصل میں قوم کی ترقی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ افسوس کہ آج کل کے پشتون اپنی عورتوں سے ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے زمانہ جاہلیت کے عرب اپنی عورتوں سے کیا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

س ب آب صاحبہ دزڑہ طوطی" کے عنوان سے ایک نظم لکھتی ہیں۔ اس کا ایک بند ہے :-

زہ چہ دخویندو لپشتنو دتعلیم بنا ترِ ملہ
عمل پرِ ځہ چہ لوئے قصور دغہ تدبیر دے مُما
دلپشتون ښځے بیدار دمہ دِ قلمہ پہ آواز!
قوم دافغان کبنِ بیشکہ اجرم کبیر دے ځما

(۱) میں کہ پختون بہنوں کی تعلیم کے لئے کمربستہ ہوں۔ تو اس پر ان کا عمل کرنا تو درکنار الٹا اس تدبیر پر قصوروار ٹھہرائی جا رہی ہوں (۲) میں قلم کی آواز پر پختون عورتوں کو بیدار کر رہی ہوں اور واقعی افغان قوم میں میرا یہ جرم بہت بڑا ہے۔

بہن بشریٰ بیگم اپنے ایک خط جو ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء کے پشتون میں شائع ہوا ہے لکھتی ہیں :- ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پشتون قوم کی تباہ حالی اور عورتوں کی بے خبری کو دیکھ کر

خون کے آنسو روتی ہوں۔ مگر افسوس کہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ پشتون اب بھی اپنی بہن بیٹی کی اصلاح کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ یہ بھی انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی جس قوم کی عورتیں بے تعلیم اور غافل ہوں۔ پشتونوں کو شاید عورتوں کی ترقی شرم و عار معلوم ہوتی ہے . . . . . . الخ

بس نور جہاں بیگم کی نظم کا ایک بند ہے :-

د سوے ھدے شخوته اخبار کتاب کتل منع دی   تو مونږ ولاړه کوی قلم ربیلار د شخو

څو نو د قوم د ترانه د ولیښول منع دی   په زنځیرونو د ذلت به یو تړلی همیشه ی

څو نو په د ور سوه و دے زنځیر شلول منع دی

اقبال پروین (یوسفزئی) ہوتی مردان سے اپنے ایک مقالہ میں لکھتی ہیں :- . . . . . غرض یہ ہے کہ اب یہ سرپرستوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے مدرسے اور تعلیمی ادارے قائم کریں جن میں دینی اور دنیاوی دونوں تعلیموں کا حق پورا کیا جائے۔ اگر عورتوں کو صرف دنیاوی تعلیم دی گئی۔ تو یہ سرپرستوں اور ماتحتوں دونوں کے لئے تباہ کن ہوگا۔ کیونکہ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اگر انسان میں صحیح قربانی کا جذبہ پیدا نہ ہوا تو وہ تعلیم عبث ہے . . . . . . الخ

غرضیکہ افغانستان اور صوبہ سرحد میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسی عورتیں ہیں۔ جو نہایت بیدار مغز۔ ترقی پسند۔ لطیف جذبات اور نازک احساسات لئے ہوئے ہیں۔ جو صرف تھوڑی سی صحیح تربیت اور رہنمائی کی محتاج ہیں۔ اُن کے جوہر دماغی۔ اُن کی پرواز تخیل دقیقہ سنجی۔ خوش کلامی۔ متانت۔ اصابت رائے و فکر۔ ذکاوت فہم و فراست اور فصاحت و بلاغت کلام تو آپ نے ان قلمی شاہپاروں سے معلوم کر لی ہوگی۔ بہت سی عورتیں ایسی ہو گذری ہیں — جو خوش نویسی و خطاطی میں ماہر تھیں بعض کئی کئی زبانوں میں ماہر بیان کی جاتی ہیں بعض کے بڑے بڑے اور ضخیم دیوان ہیں۔ پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار اشعار کہے ہیں ایک ایک نے کئی کئی کتابیں ترجمہ تصنیف یا تالیف کی ہیں۔ کیونکہ جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ آج کل کی قومی اور رسمی مجبوریوں کے باعث تو کسی عورت کا نام تک لکھنا اور بیان کرنا بھی نہایت معیوب اور ممنوع ہے چہ جائیکہ اُن کے حالات قلمبند کر کے شائع کئے جائیں۔

شمیم بھیروی

نقشِ فریادی

یہ مقالہ ایک بیانیہ ہے سرحد کی دستکاریوں کا یہ ان شوریدگانِ غیرت کی آشفتگیوں کا۔ کہانی ہے جو آج ہمارے نے نقشِ فریادی بن چکے ہیں۔ ایشیائی تمدن کے پھیلاؤ اور ترقی میں درہ خیبر کی گذرگاہ اور سرحد کی سرزمین کا پیامبرانہ حصہ فرنگی سیاست و مدنیت نے اصلاحات کا سہارا لے کر ختم کر دیا۔

یہ سرحد چٹانوں کا گہوارہ سبزہ زاروں کا وطن! یہ سرزمین جہاں صالح خون پیدا ہوتا رہا۔ جہاں کے بسنے والے صدیوں تک ایشیائی تہذیب کے خدوخال سنوارتے رہے یہ سرحد جہاں انسانی دماغ اور دست و بازو کی ہنرمندیاں تمدن کے چہرے پر آب و رنگ بن کر زیبائی کی ضامن رہیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے گوری نسلوں کی سیاسی مصلحتوں کا شکار تھا اور اس عرصہ کی فتراک آسودگی میں اس کی فنیت و ہنرمندی پر کیا کیا نہ گذری

یہ داستان ہے اس آشوب کی جس سے سرحد کی فن کارانہ صلاحیتیں ہنرمندانہ قابلیتیں اور دستکارانہ قوتیں بری طرح ٹکرائیں۔

سرحد میں فرنگی شطرنجیت کی بساط بچھی رہی۔ مہرے بدلتے رہے اور اس مہرہ بازی میں سرحدی تمدن کے اصلی نقوش دھندلاتے رہے۔ اور ایک طویل عرصے کے لئے وہ عظیم دستکاریاں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں۔ یہ وہ عظیم دستکاریاں تھیں جن کے فروغ نے سرحدی تمدن و ثقافت کو احساسِ برتری عطا کئے رکھا۔ اور یہ صنعت

کاریاں ہماری ایشیائی ثقافت کا جزو و جوہر بن گئیں

پشاور جو ایشیائے کوچک کے قدیم قافلوں کی گزرگاہ رہا ہے۔ اور جس کے سینے پر صدیوں تک شہنشاہی وغیرہ کی ہیبتیں پلنے کو باسی ہیں۔ اگر نام کے لغوی تجزیہ کے لحاظ سے "پیشہ ور" کی بگڑی ہوئی صورت نہ بھی تسلیم کیا جائے۔ تو پھر اس شہر کے گلی بازاروں کے قدیم نام اس خیال کو تقویت دیتے ہیں۔ کہ پیشہ ور کو تغیرات نے پشاور بنا دیا۔ "چڑوے کوباں" کا مشہور بازار اپنے تاریخی پس منظر کو لئے ہوئے اس عہد کی یاد دلاتا ہے۔ جبکہ انسانی غیرت و خودی خداؤں کی تلاش میں بتوں کے چڑھاوے پر مجبور رہتی۔ اس بازار میں دھان کو ڈھینکی سے کوٹا جاتا اور کوبیدہ چاولوں کو چڑووں کی شکل دے کر بتوں پر چڑھاوا کیا جاتا۔ اس صنعت کاری کے طور طریقے کی کڑیاں سرزمین بنگال سے آج بھی ملی ہوئی ہیں جہاں ڈھینکی کا استعمال مشینوں کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا ہے۔ "چڑووں" کی صنعت اس میں شک نہیں کہ کم و بیش آج بھی اس بازار میں موجود ہے۔ لیکن پتھر کی مورتیوں کی بھینٹ اپنا جامہ بدل کر آج جن دیری اور بھوت پریت "معبود ان خیالی" کا نذرانہ بن چکی ہے۔ چنانچہ اوہام پرستوں پر عورتوں کو جب بھی ہسٹیریا کا دورہ پڑتا ہے تو دفعیہ جنات کے لئے سرود و چنگ کے ساتھ "بیٹھک" کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اور چڑوے تقسیم کئے جاتے ہیں۔

پشاور کی گلیوں میں جہاں بلدیہ کے سائن بورڈ نصب کئے گئے ہیں ان میں ایک "بینگڑی گراں" بھی ہے۔ "بینگڑی گراں" کے محلے میں جو شہر کے ایک مشہور علاقہ کریم پورہ میں واقع ہے کسی زمانے میں پتھر کو گلا کر کانچ اور مٹی کے گجرے اور چوڑیاں بنائی جاتی تھیں۔ اور سرحد و ماوراء سرحد کے کوہستانی علاقوں میں سینکڑوں میلوں تک یہ مصنوعات فروخت کے لئے جایا کرتی تھیں سگے ہوئے پتھر کو بطوں کی شکل میں ڈھالا جاتا تھا۔ اور یہ بطیں ایک تولہ عطر سے لے کر ایک من عطر تک کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ ۲۵ برس قبل یہ صنعت ایک یاد پاستاں ہو کر رہ گئی ہے۔ پل پختہ کے پاس محلہ تنور سازاں بھی اپنے نام کی رعایت سے اپنا تعارف آپ

گذار رہا ہے۔ چونکہ تنور سازی کو پشاور کی تہذیب میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس لئے یہ محلہ انہیں فن کاروں سے آباد تھا۔ جو دیو قامت تنور بناتے تھے۔ اگرچہ اس وقت بھی تنور سازی ہوتی ہے۔ لیکن اس محلے میں نہیں۔

عطر سازی و شیشہ گری کے ساتھ ساتھ ڈبگری کا وہ علاقہ جو شہر اور چھاؤنی کے نصف قریب میں آج چرم خام کی منڈی ہے۔ اپنے نام سے اس دستکاری کی غمازی کر رہا ہے۔ جو "ڈبہ گری" کے نام سے مشہور تھی۔ یہاں چمڑے کے مٹکے یا ڈبے تیار کئے جاتے تھے۔ ان ڈبوں میں روغن۔ گھی۔ عطر اور خوشبوئیں بھری جاتی تھیں۔ اور یہ مٹکے جو چمڑے کو گلا کر تیار کئے جاتے تھے۔ ان میں ایک تولہ وزن کے عطر بھرنے کے ڈبے بھی ہوتے تھے۔ اور ایک من تیل یا گھی ڈالنے کے بھی۔ اس ڈبہ گری کی ایک قسم کو "یخدان" کہا جاتا ہے۔ چمڑے اور لکڑی سے تیار کردہ بکس اندر کی چیز کو گرمی میں خشک نہیں ہونے دیتا۔ اور سردی میں نمی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور موجودہ برقی دور کے ریفریجیٹر کی عمدہ قسم ہے۔ جو گیس اور بجلی کا محتاج نہیں۔ ہندوستان سے روس اور چین تک گدھوں کے ذریعے ان یخدانوں میں مال پہنچائے جاتے تھے۔ اور یہ صنعت آج محض ایک بھولی بسری یاد کی تازگی کی حد تک محفوظ ہے۔

چمڑے کی صنعت کاریوں میں "جستے" کو بہت بڑی اہمیت حاصل رہی ہے "جستہ" ایک قسم کی زنانہ پاپوش تھا جسے کابلی عورتیں خصوصیت سے پہنا کرتی تھیں اسی جستہ دوزی کے نام پر ایک پورا بازار اور محلہ آباد تھا۔ کم و بیش پچاس ساٹھ دکانیں ہوں گی۔ لیکن آج اس صنعت کا نام تک نہیں۔ اگرچہ بازار "جستہ دوزاں" کا وجود ابھی تک ہے۔ کہتے ہیں کہ دو چار آدمی اب بھی ان لوگوں کی باقیات الصالحات میں سے ہیں جستہ دوزی کے ساتھ ساتھ ساقی سازی کا فن بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و اہم فن تھا۔ آج مشینی دور میں جبکہ توپ۔ ہوائی بم۔ ایٹم اور شعاع کا دور ہے اگرچہ ساقی سازی کی اہمیت نہیں۔ تاہم اس دور میں جبکہ تلوار کی جنگیں لڑی جاتی تھیں ساقی ساز جس کے ذمے تلواروں کے "میان" بنانے تھے۔ وقت کی ایک مخصوص

شخصیت ہوا کرتا تھا۔ یہ میان گھوڑے۔ گدھے اور خچر کے چمڑے سے بنائے جاتے تھے۔ کچے چمڑے پر گلکاری کی جاتی۔ اور یوں دندانے اٹھائے جاتے۔ کہ آگ میں جلے بغیر دندانے نہ ٹوٹتے اور اس چمڑے کی ساخت میں سب سے بڑی غنیمت یہ تھی۔ کہ ان کی چمک قائم رکھنے کے لئے کسی قسم پالش کی ضرورت نہ ہوتی پشاور کے تیار شدہ میان خچروں اور گدھوں کے ذریعہ ہزاروں سینکڑوں میل دُور دُور پہنچائے جاتے۔ انگریزی عملداری میں سرحد کے باشندوں کو نہ صرف بیرونی دنیا میں جاہل۔ کندہ ناتراشں۔ لڑاکے تندمزاج ہی مشہور کیا گیا۔ بلکہ فرنگیوں نے پوری جدوجہد کے ساتھ سرحد کی دستکاریوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ اور ان دستکاریوں کے مٹنے کے بعد بیکاری کی لعنتیں مسلط ہو کر یہاں کی تہذیب تمدن کو داغدار کر گئیں سو رنہ جس ملک کے صرف مرکزی شہر میں کم وبیش ساٹھ دستکاریاں ہوں وہاں ثقافت کا کوئی شعبہ زوال پذیر ہو سکتا تھا؟

" نسوار سازی " سرحد میں ہمیشہ سے تمباکو بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ اور تمباکو کی پتیوں کو علیحدہ کر کے انہیں کوٹ کر نسوار بنائی جاتی ہے۔ یہ فن آج بھی موجود ہے۔ لیکن دھندلا دھندلا۔

بیٹھے کا کام۔ تیراہ کے علاقے سے منوں کی تعداد میں بیٹھا (مزری) برسوں سے یہاں آتا ہے اور یہاں کی مشہور صنعت بادکش (پنکھا) سازی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور غالباً یہی ایک صنعت ہے جس پر مشینی اثرات پورے طور پر غلبہ نہ پا سکے بیٹھے کے پنکھے، چٹائیاں، ٹوکریاں اور کھلونے تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ صنعت گھریلو ہے اور اس میں عورتوں کا حصہ زیادہ ہے

مہر کندی۔ پیتل۔ لوہے اور تانبے سے مہریں بنائی جاتی تھیں۔ اور مہر کندوں کے علاوہ صیقل گری کا کام بھی کیا جاتا تھا۔ یا تو سرحد کی بنی ہوئی مہریں ایران و توران تک جایا کرتی تھیں۔ یا آج مہریں بنوانے کے لئے راولپنڈی یا لاہور جانا پڑتا ہے

" فولاد ڈھالنا " فولاد سازی ایک پوری تاریخ لئے ہوئے ہے۔ ایشیائی

حملہ آوروں کی گذرگاہ ہونے کی وجہ سے سرحد کے مرکز پشاور کو جنگی ادوار میں جہاں بحران و عبور کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ وہاں جنگ زرگری کا بھی موقع ملتا تھا۔ حملہ آوروں کی خون آشامی کے مقاصد پورا کرنے کے لئے یہاں بھٹیوں فولاد ڈھالا اور گرمایا جاتا۔ سال بھر منوں لوہے کو کوٹ کوٹ کر بہترام بنایا جاتا۔ اور اس سے تلواریں تیار کی جاتیں۔ اور زرہ بکتر بنائے جاتے۔ اور انہیں بادشاہوں کی نذر کیا جاتا۔ تلواریں بنانے والے کاریگر اس قدر اہمیت رکھتے تھے۔ اور ان کی اتنی بڑی مانگ تھی کہ بادشاہ انہیں اغوا کر لیتے۔ اور انہیں اپنے لشکر میں اسلحہ سازی کے لئے رکھتے۔ اس دور کی اصطلاح میں اسے "لوہارچوری" کہا جاتا تھا۔ آج بھی اس فن کی یادیں پشاور کا مشہور و معروف محلہ جو قصہ خوانی کے بالکل عقب میں ہے۔ ڈھکی نعلبندی کے نام سے موسوم ہے جہاں صنعت فولاد کی ابتدا نعل سازی سے ہوئی اور انتہا شمشیر گری پر پہنچ کر اس گرانبہا اور غیرت افروز دستکاری کو ختم ہی کر گئی۔ تلوار کے بعد تسبیح مشرقی اقوام کے مذاہب میں ایک خصوصی درجہ رکھتی ہے۔ سرحد میں چراٹ کے مقام پر زیتون کے درختوں کا ذخیرہ ابتدا سے چلا آتا ہے۔ اور پٹھانوں کے قلب و جسد کی طرح اس مضبوط و توانا لکڑی سے مونگ کے دانے سے مہین دانے تسبیح کے لئے تیار کئے جاتے تھے۔ اور آج بھی یہ صنعت جاری ہے۔ یہی تسبیحیں دیگر اسلامی ممالک کے علاوہ مکہ معظمہ بک جاتی ہیں۔ جہاں تقدیس حاصل کر کے حجاج و زائرین کے ساتھ دوبارہ اس ملک میں تحفے کی صورت لے کر آتی ہیں۔ تسبیح سازی کے ماسوا اسی لکڑی سے سرمہ دانیاں تیار کی جاتی ہیں اور خراد کا کام لیا جاتا ہے۔ پشاور میں نقش افزائی کا کام آج گو آخری ہچکیوں پر ہے لیکن قدیم عمارات کے چوبی نقش نگار اور قدیم وضع مکانات کے "چینی خانے" اور ان کی میناکاری انسانی دستکاری و نقش پیرائی کے شاہکار ہیں۔ مغرب کو فن تعمیر پر ناز ہو سکتا ہے۔ لیکن سیٹھیوں کے محلوں میں ان کے قدیم مکانات دیکھ کر مغرب کی تعمیریں اہل نظر کو ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ مکانات قدیم ایشیا کی تہذیب و تمدن کی زندہ جاوید نشانیاں ہیں۔ کشادہ اور روشن صحن بیٹھک خانے

ہوادار اور منور کرے انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ آج عہد جمہور میں حرم سراؤں کے خواب زندہ ہو کر ان مکانات کی شکل میں آ گئے ہیں۔

چوبی دستکاریوں کے سلسلے میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی خرادکاری اور لکڑی کے آئینہ فریم اور "اشینڈ"، شطرنج کے مہرے۔ عطردانیاں اور بہترین قسم کا فرنیچر تیار کیا جاتا ہے۔ خراد کے لئے زنگ ڈیرہ کے کاری گر خود ہی تیار کرتے ہیں۔ فنی اعتبار سے ڈیرہ میں چوب کاری کشمیر سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ تمام فن و حرفت اس قوم کے ہاتھ میں ہے جسے فرنگی استعماریت نے ہمیشہ تمدن ناآشنا مشہور رکھا۔ اور جس کی بربریت کے افسانے سنا سنا کر ہندوستان کی حفاظت کے بہانے صدیوں تک ہمیں غلام بنائے رکھا

زر دوزی اور چکن دوزی سرحد کی مشہور صنعتوں میں سے ہے، زری سے تلے دار ٹوپیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور اسے "عرق چین" کہا جاتا ہے۔ اس نوع کی ٹوپیاں مغلیہ دور میں عورتیں استعمال کیا کرتی تھیں۔ اور قدیم الایام پشاور کے اور شرفاء اور پردہ نشین طبقے کی دوشیزائیں اس نوع کی ٹوپیاں استعمال کرتی تھیں۔ اور ایشیائی تمدن کی یہ نشانی سرحد سے دہلی اور دہلی سے لکھنؤ پہنچی۔ اور میں نے اس نوع کی ٹوپیاں بمبئی اور کاٹھیاواڑ میں بوہری اور میمن خاندانوں کی لڑکیوں کے سروں پر دیکھی ہیں۔ کشمیر میں بھی سرحد کے بنے ہوئے عرق چین جایا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ ٹوپیاں رواج سے باہر ہو گئیں۔ لیکن زردوزی کا کام ہنوز باقی ہے۔ اور یہ مردانہ ٹوپیوں کی شکل میں جسے اصطلاح عام میں کلاہ پشاوری زری کہا جاتا ہے۔ زردوزی کا تمام کام یہاں کی عورتیں کرتی ہیں۔

. . . اکثر و بیشتر زری کلاہ کے علاوہ "سادہ کلاہ" بھی پشاور کی بہت بڑی صنعت ہے۔ ہزاروں آدمی اس کے چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ صنعت اب ذرا ختم ہو چکی ہے۔ زردوزی کے ساتھ ساتھ پشاور میں سونے اور چاندی کی تاروں سے اور مقیش کی تاروں سے تلہ و مقیش تیار کی جاتی تھی۔ آج مقیش ولایت سے اور تلہ سورت سے آتا ہے۔

وہ ہمارا خواب تھا یہ خواب کی تعبیر ہے

صنعت زر و سیم میں چوک یادگار کے ساتھ ساتھ بازار صرافاں میں زرگروں کی دکانوں پر آپ کو پرانی چاندی کے جوتے، بادشاہ کیلئے گلدان، سرمہ دانیاں وغیرہ آپ کو نظر آئیں گی۔ گذشتہ جنگ سے قبل اکثر ذہنی سیاح بازار صرافاں میں آیا کرتے تھے۔ اور مجھے یاد ہے کہ قریب قریب ہر سیاح عورت اور مرد ایک بڈھے مسلمان زرگر کی تصویر ضرور لیا کرتے تھے جس کی نہایت مختصر سی ایک دکان تھی۔ اور اس میں پرانی وضع کے چاندی کے زیورات رکھے رہتے تھے۔ لوگ غالباً اس بڈھے زرگر اور اس کی چھوٹی سی دکان کی تصویر لیتے کو دیکھتے ہوئے کہ سرحد کا تمدن یوں دم توڑ رہا ہے۔

نقش گری اور رنگ سازی کے ضمن میں الو گرد کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔ بغیر رنگ کے ہر کپڑے پر نقش بنائے جاتے تھے۔ آج یہ کام یورپ وروس میں مشینوں کے ذریعے ہوا کرتا ہے۔ قریب ۱۵ سال ہوئے یہ فن بھی اپنی موت آپ مرگیا۔ الوگری کے لئے دور دور سے آرڈر آیا کرتے تھے۔ اور الوگر ہاتھ سے مخمل کا ڈرائی تیار کرتے تھے۔

شیشہ سازی کا کام بنوں میں بھی ہوتا ہے۔ اور شیشے کو پگھلا کر پھونکوں کے ذریعے کانچ کی بوتلیں تیار ہوتی ہیں۔

ان منظم دستکاریوں کے علاوہ اور بیسیوں صنعتیں رواج پذیر تھیں لیکن آج یا تو فنا ہو چکی ہیں یا فنا پذیر ہیں۔

چند پشتوں سے کاغذ بھی کسی زمانے میں بنایا جاتا تھا۔ گھریلو طور پر جو کاغذ بنتا وہ اکثر بازار کے پنساری سودا سلف کے لئے خریدتے اور قید خانوں کے اندر لکھنے کے لئے کاغذ تیار کیا جاتا تھا لیکن آج یہ صنعت نہیں ہے۔

کاغذ سازی کے علاوہ ابریشم گری اور آہن گری کا کام بھی قدیم الایام سے ہے اور ان کے نام سے پشاور کے دو بازار آج بھی آباد ہیں۔

کوہاٹ اور پشاور میں چمڑے کے چپل اور زری کی جوتیاں نہایت فنکارانہ انداز میں تیار کی جاتی ہیں۔

سرحد کے تہذیب و تمدن کی لوازمات میں قالین اور پوستین کو بڑا دخل ہے۔ قالین کے

ساتھ ساتھ رفوگری۔ اور پوستین کے ساتھ پوستین دوزی اور تہذیب سرحد کی بڑی نشانی لنگی اور لنگی کے ساتھ کنذی گری بھی ایک مستقل پیشہ ہے۔ لنگی کو کنذی کرنے کا کام مغل سپہ سالار مہابت خان کی بنائی ہوئی عظیم الشان مسجد کے زیرین حجروں میں آج بھی ہوتا ہے

پشاور میں خصوصیت کے ساتھ صنعت و دستکاری کا اس قدر رواج تھا۔ کہ دستکاریوں کے نام سے محلے آباد ہیں۔ قصہ خوانی کے قریب ہی محلہ ککالاں رحیم کا مشہور محلہ شاہ ولی قتال ہے جہاں مٹی اور چینی کے برتن بنائے جاتے تھے۔ اور آج بھی بنائے جاتے ہیں مٹی کے برتنوں پر رنگین روغن گری مٹی کے عظیم ترین مٹکے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں روغنی منقوش مٹی کے پیالے اور پلیٹیں انگریز سیاح تحفہ کے طور پر یورپ لے جایا کرتے تھے۔

مجھے حیرت ہے دستکاریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پشاور کی نان پزی یعنی گندمی روٹی بنانے کا ذکر کر رہا ہوں۔ یہ محض تنور جھونکنا نہیں۔ بلکہ ایک مستقل فن ہے۔ پشاور کے ہر گلی بازار میں تنور ہیں جہاں روٹی پکائی جاتی ہے آٹا گوندھنے۔ خمیر اٹھانے۔ پیڑے بنانے۔ روٹی تیار کرنے اور تنور میں پکانے کے لئے الگ الگ کاریگر ہیں۔ اور اس کاریگری سے منقوش روٹی تیار کرتے ہیں جیسے لواش روٹی کی ایک قسم جو پک کر ہڈی کی طرح ہو جاتی ہے جب دودھ پانی یا چائے میں ڈالی جاتی ہے۔ تو ملائی کی طرح نرم ہو جاتی ہے

قصہ خوانی کے بل کھاتے ہوئے طویل بازار کے ایک ٹکڑے کو بازار مسگراں کہتے ہیں جس کے چھوٹے پیچ سے لے کر حمام تک جہاں بنائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے مٹکے، چائے جوش اور طعام گیر (ٹفن کیریر) تمام تر ہاتھوں سے بنائے جاتے ہیں۔ اور کسی قسم کی کوئی مشین استعمال نہیں کی جاتی۔ اور یہ دستکاری قریب ڈیڑھ صدی سے رائج ہے۔

اسلحہ سازی۔ پشاور سے کوہاٹ جاتے ہوئے پہاڑیوں کے بیچ میں درہ کوہاٹ واقع ہے۔ جہاں دائیں جانب بندوق، کارتوس اور چھری۔ کٹاری بنانے کے کارخانے ہیں۔ یہ صنعت غیر ملکی مشینوں کی احتیاج سے بری ہے۔ اور مدتوں سے مروج ہے

ہوئے یہاں کی بنی ہوئی بندوقیں کارتوس اور دوسرے اسلحہ جات دُور دُور تک جاتے تھے۔ اور جاتے ہیں۔ یہ ساخت کے اعتبار سے ولایتی بندوقوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ ضرورت کے وقت یہاں توپیں بھی بنائی جاتی ہیں

سرحد میں دستکاریوں کا زوال دراصل مغربی تمدّن کے عروج اور مشینوں کی رواج پذیرائی کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وقت کے تقاضوں نے مشینوں کو رواج دینا ہی تھا۔ لیکن یہ رواج مشرقی ممالک کے فن وصنعت کو غارت کر گیا۔ بیکاری بڑھ گئی۔ اور ایک ایسا اقتصادی بحران پیدا ہو گیا جس نے دنیا کو عمومیت اور مشرق کو خصوصیّت سے نظریات کی اقتصادی جنگ میں مبتلا کر دیا۔ فرنگی نے اپنے عہد میں سرحد کی دستکاریوں اور صنعت کی کبھی حوصلہ افزائی نہ کی۔ یہ اس لئے نہ تھا کہ یہ لوگ مشینی مسابقت میں ہار جاتیں بلکہ محض اس لئے تھا کہ اہل حرفہ وصنعت اپنے ہنر کو کھو کر اپنی تہذیب اخلاق اور دماغی صلاحیتوں سے بھی محروم ہو جائیں۔ اب غلامی کے خاتمے پر امید بندھ چلی ہے کہ سرحد میں یہ مردہ صنعتیں پھر سے زندہ ہو جائیں گی۔ لیکن اب یہ امید بہت سارے سہاروں کا منہ تک رہی ہے۔ خدا کرے کہ آزادی کے محافظ فن اور فن سے زیادہ اس کی اقتصادی برکات کا احساس کر سکیں +

●

جب کوئی نظریہ عوام کو اپنی گرفت میں لے
لیتا ہے تو وہ خود ایک مادی قوت بن جاتا ہے
(مارکس)

●

قتیل شفائی

صنعتِ فلمسازی میں سرحد کا حصہ

صوبہ سرحد نے جہاں اردو ادب میں اپنے وقت کا سب سے بڑا مزاح نگار "پطرس" پیدا کیا وہاں صنعت فلمسازی پر بھی اس کے احسانات کچھ کم نہیں ہیں۔ اگر ہم فلم کے باقی شعبوں سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف شعبہ اداکاری کو ہی سامنے رکھیں تو ہمیں ہر زمانے کا بہترین ہیرو صوبہ سرحد ہی سے متعلق نظر آئے گا۔

خاموش فلموں کا زمانہ ختم ہوا تو سلولائیڈ کے ٹکڑوں نے بولنا شروع کر دیا۔ یہ زمانہ اگرچہ فلمی ارتقاء کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے فلمسازوں کا فنی شعور ان دنوں اس قدر ناپختہ تھا کہ ہم ناطق فلموں کے آغاز سے چار پانچ سال بعد تک کے دور کو اس دودھ پیتے بچے سے تشبیہ دینے پر مجبور ہیں۔ جو ماں کی گود میں لیٹا لیٹا کبھی تو بے معنی طور پر ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے۔ اور کبھی سوچے سمجھے بغیر بے مقصد سی غاں غوں کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ اس لئے ہم اس ابتدائی زمانے سے آنکھیں بند کر کے آگے بڑھ جائیں تو کوئی حرج نہ ہوگا۔

ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کے عروج کا زمانہ ہی وہ زمانہ ہے۔ جب دیگر فلمی ادارے بھی قدرے سوجھ بوجھ کا ثبوت دے رہے تھے جنوں اور پریوں کی کہانیاں میڈن تھیٹرز اور سیٹھ مودی لوگوں کے جنازوں کے ساتھ رخصت ہو رہی تھیں اور عام انسانوں کے دکھ سکھ اور دشمنی اور دوستی کی مبالغہ آمیز باتیں فلمی افسانوں میں شامل ہو رہی تھیں۔ یہ دور اگرچہ پہلے دور سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا لیکن ہیروئن کو حور سے بھی زیادہ خوبصورت دکھانا اور ہیرو کو شہزادہ گلفام کے سے نقش و نگار کے ساتھ پیش کرنا ہی فلمسازوں کے لئے باعث افتخار تھا چنانچہ فلمسازوں کی اس ضرورت کو مرحوم گل حمید نے پورا کیا تھا۔ گل حمید اپنے وقت کا خوبصورت

ترین ہیرو تھا جو تیکھے نین نقش رکھنے کے علاوہ اداکاری میں بھی بہت آگے نکل گیا تھا۔ اس نے کئی ایک فلموں میں مردانہ حسن اور معیاری اداکاری سے ایسے ایسے اثرات چھوڑے جن کی یاد آج بھی ہمارے دلوں میں جاگزین ہے۔ وہ "خیبر پاس" اور "باغی سپاہی" میں کچھ اس انداز سے نکھرا کہ صنعت فلم سازی کی فضاؤں میں خنک خنک سے اجیالے تیرنے لگے۔ اور وقت نے اسے لاتعداد فلمی ستاروں میں چاند بنا کر آسمان شہرت پر جا سجایا

گل حمید کی وفات کے بعد کا زمانہ اداکاروں کے لئے بڑی جدوجہد کا زمانہ تھا۔ جس میں کئی اداکار ہیرو بن کر چمکے اور تھوڑی دیر جگنو کی طرح کہیں کہیں روشنی کی رمق چھوڑتے ہوئے خلاؤں میں تحلیل ہوتے گئے۔ البتہ پرتھوی راج ہی ایک ایسا فن کار تھا۔ جس کی اداکاری نے اُس دور کی صنعت فلم سازی کو ایک دیرپا بخت ہے۔ اگرچہ پرتھوی راج گل حمید کے زمانے میں بھی اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ لیکن اب تو ہر طرف پرتھوی راج ہی پرتھوی راج تھا۔ اس کی ہالی وڈ سٹائل کی اداکاری کروڑوں دلوں میں گھر کر چکی تھی اور وہ نیو تھیٹرز کے ٹریڈ مارک میں زیادہ سے زیادہ کشش پیدا کرنے کا موجب بنتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ نیو تھیٹرز کے پُرجلال ہاتھی سے اچک کر کبھی "رنجیت" کے گھوڑے کی لگامیں تھام لیتا اور کبھی منروا کے شیر کے جبڑے چیرتا ہوا دکھائی دیتا اس نے جتنی بھی فلموں میں کام کیا لوگوں نے سب کو خراج تحسین ادا کیا۔ اور تیزی سے آگے بڑھتا ہوا وقت پرتھوی راج کے سینے پر ہمہ گیر شہرت کا امتیازی تمغہ لگاتا ہوا ایک نئی منزل کو لپک گیا۔

پرتھوی راج کے زمانے سے فوراً ہی بعد صوبہ سرحد کی مردم خیز سرزمین نے اپنا ایک اور فرزند میدان فلم سازی میں اتار دیا اور وہ تھا دلیپ کمار۔ دلیپ کمار موجودہ زمانے کا ایک ایسا ہیرو ہے جس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ دلیپ کی اداکاری وقت کے ان تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ جو حقیقت پسندی کے بطن سے جنم لیتے ہیں۔ وہ جب پردۂ سیمیں پر نمودار ہوتا ہے تو ہم یوں محسوس کرتے ہیں۔ جیسے ہماری ہی زندگی کا کوئی بھٹکا ہوا ٹکڑا سکرین پر آ نمودار ہوا ہے

وہ چپت ہے۔ تو پورا ماحول حرکت میں آجاتا ہے۔ وہ رُکتا ہے تو ہر طرف ایک انجماد کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے لاتعداد مداح ایک بار پھر اس کی اداکاری سے پیار کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔

مجھے صوبہ سرحد کی غیر ضروری وکالت نہیں کرنی ہے شاید یہ اتفاق کی بات ہو کہ صنعت فلمسازی کے ان تینوں ادوار میں سرحدی ہیرو ہی سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں۔ لیکن میرا مشاہدہ کہتا ہے۔ کہ یہ سرزمین واقعی مردم خیز ہے۔ اور اگر یہاں خوانین سرحد اور ان کی جاگیردارانہ ذہنیت سے پھیلی ہوئی لاتعلیمی دور کر دی جائے۔ تو یہاں ایک نہیں ہزاروں پطرس اور گل حمید اور پرتھوی راج اور دلیپ کمار پیدا ہو سکتے ہیں۔

متحدہ اور تقسیم شدہ ہندوستان میں صنعت فلمسازی کے بڑے بڑے مرکز صرف تین ہی رہے ہیں بمبئی، کلکتہ اور لاہور۔ اور جب ہم ان تین مراکز کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں ہر جگہ سرحدی فنکاروں کی نمائندہ حیثیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کلکتے کی ایسٹ انڈیا فلم کمپنی میں اگر گل حمید کی شہرت کے چراغ جلتے دکھائی دیتے ہیں۔ تو نیو تھیٹرز میں پرتھوی راج کی عظمت کے امٹ نشان موجود ہیں۔ بمبئی میں پرکاش پکچرز کی اپسرا اگر جینت کی آرتی اتارتی نظر آتی ہے تو منروا کے شیر کی گرج الناصر کی شہرت کا اعلان کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لاہور میں اگر شوری پکچرز کی پنجابی فلم مجنوں کی صاحبزادہ اداکاری کے باوجود سلور جوبلی منائی جاتی ہے۔ تو پنچولی پکچرز کے شیریں فرہاد میں پرکاش پکچرز بمبئی کا شہرت یافتہ جینت ہی فرہاد کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ غرضکہ جہاں جہاں سرحدی فنکاروں کو ان کی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا اشارہ ملا ہے۔

وہیں وہیں انہوں نے اپنے اپنے مداحوں کی توقعات کا پوری طرح ساتھ دیا ہے چنانچہ ہر انے اداکاروں میں ڈبلیو ایم خان۔ موتی بائی۔ آغا پیر جان اور ترلوک کپور کے نام کبھی کبھی آج بھی سننے میں آجاتے ہیں۔ اور نئی پود میں سے الناصر مدھو بالا، ناصر خان، راج کپور۔ اور اس کا بھائی کنول کپور۔ پارو۔ ظہور راجہ مجنوں اور زاوینہ بڑے متواتر

اعزاز سے فلم انڈسٹری کی خدمات پر کمربستہ ہیں۔ ان میں سے راج کپور کو آپ نے "آگ"
"اعزاز" اور "سنہرے دن" میں ضرور دیکھا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ سرحد حسب معمول
آنے والے دور کے لئے بھی ایک ایسا نوجوان تیار کر رہا ہے۔ جو اپنے پیشرو سرحدی
ہمرونر کی طرح وقت کا بہترین ہیرو ثابت ہوگا۔

شعبہ اداکاری کے بعد ہدایت کاروں کا ایک انبوہ کثیر دکھائی دیتا ہے جس میں
اگرچہ سرحد کی نمائندگی کچھ ایسی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی یہ نہیں کہہ سکتا۔
کہ اس شعبے تک اہل سرحد کی رسائی ہی نہیں ہے۔ "بھولے بھالے" اور "تیمم" کے ہدایت کار
ضیا سرحدی پشاور سے تعلق رکھتے ہیں۔ "ہیر رانجھا" اور "بھائی" کے خالق تھے۔ ڈی۔ مہرو
ایبٹ آباد کی پیداوار ہیں مدحن کے چھوٹے بھائی بلو مہرو بھی اب ہدایت کاروں کی صف
میں شامل ہو چکے ہیں) ہدایت کار ظہور راجہ ضلع ہزارہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں
کے رہنے والے ہیں۔ سٹنٹ فلموں کے مقبول ہدایت کار اے ایم۔ خاں نوشہرہ میں
پیدا ہوئے۔ اور دلی صاحب کی اردو فلم "ہیر رانجھا" بنانے والے ہیرلڈ لوئیس مجنوں
کے بچپن کو آج بھی ایبٹ آباد کے ریگزار نہیں بھولے۔ اگرچہ رفیق غزنوی صرف
ایک پشتو فلم "لیلیٰ مجنوں" بنانے کے بعد ہمیشہ کے لئے شعبہ موسیقی ہی کے ہو کر رہ گئے۔ اس
کے باوجود انہیں سرحد کی سرزمین عزت سے یاد کرتی ہے۔ اور "آگ" کے ہونہار ہدایت کار
راج کپور کے لئے تو ابھرنے کے لاتعداد مواقع ابھی باقی ہیں سا امید ہے کہ پرتھوی راج
کا یہ ہونہار سپوت اپنے باپ کی طرح صوبے سرحد کے نام کو زیادہ سے زیادہ روشن کریگا۔

ہدایت کاروں کی صف سے ذرا آگے بڑھئے تو شعبہ موسیقی میں دو نام ہمیں خاص
طور پر متوجہ کرتے ہیں۔ ایک جی۔ ایم۔ درانی اور دوسرا رفیق غزنوی۔ درانی نے زیادہ
تو فلموں کے لئے بیک گانے ہی دئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی راجہ ہودی ٹون کی تقریباً
نصف درجن فلموں کی نغمہ سازی بھی درانی ہی کی رہین منت ہے اسی طرح رفیق غزنوی
میوزک ڈائریکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی فلموں کے لئے بیک سنگر بھی ہیں۔ اور
یہ دونوں موسیقار فنی لحاظ سے اب بھی زندہ ہیں۔ اور ان کا فن آج بھی ہمارے

لئے پوری گرمجوشی سے سرگرم عمل ہے۔ اگرچہ تقسیم ہند نے رفیق غزنوی کو صنعت فلمسازی سے چھین کر ریڈیو پاکستان کی باہوں کے حوالے کردیا ہے۔ لیکن جب کبھی حالات نے کروٹ بدلی۔ یہ البیلا فنکار ایک بار پھر اپنی تمام تر سربلندی کے ساتھ سلولائیڈ کے بے جان ٹکڑوں میں موسیقی کی زندگی آمیز حرارت شامل کرتا ہوا نظر آئے گا۔

ان دو بڑی شخصیتوں کے بعد ایک نیا موسیقار بڑی تیزی سے ابھرتا نظر آتا ہے۔ اور وہ ہے کریم داد خاں۔ یہ نوجوان نغمہ سازی کے میدان میں اگرچہ نو وارد ہے۔ لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اگر انڈسٹری نے کریم داد خاں کی پوری طرح سے قدر افزائی کی تو وہ پنجاب میں دوسرا نوشاد ثابت ہوگا۔

آیئے اب ذرا فلمسازوں کے گروہ کی بھی چھان بین کر ہی لیں۔ کیونکہ جس طرح ہماری انڈسٹری میں سرحدی اداکاروں، ہدایت کاروں اور نغمہ سازوں کی ایک امتیازی حیثیت ہے۔ اسی طرح فلمسازوں میں بھی رائے بہادر چونی لال جیسی شخصیت ہمیں صوبہ سرحد کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ "بمبئی ٹاکیز" اور "فلمستان" آج ہندوستان کے معیاری فلمی ادارے قرار دئے جاتے ہیں۔ تو یہ سب کچھ رائے بہادر چونی ہی کے دم قدم سے ہے۔ شاید رائے بہادر جیسا عملی تجربہ اور قوتِ تنظیم ہندوستان کے اور کسی فلمسازی کے حصے میں نہ آئی ہو۔ انہوں نے جو بھی قدم اٹھایا ہے۔ وہ صنعت فلمسازی کو برسوں آگے لے گیا ہے رائے بہادر کے علاوہ ہندوستان میں جیب سرحدی فلمسٹار پارو بھی فلمساز کی حیثیت سے میدان عمل میں آچکے ہیں۔ اگر حالات نے موافقت کی تو ہم ان لوگوں سے بھی کچھ نہ کچھ توقعات وابستہ کرسکتے ہیں۔ اور یہ ہے راج کپور — وہی "انداز" اور "سنہرے دن" کا ہیرو اور پرتھوی راج کا بیٹا۔ اداکاری تو اسکی گھٹی میں پڑی ہے۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے جیسے فلمسازی کے میدان میں بھی وہ مبتدی نہیں ہے۔ بھلا "آگ" اور "برسات" جیسی فلمیں پیش کرنے والے راج کپور کی ذہانت کا لوہا کون نہیں مانے گا —؟

ادھر پاکستان میں اگرچہ فلمسازی کی وہ گہما گہمی نہیں جو ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ یہاں اوّل تو فلم انڈسٹری ابھی گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے بچے کے برابر ہے۔ اس

پر سرمایہ والوں کی عدم توجہی نے اس انڈسٹری کو آگے بڑھنے سے روک رکھا ہے۔ اس کے باوجود جو چند گنے چنے فلمساز دکھائی دیتے ہیں ان میں پشاور کے آغا گل کا نام خصوصیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ آغا گل اگرچہ بنیادی طور پر ایک فلمی تقسیم کار ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے ایک پنجابی فلم "مندری" کی فلمبندی بھی شروع کر رکھی ہے۔ اگر ان کی سرگرمیاں بے ہمتی اور لایقینی کی بھینٹ نہ چڑھ گئیں۔ تو صوبہ سرحد اپنے اس باہمت فرزند کو ہمیشہ عزت سے پکارے گا۔

فلمسازوں کے زمرے میں ظہور راجہ کا ذکر ذرا تفصیل سے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں۔ کہ فلم لائن میں جہاں اور سینکڑوں قباحتیں موجود ہیں۔ وہاں ایک قباحت یہ بھی ہے۔ کہ یہاں بعض غیر شریفانہ وسائل کے سوا عام طور پر کسی کی دال نہیں گلتی۔ یہاں کبھی تو جمالی لطافتوں کے سہارے آگے آنے کا موقع نصیب ہوتا ہے اور کبھی جدلی قوتوں کے بل بوتے پہ اپنے لئے کوئی امتیازی مقام حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن حقیقت ہے کہ ظہور راجہ محض اپنی ذاتی قابلیت اور خود اعتمادی کی پر فلم لائن میں شامل ہوئے نہ تو ان کے پاس بھڑکیلی سفارش تھی اور نہ ہی آقتا کا طلسمی ڈنڈا تھا۔ وہ ایک معمولی اداکار کے طور پر میدان فلم میں اترے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہدایت کاری کے مراحل طے کرتے ہوئے فلمسازی کی حدود میں داخل ہو گئے۔ تقسیم ہند سے پہلے بمبئی میں انہوں نے کوئی نصف درجن فلمیں پیش کیں۔ اور تقسیم ہند کے بعد مسلم فلمسازوں میں سے انہوں نے ہی فلم "جہاد" سے فلمسازی کا آغاز کیا۔ ظہور راجہ ان دنوں کراچی میں ہیں۔ اور وہاں ایک سٹوڈیو بنانے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہیں۔

اب رہے فلمی ادیب سو یہاں صوبہ سرحد کا پلڑا کچھ ہلکا سا معلوم ہوتا ہے۔ "مستند" فلمی ادیبوں میں سے ضیا سرحدی کے علاوہ اور کسی ادیب کی نمایاں حیثیت کا سراغ نہیں ملتا۔ صرف شاطر غزنوی نے فلم "بھائی" اور "کنیز" لکھ کر قدرے آگے آنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے بھی گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اگر آذر سرحدی کے لکھے ہوئے فلم "جگنو" کے دو ایک گانے کسی شمار میں آسکتے ہیں۔ تو انہیں بھی صوبہ سرحد کے حساب میں ڈال دیجئے باقی اللہ اللہ خیر سلا۔ البتہ نئے لکھنے والوں میں سے قتیل

شفائی نے پنجاب کی چند فلموں کے گانے لکھے ہیں۔ لیکن چونکہ قتیل کی کوئی فلم ابھی تک مارکیٹ میں نہیں آئی۔ اس لئے وہ بھی پس منظر ہی میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ ویسے اتنی امید ضرور ہے۔ کہ جب قتیل کی کوئی فلمی کاوش منظر عام پہ آئے گی۔ تو زمانہ اسے ٹھکرائیگا نہیں۔ بلکہ اس کا بغور جائزہ لے گا۔ اور اگر قتیل کی کسی کاوش میں کچھ دم ہوا تو اس کا سارا کریڈٹ صوبہ سرحد ہی کے حصے میں آئے گا۔

یہ ہے وہ مختصر سا فلمی جائزہ جسے اٹک کے اس پار کی سرزمین سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب صنعت فلمسازی میں صوبہ سرحد کی اتنی عظیم نمائندگی موجود ہے۔ تو یہ صوبہ اپنے ہاں اس صنعت کو فروغ دینے کے سلسلے میں سنجیدگی سے کیوں نہیں سوچتا؟ کیا اس کے ہاں صنعت فلمسازی کے پنپنے کے امکانات نہیں ہیں؟ اس کے جواب میں مجھے بہت سادہ لفظوں میں صرف اتنی سی گزارش کرنی ہے۔ کہ صوبہ سرحد میں یہ صنعت اتنی ہی ترقی کر سکتی ہے۔ جتنی کہ پاکستان اور ہندوستان کے دیگر مراکز میں ترقی کر چکی ہے۔ کیونکہ یہاں نہ تو سرمائے کی کمی ہے۔ اور نہ ہی اچھے داعیوں کی۔ یہاں آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے جہاں وادی کاغان اور ایبٹ آباد کا کہستانی علاقہ موجود ہے وہاں بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے ریگستانی خطے مناظر بندی کے لئے بڑے موزوں ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب تک صوبہ سرحد کے صاحب اقتدار طبقے کی علمی پستی اور فنی عزاقی دور نہیں ہو جاتی یہاں صنعت فلمسازی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ متوسط نوجوان طبقے میں فلمسازی کے رجحانات موجود ہیں۔ لیکن ہر ملک میں چونکہ اس طبقے کی مالی حیثیت ہمیشہ ناتسلی بخش رہی ہے۔ اس لئے یہ روگ ان کے بس کا نہیں۔ ہاں اگر حکومت چاہے تو یہ صنعت فروغ پا سکتی ہے۔ لیکن صوبہ سرحد کی حکومت کے ارباب اختیار میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہیں جنگ اقتدار اور علاقائی دھڑے بندیوں کے سوا اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اگر بھولے بھٹکے سے کبھی ان کی رگ ظرافت پھڑکے بھی تو ان کا دائرہ عمل زیادہ سے زیادہ رقص و سرود سے آگے نہیں بڑھنے پاتا۔ بھلا ایسے حالات میں فلمسازی کو ایک صنعت کی حیثیت سے کوئی کسی طرح فروغ دے سکتا ہے۔

افضل جدون نظامی

گلیات اور وادی کاغان

ایبٹ آباد پاکستان کے شمال مغربی صوبے کا واحد صحت افزا اور گرمائی مقام ہے جہاں
سرد اور خوشگوار ہواؤں کے ساتھ ساتھ پانچویں ساتویں دن پسینہ بھی جسم کے مسامات کھول
کر صحت افزائی میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ وادی رش ایک چھوٹا سا پہاڑوں میں گھرا ہوا
خوبصورت میدان ہے جس کے مشرق میں نواں شہر شمال مشرقی کونے میں چھاؤنی کاکول
(جو پاکستان کے فوجی افسروں کی تربیت گاہ ہے) اور جنوب مغربی کونے میں قدیم ترین
تاریخی قصبہ دھمتوڑ ہے (جو جدون قبیلے کا مارا تخلافہ رہ چکا ہے۔ اور ایک ہزار سال قبل
مسیح سے آباد چلا آتا ہے) مغرب کی ساری سمت ایبٹ آباد نے گھیری ہوئی ہے۔ "جب"
کے نالے نے جو کہ وادی رش کے وسط سے گزرتا ہے اس میدان کو دو خوبصورت حصوں
میں تقسیم کر دیا ہے چاروں طرف پہاڑوں کے سرسبز و شاداب سلسلے ہیں جن کے ٹھنڈے اور
خوش ذائقہ چشموں کا پانی جب کی زندگی کا باعث ہے چشمہ الیاسی خوبصورت ترین چشمہ ہے
جہاں ضلع ہزارہ کی مشہور و دیدہ زیب مسجد جامع الیاسی سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتی رہتی ہے
اب آیئے ہم آپ کو گلیات اور درہ کاغان کی سیر کرائیں۔ چلئے بس تیار ہے۔ یہ بس
وادی رش کی سفید و لذیذ مکئی اور دھان کے سرسبز کھیت اور... یہ سیدھی سڑک
ٹھنڈیانی کو جاتی ہے۔ لیکن ہم اس طرف نہیں جائیں گے۔ لیجئے بس نشیب و فراز
کو پھاندتی لقائی پہنچ گئی۔ دس بجے ہیں دروازہ کھلا۔ اور بس نے پہاڑی سڑک پہلے
پیچھے رکھ دیئے سڑک کے داہنے طرف دیکھئے۔ نشیب میں ندی دوڑتا فتاں و خیزاں

جا رہی ہے۔ بائیں طرف پہاڑ کی اونچائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ یہ ہرنو کا پل ہے یہاں ہرنو اور ندی اور نڈ ایک دوسرے کے گلے مل رہی ہیں — آپ کیا سوچ رہے ہیں ابھی تو چڑھائی کی ابتدا ہے لیکن چڑھائی کو چھوڑئیے۔ آپ گردو پیش کے سبز پوش پہاڑ دیکھئے۔ ابلتے ہوئے چشموں کا نظارہ کیجئے۔ سڑک کے دائیں دوڑ ندی کا ایک مسلسل - - اور اٹوٹ گیت سنئے۔ اس کے کنارے دھانی کھیتوں کی لہلہاہٹ سے آنکھوں کو فردوسِ نظر بنائیے۔

یہ جگنو تر ہے۔ یہاں سے ہمیں کھٹ مٹھے انگور دناشپاتی اور لال خوبانیاں خرید لینا چاہئیں۔ یہی تو یہاں کا تحفہ ہے۔ اس گاؤں کو لنگا کہتے ہیں۔ یہ سڑک کے دونوں طرف صنوبر کے درخت ہیں۔ یہ خودرو بنفشہ اور دوسرے جنگلی پھول کتنے دیدہ زیب ہیں۔

— لیجئے اب ہم باڑہ گلی پہنچ گئے ہیں۔ آ ہا ہا یہ حسین حسین چوٹیاں کتنی دلکش ہیں یہاں فوجی بارکیں بھی ہیں۔ چھاؤنی جو ہوئی۔ یہ روئی کے گالے نہیں جناب یہ تو ٹھنڈا ٹھنڈا ابر ہے۔ لیکن ہے بڑا خوشنما۔ اس نے تو اپنے حریری پردے میں ساری فضا کو چھپا رکھا ہے۔ ارے یہ تو ہمارے بال بھی نم آلود ہو رہے ہیں۔

اس مقام کو کالا باغ کہتے ہیں۔ انگریزوں کے عہد کا نہیں۔ آج کا کالا باغ آج کے کالا باغ میں ٹامی گورے نہیں۔ پاکستانی فوج مقیم ہے۔ یہ بازار پر رونق اسی لئے تو ہے۔ مگر آپ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان سارلیوں، غزالوں اور دلفریب پریوں کو کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کوئی نئی بات تو نہیں۔ یہ نتھیا گلی ہے۔ گرمی کے موسم میں اس پر جوانی اور رعنائی برستی ہے۔ اور اس کے بعد کچھ نہ پوچھئے۔ نہیں جناب! اس جگہ کے لوگ اتنے امیر نہیں۔ یہ تو دور دیس سے آنے والی مخلوق ہے۔ جو صرف اس خطے کا جوبن چوسنے آتی ہے۔ دور دیس سے، سرحد پنجاب کے کونے کونے سے اس موسم کے بعد جس وقت یہ علاقہ اور اس کی سنسان سڑکیں منوں برف کے نیچے دبی ہونگی۔ اس وقت صرف یہاں کے مزدور پیشہ سیاہ پوش دجو خوفزدہ سہمے ہوئے سڑک کے کنارے چلتے نظر آتے ہیں) اور یہاں کے باسی۔ جاڑے کی جان لیوا سردی کا مقابلہ

کرکے پھر انہیں لوگوں کی خدمت اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے زندہ ہو جائیں گے

وہ سامنے نتھیا گلی کا محلہ موچی ڈھارہ ہے ۔ اور یہ ہے بس کا اڈہ ۔ اس وقت ٹھیک بارہ بجے کا وقت ہے ۔ آیئے اب "رئیس خانہ" میں جا کر آرام کریں ۔ اور چائے پئیں ۔ کہ یہاں کی زندگی کا لازمہ چائے ہے ۔ یہ دوسری بات ہے ۔ کہ لال پری کے شیدا بھی یہاں بہت ہیں ۔ جن کے لئے ہیں ہوٹل کے خوشنما کمرے آغوش وا کئے ہوئے ہیں ۔ اور متعدد بہرے ہر وقت استقبال کے لئے تیار رہتے ہیں ۔ یہاں رات کے وقت ساری اور پتلونیں غرارے اور شلواریں باہم رقصاں نظر آتے ہیں ۔

اٹھیے جناب آرام فرما چکے ۔ بوندیں بھی درختوں اور سڑکوں کو دھو دھا کر رخصت ہو رہی ہیں ۔ ہمیں مال روڈ کی سیر کرنا ہے ۔ یہ سڑک اسی بلدیہ کے آخری محلہ ڈونگا گلی تک گئی ہے ۔ یہاں کی سیر خالی از دلچسپی نہ ہو گی ۔ بعض جوڑے آپ کو خوش وخرم ہنستے بولتے چلتے پھرتے لطف اندوز ہوتے نظر آئیں گے ۔ یہ "ہنی مون" منانے والے لوگ ہیں بعض آبادی سے دور تخلیے کی جگہ ڈھونڈتے نظر آئیں گے ۔ یہ جوڑے ابھی کورٹ شپ کی صعب ناک گھاٹی سے نہیں نکلے ۔ چاروں طرف سرو اور چیل کے درخت زندگی کے فرائض سے بے خبر انسانوں کے اشتغال و افعال کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہیں ۔

یہ ہے ڈونگا گلی یہاں علاقہ کا مجسٹریٹ بھی ہے ۔ بلدیہ بھی اور محکمہ جنگلات کے دفترات بھی ۔ بازار سے گھوم کر موکش پوری کی چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کریں گے لیکن عصا کے بغیر چڑھنا محال ہے ۔

وہ دیکھیے چھنی ہوئی دھوپ زمین پر سوکھے ہوئے سوزن نما پتوں کی زردی میں چمک کا امتزاج پیدا کر کے روح افزا رنگ میں بدلتی جا رہی ہے ۔ انگاریہ پھول ۔ دعوت نظارہ دے رہے ہیں ۔ اوہو آپ تو ابھی سے ہانپنے لگے ۔ چڑھائی پہ تیزی سے نہیں چڑھنا چاہیئے ۔ آہستہ روی بہتر ہے ۔ ان سوکھے پتوں پر تو پاؤں ٹکانا بھی خطرناک ہے ۔ سر کا پسینہ ایڑی تک بہنے لگا ۔ لیکن ہم تو

چوٹی پر آ گئے ہیں۔ آہا ۔ یہ خوشنا پھولوں کا تختہ ہے یا حسن دمشق کی لبا طیں بچھی ہوئی ہیں۔

بس جی بہت سستا لئے ۔ اٹھیے اب شمالی کنارے پر کھڑے ہو کر جنگلات کے عمیق نظارے دیکھیں۔ ذرا سامنے نگاہ ڈالئے ـــ وہ پونچھ کا علاقہ ہے۔ آزاد کشمیر اور ہندوستان کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل توپیں لگائے مورچے بنائے کھڑی ہیں ۔ دریائے جہلم رستے کی تنگی کے باعث سمٹتا ہوا چاندی کی دھار کی طرح بہہ رہا ہے ۔ اور وہ نیچے مظفر آباد کا شہر دور ایک دھند لکے میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے ۔

اب ہمیں واپس جانا چاہیئے ۔ خیال رکھیئے اترائی بڑی احتیاط چاہتی ہے ۔ یہ سوزن نما سوکھے پتے پھسلا کر خوفناک گھاٹیوں میں اتار دیتے ہیں ۔ یہ ہیں ڈونگا گلی کے حوض یہ خوبصورت آہنی حوض پانی کے ذخیرے ہیں ۔ ایک مری اور دوسرا نتھیا گلی کے لئے ۔ ان کے دائیں طرف خوبصورت پھولوں سے لدا ہوا مصنوعی فرازبانی کے نظاروں کو کتنا دیدہ زیب بناتا ہے ۔ یہ رومان پرور جگہ عاشق مزاج حضرات کی خاص سیرگاہ ہے ۔ آیئے یہاں ذرا سستا لیں ۔ ہاتھ منہ بھی دھولیں گے ۔ لیکن نہیں ۔ کالے کالے بادل گھر گھر آنے شروع ہو گئے ہیں ۔ اور ہمیں بارش سے پہلے رئیس خانہ پہنچ جانا چاہیئے ۔

یہ لو بوندوں نے راستہ میں ہی آ لیا ۔ یہ بوندیں معمول سے بہت موٹی ہیں ـــ ؟

نہیں یہاں " بن بادل " کہتے ہیں ۔ ڈاک خانہ کے برآمدہ میں پناہ لیجئے ۔ ورنہ کپڑوں کی خیر نہیں ۔ لیجئے بارش بھی گئی ۔ ادھو آپ کے تو دانت بج رہے ہیں ۔ یہ بھی اچھی رہی اگست اور یہ عالم ۔ رات رئیس خانہ میں ہی بسر کریں گے صبح گیارہ بجے مری جانے والی بس پر سوار ہو کر پنجاب اور سرحد کا سنگم دیکھنے جائیں گے ۔

چلئے صاحب بس تیار ہے ۔ ڈونگا گلی تو ہم نے کل ہی دیکھ لی ۔ دائیں انتہائی عمق اور بائیں انتہائی اونچائی اور اس قدر سرسبز و شاداب کہ بس زمرد ہے زمرد ۔ یہ دکانیں کوزہ گلی کی ہیں ۔ بائیں ہاتھ والی سڑک جس پر ایک فوجی لاری گرجتی آ رہی ہے ۔ گھوڑا ڈھاکہ سے ہوتی ہوئی خانس پور جاتی ہے ۔ وہ سامنے ندی پر دبہتی جا رہی ہے ۔ اس کے

دونوں طرف دھان کے لہلہاتے کھیت کتنے دیدہ زیب معلوم ہوتے ہیں ۔ یہاں کی خوبانیاں ناشپاتیاں ۔ اخروٹ اور بادام خاص خوبیوں کی وجہ سے مشہور ہیں ۔ مگر نقل و حرکت کی مشکلات کے باعث بیرونی دُنیا ان کی لذت سے ناآشنا ہے ۔ وہ سامنے نورا کا تھانہ ہے ۔ جنوب کی طرف پہاڑی کے دامن میں گھوڑا گلی ہے ۔ جو پنجاب کی حدود میں واقع ہے ۔ شمال میں ناڑہ کا قلعہ ہے ۔ جہاں قبیلہ کڑوال کی سکھوں سے تاریخی لڑائیاں ہوئی تھیں ۔۔۔ یہ ہے خیرا گلی ۔ وہ اُونچائی پر فوجی بارکیں نظر آرہی ہیں ۔ گھوڑوں اور خچروں کی ہنہناہٹ سُنئے ۔ وہ فوجی بازار میں سودا سلف خرید رہے ہیں ۔ یہ ہے باڑیاں ۔ یعنی سرحد پنجاب کا سنگم ۔ اب ہمیں بس کو خیر آباد کہنا چاہئے ۔ لیکن بس کے ساتھ سڑک کو بھی چھوڑ کر پگڈنڈیوں پر چلنا ہوگا ۔ وہ دیکھئے ۔ گلیات کے سیاہ پوش باسی جن کے نحیف و نزار جسم اور بے رونق چہرے بھوک اور افلاس کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں ۔ یہ ہیں ان کے کچے مکان اور ان رنگ برنگ کے پھولوں والی بیلیں جن میں کدو بھی ہیں ۔ توریاں ہیں ۔ کھیرے بھی ۔ انگور بھی اور ارنا کے دیدہ زیب پھول بھی اپنے جوبن پر ہیں ۔ دائیں بائیں دیکھئے ۔ مکئی کے بھرپور کھیت اور لہلہاتی گھاس کی دُنیا اور سرد چشمے ۔۔ ۔ یہ پگڈنڈی ہمیں خانس پور پہنچائیگی ۔ یہاں پہلے گوروں کی چھاؤنی ہوا کرتی تھی ۔ مگر اب ان بارکوں پر اپنے دیس ہی کی فوج کا قبضہ ہے ۔ چلئے آگے چلیں ۔۔۔ یہ ہے گھوڑا ڈھاکا" کی چھاؤنی ۔ یہ بھی پہلے گوروں کا مسکن تھا ۔ مگر اب ہماری "بچہ فوج" کی تربیت گاہ ہے ۔ ہمیں سڑک چھوڑ دینی چاہئے ۔ کیونکہ سڑک کے ذریعہ یہاں سے تین میل کوزا گلی ۔ اور کوزا گلی سے پانچ میل ڈونگا گلی ۔ یعنی آٹھ میل کا چکر کون کاٹے ۔ پیپ لائن سے ڈونگا گلی صرف ۴ میل ہے ۔ ہمیں یہ چھوٹی سڑک ہی اختیار کرنی چاہئے ۔ یہ دیکھئے ۔ پیپ لائن کے بائیں ہاتھ جگہ جگہ ٹامی پلٹنوں کی بہادری کے کتبے چٹانوں پر کندہ ہیں ۔ اور یہ دائیں طرف کی گہرائی جنگلی درختوں اور جھاڑیوں کی افراط سے جیسے سبز پوش ہے ۔ ساڑھے پانچ بجے ہیں ۔ وہ رہا سامنے نتھیا گلی کا رئیس خانہ "زمین گول ہے" ۔ اب رات اسی رئیس خانے میں بسر کریں گے ۔ نتھیا گلی کی

صبح کتنی سہانی ہے۔ خوش نما کوٹھیاں ۔ گرجا گھر اور سبز رنگ کا گورنمنٹ ہاؤس کیسے بھلے دکھائی دے رہے ہیں۔ آج ہم میرجانی کی چوٹی کی طرف جائیں گے۔ یہ چوٹی مری کشور کی سے زیادہ اونچی ہے۔ یہ عملی میراہے۔ یہاں اپنے عصا وغیرہ سنبھال لئے۔ اور چڑھنا شروع کر دیجئے۔ ہمت نہ ہاریئے۔ چڑھائی پر سانس پھول جانا اور ہانپنا معمولی بات ہے بس اب تھوڑی سی منزل باقی ہے۔ یہ رہی میرجانی کی چوٹی۔ ابھی صرف گیارہ ہی بجے ہیں۔ بس ڈیرہ یہیں ڈال دیجئے۔ اب دوربین کام دے گی۔ وہ دیکھئے سامنے ایبٹ آباد اور وادیٔ رش۔ اور ذرا دائیں مڑ کر دیکھئے۔ وہ وادیٔ کشمیر ہتھیلی کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ ٹھنڈیانی کی کچی سڑک پر جانا ہوگا۔ لیکن اس کے لئے ہمیں گھوڑے لینے ہوں گے۔ آہا ہا کتنے سرسبز کھیت ہیں۔ اور یہ چشمے۔ اُبلتے چشمے جیسے سیال ہو گئی ۔ یہ رہی ٹھنڈیانی۔ یہ تو اسم بامسمیٰ جگہ ہے۔ یہاں تو دانت بجنے لگتے ہیں۔ یہ کیمپ اوڑ ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں یہاں بڑی رونق ہوتی تھی جسے کنڈ کہتے ہیں۔ اس کے کنارے گورکھا فوج اور کوٹھیوں میں سفید فام انگریز رہا کرتے تھے آج کل تو سنسان ہے۔ یہ گلیات کی آخری چوٹی ہے۔ جڑی بوٹیاں یہاں بہت پائی جاتی ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندو جوگی اور سنیاسی اپنے زرد زرد لباسوں کے ساتھ ان چوٹیوں پر جڑی بوٹیاں ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ یہاں کے کئی باشندے اپنے دکھ درد کا بھلا بُرا علاج انہی بوٹیوں سے کر لیتے ہیں۔ کیونکہ سردیوں میں یہاں کے ہسپتال مقفل ہو جاتے ہیں۔ اور گرمیوں میں امراء کے علاج کے لئے اپنی آغوش وا کر دیتے ہیں جیسے غریب تو بیمار ہی نہیں ہوتے۔ مغرب کی طرف چھ میل ڈھلان میں وہ ڈاک بنگلہ ہے جہاں پچھلے سال ڈاکٹر خان صاحب نظر بند تھے۔

نیچے یہ گڑھی حبیب اللہ ہے۔ چلئے جلدی پی لیجئے کیونکہ ہمیں اس موڑ سے بالاکوٹ جانا ہے —— یہ ہے بالاکوٹ درّہ کاغان کا دروازہ۔ یہاں سے سواری کے لئے صرف گھوڑے بڑی آسانی کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ذرا خیال سے چلئے گا۔ کیونکہ سڑک پُل صراط سے کم نہیں۔ اور ندی بھی بڑی تیز و تند ہے۔ سڑک کے ساتھ ہی

تو ہے۔ ذرا پاؤں پھسلا۔ اور آدمی جیسے پیدا ہی نہیں ہوا۔ آہا! کتنا اچھا سماں ہے۔ اوپر نیلا آسمان۔ نیچے گیت گاتی ہوئی ندی۔ اور آس پاس گلوں اور سبزے کی بہتات زمین پر بہشت کا جواب ہے ــــ اب ہم بالاکوٹ سے چار میل نکل آئے ہیں۔ اِسے سنگھڑ کہتے ہیں۔ ابھی ہم نے بارہ میل چل کر کوائی کے ڈاک بنگلے میں پہنچنا ہے۔ کوائی کے مناظر تو گلیات کو بھی مات کر رہے ہیں۔ آگے چلئے۔ سردی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ سڑک بھی تو بڑی تنگ ہے۔ کچھ بھی ہو۔ مناظر کتنے اچھے ہیں۔ ہر ہر قدم پہ ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست ــــ لیکن یہاں سے ہمیں تازہ دم گھوڑے لینے ہوں گے۔ اب تو راستہ بڑا ہی اتنا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ حصّے تو اور بھی ہولناک ہیں۔ پہاڑ پستے۔ یہ تو میتوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ دلربا مناظر اس صعوبت کو بھلا دیں گے۔ اب ہم آٹھ میل آ چکے ہیں۔ کتنے اونچے پہاڑ ہیں۔ ہمارے دونوں طرف۔ ارے یہ تو اندھیرا ہو رہا ہے۔ سورج دکھائی نہیں دیتا۔ پھر اندھیرا کس طرح نہ ہو۔ پہاڑ بھی تو بڑے گنجان ہیں نا ــــ اب تو ندی کے سہانے گیت بھی ڈراؤنے لگتے ہیں۔ اس گھاٹی کو اندھیریلا کہتے ہیں۔ یہ تو آسمان دکھائی دیا۔ اندھیرا کم ہوا۔ ہم تین میل اندھیرے میں ہی چلتے رہے۔ لیکن اب تو بادلوں نے آن گھیرا ہے۔ اور سردی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے ــــ یہی ہے کاغان جہاں ہم اگست میں کانپ رہے ہیں۔ چلیے ڈاک بنگلے چلیں۔ خانساماں سے چائے بنانے کا کہیں گے ــــ لیکن اُس سے کہیں گے۔ کہ چائے میں وہ پتی ضرور ڈال دے۔ جس سے سردی کافور ہو جاتی ہے۔ ورنہ خالی حولی چائے اس زمہریری سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اب سو جائیے۔ صبح اُٹھ کر سیر کریں گے۔

کتنی حسین صبح ہے۔ وہ سامنے برف میں ڈوبی ہوئی گھاٹیاں چاندی کے ڈھیر معلوم ہوتی ہیں۔ اکتوبر میں جب یہاں برف پڑتی ہے۔ تو یہ سامنے بہتی ہوئی ندی اس کی لپیٹ میں آ جاتی ہے ــــ اس طرف دیکھئے۔ خودرو پھولوں نے کیا عجیب سماں باندھ رکھا ہے۔ تین تین چار چار فرلانگ تک ایک ہی رنگ اور ایک ہی

شکل کے پھولوں کے تختے بچھے ہوئے ایک تختہ ختم ہوتا ہے۔ تو آگے دوسرے رنگ اور شکل کا تختہ سامنے آجاتا ہے۔ اور وہ رنگ برنگ کی تتلیاں چھوٹی چھوٹی چہکتی ہوئی خوش رنگ چڑیاں، مست کر دینے والی بھنبھناتی شہد کی مکھیاں۔ اور گاتے ہوئے جھرنے۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ اور جنت اسی کو کہتے ہیں۔ گھوڑے کس لیجئے، اور چلئے۔

اسے نہراں کہتے ہیں۔ یہ آزاد سرحد اور درہ کاغان کے درمیان تجارت کی منڈی ہے کوہستانی علاقے کا گھی، شہد، کمبل، بھیڑ بکریاں وغیرہ یہاں ہی آکر بکتے ہیں۔ اور شکار بہت ملتا ہے۔ یہاں جنگلی مرغ، مرغ زریں اور دوسرے قیمتی پرندوں کا تو شمار ہی نہیں۔ انسان خود نہ تھکے۔ تو شکار رہتا ہے۔ وہ دیکھئے سبز روپہلی اور مختلف رنگوں والی چڑیوں کا ڈار۔ چلئے آگے چلیں۔ یہ ہے مشہور جھیل۔ سیف الملوک جس کے ساتھ سیف الملوک اور بدرالجمال کا رومان منسوب ہے۔ اور اس کے سامنے وہ سفید پتھر کی چٹان ہے جس کے متعلق مشہور ہے۔ کہ وہ سفید دیو تھا۔ جو سیف الملوک اور بدرالجمال کے عشق میں مخل ہونا چاہتا تھا۔ اور ان کی بددعا سے پتھر ہو گیا۔ اس چٹان سے آگے چڑھائی پر بھی ایک جھیل ہے۔ "لولو سر" نام تو سنا ہی ہوگا۔ کنہار کی ندی اسی جھیل سے نکلتی ہے۔ یہ وہی ندی ہے جس کے توسط سے درہ کاغان کی تمام عمارتی لکڑی باہر کی دنیا تک پہنچائی جاتی ہے۔

یہ جو برف کی سلیں اور ڈھیر دیکھ رہے ہو۔ یہ پگھل کر انہیں جھیلوں کے پیٹ میں آتے ہیں۔ ان چشموں، جھیلوں، پھولوں اور دیگر فردوسی نظاروں کی دنیا سے آگے چیلاس ہے ضلع ہزارہ کی آخری سرحد اس سے آگے پھر گلگت کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں کے انگور دنیا بھر کے انگوروں سے بہتر ہیں۔ نازک، اتنے کہ اگر آپ ایک خوشہ رومال میں باندھ کر ایک فرلانگ چلیں۔ تو رومال میں چھلکوں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اور یہاں شلغم اور مولیاں بھی کاغان جیسی کہیں نہیں دستیاب ہو سکتیں۔

سیر کافی ہو چکی بس اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔

ص ۔ فیضی

پٹھانوں کے رومان

سرحد کی درشت سرزمین جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں تمام دوسرے خطوں سے پیچھے ہے وہاں رومانوی لحاظ سے بھی پس ماندہ سمجھی جاتی ہے ۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ یہاں کبھی رومان کھیلے ہی نہیں گئے ۔ صحت مند جوانی اور گرم خون جہاں بھی ہوگا اس کا جنسی اور حسیاتی ردِعمل رومان کی شکل میں ظاہر ہونا لابدی ہے پٹھان قوم بھی صحت مند جوانی اور صالح خون کی حامل ہے ۔ اور اسی لئے فطری تقاضوں کے سامنے بے دست و پا ہے ۔ مگر سماجی پابندیوں کے بوجھ تلے فطری امنگیں کیسے ابھر اور پنپ سکتی ہیں ۔ یہاں سماجی بندھنوں کی گرفت اتنی سخت ہے کہ رومان کا دم گھٹنے لگتا ہے ۔ ایسے گھٹے گھٹے ماحول میں اس قسم کے رومانوں کا کوئی امکان نہیں جن کا تذکرہ ماورائے سرحد کے ادیب پنگھٹ سے کھلیان تک کے مختصر رومانی فاصلے اور وقت میں ہمارے سامنے بے دھڑک پیش کرتے ہیں ۔ لیکن یہاں تو ہر دھڑکن کے ساتھ موت کا دھڑکا لگا رہتا ہے ۔ یہاں کا ہر رومان سنسناتی ہوئی گولیوں کے ماحول میں کھیلا جاتا ہے ۔ کسی ملک کے رہنے والوں کی سماجی اور اجتماعی زندگی کے خدوخال اُن کے رومان کے آئینے میں بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں ۔ سرحد کے بیشتر رومان یہاں کے جنگجو باشندوں کی عسکریت کے گرد گھومتے ہیں اور ان کا ہیرو عسکری خوبیوں کی وجہ سے محبوب کا منظورِ نظر بنتا ہے

ماضی بعید میں یہاں جو رومان وقوع پذیر ہوئے ان میں "موسیٰ خان گل مکئی"

آدم درخانئے۔ فتح خاں رابیاؔ۔ مومن خاں شیرینؔ۔ اور تجوبہ جلاتےؔ خاص طور پر مشہور ہیں۔

جاڑے کی طویل راتوں میں دہکتے الاؤ کے گرد نوجوانوں اور بوڑھوں کا کوئی جمگھٹ ان کے تذکروں سے خالی نہیں ہوتا۔ سماجی پابندیوں کے خلاف بغاوت کرنے والے یہ چند سرپھرے جنہوں نے پوری قوم کو دھڑکنیں عطا کیں۔ کون تھے ؟ یہ سوال ہر غیر سرحدی کے ذہن میں ابھرے گا۔ اور ان کے رومان سے آگاہ ہونے کے لئے ہر سماعت مشتاق ہو گی ۔۔ آئیے ہم آپ کو ان محبت بھرے دلوں کی کہانیاں مختصر الفاظ میں سنائیں ۔

آدم دُرخانئے

آدم حسن خان کا بیٹا اپنے عہد کا مشہور خانزادہ تھا اور یوسف زئیوں کے خاندان میٹہ خیل سے تعلق رکھتا تھا۔ جو سوات کے علاقہ بری کوٹ میں ایک نامور قبیلہ ہے درخانئے یوسف زئی کے بہت بڑے خان طاؤس کی لڑکی تھی آدم اور دُرخو (درخانئے) کی محبت بچپن سے شروع ہوئی ۔

آدم کی داستانِ محبت بڑی طویل ہے۔ اس کہانی کا مرکزی شخص میرامی "آدم کا رقیب" تھا۔ اور یہ چاہتا تھا کہ دُرخو کو آدم سے جُدا کر دے

آدم لڑائیاں لڑتا ہے محبت کے داؤ پر سر دھڑ کی بازی لگاتا ہے۔ مگر ناکام رہتا ہے۔ اور آخر اسی طرح ناکام آرزو دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ دُرخو بھی اس سے پیچھے نہیں رہتی۔ اور خدائے محبت کے حضور اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتی ہے اور دونوں ایک ساتھ دفن ہوتے ہیں۔ آدم خان کے عشق کی داستان اس کے اپنے اشعار کی صورت میں یہاں زبان زدِ خاص و عام ہے اور پٹھانوں میں یہ منظوم ڈرامہ بہت مشہور ہے ۔

آدم خاں دُرخو سے یوں اظہارِ محبت کرتا ہے : ۔

در خانئ میر من مسلوکے
درخواسے میرے دل کی مالکہ
چہ پہ درست جہان دِلاپے دہ حُسن کوکے
ساری دنیا میں تیرے حسن کی شہرت ہے

آدم ستا کتو رنځور کړہ
آدم تجھ کو دیکھ کر بیمار ہوگیا ہے
کہ ورکو زړے کړے دہ دواړو زلفو خوکے
اللہ اپنی زلفوں کی سرکشی کو کم کر

اور اس شعر میں کتنی یاس ہے:۔

څہ دہ بدو آدم خان دے
آدم کتنا بُرا ہے
دہ آدم څہ دہ بدو ځان دے
آدم کی حیثیت نفرت کے قابل ہے

چہ ستاد نظر پرنہ شو
کہ تیری ایک نظرِ کرم کا سزاوار بھی نہیں
پہ دا ځان پورے حیران دے
اپنے آپ پر وہ افسوس کرتا ہے

آدم کا رباب سارے پٹھانوں میں مشہور ہے۔ اور یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اگر کوئی آدم کے حرا کے درخت کی لکڑی کا مضراب استعمال کرے۔ تو وہ بہت جلد ہی رباب بجانا سیکھ لیتا ہے۔

موسیٰ خان اور گل مکئی

موسیٰ خان گل مکئی کا چچازاد بھائی اور اُس کا محبوب تھا۔ "سُہیلی" جو اس دمان کا ولین ہے۔ گل مکئی کو موسیٰ خان سے چھین لینا چاہتا ہے۔ مگر ولی جان اور میر ولی کی مدد سے (جو موسیٰ خان کے دوست تھے) سہیلی اپنی اس کوشش میں ناکام رہتا ہے۔ اور ولی جان میر ولی کے مرنے کے بعد جب موسیٰ خان کسی سفر پر ہندوستان سے واپس آتا ہے۔ تو سُہیلی "میدان خالی دیکھ کر" گل مکئی کو اغوا کر لیتا ہے۔ موسیٰ خاں جب ہندوستان سے واپس آتا ہے۔ تو سہیلی کی طاقت کے سامنے اپنی بے چارگی دیکھ کر غصے سے طیش آجاتا ہے۔ اور رات کو سہیلی کے گاؤں پر تن تنہا حملہ کر دیتا ہے۔ لیکن انجام کار وہ سہیلی کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے۔ گل مکئی جب یہ خبر سنتی ہے۔ تو سہیلی سے کہتی ہے۔ کہ میں تجھ سے شادی کر لوں گی لیکن مجھے

آخری بار موسے خان کی قبر دیکھنے کی اجازت دیجئے ۔ وہ اجازت دے دیتا ہے ۔ گل مکئی قبر پر جا کر فرطِ غم سے بے ہوش ہو کر گر پڑتی ہے ۔ لیکن جلد ہی یہ بے ہوشی موت کے دوامی سکوت میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔

فتح خان اور رابیا

فتح خان اسلم خان کا بیٹا اور قومیت کے لحاظ سے "بڑلیس" تھا ۔ جو قندھار کے نواح میں ایک بہت بڑی قوم ہے ۔ رابیا اس رومان کی ہیروئن تھی ۔ جو اسلم خان کے وزیر کی لڑکی تھی ۔ فتح خان ۶۰ بڑلیسوں کی ہمراہی میں ہندوستان کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا ۔ وہاں پر اس نے مغلوں کے ساتھ لڑائی کی لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی اور اس کے تمام ساتھی کام آ گئے ۔

فتح خان کی زندگی کا زمانہ ایک معلوم عرصہ شمار کیا جاتا ہے ۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس عہد میں پیدا ہوا ۔ لیکن یہ ظاہر ہے ۔ کہ یہ واقعہ ایک ہزار صدی ہجری سے پہلے کا ہے ۔ اس لئے یہ "کلا بست" جو بڑلیس حکومت کا پایۂ تخت تھا ۔ اس وقت آباد تھا ۔ یہ تاریخی شہر اسلام سے پہلے هیاطلہ بادشاہوں کے تصرف میں تھا ۔ مگر بعد میں نوشیرواں ساسانی نے اس پر قبضہ کر لیا

مسلمانوں کے حملے کے وقت بھی یہ شہر آباد تھا ۔ بلاذری لکھتا ہے ۔ کہ وزان بست ۳۰ھ سے ۵۰ھ تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا ۔

اگرچہ اسلامی مورخین خرابۂ کلا بست کو سلطان علاؤ الدین جہانسوز اور پھر تیمور لنگ سے منسوب کرتے ہیں ۔ مگر تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے ۔ کہ علاؤ الدین نے بست میں صرف غزنوی بادشاہوں کی نشانیاں مٹائی تھیں ۔ جیسا کہ طبقات ناصری میں لکھا ہے اور تیمور نے بھی بست کو کلی طور پر تباہ نہیں کیا تھا ۔ اس لئے کہ تیمور کے بیٹے میرزا شاہرخ نے اسی شہر میں ۸۰۷ سے ۸۵۰ ہجری تک اپنا سکہ چلایا تھا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ یہ شہر دسویں صدی ہجری سے

پہلے موجود تھا۔ اور اسی لئے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ فتح خان کا قصہ اس سے پہلے کا ہے۔

فتح خان جو نہایت بہادر اور جنگجو انسان تھا۔ رابیا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے

که بنده کره رابیا کله له ما بنده کره — داجنگی زغره دِ مخے لره راوړی

اگر رابیا مجھ پر تو احسان کرنا چاہتی ہے — تو جنگی زرہ میرے واسطے لے آ

فتح خان آخری بار میدان جنگ کو جاتا ہے۔ اس دفعہ رابیا مایوس ہے وہ جانتی ہے کہ فتح خان زندہ واپس نہیں لوٹیگا۔ تو وہ گھوڑے سے بڑی منت اور سماجت کے ساتھ کہتی ہے۔

دہ فتح اٗس نال نال به دِ زرین کړم

اے فتح خان کے مرکب میں تیرا ہر نعل سونے کا بنا دوں گی

که دِ دا وار فتح راوړه را امیل به دِ وه غاړے ونکین کړم

اگر فتح اس بار زندہ واپس لوٹا تو میں اپنا ہار بھی تجھے پہنا دوں گی

اور پھر جب فتح خان کو میدان جنگ میں وطن کی یاد ستاتی ہے تو وہ کہتا ہے ؎

که پاخه دی ده قند هارا نار پاخه دی

اگر قندھار کے انار پکے ہیں تو میرے کس کام کے

اسلم خان بابا دِ خوری په ما تارخه دی

اسلم خان (فتح کا باپ) اس کے مزے لوٹے میرے لئے تو وہ کڑوے ہیں

فتح خان کی محبوبہ رابیا بھی اُس کے ساتھ ان جنگوں میں تھی۔ فتح خان کا بھائی کرمے اور رابیا کا بھائی پور دل بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ آخری لڑائی میں جب فتح خان بھی مارا گیا۔ تو رابیا نے اپنے خاوند کی لاش پر انتقام لینے کی قسم کھالی اور مغلوں کے خلاف دوبارہ اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن آخر کار اپنی قلیل ترین فوج کے خاتمے کے بعد خود بھی قتل ہو گئی۔ اور اس طرح اس عسکری رومان کا خاتمہ میدان جنگ میں ہوا۔

جلات اور محبوبہ

محبوبہ ایک حسین شہزادی تھی۔ جس کے حصول کی خاطر جلات کے چھ بھائی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ جلات اُن کا ساتواں اور آخری بھائی تھا۔ اس نے بھی کمر ہمت باندھ لی۔ مشکل یہ تھی کہ محبوبہ کو حاصل کرنے کی شرط بڑی کڑی تھی۔ محبوبہ ایک مخصوص تہ خانے میں چھپ جاتی تھی۔ اور امیدوار اُسے ڈھونڈھتا۔ مگر تہ خانے کی بھول بھلیوں میں وہ خود کو بھول جاتا تھا۔ اور محبوبہ کو ڈھونڈ نکالنا تو ایک طرف۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بیچارا خود بھی جان سے مارا جاتا۔ جلات مہم سر کرنے سے پہلے پیچ پیر گیا۔ جہاں ایک بزرگ کی دعائیں حاصل کرنے کے بعد وہ محبوبہ کے شہر کی طرف چل پڑا۔ اتفاقاً وہ شہر میں ایک مالن کے ہاں اترا جو روز محبوبہ کے لئے ہار پرویا کرتی تھی۔ جلات نے ایک دن اپنے ہاتھ سے ہار پرو کر مالن کے ہاتھ بھجوا دیا۔ جو محبوبہ کو بہت پسند آیا۔ اور محبوبہ نے اُسے حکم دیا کہ ہار پرونے والی لڑکی کو خود حاضر کیا جائے مالن بڑی سٹ پٹائی۔ مگر جلات نے اُس کی ڈھارس بندھائی۔ اور اس طرح جلات لڑکی کے بھیس میں محبوبہ کے پاس پہنچا۔ پہلی ملاقات میں دونوں کے دل دھڑکنے لگے۔ اور جلات نے محبوبہ سے کہا آؤ کہ ہم آج رات مل کر دعا مانگیں کہ خدا مجھے لڑکی سے لڑکا بنا دے اور اسی طرح محبوبہ نے تہ خانے کا راز بھی اس پر افشا کر دیا۔ دوسرے دن جلات رسمی اعلان کے بعد تہ خانے میں محبوبہ کو ڈھونڈنے اتر پڑا۔ محبوبہ نے اُسے جگہ بتا دی تھی۔ کہ میں گل ریحاں کے جھنڈ میں انتظار کروں گی۔ چنانچہ اس طرح یہ دونوں دھڑکتے ہوئے دل مل گئے۔

مومن خان شیرینو

کہا جاتا ہے کہ پہلے زمانے میں قندھار کے نواح میں دو بھائی رہتے تھے۔ بڑا بھائی قوم کا مشر (چودھری) تھا۔ اس کے سات بیٹے تھے۔ مگر چھوٹے بھائی

کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دونوں نے آپس میں یہ عہد کیا۔ کہ اگر ان کے ہاں لڑکا لڑکی ہوئی۔ تو ان کی ایک دوسرے کے ساتھ شادی کریں گے۔ تھوڑی مدت کے بعد بڑے بھائی کے گھر لڑکی پیدا ہوئی۔ اور چھوٹے بھائی کے گھر لڑکا۔ لڑکی کا نام "شیرین" اور لڑکے کا نام "مومن خان" رکھا گیا۔ اور بچپن ہی سے دونوں کی نسبت کر دی گئی۔ دونوں بھائیوں کے مرنے کے بعد "مشر توب" (منصب سرداری) پر جرگے ہونے شروع ہوئے۔ اور آخر کار آدھی قوم نے "شیرین" کے بھائی "زبردست خان" کو اپنا مشر مقرر کیا۔ اور آدھی قوم نے مومن خان کو

"شیرین" کا بھائی زبردست بڑا حاسد۔ بدمزاج اور نالائق تھا۔ جب مومن خان نے اس سے شیرین کا رشتہ مانگا۔ تو اس نے ٹکا سا جواب دیا۔ مومن خان یہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ قوم آپس میں کٹ مرے۔ اس لئے وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔

مومن خان کا یہ سفر بہت طویل تھا۔ وہ بارہ برس تک وطن سے دور رہا۔ وہ ایک بہادر اور جری پٹھان تھا۔ جہاں جہاں وہ جاتا لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے۔

بارہ برس گزرنے کے بعد وہ شیرین کی محبت سے مجبور ہو کر وطن واپس لوٹا مگر بدقسمتی سے وہ رات کو گھر آیا۔ گھر والوں نے اسے نہیں پہچانا۔ اور چور کے دھوکے میں زبردست نے مومن خان کو قتل کر دیا۔ یہ رومان اس طرح پیوندِ خاک ہوا۔

مومن خان اور شیرین کے رومان کے سلسلے میں ہمیں چند ٹپے ملتے ہیں۔ جو فسردہ دلوں کو ہمیشہ گرماتے رہتے ہیں۔

مومن خان جب ہندوستان جانے لگتا ہے۔ تو شیرین اس سے پوچھتی ہے۔

تا د ء سفر موزے پہ خپو کړے ——— دا زیړه ګلو باغ پہ چا سپارے حینه

تو نے تو سفر کے لئے جوتے پہن لئے ہیں ——— مگر یہ پھولوں کا باغیچہ کس کے سپرد کر کے جا رہے ہو

مومن خاں جواب میں کہتا ہے :-

ما دَ سفر مو زے پہ چزو کڑے
یقیناً میں سفر پر جا رہا ہوں

دزیرو گلو باغ پہ خدائے سپارم مینه
اور پھولوں کے باغیچہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں

شیرین کہتی ہے :-

چه هو رے ځے . خال م ھیچی کڑه
جاتو رہے ہو لیکن میرے خال اچھی طرح ذہن نشین کر لو

ده هندوستان ده پیغلو نه دے خالونه
کیونکہ ہندی دوشیزاؤں کے خال نہیں ہوا کرتے

مومن خاں کہتا ہے -

ده هندوستان دَ لور ته ځمه
دیہ ٹھیک ہے کہ میں ہندوستان جا رہا ہوں

ده هندوستان جونده م خو نیشته نه بلے دو بنده
دلیکن ہندی دوشیزائیں میری منہ بہنیں ہیں

یہ تھا ان سرحدی رومانوں کا خلاصہ ان میں بعض زندگی سے قریب بھی ہیں اور دور بھی جو زندگی کے ساتھ لگا نہیں کھاتے انہیں تخیلی ہی کہنا چاہیئے -

ان رومانوں کا روایتی پہلو جو کچھ بھی ہو بہرحال یہ ہیں سب کے سب متداول -

ان مقامی منظوم رومانوں کے علاوہ غیر مقامی رومانوں کے ترجمے بھی پشتو نظم میں موجود ہیں - جو حجروں - چوپالوں اور محفلوں میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں

لیلی مجنوں - شیرین فرہاد - بہرام شاہزادہ سیف الملوک - اور گنج شام وغیرہ جو غیر مقامی ہونے کے باوجود پٹھانوں میں مقبول ہیں ؞

●

ح - ر - صاحبزادہ

پشتو لوک گیت

کسی زبان کے فنی اور اس کے بولنے والوں کے سماجی اور معاشرتی رجحانات کا پتہ صرف اُس کے لوک گیتوں سے ہی چل سکتا ہے - کیونکہ مشرقی عوام کے لئے ان کے داخلی جذبات کے اظہار کا واحد ذریعہ عوامی شاعری ہے - اور عوامی شاعری سے ہی عوامی معیاری یا سنجیدہ ادب کی اونچ نیچ کا علم ہو سکتا ہے - لہٰذا کسی زبان کو معیار کی کسوٹی پر پرکھنے اور عوامی ادبی معیار کا صحیح اندازہ لگانے کا واحد ذریعہ یہ ہے - کہ اس زبان کے لوک گیتوں کو جانچ لیا جائے۔

پشتو ادب پر بعض دیگر مشرقی لٹریچر کی طرح عرصہ تک گمنامی کا پردہ پڑا رہا - اس کی وجہ قومی جمود اور بے حسی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی - پشتو بولنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی رہی - (اور پشتو سمجھنے والوں کا ایک خاص طبقہ اب بھی یہ سمجھ رہا ہے) کہ پشتو ادب کو جو ارتقائی درجہ علامہ محمد ہوتک کے زمانہ میں نصیب ہوا تھا - پھر اس کے لئے وہ عروج حاصل کرنا ناممکن ہے - اسی وجہ سے پشتو فنکاروں اور ادیبوں کے اعصاب پر احساس کمتری اور ادبی بے مائیگی کا جو بھوت سوار رہا تھا اُس نے انہیں اُبھرنے نہ دیا - یہی سبب ہے - کہ پشتو ادب وہ معراج حاصل نہ کر سکا جس کا وہ مستحق تھا۔

پٹھان ایک پس ماندہ قوم ہے اور دیگر اقوام عالم کی نسبت تعلیمی لحاظ سے بہت پیچھے ہے - اور ظاہر ہے - کہ تعلیمی پسماندگی کے ردِ عمل نے اُس کے فنی اقدا

کو متاثر کیا۔ اور اسی لئے ہم پشتو شاعری کو عوامی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ پشتو ادبا کا جو طبقہ ادب برائے ادب کے فرسودہ نظریئے کا حامی رہا۔ وہ عوام میں کوئی نام نہ پا سکا۔ اور نہ اُن کا ادب آفاقی ادب ثابت ہُوا۔ اس کے برعکس پشتو کے وہ ادیب جو ادب کو زندگی کے مختلف زاویوں سے دیکھتے رہے۔ اور زندگی کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی کروٹ لینے پر مجبور کرتے رہے۔ سب عالمگیر شہرت کے مالک بنے۔ اور صالح اور صحت مند ادبی خدمت کی وجہ سے زندگی کے قریب آتے رہے۔

پشتو کے اکثر ادیب زندگی سے فراریت اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ زندگی اپنے ہر موڑ پر انہیں آئینہ دکھاتی ہے۔ جس میں وہ ہر قدم پر اپنے ادبی اور سماجی خدوخال کا جائزہ لیتے ہیں۔ عسکریت جو پٹھان ماحول کا جزو لاینفک ہے۔ ہر موزوں موقع پر ادب کا ساتھ دیتی ہے اور یہ تو ظاہر ہے۔ کہ ادب کو زندگی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ہی "ادب برائے زندگی" کا اصلی مفہوم ہے۔ اسی لحاظ سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں۔ کہ پشتو درحقیقت ایک نہایت ہی ترقی پسند زبان ہے۔ جس پر اس کے رجعت پرستانہ ماحول نے رجعت پرستی کا رنگ چڑھا دیا ہے۔

پشتو کے لوک گیت بسا اوقات علاقائی ضرورت کے مطابق کہے جاتے ہیں۔ اُن علاقائی وحدتوں کا اکثر طبقہ ناخواندہ ہوتا ہے۔ اس لئے اُن کے گیت اتنے ترقی یافتہ نہیں ہوتے۔ جو فنی کسوٹی پر پورے اتریں۔ لیکن اگر لوک گیت عوام کے مزاج عقلی سے ہم آہنگ ہوں۔ تو انہیں قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔

"ٹپے"۔ "لوبے"۔ "چار بیتے" اور "بدلے" یہ ہیں پشتو لوک گیت کے اصناف اور اس کے عناصر۔

ٹپہ پشتو زبان کی اپنی تخلیق ہے۔ اور اس کا وجود دوسرے ادب میں بالکل مفقود ہے۔ یہی ایک صنف ہے۔ جو اٹک سے قندھار تک کے پٹھانوں کا مشترکہ ملی ترانہ ہے۔ کہیں اسے ٹپہ کہا جاتا ہے کہیں لنڈئی۔ اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق یہ قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ ٹپہ پشتو زبان میں "مُہر" کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ پٹھان بات بات میں اس کو

ضرب المثل کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے اسے ٹپہ کہا جاتا ہے۔ اور یا یہ کہ ٹپہ "تالی مارنے" کو بھی کہتے ہیں۔ چونکہ ٹپے کی دھن کے ساتھ ساتھ اس کی لے پر تالیاں بھی پیٹی جاتی ہیں۔ اس لئے اس صنف کا نام ہی ٹپہ قرار پایا۔ یا یہ کہ ٹپہ "تھپکی" کو بھی کہتے ہیں۔ اور یہ محزوں دلوں کے لئے بمنزلہ ایک "تھپکی" کے ہوتا ہے۔ اس لئے اسے ٹپہ کہا جاتا ہے۔ لنڈئی کے معنی تو ظاہر ہیں۔ کہ چونکہ اس کا پہلا مصرعہ مختصر اور دوسرا طویل ہوتا ہے اس لئے اس کو لنڈئی "یعنی کوتاہ کہا جاتا ہے۔ جیسے یہ مثال:۔

خما اشنا گل دہ نرگس دی بل تہ پہ ترس وسے ماتہ سم نظر کوینہ

میرا محبوب نرگس کا پھول ہے۔ جو غیر کو زہر بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ اور مجھے شہد آمیز نگاہوں سے۔

خما اشنا گل دہ لالہ دی پہ رنگ اشنے دے بلبلان ورلہ ځینہ

میرا محبوب گل لالہ کی طرح حسین ہے جسے دیکھنے کے لئے عندلیبان چمن جوق در جوق آتی رہتی ہیں۔

خما اشنا گل دہ صد بڑی پہ ما خبر دے چہ مین ورتہ مے یمہ

میرا محبوب گل صد برگ ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ میں اسے چاہتا ہوں

خما اشنا گل دہ رابیل دی زړہ م غلبیلی ورسی کری فریاد وینہ

میرا محبوب موتیا کا پھول ہے ۔ میرا دل چھلنی چھلنی ہو چکا ہے۔ لیکن پھر بھی فریاد کر رہا ہے۔

چہ نیمہ شپہ شی یار رایاد شی زړہ پہ فریاد شی سترگے اوښکے سہ وینہ

آدھی رات کو جب مجھے اس کی یاد آتی ہے۔ تو دل بے اختیار فریاد کرنے لگتا ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

چہ کلہ کلہ را پہ زړہ شی سر پہ بازو کړم اوښکے کوزے تویدومہ

جب کبھی مجھے تیری یاد آتی ہے۔ تو سر بہ زانو ہو کر اشک افشانی کرتا ہوں۔

څاده ذړه آرامه راشه   په تمامي جهان اختر په ما غمونه
اے آرام جان آ ۔ تمام دنیا عید منا رہی ہے لیکن میں غموں میں مبتلا ہوں

څاده ذړه آرامه راشه   ملهم څما شه چه م زخم کړی پرهرونه
اے آرام جان آ ۔ میرے لئے مرہم شفا بن تاکہ میرے زخم صحتیاب ہوں

که دے باڼړه قاتلان نه وے   په دروازو کښې به دِچا کړل فریادونه
اگر تمہاری پلکیں قاتل نہ ہوتیں ۔ تو تمہارے دروازے پر کون سسک سسک کر فریاد کرتا

سترګے م خوږ و لاس م پرایښے   د اشنا غم په کښې غړیږی ړوند به شمه
میں نے اپنی دکھتی آنکھوں پر (غم سے بے قرار ہو کر) ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ محبوب کا غم ان میں کھٹک رہا ہے۔ میں کہیں اندھا نہ ہو جاؤں

عشق، عاشقی اور سوز و گداز کے نیچرل جذبات و واردات کے علاوہ وہ ٹپے جو سیاسی تحریکوں کے مرہونِ منت ہیں۔ اپنے اندر جوش، زندگی اور تڑپ رکھتے ہیں۔ ان ٹپوں کا نقطۂ نظر سامراج شکن اور شجاعت آموز ہے

د آزادئ ناوی جوړیږی   هر ځلمی لغړے دهی څما د شینه
آزادی کی دلہن سجائی جا رہی ہے   اور ہر نوجوان اسے اپنانے کی کوشش میں ہے

که م فرنګ ټوټے ټوټے کړی   د قام د ننګ مناسب ستا افغان کړم منه
اگر انگریز مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دے   تب بھی میں قومی وقار کو ٹھیس نہیں لگنے دوں گا

ٹپوں کے بعد "لوبوں" کا درجہ آتا ہے۔ یہ بھی پشتو کی اپنی تخلیق ہے۔ اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آج سے نصف صدی پیشتر اس کا وجود نہیں تھا۔ اگرچہ اس کی ایک ناکمل سی شکل یعنی نیمکئی اس وقت بھی موجود تھی۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ پشتو میں تخلیقی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ اور اس کے لئے علامہ ہوتک۔ خوشحال خان۔ عبدالحمید یا علی خان کا دور اور کسی شخص کی سرپرستی کی ضرورت نہیں۔ بلکہ پشتو میں فی نفسہ ایسے عناصر ہیں۔ جو اسے نئے نئے ماحول سے روشناس کراتے ہوئے جدت بخشتے ہیں۔ اور یہ بات ہمارے اس دعویٰ پر بھی دلالت کرتی ہے۔ کہ پشتو درحقیقت

ایک نہایت ترقی پسند زبان ہے اور اس میں اتنی گنجائش ہے کہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بشانہ ادبی میدان میں پوری اتر سکے۔ کیونکہ بے مائیگی کے باوجود اگر کسی زبان میں اتنی لچک ہو سکتی ہے۔ کہ وہ اپنی شاعری میں جدید اصناف کا اضافہ کر سکے۔ تو یقیناً اس میں اتنی صلاحیت بھی ہو سکتی ہے۔ کہ وہ زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات کی آئینہ دار بھی ہو سکے۔ اور کارزارِ حیات میں اپنے لئے ایک مخصوص مقام پیدا کر لے۔

"لوبہ" کی وجہ تسمیہ کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ذہن میں صرف یہی بات آسکتی ہے۔ کہ لوبہ جس کا مطلب اردو میں "کھیل" ہوتا ہے۔ اکثر عاشق و معشوق کے باہمی مکالمات کی عکاسی کرتا ہے۔ اور اسی بنا پر اسے "PLAY" کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

یہ مستزاد کے قسم کی ایک چیز ہے۔ جس کے پہلے دو مصرعے ایک ہی قافیہ پر ہوتے ہیں۔ مگر بحر میں مختلف پہلا مصرع عموماً طویل اور دوسرا مختصر ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے مصرعے تعداد میں دو یا تین یا بعض اوقات چار بھی ہوتے ہیں۔ آخری مصرعے کو مطلع کے مصرع کے ساتھ گرہ لگا دی جاتی ہے۔ اور یوں پہلا بند جسے "کڑی" کہتے ہیں مکمل ہوتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ "لوبہ" کبھی "کامیڈی" جذبات کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ عموماً ٹریجڈی ہوا کرتا ہے۔ یا پھر دیگر مشرقی زبانوں کی طرح مرثیہ (جسے میرے خیال میں اپنی خودی کا نوحہ کہنا چاہیئے) اس صنف کے دو بڑے استاد "استاد رحیم اور استاد مظہر" تھے۔ اول الذکر صاحب کو فوت ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔ یہ موضع سوڑی زئی علاقہ ہشت نگر ضلع پشاور کے رہنے والے تھے۔ بالکل اُمی تھے۔ اور اسی وجہ سے جو کچھ لکھتے تھے۔ عوامی جذبات سے متاثر ہو کر اور عوام کے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر لکھتے تھے۔ ان کے لوبے پختونخوا میں عموماً اور علاقہ ہشت نگر میں خصوصاً نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی سوانح حیات کا ہمیں پوری طرح علم نہیں صرف اتنا پتہ ہے۔ کہ افلاس میں پیدا ہوئے۔ اسی میں پلے بڑھے۔ اور اسی ماحول میں

سسک سسک کر مر گئے۔ گویا جو کچھ انہوں نے لکھا اپنی آپ بیتی لکھی جس سے سرحد کے باشندوں کی اکثریت کے افلاس، فاقہ کشی اور بدحالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز یہاں کے اونچے طبقے۔ خوانین، ارباب اور بڑے بڑے جاگیردار و سرمایہ داروں کی قساوت قلبی اور اجارہ داری کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔

استاد رحیم جان پشتو کا ایک بہت بڑا عوامی فنکار تھا۔ یہ نوحہ انہی کا ہے:۔

دہ غم دہ لاسہ م پہ زړہ باندې خفقان راځي — نوی طوفان راځي

(غم کے ہاتھوں میرے دل پر خفقان مسلط ہے — نیا طوفان آرہا ہے)

یو دہ نیو نلې ظلمونہ — غټ غټي لا او سونہ — هلئے دہ غریبانو ژوندونہ

(ایک انگریزی ظلم ہے — دوسرے ان توندوں والوں نے ہمیں جلاویا — افسوس غریب کی زندگی)

یو ستم تېر نہ دی چہ بل پورې د آسمان راځي — نوی طوفان راځي

(ایک ظلم ابھی ختم نہیں ہوتا کہ آسمان دوسرا ستم توڑ دیتا ہے — نیا طوفان آرہا ہے)

ځائے مو بہ ښار کښې نشتہ دے — دہ کار درک نشتہ دے — دہ ژوند نو حق نشتہ دے

(شہر میں بھی ہمارے لئے جگہ نہیں — مزدوری الگ نہیں ملتی — (کیا) ہمیں زندہ رہنے کا حق نہیں)

پہ دے حالت م سیلابونہ لہ چشمان راځي — نوی طوفان راځي

(اس حالت پر میری آنکھوں سے سیلاب (اشک) جاری ہے — نیا طوفان آرہا ہے)

بارہ پټے کوو مونږ — یوے ماڼے کوو مونږ — بیا هم فاقے کوو مونږ

(ہم کھیتی باڑی کرتے ہیں — ہل اور سہاگہ چلاتے ہیں — پھر بھی فاقے کرتے ہیں)

چہ دہ غوبل پہ وخت کښې ویش لہ خانان ځي — نوی طوفان راځي

(کیونکہ کھلیان پر بٹائی لینے کے وقت خان آجاتے ہیں — نیا طوفان آرہا ہے)

خان تہ ارزل وی غریب — دہ کمانړی ټل وی غریب — تر څو بہ ځل وی غریب

(غریب خان کو کینہ دکھاتا ہے — غریب بیلنے کا گنا ہے — غریب کب تک چور کہلائے گا)

یہ مختبر بہ آخر قہر دہ سبحان راځي — نوی طوفان راځي

(انجام کار سرمایہ دار پر قہر الٰہی نازل ہو گا؟ — (کیونکہ) نیا طوفان آرہا ہے)

استاد مطہر فدا بھی اسی طبقہ کے ایک فرد ہیں۔ جو زمانہ کی تلخیاں چکھنے اور پٹھانوں کو اپنے ٹوپوں سے گرمانے کے لئے ابھی تک زندہ ہیں۔

یہ علاقہ خلیل کے ایک گاؤں پشتہ خرہ میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے آفاقی شہرت کے مالک ہوئے۔ پٹھانوں کا کوئی متنفس ایسا نہ ہوگا جس کی زبان پران کا کوئی شعر نہ ہو۔ میں نے اکثر گلی کوچوں میں چھوٹے بچوں کی زبان سے ان کی پوری کی پوری غزلیں اور بڑے بوڑھوں سے ٹوپے سنے ہیں۔ اگرچہ علمی بے مائیگی کی وجہ سے ان کے ٹوپوں میں آتنی پہنائیت نہیں جو تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کر سکے۔

اکثر شکایت روزگار کا تذکرہ ہوا کرتا ہے۔ اور یوں تھکے ہارے کسانوں، درماندہ حال مزدوروں اور محنت کے پسینے میں شرابور دکھی انسانوں کے لئے اس میں تفنن طبع یا ہنگامی تسکین کا بہت کچھ سامان ہوتا ہے۔

دہ اوخکو پہ کے سترگے چا تہ واړومہ غم پہ زړہ د ننہ ځہ تیرہ وُم

اشک آگیں آنکھیں کس کی طرف پھیروں (کوئی ساتھی نہیں)۔ اس غم کو دل میں چھپا کر زندگی گذار رہا ہوں

هر نوے غم ځما میلمہ دی وېش کښې اول م پہ نامہ دی

ہر نیا غم میرا مہمان ہوتا ہے۔ غم کی تقسیم کے وقت پہلا نام میرا ہی تھا

پہ میلمستیا ئې د ہ تن ټوټې ورکومہ غم پہ زړہ د ننہ ځہ تیرہ وُمہ

اس (بن بلائے) مہمان کی مہمانی میرے تن کے ٹکڑے ہیں۔ اس غم کو دل میں چھپا کر زندگی گذار رہا ہوں

وتښتے ځما د ہ زړګی کورګیږہ ولې ئې تیول راتہ سورا د کړہ

اس نے میرے من کی دنیا اجاڑ دی۔ میرا سینہ دد بھر کر دیا

فکر کوم چہ طرف او تښتم غم پہ زړہ د ننہ ځہ تیر دم

سوچتا ہوں کہ کس طرف کو بھاگ جاؤں۔ اس غم کو دل میں چھپا کر زندگی گذار رہا ہوں

پہ کور کښې غم بہر م غم دی چہ چرتہ زم را سرہ سم دی

گھر پہ بھی یہی غم اور گھر سے باہر بھی یہی دکھڑا۔ جہاں جاتا ہوں۔ وہیں میرے ساتھ ہوتا ہے

یو تلے نوی چہ بل غم تہ غاړہ شم غم پہ زړہ د ننہ ځہ تیر وم

ایک غم ابھی بنے ہی کو ہوتا ہے کہ دوسرا گلے پڑ جاتا ہے۔ اور یہی غم دل میں چھپا کر زندگی گذار رہا ہوں

چار بیتہ :۔ یہ پشتو شاعری کی ایک قدیم صنف ہے۔ اسے صرف متقدمین یا متوسطین نے لکھا۔ متاخرین نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ پشتو کے ترقی پسند شعرا میں سے کسی نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی نہیں کی۔ حالانکہ یہ بہت ہی مرغوب صنف ہے۔ پٹھانوں کی ہنگامی اور تاریخی چیزیں اس صنف میں بہت ملتی ہیں جو عام طور پر لوگ ہر وقت گنگناتے رہتے ہیں۔

اس میں مصرعوں کی تعداد تین سے لے کر نو تک ہو سکتی ہے۔ اور پہلے تمام مصرعوں کو مطلع کہا جاتا ہے۔ مطلع کے بعد کے مصرعے مطلع کے مصرعوں کے برابر ہوتے ہیں۔ اور ان مصرعوں کے آخری مصرعے کو مطلع کے پہلے مصرعے پر گرہ لگوی جاتی ہے۔ دوسرا بند مطلع کے دوسرے مصرعے پر گرہ لگا کر ختم کیا جاتا ہے وعلٰی ہذا القیاس جب یہ لڑی پوری ہو جاتی ہے یعنی مطلع کے ہر مصرعے پر بند لگا دیا جاتا ہے۔ تو ایک "کڑی" پوری ہو جاتی ہے۔ کڑی پشتو میں اردو کے بند کے مفہوم میں استعمال ہو سکتی ہے۔

اس صنف کے استادوں کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے علاقہ خلیل کے اخوند نور الدین (اگرچہ امی تھے لیکن اخوند کہلاتے تھے) علاقہ مہمند کے صاحبزادہ سیف الرحمن۔ اور ادینہ والے صاحبزادہ غلام قادر کے نام قابل ذکر ہیں

اخوند نور الدین بلا کے پرگو تھے۔ فی البدیہہ کہنے میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ ان کے اکثر چار بیتے فی البدیہہ ہی موزوں ہوئے ہیں۔ اور بالخصوص یہ چار بیتہ:۔

دہ زلفو دوارہ سانگونہ دِ دہ مخہ کرہ چاپیرہ   جمال چہ شش کبن گورے

کوتے کے دو پنکھ (زلفیں) تمہارے چہرے کو ہالہ کئے ہوئے ہیں۔ اور تم حسن و جمال آئینے میں دیکھ رہی ہو

تابیا پہ سو لبانو د نداسہ مښلے دِ سِرہ   لیلے دہ خیالہ خورے

پھر تم نے سرخ ہونٹوں پر دنداسہ ملا ہے ۔ لیلے خیاباں خراماں جا رہی ہے

صاحبزادہ سیف الرحمن صاحب بازید خیل علاقہ مہمند ضلع پشاور میں سنہ ۱۸۶۹ء کے قریب پیدا ہوئے۔ اور ابھی تک بقید حیات ہیں۔ ان کے چار بیتوں میں تنوع بہت ہے۔

گرزم جدا زه م هر دم کبن د ه خارو سره وی!
میں تو اُن سے جُدا ہوں۔ لیکن میرا دل سدا اُس کے پاس رہتا ہے
د ه خدائے په درکبن م همیش لاس په دُعا نیولے
روصال کے لئے) ہمیشہ دست بدعا ہوں
گرزم جدا ستا په یاری کبن م طاعون شه جینئ
میں تم سے جُدا ہوں۔ اور تیری محبت نے مجھے طاعون میں مبتلا کر دیا
اے لڑکی (لڑکی سے تخاطب پشتو ماحول سے بغاوت کے مترادف
ہے۔ اس "بدعت" کو انہیں نے شروع کیا ہے)
د ه رب د ه پاره لگ په سترگو د ه کوم اوگوره
خدا کے لئے میری طرف ذرا نظرِ کرم سے دیکھ
سترگے م سپینے په ژړا حال م زبون شه جینئ
لڑکی! روتے روتے تو میری آنکھوں کا نور بہہ گیا ہے اب تو میرا حال بُرا ہے
یم زخمی والہ د ه سرو شونډو د ملهم اوگوره
میں تو زخمی ہو گیا ہوں (میرے زخموں پر) سرخ ہونٹوں کا پھاہا رکھ
ستا د ه فراقه م قد کوږ لکه د ه نون شه جینئ؟
تیرے فراق نے تو مجھے "ن" کی طرح خمیدہ کر دیا ہے
یمه زخمی والہ د ه سرو شونډو د ملهم اوگوره
ایسے ہجر کے بیمار کے لئے لب لعلین کا مرہم ڈھونڈ
کوم به ساعت وی چه صحبت به د ه ماه رُو سره وی
(میری آنکھیں ترس رہی ہیں) کب ماہ رو سے ملاقات ہو گی!
سوم په لاس کبن گل صنم له تا فدا نیولے
تجھ پر قربان کرنے کے لئے میں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھا ہوا ہے
صاحبزادہ غلام قادر صاحب کو فوت ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ مرحوم

او ینہ ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پشتو کو بڑی جدتیں بخشی ہیں۔ ان کا ایک مشہور چار بیتہ ہے :-

دہ دلبر بشرہ بہ کلہ خاطر ہیر شی — چہ بیلتون راتہ وھی پہ کہاڑی لاس
مجھ سے یار کا چہرہ بھلایا نہیں جا سکتا — جب کہ فراق چھری پر ہاتھ پھیر رہا ہے
نیک نظر بہ پہ ما کلہ دہ کل ھیر شی — عزرائیل راتہ وھی پہ ککوئی لاس
مجھ پر دلبر کی نظر کرم کب ہوگی ؟ — جب عزرائیل میرے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہوگا؟

دہ دلبر ښوم لیک دہ زړہ پہ سردے — مطالعہ ئکہ ملا کوم مدام پکښ
دلبر کی صورت میرے دل میں کھنچی ہوئی ہے — جیسے میں ملا کی طرح پڑھا کرتا ہوں
دغہ جیم خولہ ئی دہ میم خ دفتر دے — دا نزئی پوزہ بے شکہ الف لام پکښ
اس کی زلفیں ج منہ م اور چہرہ ایک کھلی کتاب ہے — ستواں ناک کو الف لام ہی سمجھئے
دہ تو د زي پہ دوز وکبن اثر دے — دہ صاد و نوشتہ ورلاندي هم مقام پکښ
اس کے ابرو میں ن کا اثر ہے — اس (ابرو) کے نیچے (ص) آنکھوں کا مقام ہے۔

یا بہ دا سبق خاطر ھر وکتن ہیر شی — یا بہ تادکرم دہ مینے دہ مرئی لاس
مکتب عشق کا یہ سبق یا تو میرے لئے زقوم بن جائیگا — اور یا پھر میں اپنی بانہیں اسکے گلے میں حائل کر دونگا
پہ مرئی کبن م دہ سرو گلو تو ھار دے — ئکہ تختہ دہ چندن ورودہ خوانی خما
میرے گلے میں سرخ پھولوں کا ہار ہے — صندل کی ٹہنی جیسی (نازک) میری جوانی ہے
تل سی ونہ پویکہ دی ظالم م پکار دے — ستا پہ شانے خلق دیر دی ارمانی خما
میرا باپ بڑا ظالم ہے۔ لوگوں کے سر کاٹا کرتا ہے — تیرے جیسے ان گنت لوگوں کو میری حسرت ہے

دہ سینے پہ منجروم تو بھار دے — پس لدرے کوہ پہ باغ کبن باغوانی خما
میرے سینے کے باغیچوں پر بہار ہے — اس کے بعد میرے باغ کی باغبانی کر
دہ زړکی زخم بہ ھلہ دي کو شیر شی — کہ دی پسے کرہ خما پہ ذکری لاس
تیرے دل کا زخم تب مندمل ہوگا — اگر تو میری نوکری شروع کرے

بدلہ :- یہ پشتو زبان کی سب سے قدیم صنف ہے۔ اس صنف کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ پشتو کا سارا لٹریچر بدلہ میں ہے۔ بدلہ مثنوی کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض لوگ ہر منظوم شئے پر اس کا اطلاق کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس کی ظاہری صورت سے عیاں ہے۔ بدلہ کا مطلب "بدلہ ہونا" ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دراصل یہ مثنوی کا دوسرا نام ہے۔ اور وہ لوگ جو اُسے دوسرے معنوں میں استعمال کرتے ہیں سراسر غلطی پر ہیں۔

یہ صنف پشتو کی رزمیہ اور بزمیہ ہر دو اقسام کی شاعری کی مکمل آئینہ دار ہے۔ مذہبی کتب مثلاً اسرار العارفین اور قصص الانبیاء۔ ناول یعنی ممتاز شہزادہ۔ لیلےٰ مجنوں آدم دُرخو۔ فتح خاں رابیا۔ جلات محبوبہ۔ جنگنامے مثلاً جنگ نامہ امام حسینؓ۔ جنگ نامہ حضرت علیؓ۔ جنگ نامہ امیر حمزہؓ۔ اور جنگ نامہ الوربے پاشا سب اسی صنف میں ہیں

اس صنف میں احمد جان کو کمال حاصل ہے۔ یہ بدلہ انہیں کا ہے:-

یو تر بله داړه خلق غولہ ول کړه
لوگ ایک دوسرے کو فریب دوستی دیا کرتے ہیں
لاس به درنه کړی کوهی ته غورزه دل کړه
کوئی تیری طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھائے گا بلکہ تجھے کنوئیں میں دھکیل دیگا
لاړه خولے دہ زړه یی یو ته وی دلبنده
اُن کی مُنہ اور دل کی بات میں تضاد ہوتا ہے؟
رور دہ رور په مرګ خوشحاله وی له ژونده
بھائی اپنے بھائی کی موت پر اُس کی زندگی سے زیادہ خوش ہوتا ہے
امان غواړه له دے دهر ده یارانو
اس زمانے کے دوستوں سے پناہ مانگو
احمد جانه په خوی زیات وی له مارانو
اے احمد جان! ان کی عادتیں سانپ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔

پہ شا بیړ تہ لکہ مار کوی گذار
یہ سانپ کی طرح منہ پھیر کر ڈستے ہیں
یت دښمن دے پہ ښکارہ بہ دِ دی یار
درپردہ دشمن ہوتے ہیں۔ اور ظاہراً دوستی کا دم بھرتے ھیں

●

نن ہم بیا پہ زړہ بلیګی اور د عشق
آج پھر میرے دل میں عشق کی آگ بھڑک رہی ہے
ځکہ خیژی ہم لہ خولے نہ شور د عشق
اس لئے تو آج میرے منہ سے چیخیں نکل رہی ھیں
اور د مینے ہم د زړہ لپسے بلیګی
محبت کی آگ میرے دل میں سلگ رہی ہے
لکہ کب د زړہ پہ وینو کبن تکیګی
میرا دل مچھلی کی طرح اپنے خون میں ہی تلا جارہا ہے
کبرجن اشنا مِ نہ کوی پښتنہ
مغرور دوست یہ نہیں پوچھتا
وے شور فریاد کوی پہ زړہ دردمنہ
کہ اے دردمند دل رکھنے والے۔ کیوں فریاد کرتا ہے
د یار مینے رانہ شرم حیا یوړہ
دوست کی محبت نے مجھ سے شرم و حیا چھین لیا ہے
د اوبو پہ سري اوچہ کیاہ یوړہ
جیسے پانی سوکھی گھاس کو بہا لے جاتا ہے؟
خبر نہ یم چہ پہ څہ گناہ م نیسی
معلوم نہیں مجھے کس گناہ کی سزا دی جارہی ہے

چہ پہ اورم ورتہ وی دہ سترگو کسی

کہ میری آنکھوں کی پتلیوں کو بھونا جا رہا ہے

چونکہ پٹھانوں کی جبلی انفرادیت یعنی عسکریت ان کی زندگی کے ہر پہلو پر غالب ہے، اس لئے ملا مقصود کا وہ مشہور جنگی چار بیتہ جو انہوں نے انگریزوں کی چترال پر فوج کشی کے وقت کہا تھا۔ نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے یہ چار بیتہ گلی کوچوں۔ حجروں اور چوپالوں پر گایا جاتا تھا۔ اگرچہ اب اس کی جگہ نئے چار بیتوں نے لے لی ہے۔ تاہم پرانے لوگ اب بھی کبھی کبھی اس زمانے کو یاد کر لیتے ہیں

انگریزو بیا ترپلے لام دینہ　　ښنگہ جنگونہ پہ چترال کوی
انگریز نے لام بندی شروع کر دی ہے　　دیکھو چترال پر کیسی لڑائیاں لڑ رہا ہے
پروت پہ درگئی ورتہ گودام دینہ　　اخلی سوات دہ بنیر خیال کوی
درگئی کو میگزین بنا دیا گیا ہے　　سوات پر قبضہ کرنے کے بعد بنیر پر چڑھائی کا خیال ہے،
انگریزو بیا جمع لښکر کڑہ نہ　　حیران پہ فکر کښی دوب لاڑ ملا ځمہ
انگریزوں نے لشکر کو پھر سے جمع کیا ہے　　اسی فکر میں حیران ہوں
پہ مالاکنڈ ی حکم ورکڑہ نہ　　تل دہ اسلام دے بہ دا ملا ځمہ
مالاکنڈ پر (چڑھائی کا) حکم دے دیا گیا ہے　　میں تو ہمیشہ اسلام کی فتح کے لئے دعا کرونگا
غازیانو دا سر مال وسی کڑہ نہ　　غنچے تر ږیږوی تہ بہ ژاړم ځمہ
غازیوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے　　غنچے بکھر رہے ہیں میں کیونکر رو دوں
دہ شہادت عالی مقام دے　　مخ ی رنڑا لکہ مشال کوی
شہادت کا مقام نہایت اعلے ہے　　(غازیوں کے) چہرے مشعل کی طرح روشن ہیں

پھر کہتا ہے:-

دہ باجوړ پہ حال آگاہ یمہ ځمہ　　عمرا خان داؤ تر کابلہ کوہ
مجھے اہل باجوڑ کی حالت کا پتہ ہے　　(کہ) عمرا خان کابل کی سمت بھاگ رہا تھا
پہ بہادرانو کښی ی نہ شتا یمہ ځمہ　　چہ زور ی نہ وو نسا دی شملہ کوہ
میں اسے (عمرا خان کو) بہادر نہیں کہہ سکتا　　(کیونکہ جب اس میں مقابلہ کی طاقت نہیں تو فرار کیوں ہوا تھا)

رحمت په بنار بت خیله وایمه شه سري کړه داؤ جنګ ي پخپله کړ
تبٹ خیل کے شہر پر رحمت ہو سر کی بازی لگا دی۔اور خود لڑے

اللہ ہو:۔ ان سب اصناف کے علاوہ ایک اور صنف اللہ ہو بھی ہے جسے اردو میں لوری کہتے ہیں۔ یہی ایک چیز ہے۔جو تقریباً سارے پٹھانوں میں تھوڑے تغیر کے ساتھ متداول ہے۔اور درحقیقت پشتو لوک گیت کی اصلی شکل یہی صنف ہے

اللہ ھو شه اللہ ھو څما ځانه اللہ ھو
سو جا۔ میری جان۔ سو جا۔ اللہ ہو
څما بچے واسے اوده دے مکه پنهٔ ده پتا سو اللہ ھو
میرا بچہ ایسے سویا ہے۔ جیسے بتاشوں کا ڈھیر (بغیر حرکت) ہو اللہ ہو
په کوزه چنه مه راځه پـه بره چـنـه درو
نچلی منزل کی طرف نہ آؤ۔ اوپر کی منڈیر کی سمت آہستہ سے جاؤ
په دے لارے مه راځئ غلو۔ اللہ ھو
اس راستے سے مت آؤ۔ اسے چورو۔ اللہ ہو
اللہ ھو شه اللہ ھو۔ څما ځانه اللہ ھو
سو جا میری جان۔ سو جا۔ اللہ ہو
للے۔ للے۔ للے۔ للو۔ اللہ ھو
سو جا۔ سو جا۔ پیارے۔ سو جا۔ اللہ ہو
پلار دِ تلے دے پـه جنګ
تیرا باپ میدان جنگ میں لڑنے کے لئے گیا ہے
بنـد تیره توره تـه څنګ
اچھی تیز تلوار کمر میں لٹکا کر!
سر به د ننګ په نوم ورکړي
اپنی ناموس کی خاطر اپنا سر دے دے گا

پہ وطن راغے ھنیر نلٹ
کیونکہ وطن پر فرنگی نے چڑھائی کی ہے
اللہ ھوشہ، اللہ ھو، ځما جانہ اللہ ھو
سوجا - میری جان - سوجا

سرخپوش تحریک کے رسالہ "پختون" میں لوریوں کا مقابلہ ہوا تھا۔ جو عورتوں نے لکھی تھیں۔ ایک خاتون سیدہ قرۃ العین نے اسی سلسلہ میں ایک لوری لکھی تھی اس لوری میں پٹھان کی فطرت کو سمویا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے مثبت جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ لوری یہ ہے۔

اللہ ھوشہ اللہ ھو	سوجا - میری جان - سوجا
تہ نوسے يې دہ خالدؓ	تو خالدؓ کا پوتا ہے
غزنوی دِ ھسے والہ	تیری نسل غزنوی سے ہے
ولے زړہ لرے جامں	(پھر) تیرا دل کیوں جامد ہے
اللہ ھوشہ اللہ ھو	سوجا ——— سوجا
تہ ځلمے شہ دہ کرنلٹ	تو شاہسوار بن
لہ دښمن ادج کړے ځنلٹ	دشمن سے منہ نہ پھیر
ملک نہ لرے کړہ فیرنلٹ	انگریزوں کو ملک سے نکال دو
اللہ ھوشہ اللہ ھو	سوجا ——— سوجا

نصراللہ خاں نصر

ریاستیں

پاکستان کے شمال مغربی صوبے میں پانچ ریاستیں ہیں۔ یہ ریاستیں تین قسم کی ہیں۔ کہستانی، نیم کہستانی اور میدانی — ان میں بعض تو اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان ریاستوں کی تاریخ اپنے دامن پر خون کے نقش و نگار لئے ہوئے ہے۔ ان کے چپے چپے اور گوشے گوشے میں خونیں داستانیں تاریخ کی چادر تانے سو رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لکھنے والے کا قلم جب ان مقامات سے گزرتا ہے۔ تو خون میں شرابور ہوتا ہے اس لئے اگر قارئین کو ان ریاستوں کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت آگ آتش اور خون کے مناظر دکھائی دیں۔ تو انہیں تعجب نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ تاریخی حقائق کو کسی طرح چھپایا نہیں جا سکتا۔

سوات

سوات صوبہ سرحد میں سرسبز شاداب کوہستانی ریاست ہے۔ اس کے بعض پہاڑوں کی بلندی سطح سمندر سے دس ہزار فٹ ہے۔ اس کا رقبہ چار ہزار مربع میل ہے۔ ریاست سوات کے شمال کی طرف چترال، جنوب کی طرف ضلع مردان، مغرب کی طرف دیر اور مشرق کی طرف دریائے سندھ اور ریاست امب ہے۔

سوات کا خطہ تین حصوں میں منقسم ہے (۱) کوہستان سوات (۲) اپر سوات (۳) اور

اور سوات ۔

سوات کے باشندوں کے بارے میں سب سے پہلے آرین مورخوں نے قلم فرسائی کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۳۲۶ قبل مسیح میں جب سکندرِ اعظم افغانستان کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے گیا تو اس وقت سوات ۔ بونیر، جندول اور باجوڑ کے باشندے بدھ مذہب کے پیرو تھے ۔ سکندرِ اعظم کے حملے کے بعد ۳۰۴ قبل مسیح میں جب سکندرِ اعظم کے مشہور جرنیل سیلوکس نے ہندوستان پر دوبارہ حملہ کیا تو اس نے دریائے سندھ کے اس پار مفتوحہ علاقے جن میں سوات، بونیر وغیرہ کے علاقے بھی شامل تھے ۔ ہندوستان کے راجہ چندر گپتا کے حوالے کر دیئے چندر گپتا نے ان علاقوں کے باشندوں کو پوری طرح سے مذہبی آزادی دے دی ۔ ۴۰۳ء میں چینی سیاح فاہیان ہندوکش سے ہوتا ہوا سوات پہنچا وہ اس خطہ میں کافی عرصہ تک رہا ۔ اس نے اپنے سفرنامے میں سوات بونیر وغیرہ خطوں کے باشندوں کا مذہب بدھ لکھا ہے اور پانچسو خانقاہوں کی وجود اس سرزمین میں تسلیم کیا ہے ۔

۵۱۹ء میں چینی سیاح سنگ یون کافرستان سے ہوتا ہوا سوات کے خطے میں وارد ہوا ۔ اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے ۔ کہ سوات کے خطے میں بدھ مذہب عروج پر ہے رات کے وقت خانقاہوں میں اتنی کثرت سے گھنٹیاں بجتی ہیں جس سے تمام فضا گونج اٹھتی ہے ۔ دریائے سوات (سوتو پرتو) کے کنارے بہت سی خانقاہیں ہیں ۔ سوات سرسبز اور شاداب ہے ۔ یہاں کے باشندوں کا گزارہ کھیتی باڑی پر ہے ۔

۶۳۰ء میں چین کا مشہور سیاح ہیون سانگ کابل سے ہوتا ہوا سوات آیا ۔ اس نے اپنے سفرنامے میں سوات کے باشندوں کے مذہب کے بارے میں لکھا ہے ۔ کہ سوات میں بدھ مذہب زوال پر ہے ۔ سوتو پرتو (دریائے سوات) کے کنارے چودہ ہزار خانقاہیں برباد یا غیر آباد ہو گئی ہیں ۔ یہاں کے باشندوں کے اخلاق کے بارے میں لکھا ہے ۔ کہ اس خطہ کے باشندے ملنسار اور محنتی ہیں چینی سیاحوں میں آخری سیاح وکنگ تھا ۔ جو ۷۵۲ء میں سوات آیا ۔ اور سوات کی ایک خانقاہ میں راہب بن گیا ۔ اس نے سوات کے بارے میں

جو کچھ بھی لکھا ہے ۔ وہ ہیون سانگ کی تصدیق کرتا ہے ۔

گیارھویں صدی کے آغاز میں جب محمود غزنوی نے افغانوں کے لشکر کی کمک سے ہندوستان پر حملے شروع کئے تو افغانوں کے لشکر کے سردار پیر خوشحال بابا نے ان مفتوحہ (سوات بونیر وغیرہ) علاقوں میں تبلیغ اسلام کی مہم شروع کی ۔

پیر خوشحال بابا نے سوات کے غیر مسلم بادشاہ گیبر کو شکست فاش دی ۔ اور سوات میں اسلامی سلطنت کا قیام کیا ۔ ان کا مزار دریائے سوات کے مشرقی کنارے رعدی گرام میں موجود ہے ۔ پیر خوشحال بابا کی رحلت کے کچھ عرصہ بعد یہاں کے اکثر باشندوں نے ہندو اور بدھ مذہب اختیار کیا ۔ اور جو بدستور مسلمان رہے ۔ انہوں نے ضلع ہزارہ کی طرف ہجرت کی ۔

سولویں صدی عیسوی کے آغاز میں افغانوں نے سوات پر دوبارہ حملہ کیا ۔ یہاں کے اکثر باشندوں کو ان خطوں سے نکالا ۔ اور جنہوں نے اسلام قبول کیا ۔ ان کو یہاں رہنے دیا ۔ یوسف زئی اتمان خیل قبیلے بیچکوڑہ اور سوات میں آباد ہوئے ۔ گگیانی اور ترکانی قبیلے باجوڑ ۔ دیر اور جندول میں بسنے لگے ۔ ان سب قبیلوں نے متفقہ طور پر یوسف زئی قبیلے کے سردار شاہ منصور کو تمام قبیلوں کا سردار منتخب کیا ۔

شیخ ملی نے ان تمام فاتح قبیلوں کے تقسیم اراضیات "ویش" کے لئے پشتو نثر میں ایک کتاب لکھی جو دفتر شیخ ملی کے نام سے مشہور ہوئی ۔ ان افغان قبیلوں نے مفتوحہ سرزمین میں تبلیغ اسلام کی اور بہت سی عبادت گاہیں تعمیر کرائیں ۔

۱۵۱۶ء میں جب بابر افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے جا رہا تھا ۔ راستے میں اس نے ان قبیلوں کے سردار شاہ منصور کی بیٹی سے ڈپلومیٹک شادی کی اور یوسف زئی قبیلوں کے جرار لشکر کو ہمراہ لے کر ہندوستان کو فتح کیا ۔

بابر کے مرنے کے بعد مغل بادشاہ ہمایوں نے سوات کو بزور شمشیر فتح کرنا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا ۔

شاہ منصور کے انتقال کے بعد بایزید انصاری پیر روشن نے وزیرستان تیراہ پشاور دیر ۔ بونیر اور سوات میں مذہبی رنگ میں اقتدار حاصل کیا ۔ اس نے اپنے مریدوں کا باقاعدہ

لشکر بنایا۔ لشکر کے اخراجات پورا کرنے کے لئے بیت المال بنایا۔ اپنے مریدوں سے باقاعدہ عشر زکاۃ وغیرہ لے کر اس بیت المال میں جمع کرتا تھا۔ اس نے پشتو زبان میں ایک منشور لکھا جس کا نام خیر البیان تھا۔ اس کتاب میں زیادہ تر اس کے عقاید تھے۔

ہندوستان کے مغل بادشاہ اکبر اعظم نے جب سلطنت کی خاطر نیا مشرب دین الٰہی کے نام سے بنایا۔ تو بایزید روشن نے اکبر کے خلاف پراپیگنڈا شروع کیا۔ اسی طرح ہندوستان کے مشہور عالم ملا محمد یزدی نے جو جونپور کے قاضی تھے سنہ ۱۵۸۰ء میں اکبر کے خلاف جہاد کا فتوےٰ دیا۔

۱۵۸۵ء میں جب اکبر اعظم کی فوج مان سنگھ کی سرکردگی میں کابل جا رہی تھی۔ اس وقت دریائے سندھ اور کابل کے درمیان کے خطوں کے قبائلی اکبر کے سخت خلاف ہو گئے تھے جب شاہی لشکر پشاور پہنچ گیا۔ تو یوسف زئی اور مندڑ نے بیلوا سے دریائے کابل کے شمالی طرف سے اور بایزید روشن نے دریائے سندھ کے مغرب کی جانب سے شاہی قافلہ اور لشکر پر حملہ کیا۔ اس حملے میں شاہی لشکر اور قافلے کے آٹھ ہزار افراد مجروح اور زخمی ہوئے اور ان کا مال و اسباب قبائلی لوٹ کر لے گئے۔

بایزید کی زندگی میں سید علی ترمذی عرف "پیر بابا" بونیر آئے۔ اور "باجا کلی" میں ڈیرا ڈالا۔ اور تبلیغ اسلام شروع کی۔ ہزاروں کی تعداد میں اس خطہ کے باشندوں نے انہیں اپنا مرشد بنایا۔ ان کے مریدوں میں اخون درویزہ بابا کا نام قابل ذکر ہے۔ بایزید پیر روشن اور اخون درویزہ بابا کے درمیان مذہبی اختلاف رونما ہوا۔ انہوں نے بایزید پیر روشن اور اس کے مریدوں پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ پیر روشن کو پیر تاریکی کا لقب دیا۔ اور اخون درویزہ کے مرید بایزید پیر روشن کو پیر تاریک کہنے لگے۔

پیر تاریک (بایزید پیر روشن) اور اخون درویزہ بابا کے درمیان کافی مذہبی مباحثے ہوئے۔ ایک دفعہ اخون درویزہ اور سید علی ترمذی مع مریدوں کے پیر تاریک کے ساتھ مناظرے کے لئے ہشت نگر میں جمع ہوئے۔ ان کا آپس میں کافی مباحثہ ہوا۔ چونکہ پیر تاریک اپنے آپ کو سچا مسلمان سمجھتا تھا۔ اس لئے اپنے عقائد پر ڈٹا رہا۔ اخون درویزہ اور پیر

تاریک کے مریدوں کے درمیان اکثر خون ریز لڑائیاں ہوتی تھیں۔

۱۵۸۵ء کے آخر میں جب پیر روشن تیراہ چلا گیا۔ اکبر کے صوبیدار محسن خاں نے کابل کی طرف سے بایزید پیر روشن پر فوج کشی کی۔ پیر روشن نے مغل لشکر کا مقابلہ کیا۔ لڑائی کے دوران میں وہ بیمار ہو گیا۔ بیماری کی حالت میں تیراہ سے بھاگ کر بونیر چلا گیا۔ اور وہیں انتقال کیا۔ بایزید کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا جلالہ اپنے باپ کے مریدوں کا مرشد بن گیا اور مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ ۱۵۸۶ء میں اکبر اعظم نے زین خان اور بیربل کی سرکردگی میں ایک جرار فوج یوسف زئی کی مہم پر بھیجی۔ اکبر کے لشکر نے بونیر پر حملہ کیا۔ اس حملہ میں شاہی فوج کو سوات۔ بونیر کے یوسف زئی قبیلوں اور جلالہ نے شکست فاش دی۔ اکبر کا مشہور درباری بیربل بھاگتا ہوا مارا گیا۔ اس کے علاوہ آٹھ ہزار سپاہی قتل ہوئے۔ اکبر کے بعد جہانگیر اور شاہجہان دونوں مغل بادشاہوں نے حکمت عملی سے کام لیا۔ انہوں نے دریائے سندھ کے اس پار قبیلوں کے درمیان بے اتفاقی پیدا کی۔ انہوں نے یوسف زئی قبیلوں کے مقابلہ میں خٹک قبیلہ کو طاقتور بنایا۔ خٹک قبیلہ نے مغل بادشاہوں کی اطاعت قبول کی۔ اس قبیلے کے سردار مغلوں کے منصب دار ہوئے اور بوقت ضرورت مغلوں کے لئے یوسف زئیوں کے خلاف لڑتے بھی رہے۔

اورنگ زیب کے عہد سے لے کر ۱۷۴۸ء تک سوات بونیر اور باجوڑ کا علاقہ مکمل طور سے آزاد رہے اور اپنے دستور کے مطابق زندگی بسر کرتے رہے۔

۱۷۴۹ء میں جب افغانستان کا بادشاہ احمد شاہ درانی افغانستان سے پنجاب فتح کرنے کی غرض سے پنجاب جا رہا تھا۔ تو سوات۔ بونیر وغیرہ خطوں کے قبیلوں نے اپنی مرضی سے احمد شاہ درانی کی بیعت کی۔ اور جنگ میں ان کے ساتھ شامل ہوئے۔

۱۸۲۳ء میں جب سردار عظیم خاں گورنر کشمیر نے سکھوں پر حملہ کیا تو یوسف زئی قبیلوں کے لشکر نے درانی لشکر کی معیت میں اس کا ساتھ دیا۔

اس جنگ کے بعد امیر دوست محمد خاں کے بھائیوں کے درمیان کابل کے تخت کے سلسلے میں کشمکش پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے کشمیر اور پشاور پر سکھ قابض ہو گئے۔

یوسف زی قبیلے کابل کے سرداروں سے بدظن ہوکر خود مختار ہو گئے۔ اور سکھوں کے خلاف صف آرا رہے۔ درانیوں کے چلے جانے کے بعد وادی پشاور میں مرحوم سید احمد بریلوی برسرِ اقتدار آ گئے۔ انہوں نے سکھوں کے خلاف لڑائی کا اعلان کیا۔ پشاور اور مردان میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں ان کے حلقۂ ارادت میں آ گئے۔ انہوں نے اپنے مریدوں کا باقاعدہ لشکر بنایا اور سکھوں پر بڑے زور و شور سے حملے شروع کر دیئے۔ یوسف زی قوم کا لشکر سید احمد بریلوی کے ساتھ مل گیا۔ لیکن بدقسمتی سے سید احمد بریلوی اور ان کے مذہبی عقائد میں اختلاف کی وجہ سے سوات کے قبیلوں نے سید احمد بریلوی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان کے متعلق یہ مشہور ہو گیا کہ وہ وہابی ہیں۔ سید احمد بریلوی کے شہید ہونے کے بعد سوات اور بونیر میں اخون صاحب کا تسلط ہو گیا۔ اخون صاحب کا اصلی نام عبدالغفور تھا۔ اور افغان قوم کے مہمند صافی قبیلے سے تھے۔

سنہ ۱۸۳۹ء میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ مر گیا تو سکھوں پر یکدم زوال آنا شروع ہوا ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ سوات پر حملہ کر سکتے۔

سنہ ۱۸۴۹ء میں جب سکھا شاہی ختم ہو گئی۔ اور انگریز قابض ہو گئے۔ تو سوات کی اُتمان خیل قوم نے انگریزوں پر حملہ کیا۔

سنہ ۱۸۵۲ء میں اتمان خیل اور سوات کے "رانیزی زی" قبیلوں نے درہ مالاکنڈ سے انگریزوں پر دوبارہ حملہ کیا۔ اس حملہ کا جواب انگریزوں نے سختی سے دیا۔ جس کی تاب سوات کا لشکر نہ لا سکا۔

سنہ ۱۸۶۳ء میں اخون صاحب سوات نے سوات اور بونیر کے باشندوں کے مشورے سے ستھانہ کے رئیس سید اکبر شاہ کو سوات کا بادشاہ بنایا۔ اسی سال اخون صاحب نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ کونڑ۔ باجوڑ۔ دیر۔ جندول۔ بونیر اور سوات کے لشکر اخون صاحب کے نشان کے تلے جمع ہو گئے اور انگریزوں پر حملہ کر دیا گیا۔ انگریزوں نے بونیر پر لشکر کشی کی۔ بونیر میں امبیلہ کے مقام پر انگریزی فوج اور مجاہدین کے لشکر کے درمیان بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ جنگ کے بعد انگریز امبیلہ سے واپس آ گئے۔ یہ جنگ امبیلہ کیمپین

۱۸۶۳ء کے نام سے مشہور ہوئی۔

۱۸۶۶ء میں اتمان خیل قبیلہ نے انگریزی سرحدات پر حملہ کیا۔

۱۸۷۷ء میں اخون صاحب فوت ہوئے ان کے دو بیٹے رہ گئے۔ ایک کا نام عبدالحنان میاں گل اور دوسرے کا عبدالخالق میاں گل تھا یہ دونوں بھائی میاں گلان (میاں گلان) کے نام سے مشہور ہوئے۔ اخون صاحب کی رحلت کے بعد سوات۔ بونیر۔ دیر اور جندول میں سخت بدامنی پھیل گئی۔ بدقسمتی سے اخون صاحب کے بیٹوں کے درمیان بھی اختلاف ہو گیا اور آپس کے اختلاف کی وجہ سے انکا اقتدار کم ہو گیا۔ اس انتشار و تفرقی کے زمانے میں ۱۸۷۷ء میں اتمان خیل اور سوات کے "رانیزی زی" قبیلوں نے انگریزی سرحد پر حملہ کیا۔ لیکن ناکامی ہوئی۔

جندول کے خان عمرا خاں نے میاں گل کے لشکر کو اپنے ساتھ ملا کر دیر کے خان پر حملہ پر حملہ کیا اور تمام دیر پر قابض ہو گیا۔

سوات کا ملک خوانین اور ملکوں میں منقسم ہو گیا۔ ہر ایک خان اور ملک اپنے آپ کو بادشاہ تصور کرتا تھا۔

۱۸۹۵ء میں جب انگریزی فوج چترال کی مہم پر دیر کے راستے جا رہی تھی تو دیر کے خان عمرا خان نے انگریزی فوج پر حملہ کیا سوات کے قبیلوں کے لشکر بھی عمرا خاں کی امداد کے لئے آئے۔ لیکن فوراً انگریزوں نے عمرا خاں اور سوات کے قبیلوں کے ملکوں اور خوانین کے ساتھ صلح کی گفت و شنید شروع کر دی۔

۱۸۹۷ء میں میاں گل اور سرتور فقیر (مستان ملا) نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا نعرہ لگایا سوات کے تمام قبیلے سرتور فقیر کے نشان کے تلے جمع ہو کر چکدرہ اور مالاکنڈ پر حملہ آور ہوئے۔ انگریزی فوج ان کے مقابلہ کے لئے مالاکنڈ آگئی۔ مجاہدین نے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ لیکن مقابلہ کی تاب نہ لا کر پسپا ہو گئے۔ اور صلح کر لی۔ اس جہاد کے بعد اخون صاحب کے دونو بیٹے عبدالحنان میاں گل اور عبدالخالق میاں گل فوت ہو گئے۔ انہوں نے دو بیٹے چھوڑے عبدالحنان میاں گل کا بڑا بیٹا ۱۹۰۳ء میں اور چھوٹا بیٹا ۱۹۰۷ء میں قتل کر دیا گیا

عبدالخالق میاں گل کے دونوں بیٹے عبدالودود گل شہزادہ اور شیریں شہزادہ زندہ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ان دونوں بھائیوں کی آپس میں سخت دشمنی پیدا ہوگئی اور ان کی بے اتفاقی کی وجہ سے ان کا اقتدار کم ہوگیا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جب ترکوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو مسلمان انگریزوں کے خلاف ہوگئے۔ ہندوستان میں مولانا سیف الرحمٰن الکوزی نے ترکوں کے حق میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا مولانا محمود الحسن شیخ الہند نے اس کی تائید کی صوبہ سرحد میں حاجی صاحب ترنگزی (فضل واحد) نے بھی انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ جب سرحدکی حکومت انہیں گرفتار کرنے لگی۔ تو حاجی صاحب مع سیف الرحمٰن الکوزی ناوگئی آت بونیر پہنچ گئے ۔ انہوں نے بونیر میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا پروپیگنڈا شروع کیا۔

۱۹۱۴ء کے آخر میں انگریزوں نے بونیر پہ فوج کشی کی۔ بونیر اور سوات کے لشکر حاجی صاحب ترنگزئی کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔

حکیم محمد اسلم سنجری مولانا عبدالعزیز آف اتمان زی اور مولانا سیف الرحمٰن الکوزی نے مجاہدین کے لشکر کو منظم کیا اور سرکاوری کے مقام پہ انگریزی فوج کے ساتھ، ۲ دن تک ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ آخر کار انگریزی فوج بونیر سے واپس آگئی اور مجاہدین کا لشکر منتشر ہوگیا۔

۱۹۱۵ء میں سوات کے قبیلے سنڈاکے ملا (کوہستانی ملا) کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے "سنڈاکے ملا" صاحب نے سوات کے قبیلوں کے مشورے سے ستھانہ کے رئیس سید عبدالجبار شاہ کو سوات کا بادشاہ بنایا۔ اور سب نے اپنے بادشاہ کی بیعت کی سید عبدالجبار شاہ بادشاہ نے سوات کے تمام قبیلوں کا جرگہ سیدو شریف میں بلایا ۔ اس جرگہ کے صلاح اور مشورے سے سوات کے لئے ایک نظام تامرتب کیا۔ اور سنڈاکے ملا صاحب کو ریاست سوات کا قاضی القضاۃ بنایا۔ سنڈاکے ملا صاحب نے جب اپنا عہدہ سنبھالا تو اُس نے اُسی سال انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کردیا سوات۔ بونیر وغیرہ کے قبیلوں نے لبیک کہا۔ اور سب اس کے ساتھ شریک جہاد ہوگئے۔ مجاہدین نے چکدرہ اور مالاکنڈ پر حملہ کیا صوبہ سرحد کے چیف کمشنر روس کیپل مع اپنی فوج کے مجاہدین کے لشکر کے مقابلہ کے لئے خود مالاکنڈ گئے۔ مجاہدین نے جوانمردی

سے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ لیکن آخر میں رسد کی کمی کی وجہ سے پسپا ہو گئے۔ اور سر ڈین کیمپل نے سوات کے قبیلوں کی ناکہ بندی کر دی

۱۹۱۶ء میں نواب دیر نے انگریزوں کے ایما پر سوات پر حملہ کیا۔ دیر والے سوات کو پار کر کے سوات کے بہت سے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن آخر میں سید عبدالجبار شاہ بادشاہ نے دیر کے نواب صاحب کو بندر شمشیر نیچا دکھایا۔ اس فتح کے بعد سید عبدالجبار شاہ صاحب نے عبدالودود گل شہزادہ میاں گل اور شیریں شہزادہ میاں گل دونوں کو سوات میں دوبارہ لبسایا۔ ان دونوں بھائیوں کو گزر اوقات کے لئے کافی زمین سوات میں دے دی۔

۱۹۱۷ء میں سید عبدالجبار شاہ بادشاہ سے سوات کے قبیلے مذہبی عقائد کے اختلاف کی بنا پر ناراض ہو گئے۔ انہوں نے سنڈا کے ملا صاحب کے مشورے سے سید عبدالجبار شاہ بادشاہ کو سوات کے تخت سے اتارا اور اخون صاحب کے پوتے عبدالودود گل شہزادہ میاں گل کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا۔ اور سید عبدالجبار شاہ کو بہ عزت و احترام سوات سے ستھانہ پہنچایا۔

عبدالودود گل شہزادہ میاں گل صاحب نے سنڈا کے ملا صاحب کی وساطت سے تمام سوات پر اپنا سکہ جمایا۔

اگست ۱۹۱۸ء میں نواب دیر نے سوات پر حملہ کیا۔ بادشاہ صاحب میاں گل نے دیر کے لشکر کے مقابلہ کے لئے اپنے بھائی شیریں شہزادہ میاں گل کو بھیجا۔ شیریں شہزادہ نے دیر کے لشکر پر بڑی بہادری سے حملہ کیا۔ لیکن خود قتل ہو گئے۔ شیریں شہزادہ کے شہید ہونے کے بعد سوات اور باجوڑ کے لوگوں کا غصہ نواب دیر کے خلاف حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اور سوات کے لشکر میں جوق در جوق شامل ہونے لگے۔

۱۹۱۹ء میں نواب دیر کے لشکر کو بادشاہ صاحب میاں گل نے سخت شکست دی اور نواب دیر کے علاقہ ادینزئی کے نصف حصہ پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۲۲ء میں انگریزی حکومت نے بادشاہ صاحب میاں گل اور نواب دیر کے درمیان صلح کرائی۔ اور ادینزئی کا علاقہ نواب دیر کو واپس دلایا۔

۱۹۲۳ء میں بادشاہ صاحب میاں گل نے بونیر اور چکسر پر قبضہ کر لیا۔ اور مفتوحہ علاقوں کی خوب تنظیم کی۔ اور مکمل طور سے امن قائم کیا۔

مارچ ۱۹۲۶ء میں حکومت ہند نے بادشاہ صاحب میاں گل کو والئی سوات تسلیم کیا۔

۳ مئی ۱۹۲۶ء کو چیف کمشنر صوبہ سرحد نے سیدو میں دربار منعقد کیا۔ اس دربار میں بادشاہ صاحب عبدالودود گل شہزادہ میاں گل کے فرمان روائے سوات ہونے کا اعلان کیا۔ اور دس ہزار روپیہ سالانہ الاؤنس مقرر کیا۔ بادشاہ صاحب نے حلف وفاداری کی رسم ادا کی۔

۱۹۲۶ء میں اعلیٰ حضرت عبدالودود میاں گل بادشاہ صاحب کو انگریزوں نے کے۔ بی۔ ای کا خطاب دیا۔ اس رسم کے ادا کرنے کے لئے ہندوستان کا وائسرائے لارڈ ارون خود سوات آیا۔ ریاست سوات میں صدیوں سے تقسیم اراضیات (ویش) کا جو دستور چلا آرہا تھا۔ اُسے یکدم موقوف کر دیا گیا۔ ریاست سوات کی سرزمین پر جہاں جہاں بھی لوگ قابض تھے۔ ان کو ان اراضی کا مالک تصور کیا گیا۔

سیدو شریف ریاست کا پایہ تخت ہے۔ یہاں ایک ہسپتال اور ایک ہائی سکول ہے۔ ریاست کے دوسرے مقامات پر پرائمری سکول بھی ہیں۔ مینگورہ۔ بڑینگل۔ گاگرا۔ ڈگر اور سیدو شریف میں ریاست کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے عالی شان عمارتیں بنائی گئی ہیں۔

ریاست کا طرز حکومت جمہوری نہیں بلکہ شخصی ہے۔ ولی عہد عبدالحق جہان زیب خاں کو اگرچہ ریاست کا مدارالمہام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہر معاملہ کا مشورہ بادشاہ صاحب میاں گل سے لیا جاتا ہے۔ اور آخری فیصلہ کا اختیار اسی کو ہوتا ہے۔ مجلس مشاورت عامہ میں ریاست سوات کے با اثر افراد کو رکھا گیا ہے۔ جن کی تعداد ایک سو بیس ہے۔ اس کے علاوہ ایک مجلس مشاورت خاص بھی ہے۔ اس مجلس میں بادشاہ صاحب میاں گل ولی عہد اور ریاست کے چند اُمرا شامل ہیں۔ ریاست سوات میں اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن دیوانی اور فوجداری مقدمات کے فیصلوں کے لئے فتویٰ ضروریہ کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ علمائے کرام شیلیفون پر عالی سوات اور ولی عہد سے اُلجھے ہوئے معاملات کے متعلق رائے لے لیتے ہیں۔

سوات کی آبادی مذہباً مسلمان ہے۔ جو اہل سنت والجماعت کہلاتے ہیں۔ ریاست میں تجارت کی مشہور منڈی منگورہ ہے۔ ریاست کی اپنی تربیت یافتہ فوج ہے۔ دفتری زبان اور ریاست کی عام بول چال پشتو ہے۔

۱۹۴۷ء میں عبدالودود گل شہزادہ والئی سوات نے کالام کے علاقہ پر فوج کشی کی اور اس علاقہ کو فتح کرکے ریاست سوات سے ملحق کر لیا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد ریاست سوات کا پاکستان سے الحاق کر دیا گیا

۱۹۴۸ء میں ریاست سوات میں سٹیٹ مسلم لیگ سوات کی تحریک شیر افضل اور محمد افضل نے شروع کی۔ لیکن وہ پنپ نہ سکی۔ دوسری کسی آزاد تحریک کے لئے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ حکام اسے برداشت نہیں کرتے اور سختی سے کچل دیتے ہیں۔ ریاست کی کل آبادی پانچ لاکھ ہے۔ آمدنی جو مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ ہوتی ہے پچاس لاکھ ہے۔

سات لوئر مڈل۔ ستائیس پرائمری سکولیں۔ ایک زنانہ اور ایک مردانہ ہسپتال ہے۔

پیداوار میں گندم۔ جوار۔ جو۔ چاول وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سوات کے باغات بہترین میوں کیلئے مشہور ہیں۔ جو بڑی کثرت سے ہوتے ہیں۔

دیر

ریاست دیر کا پورا نام دیر۔ سوات۔ جندول ہے۔ ریاست دیر یہ کوہستانی ملک ہے۔ اس کے مشرقی جانب دریائے سوات شمال مشرق کی طرف گلگت اور کشمیر شمالاً۔ چترال۔ شمال مغرب کی سمت افغانستان مغرب کی طرف باجوڑ اور جنوب میں مالاکنڈ ہے۔

دیر میں ہندوکش کا بلند ترین سلسلہ کوہ ہے۔

ریاست دیر کا رقبہ تین ہزار مربع میل ہے۔

دریائے پنجکوڑہ اور دریائے سوات دیر کے مشہور دریا ہیں جو چالس پلد کی جھیل سے نکلتے ہیں۔

ریاست دیر کی کل آبادی چھ لاکھ پچہتر ہزار ہے۔

ریاست دیر کے قدیم باشندے بدھ مذہب کے پیرو تھے۔

سولھویں صدی عیسوی میں جب افغانوں نے اس ملک پر حملہ کیا اور یہاں کے ان باشندوں کو اس ملک سے نکالا۔ اور جو باقی بچے انہیں مسلمان کیا اور ترکلانی اور یوسف زئی قبیلے دیر کی سرزمین میں آباد ہوئے۔

ریاست دیر کے حکمران ملا الیاسؒ کے خاندان سے ہیں۔ جو اخون بابا کے نام سے مشہور تھا۔ اخون بابا یوسف زئی قبیلہ پائندہ خیل سے تھا۔ دیر میں اس کی شہرت سترھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ اس کی اولاد میں غلام خاں پہلا شخص تھا جس نے دیر میں طاقت حاصل کی۔

۱۸۴۹ء میں جب انگریز پشاور مردان وغیرہ اضلاع پر قابض ہوئے تو رحمت اللہ خاں دیر میں برسر اقتدار خان تھا۔

۱۸۸۴ء میں رحمت اللہ خاں کے فوت ہونے کے بعد محمد شریف خاں باپ کی جگہ مسند پر بیٹھا۔

جندول کا خان عمرا خان جو کہ بہادر دلیر اور طاقتور تھا۔ اس نے محمد شریف خاں پر ۱۸۹۰ء میں حملہ کیا۔ محمد شریف خاں کو شکست دی عمرا خان دیر پر قابض ہوا۔

۱۸۹۵ء میں جب انگریزی فوج چترال ریلیف پر چترال جا رہی تھی۔ تو دیر کے خان عمرا خاں نے انگریزی فوج کو راستے میں روک رکھا۔ محمد شریف خاں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ محمد شریف خاں کے لشکر اور انگریزی فوج نے مل کر عمرا خاں کے لشکر کو شکست دی۔

انگریزی فوج نے مددش کو فتح کیا اور چترال پہنچ گئی۔ اس خدمت کے صلہ میں انگریزوں نے محمد شریف خاں کو خان آف دیر بنایا۔ محمد شریف خاں نے انگریزوں سے معاہدہ کیا۔ کہ میں چترال روڈ اور ڈاک کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں گا۔ ٹیلیگراف کے ستونوں پوسٹ آفس کمیونیکیشن کا خاطر خواہ تحفظ کروں گا۔ اور دیر سے جو سڑک چترال کو جاتی ہے۔ اس پر انگریزی حکومت کا جو مال گزرے گا۔ اس کا محصول وغیرہ نہیں لوں گا۔

اس معاہدے کے صلے میں انگریزوں نے محمد شریف خاں کو دس ہزار روپیہ سالانہ دینا منظور کیا۔ اور چار سو بندوقیں مع کارتوسوں کے انعام میں دیں۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں نواب اپنی ریاست کے حدود دریائے سوات کے دائیں کنارے پر وسیع کرنے کی غرض سے سوات پر حملہ آور ہوا۔ سوات کے بادشاہ میاں گل صاحب نے نواب دیر کے لشکر کے مقابلہ کے لئے سواتیوں کی فوج بھیجی۔ نواب دیر کو سخت شکست ہوئی۔ اور اس کے پانچسو آدمی مارے گئے۔ بادشاہ صاحب میاں گل نواب دیر کے علاقہ ادینزی کے نصف حصہ پر قابض ہو گیا۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے سوات کے بادشاہ میاں گل صاحب کی مرضی سے ادینزئی کا علاقہ نواب دیر کے حوالے کیا۔

فروری سنہ ۱۹۲۵ء میں نواب دیر اورنگ زیب خاں فوت ہو گیا۔

نواب دیر کے مرجانے کے بعد شاہجہان خان اور عالم زیب خاں دونوں بھائیوں کے درمیان دیر کی نوابی پر تنازعہ پیدا ہو گیا۔ عالم زیب خاں کی پشت پر سوات کا بادشاہ میاں گل صاحب اللہ خاں آف خار تھے۔ عالم زیب خاں نے نواب دیر پر حملہ کر دیا۔ شاہجہان خان نے عالم زیب خاں کو شکست دی۔ آخر انگریزی حکومت نے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دی۔ شاہجہان خاں کو خان آف دیر تسلیم کیا۔ عالم زیب خاں کے لئے پانچسو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ اور وہ ریاست دیر سے باہر باجوڑ میں پناہ گزین ہوا۔

۱۲ مئی سنہ ۱۹۲۵ء کو گورنمنٹ آف انڈیا نے شاہجہان خاں کو نوابی کا خطاب دیا چکدرہ میں چیف کمشنر صوبہ سرحد نے نوابی کی رسم ادا کرنے کے بعد نواب دیر کو پندرہ ہزار روپیہ بطور خلعت عطا کیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں جب صوبہ سرحد میں سرخپوش تحریک شروع ہوئی۔ تو نواب دیر نے انگریزوں کا ساتھ د ... اور اپنی ریاست میں سرخپوش تحریک کو قطعاً نہ پھیلنے دیا۔ یہاں چند ایک تاریخی راستے ہیں ایک راستہ (سڑک) مالاکنڈ۔ چکدرہ سے نکل کر ریاست دیر سے ہوتا ہوا لوری پہاڑ کی برفانی چوٹی سے ہو کر چترال پہنچتا ہے۔ اس راستے پر مالاکنڈ سے لوری تک موٹر لاری آسانی سے چل سکتی ہے۔ دوسرا راستہ پنجکوڑہ اور

گوسم ٹاگ سے ہوکر رود بار باجوڑ کے کنارے کنارے باجوڑ پہنچتا ہے اور باجوڑ سے آزاد قبائل کے علاقہ مہمند کو جا نکلتا ہے۔ یہی راستہ جب تورہ غنڈری کے ساتھ بمقام منڈہ گھوم جاتا ہے۔ تو کالٹ اور شاہی سے ہوکر آسمار افغانستان پہنچتا ہے۔ ریاست دیر کی آب و ہوا عام طور سے صحت بخش ہے۔ موسم سرما میں پہاڑوں پر برف گرنے کی وجہ سے معمول سے سردی زیادہ ہوتی ہے۔

ریاست میں ملازمت اور زمینداری دو مشہور پیشے ہیں۔ لڑنے کا پیشہ انہیں وراثت میں ملا ہے۔ یہ دشمن کے مورچوں پر چڑھ دوڑنے میں زیادہ مشہور ہیں۔

طرز حکومت شخصی ہے۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات قاضی القضاۃ اور قاضی شریعت کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ ہر ایک فیصلہ نواب دیر کی منظوری سے ہوتا ہے۔

ریاست کے تمام باشندے سنی مسلمان ہیں۔

ریاست میں باقاعدہ فوج کم ہے۔ چونکہ ریاست دیر کے باشندے بندوق چلانے اور لڑائی لڑنے کی تربیت بچپن سے گھروں میں حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے جب نواب دیر کو فوج کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو ریاست کے باشندوں کو لشکری بنا لیا جاتا ہے۔ ریاست کے لشکر کے عہدہ داروں کے لئے حوالدار، جمعدار، صوبیدار، کمان افسر اور سپہ سالار وغیرہ عہدے مقرر ہیں۔

ریاست دیر میں ایک اسلحہ خانہ ہے جس میں بندوق توپ اور کارتوس مشینی آلات سے تیار کئے جاتے ہیں۔

ریاست میں تجارت کی مشہور منڈی دیر ہے۔ ہر ملک کے تاجر یہاں آکر خرید و فروخت کرتے ہیں۔ ریاست دیر سے گھی، اون، کمبل، پٹی، اخروٹ اور لکڑی برآمد ہوتے ہیں۔

مکئی، جوار، چاول اور گندم کے علاوہ جڑی بوٹیوں میں عناب، بنفشہ، ریوند چینی، مامیرہ کی پیداوار بکثرت ہے۔

ریاست میں ایک بجلی گھر ہے۔ ریاست کے اہم مقامات پر پختہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ اور ٹیلیفون کا سلسلہ ہر ایک تحصیل اور قلعے تک قائم ہے۔

نواب دیر کے دو بیٹے ہیں - ولی عہد کا نام محمد شاہ خان خسرو ہے - اور دوسرے کا نام محمد شہاب الدین خان ہے۔

۱۹۳۹ء میں جب انگریزوں نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا - تو نواب دیر نے انگریزوں کا ساتھ دیا جنگ کے دوران میں کئی دفعہ انگریزوں کو ہزاروں روپیہ چندہ دیا۔ اور دیر کے سینکڑوں آدمی انگریزی فوج میں بھرتی ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں نواب دیر نے پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔

۴۸-۱۹۴۷ء کی جنگ کشمیر میں نواب دیر نے بھی اپنا لشکر کشمیر بھیجا - جسے نوشہرہ کے محاذ پر متعین کیا گیا تھا۔

چترال

ریاست چترال صوبہ سرحد کے شمال میں واقع ہے - اس کی مغربی سرحد افغانستان سے ملی ہوئی ہے - جو ۲۵۰ میل لمبی ہے - شمالی سرحد سوویٹ روس سے اور جنوبی ریاست دیر سے ملحق ہے - ریاست چترال لوھاری درہ کی چوٹی سے لے کر کوہ ہندوکش کے جنوب تک پھیلی ہوئی ہے - اس کا دوسرا نام قاشقار بھی ہے - ریاست چترال کا رقبہ چار ہزار مربع میل ہے - اور آبادی ایک لاکھ بیس ہزار ہے - ریاست کا دارالخلافہ بھی چترال ہے - جو تجارت کا بہت بڑا مرکز ہے۔

چترال کے پہاڑ پاکستان کے بلند ترین پہاڑوں میں شمار ہوتے ہیں جن پر سردیوں میں کافی برف پڑتی ہے۔

اس خطہ کے قدیم باشندے ہندوستانی نسل بدھ مذہب کے پیرو تھے - سکندر اعظم کے حملہ کے زمانہ میں چترال کی سرزمین بدھ مذہب کا مرکز تھی۔

سولھویں صدی عیسوی میں افغانوں نے اس ملک پر قبضہ کر لیا - اور تبلیغ کرکے تمام باشندوں کو اسلام کی تعلیم دی - چترال کے قدیم باشندے اب بھی چترال میں معمولی سی تعداد میں ہیں - جو خو کے نام سے مشہور ہیں - ان کی زبان کو کھوار کہتے ہیں - اور

باقی کافرستان چلے گئے۔ جو اب بھی کافرستان میں بستے ہیں چترال کے موجودہ حکمران اپنے آپ کو امیر تیمور کے اولاد سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کا مورث اعلیٰ ایوب بابا سترھویں صدی عیسوی میں چترال آکر آباد ہو گیا تھا۔ اور چترال کے حکمران ریاس کی نوکری اختیار کر لی تھی۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں چترال چین کا ماتحت تھا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایوب بابا کی اولاد میں سے محترم شاہ دشاہ کٹور، چترال کے خطہ کا حاکم یعنی مہتر بنا۔ ۱۸۷۸ء میں چترال کے مہتر امین الملک نے افغانستان کے حملے کے ڈر سے اپنے آپ کو کشمیر کا باجگذار بنایا۔ حکومت ہندوستان نے ان کے معاہدہ پر مہر ثبت کی۔

۱۸۸۵ء میں لوخارٹ مشن چترال گیا۔ ۱۸۸۹ء میں انگریزی حکومت نے ہندوستانی گورنمنٹ کی طرف سے ایک پولیٹیکل ایجنٹ گلگت میں مقرر کیا۔ اور مہتر چترال کو امدادی معاوضہ دینا شروع کیا۔

۱۸۹۱ء میں امین الملک نے انگریزی حکومت کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کی رُو سے سڑکے کی وفلاح اور بیرونی پالیسی کے معاملات میں انگریزی حکومت کے مشورے پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ انگریزوں کی حکومت نے امین الملک کے امدادی فنڈ کو اور بھی بڑھا دیا۔

۱۸۹۲ء میں شیر افضل نے اپنے بھتیجے افضل الملک کو قتل کر دیا۔ ۱۸۹۲ء میں امین الملک اچانک مر گیا۔ امین الملک کے بیٹوں کے درمیان چترال کے تخت پر کشمکش شروع ہوئی۔ تخت کے کئی دعویدار بن گئے۔ معاملہ نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ان دعویداروں نے آپس میں بڑی خون ریز لڑائیاں لڑیں۔ انگریزی حکومت نے امین الملک کے بڑے بیٹے نظام الملک کو چترال کے تخت کا مستحق سمجھ کر اُسے مہتر چترال تسلیم کیا۔ نظام الملک نے شیر افضل کو جلا وطن کر دیا۔ چونکہ نظام الملک چترال کے باشندوں اور اپنے بھائیوں کی مرضی سے مہتر چترال نہیں بنا تھا اس لئے اس کے بھائی امیر الملک نے چترال کے باشندوں کے مشورے سے ۱۸۹۵ء میں قتل کر دیا۔ نظام الملک کے بھائی شجاع الملک نے ضلع شاہ کٹور میں مہتر چترال ہونے کا اعلان کیا۔ اور انگریزوں کے

ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کئے۔

اس بدامنی کے زمانے میں جبکہ افغانستان اور ہندوستان کے درمیان حدبندی کا سلسلہ جاری تھا۔ افغانستان کی فوجیں زمان خاں گگی خیل آفریدی کی سرکردگی میں چترال کی وادی میں مقیم تھیں۔ امیر کابل امیر عبدالرحمٰن خاں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر شجاع الملک کے پناہ گزین بھائی شیر افضل خاں کو آلہ کار بنایا۔ شیر افضل خاں موقعہ کی تلاش میں تھا۔ اُس نے امیر کابل سے فوجی کمک لے کر چترال کا رُخ کیا۔ جندول کے خان عمرا خاں اور دیر کے خان نے بھی شیر افضل خاں کا ساتھ دیا۔

شیر افضل خاں اور عمرا خاں کے لشکر نے چترال کے قلعہ اور گلگت میں انگریزی فوج کو محصور کیا۔ گلگت کا پولیٹیکل ایجنٹ رابرٹسن (جو بعد میں جارج رابرٹسن کے نام سے مشہور ہوا) مع اپنے ۵۴۳ سپاہیوں کے گلگت میں مقابلہ کرتا رہا۔

۴ مارچ ۱۸۹۵ء کو انگریزی حکومت نے چترال ریلیف کی مہم شروع کی۔ شجاع الملک نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ چترال ریلیف فورس کا ایک دستہ جو پندرہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا ملاکنڈ کے راستے چترال پہنچا۔ اور دوسرا دستہ جو کہ ۲ توپوں، ۲۲ پوانیرز اور چھ سو سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ کرنل کیلی کی سرکردگی میں کشمیر کی جانب سے درہ شندور اور مستوج سے ہوتا ہوا چترال پہنچا۔ اُونچے پہاڑوں پر گزرنے کی وجہ سے جن کی اونچائی ۱۲۲۳۰ فٹ تھی۔ چترال ریلیف فورس کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

۲۰ اپریل ۱۸۹۵ء کو چترال فتح ہوا۔ شیر افضل خاں نے اطاعت قبول کی۔ ریاست چترال کا نظم و نسق انگریزی حکومت نے اپنے قبضہ میں رکھا۔ چترال میں ایک کمپنی بنگالی سپرمینا ایک سیکشن توپخانہ اور دو ہندوستانی پلٹنیں متعین کر دیں۔ اور شجاع الملک کو مہتر چترال تسلیم کر لیا گیا۔

۱۹۱۴ء میں "خوش وقت" ضلع کا نظام جو ۱۸۹۶ء سے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ چترال کے قبضہ میں تھا سیکرٹری آف سٹیٹ نے مہتر چترال کے حوالے کر دیا۔

۱۰ مئی ۱۹۱۶ء کو پولیٹیکل ایجنٹ نے چترال دربار میں سرکاری طور سے باقاعدہ اعلان

کیا کہ چترال میں خوش وقت ضلع کا نظم و نسق مہتر چترال کے سپرد کیا

۱۹۱۶ء کے اخیر میں اس خطہ کے باشندوں نے مہتر چترال کی حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرے شروع کئے۔ لیکن مہتر چترال نے انہیں دبا دیا۔ ۱۹۱۹ء میں افغانستان کی جنگ کے دوران میں جب کہ افغانستان کی فوج اور قبائلیوں نے چترال کے علاقہ میں ارندو پر قبضہ کیا۔ تو مہتر چترال نے اپنے باڈی گارڈ چترال سکاؤٹ اور انگریزی فوج کی مدد سے افغانستان کا قلعہ بیرکوٹ فتح کر لیا۔ اس خدمت کے عوض میں انگریزی حکومت نے مہتر چترال کو نسلاً بعد نسلاً ہز ہائی نس کا خطاب عطا کیا۔ توپ کے اا گولوں کی سلامی کا اعزاز دیا گیا۔ اور ایک لاکھ روپیہ نقد انعام ملا

۱۸۹۹ء میں انگریزوں نے چترال میں صرف ایک ہندوستانی پلٹن رہنے دی۔ اور باقی تمام فوج کو ہندوستان واپس بلا لیا۔ چترال میں ایک سو دس "چترالی لیویز" کے سپاہیوں کو لواری درہ کی چوٹی تک حفاظت کے لئے مقرر کیا۔ اس لیویز کے اخراجات حکومت ہند نے اپنے ذمے لئے۔ اس کے علاوہ چترال سکاؤٹس کی بنیاد رکھی جس میں سپاہیوں کی تعداد ۹۸۹ تھی۔ مہتر چترال کو چترال سکاؤٹ کا اعزازی کمانڈنٹ مقرر کیا گیا۔

۱۹۰۳ء میں دہلی دربار تاجپوشی کی رسم کے موقعہ پر انگریزی حکومت نے کمپینین آف برٹش ایمپائر کا خطاب دیا۔

جنوری ۱۹۱۹ء میں مہتر چترال کو کے۔ سی۔ آئی کا خطاب ملا۔

۱۹۳۶ء میں ہز ہائی نس شجاع الملک نے وفات پائی۔

شجاع الملک کے بعد ان کے بڑے لڑکے محمد ناصر الملک ۱۹۳۶ء میں مسند پر بیٹھے۔

محمد ناصر الملک ۹ دسمبر ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ازاں بعد اسلامیہ کالج پشاور میں داخل ہوئے ۱۹۲۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی ملے کیا۔

۱۹۳۶ء میں مہتر چترال شجاع الملک انگریزی حکومت نے ناصر الملک کو مہتر چترال تسلیم کر لیا۔

مظفرالملک سلطان و ذیابیطس کی مزمن بیماریوں کے عرصہ سے شکار تھے چنانچہ انہیں عارضوں سے ۷ جنوری ۱۹۴۹ء کو انتقال کر گئے ۔

مظفرالملک کے بعد شہزادہ سیف الرحمن مہتر چترال بنائے گئے ۔ شہزادہ سیف الرحمن شہزادہ سیف الرحمن ۱۳ مارچ ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم چترال میں حاصل کی ۔ ۱۹۴۲ء میں اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور میں داخل ہوئے ۔ میٹرک کا امتحان اسلامیہ کالجیٹ سکول میں دیا ۔ لیکن ناکام ہوئے ۔ اس کے بعد فوجی تربیت حاصل کرنے کے لیے کوہ کول چلے گئے ۔ اس تعلیم کے دوران میں آپ والد ہز ہائی نس مظفرالملک کے اچانک فوت ہونے کی وجہ سے چترال آ گئے ۔ ۲۱ جنوری ۱۹۴۹ء کو مالاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ محمد شریف خان نے سرکاری طور پر ولی عہد سیف الرحمن کی دستار بندی کی رسم ادا کی ۔ اور حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں مہتر چترال تسلیم کیا گیا ۔

ریاست چترال کو زمانہ قدیم سے سیاسی اہمیت حاصل ہے ۔ وسط ایشیا کی جنگجو اقوام اکثر ریاست چترال سے ہو کر ہندوستان پر حملہ آور ہوتی رہیں ۔ سکندر اعظم بھی چترال سے ہو کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا ۔ چین کی حکومت نے ہندوستان فتح کرنے کی غرض سے چترال فتح کیا تھا ۔

چترال کی سرزمین کوہستانی ہے ۔ اس میں میدانی علاقے بہت کم ہیں اس لئے چترال میں زراعت کے لئے بہت کم گنجائش ہے ۔ یہاں کے پہاڑوں میں دیودار کے جنگلات پائے جاتے ہیں ۔

چترال کے باشندے بارش کو پسند نہیں کرتے ۔ ان لوگوں کو بارش بجائے فائدہ کے نقصان پہنچاتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چترال کے پہاڑ بہت بلند اور عمودی ہیں ۔ جب اس کے پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے ۔ تو پہاڑوں کی چوٹی سے جب پانی پہاڑ کے دامن کو آتا ہے ۔ تو وہ اتنی تیزی سے گرتا ہے ۔ کہ اپنے ساتھ اونچائی سے پتھر بھی بہا لاتا ہے جس کی وجہ سے مکان اور قابل کاشت

زمینیں تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

چترال کو دو راستے جاتے ہیں۔ ایک پہاڑی راستہ گلگت کی طرف سے جو سطح سمندر سے ۱۲۲۳۰ فٹ اونچا ہے۔ دوسرا مالاکنڈ سے ہو کر باجوڑ اور دیر سے ہوتا ہوا لواری کی چوٹی سے اتر کر چترال پہنچتا ہے۔ یہ پہاڑی راستہ گلگت کے راستے کی نسبت آسان ہے۔

چترال کے شہر سے ۲ میل کے فاصلے پر ایک گرم چشمہ ہے جس سے گندھک کا ابلتا ہوا پانی نکلتا ہے۔ یہ پانی اتنا گرم ہوتا ہے۔ کہ اگر اس میں پانچ منٹ تک انڈا رکھا جائے تو وہ خود بخود ابل جاتا ہے۔ اس پانی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگر اس پانی کو ٹھنڈا کر کے اس سے غسل کیا جائے تو خارش وغیرہ کی بیماریوں کے لئے تریاق کا کام دیتا ہے۔

چترال سے اونی چغے۔ جرابیں۔ پٹی۔ ٹوپیاں۔ کمبل۔ دیودار کی لکڑی۔ معدنی پتھر گھوڑے اور شکاری پرندے باز وغیرہ برآمد ہوتے ہیں۔ اور ان کی تجارت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔

ریاست چترال میں شخصی حکومت ہے۔ مقدمات کے فیصلے شریعت اسلامیہ کی رو سے ہوتے ہیں۔ ریاست کی دفتری زبان فارسی ہے۔ اور ریاست کے باشندے چترالی زبان بولتے ہیں۔ چترالی زبان میں فارسی اور پشتو کے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ اسکولوں میں درسی طور پر فارسی اور اردو رائج ہے۔

امب

امب سرسبز اور پہاڑی ریاست ہے۔ اس کے بعض پہاڑوں کی بلندی سطح سمندر سے سات ہزار فٹ ہے۔ اس کا رقبہ دو سو پچیس مربع میل ہے۔ ریاست امب ضلع ہزارہ میں واقع ہے۔ اس کے مغرب کی طرف۔ اکازئی۔ حیدن۔ مدازئی اور مدہ خیل آزاد قبائل کے پہاڑ ہیں۔ شمال مشرق کی طرف تحصیل مانسہرہ اور شمال مغرب کی طرف یاغستان ہے جن میں حسن زئی۔ نصرت خیل۔ لبی خیل۔ اکازئی اور سوستی

بستے ہیں جنوب کی طرف تحصیل ایبٹ آباد ہے۔

ریاست امب کے باشندے افغان ہیں جو تناولی قوم کے نام سے مشہور ہیں۔ تناولی قوم کے مورث اعلیٰ زمانہ قدیم میں افغانستان کے درہ نانال سے گئے تھے جب وہ اس خطہ (ریاست امب) میں مستقل طور پر بسنے لگے۔ تو رفتہ رفتہ تناولی قوم کے نام سے مشہور ہوئے۔

تمام تناولی قوم کی آبادی ایک لاکھ ہے۔ لیکن وہ لوگ جو خاص ریاست امب میں آباد ہیں۔ ان کی تعداد پچاس ہزار ہے۔ تناولی قوم کے چار مشہور قبیلے ہیں۔ (۱) پلال (۲) ہندوال (۳) لابیال (۴) بیتال۔

پلال اور ہندوال قبیلے اکثر برسر اقتدار رہے۔ ان دونوں قبیلوں کی آپس میں سرداری پر اکثر لڑائیاں اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اور جو بھی برسر اقتدار آجائے۔ ساری قوم کا سردار کہلاتا ہے۔

۱۷۴۳ء میں زبردست خاں قبیلہ پلال سے تناولی قوم کا سردار بنا یہ بہت ملنسار اور مدبر انسان تھا۔ ۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ درانی افغانستان سے کشمیر کے راستہ ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے جا رہا تھا۔ تو دوران سفر میں مظفر آباد کے نزدیک زبردست خاں معہ اپنے سواروں کے احمد شاہ درانی کے حضور میں حاضر ہوا۔ کورنش بجالانے کے بعد جنگ میں شامل ہونے کی التجا کی۔ احمد شاہ درانی نے اس کی درخواست منظور کر لی۔ درانی لشکر کے ساتھ زبردست خاں مع اپنے سواروں کے ہندوستان پہنچا۔ اور وہاں بڑی تندہی سے لڑا۔ دہلی کے فتح ہونے کے بعد جب احمد شاہ درانی افغانستان واپس جا رہا تھا۔ تو زبردست خاں کو بارہ ہزار روپے کی جاگیر اور صوبہ خاں کا خطاب دیا۔ اور نقارہ، نشان اور فرمان شاہی مرحمت فرما کر اسے رخصت کیا۔ زبردست خاں نے تناول آکر مکمل طور سے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔

جہاں داد خان کے زمانے میں سکھ . . . .

جرنیل افغانوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ لاہور دربار کا نظام تلپٹ ہو چکا تھا۔ سکھ فوج باغی ہو چکی تھی۔ اس زریں موقعہ سے جہاں داد خان نے فائدہ اٹھایا اُس نے اپنی ریاست کی حدود وسیع کیں۔ . . . .

. . . . . . اور ریاست کے لئے نظام نامہ بنایا۔ اور تناولی قوم میں قوم پرستی کا جذبہ پختہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "تناولی قوم" ایک خطہ میں ایک باپ کے بیٹوں کی طرح بسنے لگی۔

سکھا شاہی کے بعد ۱۸۴۹ء میں جب انگریز پنجاب اور صوبہ سرحد پر قابض ہو گئے۔ نوجہانداد خان نے از روئے سیاست انگریزوں سے بجائے دشمنی کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جہانداد خان اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ضلع ہزارہ کے حاکم میجر ایبٹ صاحب کے ساتھ قلعہ شیروان میں معاہدہ ہوا۔

۱۸۵۶ء میں جہانداد خان کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے محمد اکرم خاں کو کم سنی کی عمر میں تناولی قوم کا سردار بنایا گیا۔

نواب محمد اکرم خاں جب سن بلوغت کو پہنچے تو انہوں نے ریاست امب کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

محمد اکرم خاں کمال درجہ کا سیاست دان اور موقعہ شناس ثابت ہوا۔ اس نے ملک میں تجارت کا سلسلہ قائم کیا اور کہا کہ تناولی قوم صرف زراعت سے متمول اور آسودہ حال نہیں ہو سکتی۔ دربند میں ایک تجارتی منڈی کھولی گئی۔ اور خود نمک کی تجارت کرنے لگا۔ نیز اپنی قوم کو تجارت کی ترغیب دی اور تجار کو ہر قسم کی سہولتیں بہنچائیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دربند یاغستان میں تجارت کی مشہور منڈی بن گیا۔

محمد اکرم خاں نے ریاست امب کے باشندوں کو جمع کیا۔ اور انہیں سمجھایا کہ ریاست امب کی سرزمین تناولی قوم کی ہے۔ ہمیں کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ لینا چاہئے جس کے ذریعہ سے ریاست امب کا خطہ ہمیشہ کے لئے ایک رہے اور ٹکڑوں میں منقسم نہ ہو۔

نواب محمد اکرم خاں نے جب دیکھا۔ کہ اب سرحد میں مسلمانوں کی طاقت دن بدن

کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں کے مسلمان اس قابل نہیں رہے۔ کہ انگریزوں سے بزور شمشیر حکومت چھین لیں۔ اس حالت میں انگریزوں سے لڑنا سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں۔ نواب نے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات اور بھی خوشگوار کر دیے۔ اور ریاست امب کو مکمل طور پر انگریزی حکومت سے وابستہ کر دیا۔

۱۸۸۸ء میں جب ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر ایبٹ صاحب کو قبائل کے لشکر نے اوگی قلعہ میں محصور کیا۔ تو نواب محمد اکرم خاں نے قبائل کے لشکر کو منتشر کیا۔ اور ایبٹ صاحب کو نجات دلائی۔ انگریزی حکومت نے اس کے صلے میں محمد اکرم خاں کو کے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا اور پانچ ہزار روپے ماہوار پنشن مقرر کی۔

۱۹۰۷ء میں نواب محمد اکرم خاں کا انتقال ہونے کے بعد اس کا بیٹا خان زمان خاں مسند نشین ہوا۔ انگریزی حکومت نے خان زمان خاں کو نواب تسلیم کر لیا۔ خان زمان خاں نے ریاست کے نظم و نسق کو قائم رکھا۔ دربند اور شیر گڑھ میں مساجد بنوائیں مستحق لوگوں کے لئے وظائف مقرر کئے۔ ریاست کے ذہین طالب علموں کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ریاست کے خرچ پر ہندوستان کے مشہور اسلامی مدارس کو بھیجنے کا انتظام کیا۔ اور جنگلات بڑھانے کے ذرائع مہیا کئے۔

ملک بوستان نے نواب خان زمان خاں کے خلاف ریاست میں بغاوت کی۔ اور علاقہ کھن میں جو کہ ریاست کا زرخیز علاقہ ہے۔ اپنی نوابی کا اعلان کر دیا۔ لیکن خان زمان خاں نے ہفتہ عشرہ میں اس بغاوت کو فرو کر دیا۔ اور بوستان خاں کو جیل میں ڈال دیا۔

۱۹۲۰ء میں جب کوہ سیاہ کے آزاد قبائل نے اوگی قلعہ پر دھاوا بولا۔ اور فوج کا اسلحہ اور بارود لوٹ کر لے گئے۔ تو نواب خان زمان خاں نے انگریزی حکومت کے کہنے پر بڑی حکمت عملی سے تمام اسلحہ وغیرہ آزاد قبائل سے واپس منگوا لیا۔ اور ان کے لشکر کو منتشر کر دیا۔ اس خدمت کے صلے میں نواب خان زمان خاں کو نسلاً بعد نسلاً نوابی کا خطاب دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک ہزار تین سو مارٹن ہندوقیں ایک لاکھ کارتوس اور ایک لاکھ روپے انعام ملا اور پندرہ ہزار روپے سالانہ الاونس مقرر ہوا۔

نواب خان زمان خاں نے اپنے بیٹے محمد فرید خاں کو ولی عہد مقرر کیا۔ اور انگریزی حکومت کو اطلاع دے دی۔ لیکن بعد میں نواب خان زمان خاں کو خود غرض لوگوں نے ورغلایا اور ولی عہد محمد فرید خاں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ انگریزوں نے محمد فرید خاں کو تین سال ہنگو میں زیر حراست رکھا۔ سید مبارک شاہ علی گوہر خاں سواتی اور محمد عباس خاں آف بیدڑہ۔ ہنگو میں محمد فرید خاں کی نگرانی اور حفاظت کرتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں اس جلا وطنی کے زمانہ میں محمد فرید خاں کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام محمد سعید خاں رکھا گیا۔

فروری ۱۹۳۶ء میں جب نواب خان زمان خاں نے وفات پائی۔ تو انگریزی حکومت نے محمد فرید خاں کو تخت امب کا وارث قرار دیا۔

نواب محمد فرید خاں بڑے تزک و احتشام سے تین سال کی جلاوطنی کے بعد ریاست امب میں داخل ہوا۔ اور ریاست کے ''رمائی دارالخلافہ دربند میں ریاست امب کی باگ ڈور باضابطہ طور سے اپنے ہاتھ میں لی۔

نواب محمد فرید خاں نے دربند اور شیر گڑھ میں ہسپتال بنائے۔ دربند میں مویشیوں کے علاج کے لئے ایک سلوتری رکھا۔ ریاست میں جدید طرز کے مدارس کھولے جن میں پشتو زبان کی پڑھائی کا انتظام خاص طور سے کیا گیا اور اُردو کو عدالتی زبان قرار دیا۔

دربند کو ٹیلیفون کے ذریعہ ہری پور ٹیلیفون ایکسچینج کے ساتھ مربوط کیا۔ ریاست کے مہمانوں کے لئے دربند اور شیر گڑھ میں اعلیٰ پیمانہ پر رئیس خانے بنائے۔

دربند میں دریائے سندھ کے کنارے خوبصورت اور عالی شان محلات تعمیر کر دئے جس کا نام فرید آباد رکھا۔

ریاست میں شخصی حکومت ہے۔ نواب محمد فرید خاں کا ایک پرسنل سکرٹری محمد اسلم خاں اور ایک پولٹیکل ایڈمنسٹریٹر ماناطالع محمد ہے۔ ان کے علاوہ سید مبارک شاہ اور علی گوہر خاں سواتی اور سید عبدالجبار شاہ ان کے خاص مشیر ہیں۔ اور ریاست کے اہم مسئلوں میں اپنے چچوں اور چچازاد بھائیوں سے اکثر نواب صاحب رائے لیتے ہیں۔

ریاست میں فیصلے اسلامی شریعت کے مطابق ہوتے ہیں۔ ریاست میں ایک قاضی القضاۃ ہے جو امب میں رہتا ہے۔ ان کے ماتحت ریاست میں قاضی مقرر کئے گئے ہیں۔ دربند اور شیر گڑھ میں مجسٹریٹ ہیں۔ ان کے علاوہ ایک افسر مال اور ایک مشیر مال ہے۔

دربند اور امب میں کپڑا بننے کی کھڈیاں نواب صاحب ہی نے لگوائی ہیں۔ اور امب کے جیل خانے میں بندوق اور توپیں بنانے کا کارخانہ بھی بنوایا۔

ریاست میں باقاعدہ فوج کا انتظام ہے۔ فوج کے افسر اعلیٰ کو سپہ سالار کہتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں نواب محمد فرید خاں کو سر کا خطاب ملا۔

۱۹۴۶ء میں ملا فضل الرحمٰن آف بگوائی نے اصلاحات کے لئے تحریک شروع کی۔ نواب صاحب کے سپاہیوں نے ان کے جلوس پر حملہ کیا۔ اور جلوس کو منتشر کیا۔ اور فضل الرحمٰن اور اس کے ساتھیوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔

۱۹۴۶ء میں سر نواب محمد فرید خاں نے صوبہ سرحد کے گورنر سر جارج کننگھم کے ایما پر آزاد قبائل کے خان سالار خاں پر حملہ کر دیا۔ نواب صاحب کے لشکر کی کمان نوابزادہ محمد عمر خاں کر رہے تھے۔ سالار خان مقابلہ کرنے کے بعد سوات چلا گیا اور اس کا علاقہ سیرائے پر نواب صاحب کی فوج قابض ہو گئی۔ نواب امب نے سیرائے کا علاقہ غلام محمد خاں کو واپس دلایا۔ کیونکہ نواب صاحب اسے سیرائے کے علاقہ کا مستحق سمجھتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں سر نواب محمد فرید خاں کے چچا زاد بھائی عالم زیب خاں نے ریاست امب سٹیٹ مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اور خود اس تحریک کے صدر بنے۔ چونکہ یہ قدم عالم زیب خاں نے نواب صاحب کے صلاح اور مشورے کے بغیر اٹھایا تھا۔ اس لئے نواب صاحب اس سے بدظن ہو گئے۔ نواب صاحب نے زیب خاں کو کافی سمجھایا لیکن وہ اپنے ارادے پر ڈٹا رہا۔ آخر کار نواب صاحب مجبور ہو گئے۔ اور عالم خاں کو ریاست امب سے جلاوطن کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں ریاست امب کا الحاق پاکستان کے ساتھ کر دیا گیا۔ ۲۸ ۱۹۴۷ء

کی جنگ کشمیر میں اپنے لشکر کو کشمیر بھیجا لشکر کی کمان نواب زادہ محمد عمر خاں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لشکر اوڑی کے محاذ پر متعین تھا۔

پھلڑہ

پھلڑہ سرسبز کوہستانی ریاست ہے۔ اور تحصیل مانسہرہ میں واقع ہے۔ پھلڑہ ریاست امب کا ایک حصہ ہے۔ اس میں ۹۰ چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں جن کی آبادی ۸،۰۷۵ ہے۔

ریاست پھلڑہ کے باشندے افغان تناولی ہیں۔ ریاست امب اور ریاست پھلڑہ کے حاکم اور باشندے ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۸۳۱ء میں جب سکھ سردار پائندہ خاں کے حملوں سے بہت تنگ آ گئے۔ تو انہوں نے سردار پائندہ خاں کے چھوٹے بھائی مدد خاں کو اپنے ساتھ ملا کر سردار پائندہ خاں کے خلاف کھڑا کیا۔ اور اسے یہ لالچ دیا کہ سردار پائندہ کے شکست کے بعد تمہیں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر سارا تناولی علاقہ دے دیا جائے گا۔ سردار مدد خاں نے سکھوں کی فوجی امداد لے کر سردار پائندہ خاں کے خلاف لڑنا شروع کیا۔ لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

۱۸۴۳ء میں جب سردار پائندہ خاں مرض اسہال میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ تو سکھوں نے اپنا رویہ بدل دیا۔ انہوں نے سردار پائندہ خاں کے بیٹے جہاندادخاں سے صلح کر لی۔ اور دریائے سندھ کے مشرقی حصہ تناول پر اُسے حاکم تسلیم کر لیا۔ اور سردار مدد خاں کو صرف وہ خطہ دے دیا۔ جو کہ اب ریاست پھلڑہ کے نام سے مشہور ہے۔

سکھا شاہی کے بعد جب ۱۸۴۹ء میں انگریز ضلع ہزارہ پر قابض ہوئے۔ تو سردار مدد خاں نے انگریزوں سے الحاق کیا۔ انگریزی حکومت نے پھلڑہ کو ریاست تسلیم کیا۔ اور اس کے والی کو خان آف پھلڑا کا خطاب دیا۔

انگریزوں نے خان آف پھلڑا کو ریاست کے اندرونی معاملات میں مکمل آزادی

دی۔

خان آف پھلڑا نے ریاست کے لئے ایک نظام نامہ مرتب کیا۔ ریاست پھلڑا کے خطہ کو اپنی ملکیت اور اس کے باشندوں کو مزارع کا درجہ دیا۔ اپنے ذاتی مصارف اور ریاست کی تمام ضروریات کا بار باشندوں کے کندھوں پر ڈالا۔ زمین کی پیمائش قیتوں کے حساب سے کی۔ اور مزارع کو محدود طور پر کاشت کے لئے زمین دی۔ ریاست کے جنگلات کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ مزارعین کے ذمہ ریاست کی بیگار لازمی قرار دی۔ ریاست کے دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ خود کرنے لگا۔ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے سردار مدد خاں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے عبداللہ خاں کو ڈپٹی کمشنر ضلع ہزارہ کی موجودگی میں ریاست پھلڑا کا خان مقرر کر دیا۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں جب سردار مدد خاں فوت ہوا۔ تو عبداللہ خاں نے مکمل طور پر ریاست پھلڑا کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

عبداللہ خاں کے چھ بیٹے تھے۔ اس نے زندگی کے آخری ایام میں ریاست پھلڑا کو چھ حصوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر ایک بیٹے کو مساوی حصہ دیا۔

سنہ ۱۸۸۵ء میں جب عبداللہ خان فوت ہوا۔ تو عبدالرحمٰن خاں کو انگریزی حکومت نے خان آف پھلڑا تسلیم کیا۔ چونکہ ریاست پھلڑا کا رقبہ پہلے ہی تھوڑا تھا۔ جب یہ چھ حصوں میں تقسیم ہوا۔ تو خان آف پھلڑا کی مالی مشکلات بڑھ گئیں۔ اسی بنا پر ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر سے اپیل کی کہ ریاست کی تقسیم ناجائز قرار دی جائے۔ خان آف پھلڑا کی اپیل منظور ہو گئی۔ حکومت سرحد نے ان کے بھائیوں کے پاس گزارے کے لئے معمولی سی زمین چھوڑ دی۔ اور باقی زمین خان آف پھلڑا کو دی۔ عبدالرحمٰن خاں نے ریاست کے باشندوں کی بہبودی کے لئے کچھ نہ کیا۔ اور پرانی لکیر کا فقیر بنا رہا۔

عبدالرحمان خاں کے مرنے کے بعد اس کے دو بیٹوں عطا محمد خاں اور تاج محمد خاں کے درمیان خانی پر سخت تنازعہ ہوا۔ آخر میں حکومت سرحد نے عطا محمد خاں کے حق میں فیصلہ کیا اور سنہ ۱۸۹۷ء میں عطا محمد خاں خان آف پھلڑا تسلیم ہوا۔ عطا محمد خان

ناکام حکمران تھا۔
ریاست کا نظم ونسق اپنے وزیروں کے ہاتھ سونپ دیا اور خود عیش وعشرت میں غرق رہنے لگا۔ ان بے اعتدالیوں کی وجہ سے وہ ہمیشہ مقروض رہتا تھا۔ بسا اوقات مزارعین سے جبراً ناجائز رقم وصول کرتا تھا۔ خان آف پھلڑا کے اس عمل سے مزارعین بہت تنگ آ گئے۔ جب عطا محمد خان فالج کی بیماری میں مبتلا ہوا۔ تو اس نے اپنے وزیر عبدالغفار خان کو ریاست کے اختیارات سونپ دیئے۔ اس کی بیماری کے دوران میں ولی عہد عبداللطیف خان کا میلان طبع مرزائی فرقہ کی طرف ہوا۔ عبدالغفار خان نے جب دیکھا کہ ریاست کے باشندے خان آف پھلڑا کے مظالم سے تنگ آ گئے ہیں۔ اور ولی عہد کے تعلقات بھی قادیانی فرقہ سے بڑھتے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے لوگ اس سے بدظن ہونے لگے ہیں۔ تو اس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ اور علم بغاوت بلند کر دیا۔

۱۹۳۳ء میں ریاست پھلڑا کے مزارعین اور ملازموں نے کام کرنا بند کر دیا۔ خان آف پھلڑا اور گزارہ خواروں کے خلاف احتجاجی جلسے اور مظاہرے ریاست بھر میں شروع ہو گئے۔ جلسوں میں خان آف پھلڑہ اور خوانین کے مظالم کی داستانیں سنائی گئیں۔ اس بغاوت کو دبانے کے لئے ڈپٹی کمشنر ضلع ہزارہ کرنل یارسنز صاحب مع فرانٹیر کانسٹیبلری پھلڑا آیا۔ اور پھلڑا میں دربار منعقد ہوا۔ اس دربار میں خان آف پھلڑہ گزارہ خوار خوانین اور مزارعین کو مدعو کیا گیا۔ اس دربار میں مزارعین پھلڑا نے سرزمین پھلڑا پر اپنے حقوق ملکیت کا دعویٰ ڈپٹی کمشنر ضلع ہزارہ کے سامنے پیش کیا۔ ڈپٹی کمشنر نے مزارعین اور خان آف پھلڑا کے درمیان صلح کرانے کی ازحد کوشش کی۔ لیکن ناکامیاب رہا۔ اور مزارعین اپنے مطالبہ پر ڈٹے رہے۔

ریاست میں امن بحال کرنے کے لئے حکومت سرحد نے ریاست کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انتھک کوششوں کے بعد حکومت سرحد نے جنوری ۱۹۳۴ء میں امن قائم کیا اور عبدالغفار خان کو ریاست سے خارج کیا۔ اور ریاست کا نظام

عطا محمد خان کو خان آف پھلڑا کے حوالہ کر دیا اور فرانٹیر کانسٹیبلری کو ریاست سے واپس بلایا
۱۵ ستمبر ۱۹۳۵ء کو عطا محمد خان نے وفات پائی۔
۱۶ ستمبر ۱۹۳۵ء کو عبداللطیف خاں کی دستار بندی نواب امب اور خوانین پھلڑا نے کی۔
۳ نومبر ۱۹۳۵ء کو سرکاری طور سے سکندر مرزا ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے عبداللطیف خاں کا رسم دستار بندی ادا کی۔ اور اُسے خان آف پھلڑا تسلیم کیا۔ بدقسمتی سے خان آف پھلڑا بھی ناکام خان ثابت ہوا۔ اس نے اپنے مفاد کو مقدم رکھا۔ اور ریاست کے باشندوں کی حالت کو سدھارنے کی طرف بالکل توجہ نہ دی۔ خود عیش وعشرت میں مصروف رہا۔ ۱۹۴۹ء میں ... مزارعین پھلڑا خان آف پھلڑا کی بے اعتدالیوں سے تنگ آکر ریاست سے ... ہجرت کر چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں پھلڑا کے لوگوں کا ایک وفد گورنر صوبہ سرحد سے حال ہی میں ملا ہے جس نے پھلڑا کو صوبے میں مدغم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

سنگِ میل :۔

پاکستان کی تمام ریاستوں میں بالعموم اور صوبہ سرحد کی ریاستوں میں بالخصوص نظام حکومت کی اندھی لاٹھی ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور وہ جس طرح چاہے۔ ریاست کے لاکھوں عوام کو اپنی مرضی کے مطابق ہانکتا رہتا ہے۔ ان لاکھوں انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے حسب منشا یا پُرامن شہریوں کی طرح مدنیت کے اصول اور عمرانیت کے فیضان سے متمتع ہوسکیں۔ بلکہ وہ اپنی زندگیاں غیر جمہوری طریقوں پر بسر کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ وہ ان احکام کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکتے۔ کیونکہ صدائے احتجاج سے ریاست کے مطلق العنان حکمران کی آمریت کا بھانڈا پھوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ کوئی ایسی جماعت یا انجمن کی تشکیل نہیں کرسکتے جس کی حیثیت عوامی ہو اور جو ریاست کے آمرانہ اختیارات سے

دُور رہ کر جمہوری ماحول تیار کر سکے
صوبہ سرحد کی ریاستوں میں بھی یہی اثر کار فرما ہے۔ کہنے کو تو یہاں کے ریاستی عوام لاکھوں کی تعداد میں جیتے جاگتے انسان ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ زندہ لاشیں ہیں جن کو ریاستی عمال جب چاہے مصالحت اور اغراض کی تکفین کر کے نفس پرستی کے تابوت میں بند کر دیتا ہے۔

اس جمہوری دَور میں جبکہ دُنیا سائنس اور علم کی رَوشنی میں ترقی کے فلک الافلاک کو مسخر کر رہی ہے۔ ہماری ریاستیں بالکل جہالت اور رجعت کے تاریک گڑھوں میں پڑی ہوئی ہیں اور ریاستوں کے عمال و حکمران طبقے کی ذاتی آسائش اور آمریت پروری کے لاکھوں عوام کی آسائشیں آرام اور حقوق کو قربان کیا جا رہا ہے

ہماری ریاستوں میں جمہوری نظام کا نام لینا بھی گناہ عظیم ہے۔ یہاں حکمران طبقے کے تشدد کے خلاف آواز اٹھانا ایسا گناہ ہے۔ جو ناقابل معافی ہے۔ یہاں عوام کی رائے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اور نہ ہی انہیں یہ حق ہے۔ کہ وہ ریاست کے کسی کام میں دخل اندازی کریں۔

ریاست کے حکمران کا ہر لفظ پتھر کی لکیر ہے۔ اگر کسی شخص نے اس سے روگردانی کی تو اس کے لئے ایسی ایسی سزائیں موجود ہیں جن کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔

غرض اس ایٹمی دَور میں بھی ہماری ریاستیں حجری زمانے کی یادگار معلوم ہوتی ہیں۔

ہماری ہر ریاست میں سامراجی دور کے نوکرشاہی ذہنیت کے راجے اور نواب اپنی ظل اللہی کو برقرار رکھنے کے لئے ریاستی عوام کی فلاح و بہبود سے قطعاً غافل ہیں۔ وہ شعوری طور پر عوام کو ترقی یافتہ بنانے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ انہیں عوام کی بیداری سے بڑے خدشات ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سیلاب ان کے تخت و تاج کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ لیکن یہ لیت و لعل یہ حیلے بہانے کہاں تک کام آ سکتے ہیں۔ زمانہ اس نقطے پر آ پہنچا ہے۔ جہاں محکوم و حاکم کے الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس وقت دُنیا کی اصلی مخلوق اور غالب آبادی عوام گراں خوابی کے مرگ آور سکوت کو توڑ کر اُٹھ کھڑی

ہوئے ہیں صرف اُٹھے ہی نہیں۔ بلکہ سینہ تان کر اپنے حقوق چھیننے کا عزم لے کر ڈٹ گئے ہیں۔ وہ اپنے زورِ بازو سے ان خود ساختہ جاگیرداروں۔ نوابوں۔ سرمایہ داروں اور انسانیت کا خون پینے والے ننگ زمین افراد سے اپنا عطا کردہ رنگا رنگ روپ چھین لینے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اب وہ کر کے ہی دم لیں گے۔ چاہے انہیں شیر کے مُنہ میں ہی کیوں نہ ہاتھ ڈالنا پڑے۔

اب وہ وقت آچکا ہے۔ کہ ریاستوں کے ان خود ساختہ حکمرانوں کے سامراجی طلسم کو باطل کر کے نظام حکومت ان کے اصلی اور جائز وارث عوام کو سونپ دیا جائے۔ تاکہ روئے زمین کے یہ بدنصیب بھیانک خطے آزادی کی روشنی سے منور ہوں۔ اور یہاں کے عوام جمہوری نعمتوں سے مالا مال ہوں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ ریاستوں کے لاکھوں عوام شخصی قید سے گلو خلاصی پائیں گے۔ بلکہ ملک کی ترقی و تعمیر میں بھی اضافہ ہوگا۔

پاکستان گورنمنٹ کا عوامی تقاضوں کے باوجود ملک میں ریاستی نظام کی قباحت کو ابھی تک برقرار رکھنا ایک ایسا فعل ہے جسے کوئی جمہوریت پسند شخص بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ہمارا ہمسایہ ملک اس سلسلہ میں قابلِ تقلید اقدام کر چکا ہے۔

•

رضا ہمدانی

شخصیات

حاجی صاحب ترنگ زئی

جب ملک کے اس پار کا خطہ آئین و اصلاحات سے نا واقف تھا اور کمپنی کی حکومت نے اس پر خطرناک اور ہنگامی حالات رکھنے والی سرزمین کا لیبل چپکا کر اسے ہر قسم کے جبر و تشدد کی آماجگاہ بنایا ہوا تھا۔ اس عہد کا قانون شکر میں لپٹی ہوئی کونین نہ تھا۔ بلکہ انگریز سامراج کی مخالفت میں اگر کسی ماتھے پر شکن بھی دیکھی جاتی تو اسے مجبور کیا جاتا کہ وہ علی رؤس الاشہاد زہر ہلاہل کا پیالہ ایک ہی سانس میں چڑھا جائے اور اس طرح کہ دیکھنے والوں کو یہی گمان ہو کہ یہ زہر نہیں پی رہا بلکہ اس کے لب مئے نشاط سے ہمکنار ہیں۔

دارسلاخان تجیرے لونرہ
ادس درابٹ پہ مخکینی ځي سو تورسیو ونہ

دارسلا خان کی حسین و جمیل لڑکیاں برہنہ سر جنرل رابٹ کے سامنے لے جائی جارہی ہیں)

پشتو کے اس شعر اس انسانیت سوز سانحے کی یاد دلاتا ہے جبکہ ارسلا خان (یوسف زئی) ایسے آزاد منش دلیر انسان کو انگریز دشمنی کی پاداش میں نہ صرف قتل کیا گیا بلکہ اس کے مال و املاک کو غارت کرکے اس کے اہل و عیال کو در

بدر پھرا یا گیا۔

جیب تور کو جس پر ایک انگریز کے قتل کا الزام تھا۔ بغیر کسی شہری عدالت میں مقدمہ چلائے فوری طور پر چوسنے میں جلا دیا گیا۔ غرض کہ تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے برطانوی سامراج نے وہ وہ مظالم ڈھائے جن کی مثال تاریخ کے صفحات میں بہت کم ملتی ہے۔

ایسے استبدادی دور میں اعلائے کلمتہ الحق، جان جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ لیکن سرحد کی تاریخ اس دور میں گونگی نہیں۔ اس بھیانک ظلمت کے دور میں بھی اس سرزمین نے روشنی کے ایسے ستون پیدا کئے جنہوں نے اپنی سحر آفریں ضیا سے مستقبل کے زندگی بخش نقوش کو ابھارا اور جن کے نقش پا نے آنے والی نسلوں کی رہنمائی کی۔

حاجی صاحب ترنگ زئی انہیں قائدین میں سے ہیں۔ آپ ترنگ زئی میں پیدا ہوئے جو تحصیل چارسدہ کا ایک مختصر سا گاؤں ہے۔ آپ کا نام فضل واحد تھا اور آگے چل کر آپ حاجی صاحب ترنگ زئی کے نام سے مشہور ہوئے۔

دینی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے غیر علاقہ کے ایک بزرگ نجم الدین عرف "ملا ہڈہ" کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ ملا صاحب ہڈہ کے انتقال کے بعد آپ ان کے خلیفہ مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ آپ نے اکناف سرحد میں کافی ہر دلعزیزی حاصل کرلی۔ اور اپنے اثر ورسوخ کے ذریعہ علماء خلفاء کو ایک مرکز پر جمع کرکے صوبے کے لوگوں میں سیاسی اور ذہنی بیداری کی مہم شروع کی۔

انگریزوں نے آپ کی اس تحریک کو بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ سمجھا۔ اور اسی بنا پر انہیں مع دیگر رفقاء کے گرفتار کرلیا۔ بعد میں آپ کو تو ضمانت پر رہا کردیا۔ لیکن آپ کے بعض خلفاء کو تین تین سال کے لئے قید کر دیا گیا۔ لیکن جب ان کی سیاسی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہ آیا تو انگریزوں نے انہیں دوبارہ گرفتار کرنا چاہا۔ آپ کو وقت سے پہلے اس کا علم ہوگیا۔ چنانچہ آپ غیر علاقہ میں لمندولی

کے پاس ہجرت کر گئے۔ آپ کے بعد آپ کی جائداد اور زمین کو ضبط کر کے نیلام کرا دیا گیا۔

حاجی صاحب کے غیر علاقہ کو ہجرت کر جانے کو حکومت نے ایک بہت بڑی سازش سے تعبیر کیا۔ اور اپنی ملوکانہ ریشہ دوانیوں سے قبائل کو حاجی صاحب کے خلاف بھڑکایا۔ جب انگریز کی سازشیں حد سے بڑھ گئیں تو ۱۹۱۶ء میں حاجی صاحب نے حافظ کور قلعہ شبقدر پر حملہ کر دیا۔

اگرچہ انگریزوں کی حمایت میں قبیلۂ حلیم زئی کے چند افراد نے آپ کا مقابلہ کیا۔ لیکن جب حاجی صاحب نے اعلان کیا کہ یہ جنگ انگریزوں کے خلاف ہے اور جہاد کے تحت آتی ہے تو قبیلۂ حلیم زئی نے حاجی صاحب کے ساتھ تعرض نہ کیا۔

انگریزوں نے جب تیسری بار افغانستان پر حملہ کیا تو حاجی صاحب افغانستان کی حمایت میں انگریزوں سے الجھے۔ ۱۹۲۶ء میں جب انگریزوں نے شمال مغرب کی طرف سے پیش آنے والے خطرات کے پیش نظر دفاع کے طور پر مہمندوں کے علاقہ میں سڑکیں تعمیر کرنا شروع کیں تو حاجی صاحب نے تمام قبائل کو جمع کر کے اس تعمیر کو اپنی آزادی کی راہ میں ایک دیوار تصور کرتے ہوئے انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ ۱۹۲۷ء میں ایک لڑائی ان قبائل کے ساتھ بھی لڑی جو انگریزوں کے حامی تھے۔

صوبہ سرحد میں ۱۹۳۰ء کی سیاسی زندگی تو تاریخ کا ایک خونین ورق ہے اس دور میں عوام کی زندگیاں مصائب و آلام میں گھری ہوئی تھیں۔ اور تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ غیر علاقے میں غاصبانہ طور پر . . . . تعمیر کا مرحلہ اور صوبہ سرحد کے عوام پر انگریز سامراج کے بے پناہ مظالم ان سب کے خلاف حاجی صاحب نے ٹھوس قدم اٹھایا اور اپنے لاؤ لشکر سمیت جس کی کمانڈ ان کے بڑے لڑکے بادشاہ گل صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ انگریزوں کے مقابل آ ڈٹے۔ سڑکوں کی تعمیر بند ہو گئی اور حاجی صاحب مظفر و منصور

لوٹے۔ ۱۹۳۳ء میں انگریزوں نے خلاف وعدہ دوبارہ سڑکوں کی تعمیر بجر شروع کردی اور اس مقصد کے لئے مہمندوں کے حلیم زئی قبیلے کو خرید لیا۔ حاجی صاحب نے پھر جہاد پر کمر باندھ لی اور سب سے پہلے حلیم زئی قبیلے کو شکست دے کر ان کے گھروں کو جلوا دیا۔ انگریزوں نے موقعے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے سڑکوں کی تعمیر بند کر کے صلح کر لی۔ لیکن اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر عہد شکنی کر کے انہوں نے ایک بار پھر سڑکیں بنانے کی کوشش کی اور اب کے تو حاجی صاحب نے اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ انگریزوں نے بھی اس دفعہ بڑی بھاری عسکری قوت کے ساتھ ان غیر منظم گروہوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن بے سود۔ انجام کار کھرپہ کی سڑک نامکمل ہی رہی۔ اس جنگ آزادی میں سینکڑوں قبائلی کام آئے۔ اور آج تک وہ نامکمل سڑک اس جنگ آزادی اور ان شہیدوں کی یاد اپنے سینے میں چھپائے محو خواب ہے۔

حاجی صاحب کی تمام عمر انگریز سامراج کے خلاف نبرد آزمائی میں گذری آخر یہ اولعزم مجاہد ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۷ء مطابق ۱۰ر شوال ۱۳۵۶ھ کو اس دار فانی سے رخصت ہوا۔

صاحبزادہ عبدالقیوم خان

صاحبزادہ عبدالقیوم خان مرحوم کو سر سید سرحد اسلئے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس صوبے میں جہاں جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ علم و فن کی ایسی مشعل جلائی جس نے سرحد کی تاریک گھپاؤں میں اجالا کر دیا۔ اسلامیہ کالج پشاور اسی نور کا منبع ہے اس کی بنیاد ۱۹۱۳ء میں صاحبزادہ مرحوم نے رکھی اور آج تک سارا صوبہ اس سے علمی استفادہ حاصل کر رہا ہے اور درحقیقت یہی وہ تنہا کارنامہ ہے جس نے ان کی زندگی کو دوام بخشا۔

ہم جب صاحبزادہ مرحوم کا نام لیتے ہیں۔ تو ہماری آنکھوں کے سامنے اسلامیہ کالج روشنی کے مینار کی طرح ابھر آتا ہے اور ان کی زندگی کا یہ روشن پہلو ان کی تمام اغیار پرستی اور سامراج دوستی کے عیوب پر غالب آجاتا ہے

صاحبزادہ مرحوم تحصیل صوابی کے مردم خیز خطے کے ایک غیر معروف گاؤں ٹوپی میں پیدا ہوئے: بچپن میں ہی والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ مشن سکول سے میٹرک کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ اپنی خداداد ذہنیت کی وجہ سے تحصیلداری سے پولیٹیکل ایجنٹ کے عہدے تک جا پہنچے اور ۱۹۱۹ء میں اس عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔

سرکاری خدمات کے صلے میں خان بہادر، سر، نواب، کے سی آئی۔ای کے خطابات اور بہت سے تمغے حاصل کئے۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۲ء تک متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں صوبہ سرحد کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک رہے۔

۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس لندن میں صوبہ سرحد کی طرف سے نامزد ہو کر گئے۔ ۱۹۳۲ء میں صوبہ سرحد کو اصلاحات ملیں اور پہلی اسمبلی ترتیب دی گئی تو اس میں پہلے پٹھان وزیر اعظم چنے گئے۔

اپنی وزارت کے عہد میں اردو ہندی سرکلر نافذ کرکے تعلیم کیلئے اردو کو لازمی قرار دیا۔

بطور سیاحت مصر۔ یونان۔ ترکی۔ بلغاریہ۔ آسٹریا۔ ہنگری۔ جرمنی۔ فرانس۔ سائبیریا۔ چینی، جاپان، ہانگ کانگ، ملایا، امریکہ، ہسپانیہ، شام بیت المقدس۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھی گئے۔

جب لوگوں کا سیاسی شعور پیدا ہوا اور خدائی خدمتگار تحریک اپنے عروج پر آئی۔ تو اسمبلی کے نئے انتخاب میں قوم پرستوں کے ہاتھوں آپ کو بری طرح ہزیمت اٹھانی پڑی

پچھتر برس کی عمر میں ۲۷ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال فرمایا۔

اردو، انگریزی اور پشتو کے بہت اچھے مقرر تھے۔ اور ملک کے چند سربرآوردہ مدبروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

خان برادران

پشاور سے بیس میل دور چارسدہ ایک مشہور و معروف گاؤں ہے۔ اتمان زئی اس سے دو میل آگے ایک چھوٹا سا مگر بڑا اہم موضع ہے جو دریائے سوات کے کنارے واقع ہے۔ اس چھوٹے سے موضع کا صوبہ سرحد کی خونین تاریخ سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ اس لئے کہ یہاں کے دو معتدر فرزندوں نے جو تحریک انسانیت کو بلند کرنے کے لئے چلائی تھی انجام کار اس کی عنان سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اور اس طرح ایک بہت بڑی اور بلند تحریک جس کے ساتھ کروڑوں عوام کی خوشحالی اور ان کا روشن مستقبل وابستہ تھا۔ دو پٹھانوں کی سادگی اور سرمایہ داروں کی عیاری سے ملیامیٹ ہو گئی۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ خان برادران نے ایسا کس نہج پر کیا۔ اور آیا انہیں ایسا کرنے کا حق بھی تھا یا نہیں۔ لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ خدائی خدمتگاروں کی تحریک کو اوائل میں جن بنیادوں پر چلانے کا ارادہ کیا گیا تھا یا کم از کم عوام کو جو کچھ بتایا گیا تھا۔ اگر اسی راہ پر اس عظیم تحریک کو چلایا جاتا تو آج کم از کم صوبہ سرحد کے مزارعین اور عوام جاگیرداری کے فرعونی چنگل اور زمینداروں کے انسانیت کش شکنجے میں اسیر نہ ہوتے۔ آج سرحد میں زمین کا مالک وہی ہوتا جو اس کے سینے کو چیر کر سونا نکالتا ہے۔ جو دنیا کا ان داتا ہے۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ کیونکہ ایک بڑے زمیندار سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے۔

خان بہرام خان اتمان زئی کے ایک بہت بڑے خان اور زمیندار تھے۔ خان عبدالغفار خان عرف باچا خان اور ڈاکٹر خان صاحب دونوں ان کے بیٹے ہیں۔ باچا خان جو ڈاکٹر صاحب سے عمر میں چھوٹے ہیں ۱۸۹۰ء میں اور ڈاکٹر خان صاحب ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ محمدزئی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب نے مشن ہائی سکول پشاور میں میٹرک کیا۔ اور ایک سال بمبئی کے گرانٹ میڈیکل کالج میں رہے۔ اور پھر ڈاکٹری کی تکمیل کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔

چھوٹے بھائی خان عبدالغفار خان نے ابھی میٹرک نہیں کیا تھا کہ بعض وجوہات کی بنا پر انہیں تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ آپ نے اتمان زئی میں ایک سکول بھی قائم کیا تھا۔ جو ۱۹۱۵ء میں حکومت نے بند کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب انگریزوں نے رولٹ ایکٹ مسلط کیا اور کانگرس نے اس کی مخالفت شروع کی تو عبدالغفار خان نے بھی اس میں حصہ لیا اور گرفتار کر لئے گئے۔ اور تحریک عدم تعاون میں شرکت کی بنا پر تین سال قید بامشقت کی سزا پائی۔ ۱۹۲۹ء میں سرخپوش تحریک کی بنیاد ڈالی جو خدائی خدمتگار کے نام سے مشہور ہوئی۔

۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں بھی شریک تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انہیں گرفتار کر کے ہزاری باغ جیل میں دو سال نظر بند رہے ۱۹۳۵ء میں بغاوت کے جرم میں گرفتار ہو کر دو سال قید بامشقت کاٹی۔ اسی زمانے میں وہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۲ء کی تحریک میں وہ دوسرے کانگریسی ممبروں کے ساتھ نظر بند کر دیئے گئے۔

ان کے دل میں گاندھی جی کی بڑی عزت تھی اور سیاسی عقائد میں انہیں کے پیرو تھے۔ اسی لئے وہ سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہوئے۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد انہوں نے پیپلز پارٹی کے نام

سے ایک جماعت بنائی جس کو کل پاکستان کی حیثیت دے کر خدائی خدمتگار تحریک کو اس کے ساتھ ملحق کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن وہ تجویز پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ اور فقیر ایپی کے ساتھ پاکستان کے خلاف سازباز کرنے کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے اور اس وقت منٹگمری جیل میں محبوس ہیں۔

ڈاکٹر خان صاحب بھی اپنے بھائی کے دوش بدوش سرخ پوش تحریک میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۳۸ء میں سرحد میں سب سے پہلی کانگرس وزارت بنی۔ تو آپ نے ہی وزارت عظمٰی کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۹۳۹ء میں کانگرس کی مرکزی جماعت کے فیصلے کے مطابق وزارت مستعفی ہوگئی۔ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو کی تحریک میں گرفتار کر لئے گئے۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں آپ نے رہا ہوکر دوبارہ قلمدان وزارت سنبھالا۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بننے کے بعد گورنر جنرل نے خان وزارت کو برطرف کرکے خان عبدالقیوم خان کو عنانِ وزارت سونپی اس کے کچھ عرصہ بعد ہی عبدالغفار خان کے ساتھ ہی ڈاکٹر خانصاحب کو بھی پٹھانستان کا پروپیگنڈا کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ان دنوں آپ ضلع ہزارہ کے ایک گاؤں میں نظربند ہیں:

سردار عبدالرب خان نشتر

پٹھانوں کے کاکڑ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۳ر جون ۱۸۹۹ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کیا اور ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ سیاسی تحریکات مثلاً تحریکِ خلافت۔ تحریکِ تبلیغ اور سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں گرمجوشی سے حصہ لیا۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۸ء تک میونسپل کمیٹی پشاور کے ممبر منتخب ہوتے رہے اور ۱۹۳۶ء میں سینئر وائس پریسیڈنٹ چنے گئے۔ ۱۹۲۹ء میں جب سرحد میں کانگرس کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی تو اس کے موسسین میں آپ بھی تھے۔

۱۹۳۰ء میں کانگریس کی تحریک سول نافرمانی کے سلسلے میں نوماہ قید بامشقت کی سزا پائی۔

۱۹۳۷ء میں آپ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے راولپنڈی سے منتخب ہوئے اور ۱۹۴۵ء تک رہے۔

۱۹۴۳ء میں جب مسلم لیگ وزارت برسراقتدار آئی تو آپ کو اس میں وزیر مالیات کے عہدے کی پیش کش کی گئی جسے آپ نے قبول کرتے ہوئے لیگ کے عہدنامے پر دستخط کر دیئے۔ ۱۹۴۵ء تک آپ اسی عہدے پر فائز رہے

تا وقتیکہ کانگریس نے اکثریت حاصل کرلی۔ اسی سال آل انڈیا مسلم لیگ کی ایکشن کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔

شملہ کانفرنس میں مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

جون ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت میں لیگ کی طرف سے آپ کو نامزد کیا گیا۔ اور

یہی دستور ہیں کونسل آف سٹیٹ کے ممبر بھی رہے۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد آپ کو وزیر مواصلات مقرر کیا گیا۔ اور اگست ۱۹۴۹ء میں مغربی پنجاب کے گورنر بنائے گئے۔

فارسی اور اردو میں شعر بھی کہتے ہیں۔ اردو، پشتو اور انگریزی کے بہترین مقرر ہیں۔ [illegible]

پشاور کی قدیم ادبی انجمن "بزم سخن" کے معاونین میں سے ہیں۔ اس زمانے میں طرحی مصرعوں پر غزلیں لکھکر انجمن کے مشاعروں میں پڑھا کرتے تھے۔

خان عبدالقیوم خان

۱۶ جولائی سن ۱۹۰۱ء کو چترال میں پیدا ہوئے۔ جہاں آپ کے والد مرحوم (اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔۔۔ جن کا انتقال ۱۹۱۸ء میں ہوا۔

اسلامیہ کالج میں تعلیم پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن چلے گئے۔

۱۹۲۶ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے لوٹے ۱۹۴۷ء تک پشاور میں پریکٹس کرتے رہے۔

سیاسی عقائد کے لحاظ سے نیشلسٹ تھے۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء تک متحدہ ہند کی مرکزی اسمبلی میں صوبہ سرحد کی نمائندگی کرتے رہے اور اسمبلی کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر بھی رہے۔

۱۹۴۵ء میں جب تحریک پاکستان عروج پر تھی تو یہ مسلم لیگ میں آ گئے۔ اور سرحد مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر چن لئے گئے۔

جب مسلم لیگ نے سرحد میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو گرفتار کر لئے گئے اور ۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء سے ۳ جون ۱۹۴۷ء تک جیل میں رہے۔

پاکستان بننے کے بعد گورنر جنرل پاکستان نے خان وزارت کو برطرف کر کے عنان وزارت ان کے ہاتھ دے دی۔ ۲۳ اگست ۱۹۴۷ء کو وزارت کا کام سنبھالا۔

مسلم لیگ میں آنے سے پہلے آپ نے انگریزی میں ایک کتاب "گولڈ اینڈ گنز" بھی لکھی تھی۔ جس میں نیشنلزم کی حمایت کی گئی تھی۔

اردو، پشتو اور انگریزی کے جادو بیان مقرر ہیں۔ سیاسی جوڑ توڑ میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ صوبے میں دوسری سیاسی پارٹیوں کے وجود کو برداشت نہیں کرتے۔

اپنی تقریروں میں عام طور پر جاگیرداری اور سرمایہ داری کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن عملاً اس طرف توجہ نہیں دیتے۔

سید محمد امیر

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی

• دنیا کی سب قوموں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انگریز قوم ہرگز قابل اعتماد نہیں ؎

یہ الفاظ ہیں مفتی سرحد مولانا عبدالرحیم پوپلزئی مرحوم کے جنہوں نے سرزمین بے آئین میں رہ کر استبداد و تشدد کے طوفان میں انگریز سامراج کی مخالفت اور عوام۔ مزدور اور دہقانوں کی حمایت کی ۔ جنہوں نے اپنے آخری سانس بھی قوم و وطن کی محبت پر نثار کر دیئے۔ جو ایک بہت بڑے انقلابی لیڈر۔ نڈر رہنما۔ فاضل اجل۔ عالم با عمل۔ حریت پرور اور انسان دوست فرد تھے۔ اور جن کی انتھک مساعی اور بے لوث قربانیوں کی بدولت آج تک فضائے سرحد میں صحیح انقلاب کی گونج باقی ہے

آپ ۱۸۹۰ء میں بمقام پشاور پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار مفتی سرحد مولانا عبدالحکیم صاحب تھے۔ علمی حلقے میں آپ کا شہرہ صرف صوبہ سرحد ہی میں نہیں بلکہ کابل، قندھار، غزنی اور ہرات تک پھیلا ہوا تھا۔ ان تمام علاقوں کے لوگ جوق در جوق آ آ کر آپ کے وسیع علم سے مستفیض ہوتے۔ سیاسی اعتبار سے بھی آپ کی شخصیت نہایت اہم تھی۔ آپ خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کے دادا حضرت علامہ مولانا محمد امین صاحب کا شمار بھی صوبہ سرحد کے ممتاز ترین علماء میں ہوتا تھا۔

پراچہ مرحوم نے ۱۹۰۵ء تک پشاور میں مختلف علماء سے اور بالخصوص اپنے والد محترم سے تعلیم حاصل کی کتب درسیہ سے فراغت حاصل کرکے ۱۹۰۸ء میں یہ ہوتے ہوئے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ یہاں اس وقت شیخ الہند علامہ محمود الحسن صاحب شیخ الدرس تھے۔ ۱۹۱۲ء میں آپ دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ کا شمار حضرت شیخ الہند کے مخصوص اور ممتاز شاگردوں میں ہوتا تھا۔ آپ اپنے درس میں جب اپنے استادِ محترم کا نام لیتے تو ہمیشہ یہ فرماتے "کہ مجھے فخر ہے کہ شیخ الہند جیسے مجاہد میرے استاد ہیں۔"

تعلیم سے فراغت حاصل کرکے آپ نے استاد کے ارشاد پر سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں جب ہجرت کی تحریک شروع ہوئی تو آپ نے نہایت ہی جان فشانی کے ساتھ اس تحریک میں قوم کی خدمت کی اپنی پر خلوص اور بے لوث خدمات کا سکہ ہر ایک کے دل پر بٹھا دیا۔ درحقیقت آپ کی سیاسی زندگی کا زمانہ کھلے طور پر یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اور آپ کی حیثیت اس تحریک میں بھی ایک قائد کی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں آپ نے ایک ہفت روزہ صحیفہ سرفروش کا اجرا کیا۔ جس میں تقریباً تمام مقالات، شذرات اور مضامین آپ ہی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہوتے تھے۔ صوبہ سرحد میں اس وقت جبکہ ظلم وجور کی قوت نے جمہوریت آزادی کو جارحانہ قوت سے دبا رکھا تھا۔ یہ اپنی قسم کا واحد اخبار تھا۔ جو کہ غریب عوام محنت کش مزدور، اور مفلوک الحال لوگوں میں بیداری اور اپنے حقوق کی حفاظت کا جذبۂ صادقہ پیدا کرتا تھا۔ انگریزی سامراج پر جائز اور تعمیری نکتہ چینی کرنا بغیر کسی خوف وخطر کے اس اخبار کا طرۂ امتیاز تھا۔ آج اگر ہم یہ کہیں تو بے محل اور بے جا نہ ہوگا۔ کہ صوبہ سرحد کی سیاسی بیداری میں اس اخبار کو بہت دخل رہا ہے۔

مولانا صاحب کی مسلسل کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۹۲۸ء میں یہاں کانگرس کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ مگر آپ نے دیکھا کہ کانگرس میں ایسے افراد ہیں جو سرمایہ دار نہ

خیالات کے مالک ہیں اور غریب عوام کی خدمت کرنا نہیں چاہتے۔ نیز آپ مکمل اشتراکی خیالات رکھتے تھے۔ اس لئے آپ ان چند اشتراکی رفیقوں کے تعاون سے نوجوان بھارت سبھا کے نام سے ایک الگ جماعت کا قیام عمل میں لائے۔ آپ کو اس جماعت کا سرپرست بنایا گیا۔ صوبہ سرحد کا تمام نوجوان اور باعمل طبقہ آپ کے ساتھ مل گیا۔ آپ نے آنے والے انقلاب کو دیکھتے ہوئے صوبہ سرحد کے قریہ قریہ، گاؤں گاؤں اور شہر شہر کا دورہ کیا، اور ایک بہادر شجاع اور نڈر انقلابی کی طرح دنیا کو یہ پیغام دیا: "دنیا چین اور آرام کی زندگی بسر کرے ملک کا نظام حکومت معاشی اور اقتصادی خوش حالی کا کفیل ہو۔ عدل و انصاف کا دور دورہ ہو ظلم و استبداد کا استیصال کیا جائے۔ ظالم کی حمایت نہ ہو اور نہ مظلوم کی حق تلفی نہ ہو۔

اس کے بعد آپ نے آزاد قبائل کا دورہ کیا، اس سفر میں آپ کے ساتھ بڑے بڑے علماء اور سیاسی کارکن بھی تھے۔ آپ کے اس سفر کا ایک بڑا مقصد علاوہ اور مقاصد کے یہ بھی تھا۔ کہ انگریزوں کی ان ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کیا جائے جو امان اللہ خاں سابق والئی افغانستان کے متعلق کی جارہی تھیں۔ چنانچہ آپ آزاد قبائل کے بڑے بڑے مشاہیر علماء مشائخ اور خوانین سے ملے اور انہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ اس سفر میں آپ کو بہت مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ نے ان تمام تکالیف کا مقابلہ کیا۔ اور اواخر ۱۹۲۹ء میں واپس پشاور لوٹے اور اس تمام روئداد کو قلم بند کر کے عوام الناس کے معلومات کے لئے شائع کیا۔ اب آپ کی ان تھک کوشش اور سعیٔ پیہم سے تمام لوگ اور خصوصاً غریب عوام جہادِ آزادی کے لئے بالکل تیار ہو چکے تھے۔ سول نافرمانی کی تیاریاں ہو نے لگیں جلسوں میں آپ کی تقاریر سے غریب اور نادار عوام آزادی کی تڑپ اور انقلاب زندہ باد کے نعروں سے اپنے قلوب گرما رہے تھے۔ کہ گورنمنٹ برطانیہ نے ۲۳۔ اپریل ۱۹۳۰ء کی صبح آپ کو مع دوسرے رفیقوں کے گرفتار کر لیا۔ اسی

دن ان کی گرفتاری پر عوام میں بے چینی پھیل گئی۔ مکمل ہڑتال ہوگئی، جلوس نکالے گئے۔ انگریزوں نے فوج طلب کی، فوج نے نہتے اور مظلوم لوگوں پر اندھا دھند گولی چلائی۔ مسلسل ساڑھے تین گھنٹے فائرنگ کی گئی۔ قصہ خوانی بازار انسانی خون سے لالہ زار بن گیا، قدم قدم پر لاشیں اور زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں تھیں کتنے نوجوانوں نے اس دن جام شہادت نوش کئے۔ اور کتنے بچے اس دن یتیم ہوئے ان تمام مصیبتوں اور تکالیف کا برداشت کرنا اور وطن عزیز کی آزادی کے لئے بیش بہا قربانیاں کرنا آپ ہی کی بے پناہ کوشش اور حصول آزادی کے لئے تیار کرنے کا نتیجہ تھا۔ پھر آپ کو گجرات جیل منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون پیکٹ کے تحت آپ رہا ہوئے۔ اواخر ۱۹۳۱ء میں آپ نے حکومت کے خلاف اتمان زئی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں صدائے احتجاج بلند کی۔ اس جرم میں آپ کو گرفتار کرکے تین سال قید کر دیا گیا اور ہری پور کی جیل میں رکھا گیا ۱۹۳۴ء میں آپ نے اس قید سے رہائی حاصل کی، جب آپ گھر پہنچے تو آپ کو میونسپل حدود کے اندر نظر بند کر دیا گیا۔ اور آپ پر کڑی نگرانی رکھی گئی۔ اس دوران میں آپ نے بیت اللہ شریف کے سفر کا ارادہ کیا، گورنمنٹ نے آپ کو سفر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ تو آپ نے احکام توڑنے کی دھمکی دی چنانچہ گورنمنٹ نے آپ کو اجازت دیدی، دو سال تک آپ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں رہے جب آپ واپس تشریف لائے تو اسی طرح آپ نے آزادی وطن کے لئے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۱۹۳۶ء میں اصلاحات کے تحت کانگرس نے یہاں اپنی حکومت بنائی، ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اب کانگرس جس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ غریبوں، ناداروں اور بھوکے زمینداروں کے لہو اور ہڈیوں پر بنی ہے سریر آرائے حکومت ہو چکی تھی۔ مولانا نے اسی کانگرسی حکومت کو نواب آف طورو کے ظلم و جور سے آگاہ کیا جو اس نے اپنے کمزور اور بے کس کسانوں پر روا رکھے تھے۔ مگر وہ حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آپ نے بار بار پراونشل کانگرس کو

بھی اس اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کیا، مگر اس طرف سے بھی کوئی جواب نہ ملا۔ آخر آپ کی سرپرستی میں غلہ ڈھیر تحریک شروع ہو گئی، آپ نے ایک بہادر انقلابی کی طرح مفلوک الحال زمینداروں کی حمایت میں "اپنی حکومت" کے مقابلہ میں آکر ۱۹۳۷ء میں تحریک شروع کر دی۔ آپ کو کانگرس کی طرف سے ہر قسم کا لالچ دیا گیا۔ اور خوب سبز باغ دکھائے گئے۔ مگر آپ کا قول تھا کہ اس میں شک نہیں کہ زمانے کے دل فریب کرشمے مضبوط سے مضبوط ارادے کو بھی متزلزل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کامیابی کا راز عزیمت میں ہے اور چشمک آرزو کے فریب خوردہ ارادے، دنیائے عزیمت کی حدود سے خارج ہیں۔" آپ نے اپنا یہ ارشاد سچا کر دکھایا۔ کہ مردانِ عزیمت ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے نہایت ہی مستقل عزم وارادہ کے ساتھ اس تحریک کو چلایا اور کانگرس کے ان تمام جھوٹے اور فریب کارانہ دعاوی کو چیلنج کیا، کانگرسی حکومت نے غریب زمینداروں پر ایک سرمایہ دار نواب کی حمایت میں وہ مظالم کئے کہ ان کے بیان سے انسانیت شرماتی ہے آخر اس اپنی حکومت نے مولانا کو گرفتار کر لیا اور ایک سال قید کی سزا دی۔ نیز جیل میں آپ کے ساتھ عام قیدیوں کا سا سلوک کیا گیا۔ اس مصیبت کو بھی آپ نے صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ ۱۹۳۸ء میں رہا ہونے کے بعد وہی غریبوں کی امداد، بے چاروں اور بے کسوں کی حمایت کا جذبہ آپ کو ضلع ہزارہ کے غریب زمینداروں اور کسانوں کی حمایت کے لئے ہزارہ لے گیا۔ تمام ہزارہ کے دورہ کرنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں پہلی ہزارہ کسان کانفرنس منعقد کی، جس کی صدارت کے فرائض بھی آپ نے ہی انجام دیئے، ان غریب عوام کے مطالبات آپ نے کانگرس کے سامنے پیش کئے۔ اور آخر پراونشل کانگرس کمیٹی کا اجلاس ایبٹ آباد میں کروا کے مزارعین کے مطالبات منظور کروائے اواخر ۱۹۳۹ء میں جب برطانوی استبدادیت نے غریب اور لاچار وزیرستانیوں پر ہوائی جہازوں کے ذریعہ بمباری، توپوں کے ذریعہ آتشیں گولے مشین گنوں

اور مسلح موٹروں کے ذریعہ گولیوں کی آگ برسائی تو آپ نے اس ظلم اور جبر کے خلاف بنوں میں ایک ہزار تقریر کی اور حکومت کو اس ظلم ناروا سے باز رکھنے کی کوشش کی نیز عوام الناس کو بھی ان مظالم سے آگاہ کیا۔ چنانچہ اس کلمۂ حق پر آپ کو گرفتار کر کے پانچ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ ایڈوائزری حکومت کے دور میں گورنمنٹ نے آپ کو اس شرط پر کہ آپ بنوں نہیں جائیں گے۔ رہا کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر اس پیکرِ حق و صداقت اور علمبردار حریت نے کمال بے باکی اور جرأت سے جواب دیا "کہ جب میں اس حکومت کو ہی عملاً تسلیم نہیں کرتا تو کسی شرط کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

چونکہ آپ کے خیالات سیاسی لحاظ سے اشتراکی تھے۔ اس لئے رجعت پسند طبقہ اور وہ کانگرسی طبقہ جو سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتا تھا آپ کے خلاف مذہب کی آڑ لے کر لغو اور فحش پراپیگنڈا کیا کرتا تھا۔ آپ کو طعنوں سے نوازا جاتا تھا۔ بالخصوص آپ پر یہ الزام لگایا جاتا کہ آپ کا طرز(ق) کار ملی مفاد کے لئے خطرناک ہے۔ مذہب کو اس سے نقصان پہنچتا ہے حدیث شریف، کوئی فقہ، تو کوئی اصول فقہ، کوئی تصوف کی کتابیں پڑھتا۔ تو کوئی اخلاق کی، کوئی منطق پڑھتا۔ کوئی فلسفہ، جب بھی کوئی استفتا آتا تو آپ قلم برداشتہ اس جواب لکھ دیتے، وعظ فرماتے تو حکمت و موعظت کے موتی بکھیرتے آپ کی اس دینی خدمت پر متفقہ طور پر تمام صوبہ سرحد اور ماورائی سرحد نے آپ کو اپنا مفتیٔ اعظم تسلیم کیا۔ صوبہ سرحد کابل، قندھار، تاشقند، اور آزاد قبائل میں ہزاروں کی تعداد میں آپ کے شاگرد موجود ہیں تصوف کے سلسلہ میں آپ جناب نجم الدین صاحب المشہور ملا صاحب ہڈہ کے پیرو تھے۔ اسی لئے مجاہد جلیل صاحب فقر و غنا جناب حاجی صاحب ترنگزئی سے بہت متاثر تھے،

جب یہ پیکرِ صبر و استقلال آخری دفعہ قید کے بعد رہا ہوئے تو بہت ہی کمزور اور نحیف ہو چکے تھے، دورانِ قید میں ہی آپ کو پلورسی اور درد گردہ کا مہلک دورہ پڑا تھا مگر اس سے آپ صحت یاب ہو گئے۔ پھر جب دوسری بار دورہ پڑا۔ تو اس سے جانبر نہ ہو سکے۔ بیماری کے ایام میں جب کبھی حاضری کا موقع نصیب ہوا تو فرماتے "امتحان کے پرچے دے رہا ہوں دیکھو کب امتحان ختم ہوتا ہے" تقریباً دس ماہ بیمار رہ کر ۵۴ برس کی عمر میں بدھ کے دن ۲۱ مئی ۱۹۴۲ء کو یہ آفتاب علم و عمل غروب ہو گیا۔

سنگ میل کا سائز

آئندہ کے لئے عوامی تقاضوں
کے پیش نظر سنگ میل کا سابقہ سائز
یعنی $\frac{22 \times 18}{8}$ کر دیا گیا ہے
حجم 60 صفحات ہو گا - اور
اس کے باوجود سالانہ چندہ
اور عام پرچے کی قیمت بحال رہیگی
سالانہ خریداروں کو سرحد نمبر
مفت پیش کیا جائے گا

مینجر سنگ میل محلہ خداداد پشاور

ضروری اعلان

ہندوستان کیلئے سنگ میل
کی سول ایجنسی ہم کسی دیانتدار
اور محنتی ادارے کو دینا چاہتے ہیں
سنگ میل کی ہندوستان میں بہت کافی
لاگت ہے اور اسکی بڑھتی ہوئی مقبولیت
کے پیش نظر آئندہ اس میں اضافہ ہونیکے
قوی امکانات ہیں صرف وہ حضرات خط و
کتابت کریں جو ایک ہزار روپے زر نقد
بطور ضمانت دے سکیں

مینجر سنگ میل محلہ خداداد پشاور

رضا حسین ہمدانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر محلہ خداداد پشاور سے شائع کیا

اسلام کی سر بلندی اور ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کی آزادی کے لئے قدرت نے عجیب و غریب اور بلند پایہ شخصیت سلطان فتح علی ٹیپو کو پیدا کیا۔ اس کتاب میں سلطان ٹیپو کی سوانح حیات، اس کا صحیح کیرکٹر، فوجی قابلیت، ملک کی ترقی و خوشحالی کے لئے ان تھک کوششیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اس کی جدوجہد، رعایا سے ہمدردی، جذبۂ جہاد، اشاعت اسلام، معدلت پروری، اس کی انصاف پسندی وغیرہ وغیرہ ان سب کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے سلطان کے صدہا اصلی خطوط، تحریریں اور حکمنامے۔ قیمت دو حصص آٹھ روپے۔

تاریخ سلطنتِ خداداد: محمود بنگلوری

ہندوستان کی طویل اسلامی تاریخ نے صرف دو مجاہدین نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان شہید کو پیدا کیا جنہوں نے استخلاص وطن کے لئے اپنے آخری قطرۂ خون کی بازی لگا دی۔ ان کی مکمل سوانح حیات

شہرود	اختر شیرانی	۳/۸
خون کی لکیر	علی سردار جعفری	۳/-
۱۹۴۸ کا شعری ادب		۲/-
شعلۂ ساز	فراق	۵/-
بادۂ مشرق	ساغر نظامی	۴/۸
جلال و جمال	ندیم قاسمی	۲/

افسانے

نئے زاویے اول		۶/-
" دوم		۶/-
۱۹۴۷ کا بہترین ادب		۶/-
ایک بات	عصمت	۳/-
چوٹیں	"	۲/۸
ہائے اللہ	ہاجرہ مسرور	۲/۸
چھپے چوری	"	۳/-
چرکے	"	۲/۸
کھیل	خدیجہ مستور	۲/-
درپن	شکیلہ اختر	۲/-
آنکھ مچولی	"	۲/۴

پاکیزہ ذوق کو جلا دیتا ہے اور انسانی ذہن و فکر کی نشو و نما میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ادبی مطالعے اردو ادب کی قدیم و جدید قدروں کا سنگم ہے۔ قیمت تین روپے۔

اسلامی خطبات : مرتبہ عبدالمجید قریشی

موجودہ زمانے میں ایک روشن خیال مسلمان کو جس قدر آیات، احادیث، تاریخی واقعات، اخلاقی باتیں۔ اصلاحی تدبیریں اور امت مسلمہ اور زوال کے اسباب اور ان کے علاج معلوم ہونے چاہئیں وہ ان خطبات میں آپ کو ملیں گے۔ ایک صحیح عقیدہ روشن خیال اور پختہ کردار مسلمان کے لئے مشعل راہ ہیں۔ قیمت دو روپے چار آنے۔

تاریخ پاکستان حصہ اوّل : قریشی مرحوم

عہد قدیم میں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات ہندوستان کی بدحالی کی بنیادیں اور پاکستان کا ظہور،

ایک سہیلی	رشید اختر	۵/۰
شمیم	فیاض علی	۶/۸
انور	″	۷/۸
میرے بھی صنم خانے ہیں	قرۃ العین	۶/۰
ماں	گورکی	۷/۸
اور ڈان بہتا رہا	″	۸/۰
یا خدا	قدرت اللہ شہاب	۱/۸
رقص ابلیس	ایم اسلم	۴/۰
شفیق	″	۳/۸
چشم لیلیٰ	″	۸/۰
فریاد خاموش	″	۵/۰
منزل	مضطر شیرازی	۴/۰
مہاجر	″	۴/۰
ٹیڑھی لکیر	عصمت	۵/۸
چور بازار	ابراہیم جلیس	۲/۱۲
دیوار	″	۳/۰
میری بھابی	جمیل واسطی	۲/۸
معمر خاتون	شوکت تھانوی	۱/۸
شیطان کی ڈائری	″	۱/۸

کی ہوسناکی کا شرمناک مرقع، ہندوستانی عورت کی سوگوار زندگی کے مختلف مناظر اخلاقی اصلاحی۔ قیمت مجلد دو روپے۔

رنگین مشاہدے : مظہر گیلانی

یہ افسانے زندگی کے مختلف واقعات کی رنگین تصویریں ہیں۔ بے حد دلچسپ۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے۔

گورکی کے افسانے : منٹو

روسی ادب کے امام گورکی کے مشہور افسانوں کا ترجمہ جس کے حریت پسند کردار کسی آئیڈیل کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ انسان اور نیچر میں صوفیانہ قربت اس تصنیف میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

بچوں کی کتابیں :

بہادر لڑکی ۶ر چار کھیل ۱۰ر بنجیہ ۶ر زلزلہ ۱۲ر دو دوست ۶ر
ترکوں کا باپ ۶ر عقلمند لڑکی ۶ر نا بدہ ۱۲ر محمد علی جناح ۶ر

بصائر قرآنی		۱|۱۲
تعارف قرآنی		۲|۰
در یتیم	ماہر القادری	۴|۰
انقلاب اسلام	ایم اسلم	۲|۸

تاریخ وسیاسیات

جب خون بہہ رہا تھا	بزمی	۳|۰
دیدہ شنیدہ	رئیس احمد جعفری	۵|۸
کشکول	"	۶|۸
بیت المقدس	"	۴|۰
خطبات نبوی	"	۲|۰
جہاد کشمیر	"	۲|۸
کربلائے پنجاب	"	۲|۸
نظام نو	"	۲|۸
میرا وطن	"	۲|۸
آزاد مصر	حسن اعظمی	۸|۰
مقدمہ کراچی	"	۱|۰
اسلام کے عالمگیر اصول	فرید وجدی	۳|۰

ہماری زیرِ طبع کتابیں

تاج : محمود بنگلوری

اسلامی تہذیب و تمدن کے عروج کی لافانی یادگار "تاج محل" کو کون نہیں جانتا۔ تاج فنِ تعمیر کا وہ شاہکار ہے جس پر مغربی صناع بھی رشک کرتے ہیں۔ ملک کے نامور اسلامی مورخ محمود بنگلوری کا ایک اور کارنامہ "تاج" ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت چار روپے

اسلامی ڈرامے : باسط سلیم صدیقی

اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے اپنے اولوالعزم راہنماؤں سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ ان کے سرفروشانہ کارنامے زندگی کے مجمد رگ و ریشہ میں حرارتِ ابدی پیدا کرتے ہیں۔ اسلامی ڈرامے اسلام کے اولوالعزم انسانوں کی زندگی کے خاکے ہیں جسے باسط سلیم صاحب پیش کرتے ہیں۔

قیمت تین روپے۔

اسلام میں امامت کا تصور	بدرالدین بدر	۱/۸
مکاتیب امام غزالیؒ	"	۳/۰
قرآنی اخلاق	صمد	۱/۴
تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات	صمد	۳/۱۲
تعمیر نو	عبداللہ انور بیگ	۱/۱۲
اصحاب کہف		۲/۰
روح جبران		۵/۰
اسلامی معاشیات		۷/۱۲
تاریخ اسلام	طبری	۸/۱۲
وحشی اقوام کی عورتیں		۳/۰
یورپ ۱۹۳۹ - ۱۹۱۸ء		۳/۸
رود کوثر	اکرام	۵/۰
تذکرہ	آزاد	۷/۰
تاریخ انقلاباتِ عالم	"	۱۰/۰
شاہ اسمٰعیل شہیدؒ	"	۳/۰

گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور

قائد اعظم : خالد اختر افغانی

مسلمانوں کا نجات دہندہ اور دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا معمار۔ قائد اعظم آج ہم میں نہیں ہے۔ لیکن اس کا زندۂ جاوید کارنامہ اور اس کی ابدی تعلیمات آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں خالد اختر نے "قائد اعظم" میں انھیں تعلیمات کی تصویر کشی کی ہے قیمت چھ روپے۔

قائد اعظم میری نظر میں :

قائد اعظم صرف مسلمان قوم کے ہی رہنما نہ تھے آج ساری دنیا آپکے فولادی عزم اور خارا شگاف ہمت کا لوہا مانتی ہے۔ قائد اعظم پر پاکستان کے فن کاروں اور نامور شخصیتوں نے کیا لکھا اس کا خلاصہ۔ قیمت تین روپے

پبلک سیفٹی ریزر : ابراہیم جلیس

ابراہیم جلیس افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیا

انقلاب روس	ٹواہر	-	٣
تاریخ انقلاب روس	شیر جنگ	٨	٤
کارل مارکس اور اس کی تعلیمات	"	٨	٦
من و یزدان اول	نیاز	٨	٧
" دوم	"	-	٦
پاکستان منظر پس منظر	عبداللہ	٠	٣
یاد ایام	عبدالرزاق	٠	٦
ہمارا قائد	سپہری	٨	٢
حیات قائد اعظم	سردار محمد	٨	٧
حیات محمد علی جناح	رئیس احمد جعفری	٨	٧
سیرتِ اقبال	طاہر فاروقی	٨	٨
الفاروق	شبلی	-	٦
الغزالی	"	٠	٤
امام اعظم رح	"	-	٤
ذکر حالی	صادق قریشی	٤	١
تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی		-	٨
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	٤	٢
نظام نو	عبدالوحید خاں	-	٣

ہے جس کے نغمے وقت کے تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جو عوام کا شاعر ہے جو عوام کے لیے لکھتا جسے عوام اپنا ساتھی سمجھتے ہیں۔ "زیر و بم" فارغ بخاری کی آٹھ سالہ شاعری کا نچوڑ ہے۔ قیمت دو روپے۔

اٹک کے اُس پار:

مؤلف فارغ بخاری۔ رضا ہمدانی

وہ سرزمین جہاں کے جفاکش باشندے اپنے ملک کی جنگ آزادی میں ہمیشہ پیش پیش رہے، لیکن سامراجی حکومت نے انہیں پہاڑوں کی اوٹ میں رکھا جنہوں نے اس وقت فسطائیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جبکہ سارے ایشیا میں ان کا کوئی ہمنوا نہ تھا۔

اٹک کے اُس پار

اس سنگین ماحول میں بسنے والے حریت پرست پٹھانوں کی تہذیب، کلچر، معاشرت اور ادب کا غیر فانی مرقع ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

سیاسیات

"جمہوریہ"	افلاطون	۵/-
اخلاق نقوماجس		۲/- [illegible]
فیدرس لائسیس اور پروطاغورس۔ افلاطون		[illegible]

نفسیات

تحلیل نفسی	حزب اللہ	۸/-
بچوں کی نفسیات	شیر محمد اختر	۱/۱۲
پس پردہ	"	۱/-
سمجھ بوجھ	"	۱/-
احساس برتری	"	۱/-
احساس کمتری	"	۱/-
آپ اور بچے	"	۱/-
سوچ اور کام	"	۱/-
تین شاہراہیں	"	۱/-
فرائڈ کا نظریہ جنس	"	۱/-
ہماری الجھنیں	"	۱/-
ہماری [illegible]	"	۱/-